BROWN BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224367

UNIVERSAL
LIBRARY

رجسٹرڈ نمبر ۴۷۰ے

ہولستان

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ
للعہ

قیمت فی پرچہ
۸

محصول صاف

عطہ کی روانگی پر آدھا

اور

عطہ کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

ہدیہ لیجیے

عطہ کی روانگی پر لفظاً ایک سال

اور

تار کی روانگی پر عطہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم	**مولانا آزاد مرحوم**	**مولانا نذیر احمد مرحوم**	**مولانا حالی مرحوم**	**مولانا شبلی مرحوم**	**مولانا ذکاء اللہ مرحوم**
اُردوے معلی عہ	آب حیات ۔ ے	محامل شریف ترجمہ ۔ ۴	یادگار غالب ۔ ے	سیرۃ النعمان جلد اول ۔ ۱۰	تاریخ ہندوستان جلد اول ۔ ۸
خود ہندی ۸ر و مدہ	دربار اکبری ۔ ۸	الحقوق والفروض ۔ ۴	حیات سعدی ۔ ۱	جلد دوم ۔ ۱۰	تاریخ ہند سلطنت انگلشیہ
دیوان غالب بمعنی ۔ ے	سخندان فارس ۔ ۹	بنات النعش ۔ ۹	مقدمہ شعر و شاعری ۔ ۱	سوم ۔ ۱۰	گزٹ نامہ ۔ ۶
مکمل دیوان غالب ۔ ۱	نگارستان فارس ۔ ۱۰	مراۃ العروس ۔ ۱۲	حیاتِ جاوید ۔ ۱۲	الفاروق ۔ ۱۲	آئین قیصری ۔ ۸
نیرنگ خیال ۔ ۱	قوت القلوب ۔ ۱۰	توبۃ النصوح ۔ ۱۰	دیوان حالی ۔ ۱	سیرۃ النعمان ۔ ۱	صحیفہ فطرت ۔ ۶
سیر ایران ۔ ۱	موعظہ حسنہ ۔ ۴		مسدس حالی ۔ ۱ر ۴	انتزالی ۔ ۱	تعلیم الانتظام ۔ ۸
دارا اکبر ۔ ۱	رویائے صادقہ ۔ ۴		مجموعہ نظم حالی ۔ ۴	المامون ۔ ۱	محاربات عظیم ۔ ۸
مجموعہ کتبات آزاد ۔ ۱	ایامیٰ ۔ ۴		مجموعہ کی مناجات ۔ ۲	سوانح مولانا روم ۔ ۶	جغرافیہ ریاضیہ ۔ ۱۲
مجموعہ نظم آزاد ۔ ۸	فسانہ مبتلا ۔ ۴		شکوۂ ہند ۔ ۲	سفرنامہ سفر روم و شام ۔ ۶	جغرافیہ ایشیا ۔ ۸
نصیحت کا گر مجہول ۔ ۸	ابن الوقت ۔ ۴			علم الکلام ۔ ۶	اہل عرب کا جہل مذہب ۔ ۶
دربار نورستان ۔ ۱۰	مصائب غدر ۔ ۱۲		مولوی شہاب الدین احمد	الکلام ۔ ۶	رسالہ علم مناسب ۔ ۶
	مجموعہ نظم بے نظیر ۔ ۴		واقعات دار الحکومت دہلی ۔ ۱۰	رسائل شبلی ۔ ۱	معاون الانساب ۔ ۱۲
	مکمل مجموعہ کچھ ۲ جلد ۔ ۱۲		تاریخ بیجاپور ۔ ۱۰	مقالات شبلی ۔ ۱	مساحت انجنیئر ۔ ۱۲
	کتب کہانیاں ۔ ۶		حرز طفلان ۔ ۱	شعر العجم جلد اول ۔ ۱	سید نور مرحوم
			انشاء طرز ۔ ۴	دوم ۔ ۱	کتاب الطلاق ۔ ۶
			عصائے پیری ۔ ۱	سوم ۔ ۱	کتاب الشفعہ ۔ ۶
			لخت جگر ۔ ۴	چہارم ۔ ۱	کچھ ۔ ۶
			حسن معاشرت ۔ ۴	پنجم ۔ ۱	
			اصلاح معیشت ۔ ۱	مواز خانیس و بیر ۔ ۱	
			اقبال و زمن ۔ ۱	مضامین عالمگیر ۔ ۸	
			شمع ہدایت ۔ ۴	آغاز اسلام ۔ ۸	مولوی سید احمد دہلوی
			انشاء بشیر ۔ ۱۲	مجموعہ کلام شبلی ۔ ۱۲	الفاروق ۔ ۱۲
			دیوان بشیر ۔ ۱۲	کلیات شبلی فارسی ۔ ۶	فلسفۃ الاسلام ۔ ۶
					تذکرۃ المعاصرین ۔ ۱۲

مجاز التنزیل ۔ لعہ	تذکرۃ الانبیا ۔ ۱		
سفرنامہ سپین جلد لطیف	شیخ سعدی ۔ ۱۲		

خلیفہ محمد حسین مرحوم	**مولوی سید ممتاز علی**		
خیالات شباب ۔ ۱			
ایشیائی شاعری ۔ ۱			
زور رجہان بیگم ۔ ۸			
بیوی سلطان ۔ ۱			
بیٹی سلطان ۔ ۱			

نوٹ کا پتہ: انسپکٹر ایجنسی ۔ گھنٹہ

۳۶۸ ھ
19
نمبر ۸۹۱۶۴۳۵
Checked 1965
1952

جلد ۳۴ فہرست مضامین بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

نمبر ۱ جلد ۳۴

فارسی ڈراما	مولوی محمد مسلم عظیم آبادی، ایم اے، ایم او ایل	۱
غزل	منشی افتخار علی جگر صدیقی	۶
اخلاق و تصوف کی رباعیاں	مولانا حسن مرتضیٰ شفق عمادپوری	۷
"ہندوستاں ہمارا"	مسٹر سلطان حیدر جوش (علیگ) ڈپٹی کلکٹر	۹
کلام اقدس	مولوی محمد عباس اقدس حیدرآبادی	۱۶
حیاتِ ابدی	مسٹر محمد مظہر حسین حیدرآبادی	۱۷
غزل	منشی سراج الدین احمد مہجور دہلوی	۲۵
آئینِ اردو	تاجنمی غلام امیر نقاد بدایونی	۲۶
غزل	منشی امیر علی رقم لکھنوی	۳۱
نظرے خوش گذرے		۳۱
مزدِ عیار	مسٹر عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی	۱-۲۶
سفیر اودھ	خودنوشت مولوی سید الدین خان بہادر مرحوم	۲۹

۰۶۴

عالمِ خیال

منشی احمد علی شوق قدوائی مرحوم کی لاجواب نظم۔ جو دو بار چھپ کر مقبول عام ہو چکی ہے۔ اب تیسری بار بالکل نئے قالب میں شایع ہوئی ہے۔ مصنف نے انتقال سے پیشتر بہت سی ترمیمیں کردی تھیں۔ پھر نظم کی مناسبت سے ایک تصویر خاص اہتمام سے بنوا کر لگائی گئی ہے۔ امۃ بیگم صفدر علی نے ایک دلچسپ مقدمہ تحریر کیا ہے۔ قیمت ۸ر

منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب فرمائیے

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول بنایا جائے دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں، یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے اُنکو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کیجائیگی۔ اس سے اُردو زبان کی آبی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلاء نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے۔ چنانچہ پروفیسر انڈریڈ ڈی۔ ایس سی پی۔ ایچ ڈی؛ پروفیسر پرا سیدلش پروفیسر برن یونیورسٹی، اور پروفیسر سر آرتھر کیتھ کے مضامین وصول ہو چکے ہیں، جنکے ترجمے اس رسالے میں شایع ہونگے۔ مقدور بلاک بھی ہونگے۔

رسالہ ماہ جنوری ۱۹۲۸ء میں شایع ہوگا۔ تقطیع بڑی رحلی اُردو کی ہوگی $20 \times 30 \frac{1}{8}$ سالانہ چندہ آٹھ روپیہ سکۂ انگریزی۔

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شایق اسکی سرپرستی فرمائیں گے۔

المشتہر: انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد دکن

فسانۂ جوش۔ اُردو کے مشہور فسانہ نگار اور ظریف انشاپرداز مسٹر سلطان حیدر جوش کے اُن دلچسپ اور مؤثر فسانوں اور دلآویز و پرکیف مضامین کا مجموعہ، جو وقتاً فوقتاً رسالہ اُنا ظر میں شایع ہوے۔ حجم ۲۰۰ صفحے۔ قیمت عہ

سفرنامۂ پرھما۔ جسمیں برہما کی اخلاقی معاشرتی تجارتی تعلیمی سیاسی زندگی کو تفصیل تحریر کیا گیا ہے اور عہد موجودہ کے نامور شخصیتوں کے حالات و واقعات درج ہیں۔ مصنفہ مولانا سید ابو ظفر ندوی پروفیسر مہامدن لال کالج۔ احمد آباد عہ

المشتہر: مینجر الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۱ جلد ۳۴

جنوری سنہ ۱۹۲۸ء

فارسی ڈراما

مضمون ذیل ایک فارسی ڈراما "وکلائے مرافعہ" کا مقدمہ ہے جو زیر طبع ہے

اب سے ایک صدی پیشتر فارسی ادبیات میں ڈراما (تمثیل) کا وجود نہ تھا۔ اگرچہ عشرۂ محرم میں واقعات کربلا اسٹیج پر دکھانے کا دستور عرصے سے جاری ہے، جسے ... "رسم تعزیہ" کہتے ہیں، مگر ہر سال ایک خاص جذبۂ انسانی (غم یا ہمدردی) کی برانگیختگی، ایک ہی اسلوب کلام، ایک ہی وضع و لباس، ایک سے سانگ، ایک ہی عبارت کی تکرار، مقررہ مقامات پر ماتم سرائی کی قیود نے اس رسم میں فرسودگی پیدا کردی ہے۔ رسم تعزیہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے نہ قابل تغیر ہے نہ ترقی پذیر۔ اس لیے اسے ڈراما سے کوئی نسبت نہیں۔ ڈراما یا تمثیل مختلف جذبات غم، غصہ، خوشی، استعجاب، ہمدردی، جرات، غیرت کو حرکت میں لاتی، سوسائٹی کے مختلف طبقات، حالات و مدارج کو آنکھوں سے دکھاتی، مختلف ملکوں اور زمانوں کے خصوصیات، عادات و اطوار کی تصویریں پیش نظر کرتی اور افراد و اقوام کے اخلاق پر دیرپا اثر ڈالتی ہے۔ غرض یہ حیات شخصی و ملی کے ہر پہلو کو محیط ہے اور دل و دماغ کے لیے ایک ایسی جولاں گاہ ہے جسکی حد و پایاں نہیں۔ اسی لیے یورپ میں جب سے یہ فن عرصۂ وجود میں آیا ہے، اسکی ترقی تمدن کے تمام شعبوں کے دوش بدوش نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط سے جب ایران یورپ کی مداخلت سے متاثر ہونے لگا اور ایران کا شمالی حصہ قفقاز اور وہ علاقے جن کو روسی ترکستان کہتے تھے زار روس کے قلمرو میں داخل ہو گئے تو یہ تو میں مغربی تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئیں۔ صدر مقام تفلس میں ۱۸۵۵ء میں ایک تھیٹر قائم کیا گیا، جس میں روسی حکام کی تفریح کے لیے روسی زبان میں یورپی ڈرامے کھیلے جاتے روسی زبان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں یہ اس قدر مقبول ہوا کہ اپنی زبان میں اس دلچسپ صنفِ ادب کی آرزو پیدا ہو گئی۔

اسی جدید تعلیم یافتہ گروہ میں قراجہ داغ کا ایک نوجوان کپتان مرزا فتح علی آخوندزادہ تھا۔ اس نے تھیٹر کے لیے اپنی زبان آذری ترکی میں جو فارسی اور ترکی سے مرکب ہے چھ تمثیلیں لکھیں:

(۱)	ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر	۱۸۵۰ء میں
(۲)	موسیو ژوردان یا حکیم نباتات	۱۸۵۰ء میں
(۳)	خرس قولدورباسان	۱۸۵۱ء میں
(۴)	وزیر خاں سراب	۱۸۵۲ء میں
(۵)	مرد خسیس	۱۸۵۴ء میں
(۶)	وکلائے مرافعہ	۱۸۵۵ء میں

انکے علاوہ ایک ناول "قصۂ یوسف شاہ" ترجمہ ۱۸۵۵ء بر الفاظ ۱۸۵۶ء میں ان سب کو یکجا شائع کیا۔ اس مجموعہ کی ایک جلد علم دوست شہزادہ جلال الدین مرزا پسر فتح علی شاہ قاچار کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ تحفتاً بھیجی گئی کہ اسکو زبان فارسی میں منتقل کرا دیا جائے، مگر شہزادے کو مدت تک اسکی طرف توجہ کا موقع نہ ملا

قراجہ داغ ہی کا ایک صاحب ذوق اہل قلم میرزا جعفر شہزادہ جلال الدین مرزا کے علمی دربار کی زینت تھا۔ اسکی گوہر شناس نظر اس مجموعہ پر پڑی تو اس نے اس کا فارسی ترجمہ شروع کر دیا۔ ۱۸۷۲ء میں ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر اور موسیو ژوردان کا فارسی ترجمہ تمام کر دیا۔ اس اثنا میں شہزادہ کی بے وقت وفات نے مرزا کو بے پناہ کر دیا۔ ایران کی فضا اور تھی۔ مغربی تہذیب و تمدن کا اس پر سایہ نہ تھا۔ اہل ایران مغربی تمثیل کے مزے سے ناآشنا تھے۔ فارسی داں سے چوری سرپرستی و قدردانی سے محروم رہ کر بھی یہ فدائے علم ہمت نہ ہارا۔ ۱۸۷۵ء تک مرزا فتح علی کی کل آذری تمثیلات اور اضافے کا ترجمہ کر کے انکو طہران سے یکجا شائع کر دیا۔ اہل علم نے انکی طرف

کوئی توجہ نہ کی - یہ تمثیلیں نہ کسی تھیٹر میں کھیلی گئیں، نہ مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل کی گئیں - اس ناقدری کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انکی زبان عام تکلمی روزمرہ اور سوقیانہ ہے، جسے پڑھنا پڑھانا اہل زبان عیب سمجھے - دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ ان میں عام درویشوں، ملاؤں، نجومیوں، کیمیا گروں کی ہجو اڑائی گئی ہے - عام اہل ایران کے دلوں میں انکی عظمت جاگزیں ہے - وہ اس تضحیک کی تاب نہ لا سکتے تھے - پولیس اور عدالت کے طرز عمل پر نکتہ چینیاں ہیں، جنکو شخصی حکومت گوارا نہ کرتی تھی - غرض مصنف و مترجم کے مقاصد میں سے نہ اصلاح معیشت کا مقصد حاصل ہوا، نہ تعلیم اطفال کا - البتہ ایک غرض پوری ہوئی - ایران حاضر کے روزمرہ اور جدید محاورات و مصطلحات زبان کی واقفیت حاصل کرکے اور ترکستان و ایران کے سرحدی قبائل کی معاشرت و تخیل کے معلوم کرنے کے لیے غیر اقوام نے انکو قدر کے ہاتھوں سے لیا اور شوق کی آنکھوں سے پڑھا خصوصاً فارسی حال کے سیکھنے میں بے انتہا فائدہ اٹھایا - فرانس، جرمنی، انگلستان میں انکی اشاعت ہوئی، ترجمے کیے گئے، تنقیدیں مرتب ہوئیں - ہندوستان میں اب تک تین تمثیلیں مع حل لغات و مقدمہ شائع ہو چکی ہیں - مرد حسیں اور حکیم نباتات لاہور سے[۱] اور تیسری تمثیل وکلائے مرافعہ ثمنہ سے، جس کا مقدمہ یہ مضمون ہے -

مرزا جعفر ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۸ء کے لگ بھگ وفات پائی - خاتم الشعرا قاآنی ۱۸۵۴ء میں رحلت کر چکا تھا - مرزا جعفر کی موت پر ایران میں انیسویں صدی کی برکات ذہنیہ کا خاتمہ ہو گیا - مگر بیسویں صدی کے آغاز نے ایران کی علمی جدوجہد میں ایک نیا باب کھول دیا - ۱۹۰۶ء کے انقلاب مشروطی سے ایران ہر شعبۂ زندگی میں بیداری کے آثار ظاہر کرنے لگا ہے - اس عرصے میں اصلاح ملکی و معاشرتی پر متعدد کتابیں اور مضامین نظم و نثر میں شائع ہوئے - ان میں چند تمثیلیں بھی نظر آتی ہیں - مثلاً شہزادہ ملکم خاں نظام الدولہ متوفی ۱۹۰۸ء کی تین تمثیلیں، کچھ شیکسپیر کے ترجمے بعض مشاہیر تاریخ پر طبعزاد تمثیلیں فارسی حال میں موجود ہیں - اگرچہ اب بھی اس صنف سخن کو قبول عام حاصل نہیں -

مغربی ڈراموں کے مقابلے میں قراجہ داغی کی متذکرہ چھ تمثیلات کوئی بلند رتبہ نہیں رکھتیں - قصہ کا دروبست (پلاٹ) عموماً سست اور بودا ہوتا ہے - عشق و محبت کی واردات مجمل، ناقص اور کسی قدر خشک ہوتی ہیں - اصل افسانہ کے پہلو بہ پہلو کوئی ضمنی حکایت نہیں ہوتی - شاعری و موسیقی

---

[۱] یہ دونوں تمثیلیں ہمارے مکرم ... پروفیسر مرزا محمد علی فضل حق ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور نے نہایت قابلیت اور محنت سے مرتب کرکے شائع کی ہیں - سلم -

نا پید ہے۔ خاتمہ حیرت انگیز نہیں ہوتا اس لیے مسرت انگیز بھی نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک بھی تمثیل مصیبت رٹریجڈی) نہیں، سبھی تمثیل بہجت (کومیڈی) ہیں۔ حالانکہ ایرانیوں کو بیانِ مصیبت میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی جس سے ٹریجڈی اور تمثیل (ایکٹ کرنے) دونوں میں اعلیٰ کامیابی کی توقع کی جاتی تھی۔

مگر ان فروگذاشتوں کے باوجود نقشِ اول کی حیثیت سے یہ نہایت منظم اور قابل قدر ہیں۔ زبان سیدھی سادی روزمرہ، ہر تکلف اور تصنع سے پاک۔ ان میں ایک خاص صفت جو سب سے زیادہ ممتاز نظر آتی ہے، وہ ظرافت ہے شستہ و لطیف۔ اس میں باوقار طنز اور ملیح ہجو کی وہ پُر لطف چاشنی پائی جاتی ہے جو ایران کی قومی خصوصیت ہے۔ جدید فارسی شاعری میں وہ فراوانی تخیل، قدرت بیان، جدت طرازی اور موسیقیت موجود ہے کہ ان زیوروں سے آراستگی کے بعد فارسی تمثیل میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

ذیل میں ایک فرانسیسی تمثیل نویس مولیر کی ایک تمثیل کے فارسی ترجمہ "گذارش عروم گریز" کا ایک منظر ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ تمثیل ۱۹۰۸ء میں قسطنطنیہ سے شائع ہوئی تھی۔ اور تمثیل منظوم کی کوشش کا نمونہ ہے۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت بھی پیش کرتی ہے کہ نظم معرّیٰ کو مشرقی مذاقِ سخن قبول نہیں کرتا۔ صنف مثنوی میں ناصبی روانی اور برجستگی پیدا کی جا سکتی ہے:۔

مولس۔ (بہ پیش فراش میرود) ..... چہ بست فرمایش؟

بیا با نیم

فراش۔ دارم دو حرف با سرکار

مولس۔ تواں دو حرف خودت را کنی بلند اظہار

فراش۔ رئیس دیوان آں را بندہ ام فراش
مرا بدست بدادست حکم حاضر باش
بتو ....

مولس۔ کجہ؟ بمن؟

فراش۔ آرے بتو

مولس برائے چہ کار

فراش۔ بحرف مفت امیدی و حضرت سرکار

حقیقۃ (ناصح) پساں؟

ناصح۔ شنیدی دلا گشتہ اندوست دلیل
سخنہ شعر کہ نگذاشت ست وقع و محل
کنوں ز پیش بخواہند بست وارۂ کار

مونس۔ من وہ ا ہنہ ہرگز نہ می کنم اقرار

ناصح۔ ولیک حکم چنیں رفتہ ہیں سبب از جا

مونس۔ بیاں ہا چہ بخواہند داد صلح وصفا
بگو بہ بزرگاں مگر بود تنسیق
کہ شعرہائے بد مردماں کنی تصدیق
از انچہ گفتہ ام انکار نیست زاں مرجع
براست ہر چہ بخواہی

ناصح۔ ولیک مضمون تو

مونس۔ نمی تواں گزرم شعر ہا پر و پیچ است

ناصح۔ قبول رائے تو خواہند وجائے خواہش ہست
برو تو

مونس۔ می روم اما نمی تواں ابدا
ز رائے خویش بگردم

ناصح۔ برو تو. خود بنما

مونس۔ مگر بحکم شہی خاص گردد و منسوب
کہ شعرہائے ستیزیدہ بافت باید خوب
وگرنہ فاش بگویم کہ شعرہاش بد اند
باید ایں کہ چنیں شاعراں بدار کشند

(بہ نغماں بیگ و نعیم بیگ ہیں کہ وہ بدمی خندند)

حقیقۃ کہ چنیں سخن دہم نبود گماں
کہ بودہ باشم و ستم بکساں

ناصح۔ رواں شوہاں

فتنہ۔ کجا شما را باید .....

مونس روم ولے دردم

بیایم ایں جا تا کش کمش برم از ہم[1]

ہندوستان کے سنجیدہ اہل قلم کی طرح ایران کے متین و موقر ادبا بھی اس صنفِ سخن کو علمی وقار و تمکنت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے حق میں ایک ہی ہوا۔ فن تمثیل یا ڈراما ذلیل اور پست حالت سے کچھ زیادہ اُبھر نہ سکا۔

محمد مسلم۔ ایم اے۔ ایم او ایل
از ہزاری باغ

---

[1] یہ تمثیل پروفیسر براؤن مرحوم کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ اب نایاب ہے۔ یہ حصہ پروفیسر کی تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم سے منقول ہے۔ مصنف کا نام پروفیسر کے نسخے پر درج نہیں۔

غزل

گل بھی ہے میری قبر پہ شمع مزار بھی — وہ دیکھکر ہنسے بھی ہوئے اشکبار بھی
عاشق بھی دخترِ رز کے ہیں اُمیدوار بھی — میخانے میں ہیں رند بھی پرہیزگار بھی
شوقِ وصال بھی ہے غمِ کوئے یار بھی — ہم بھی اُدھر چلے ہیں دلِ بیقرار بھی
انداز اپنے غنچۂ دل کا وہی رہا — گزرے خزاں کے دن ہوئی رخصت بہار بھی
جن نامیوں کا نام تھا سارے جہان میں — باقی نہیں اب اُن کا نشان مزار بھی
آئینہ رکھکے سامنے زلفیں بھی تم بناؤ — اور اپنے باغِ حُسن کی لُوٹو بہار بھی
جو ہے وہ مستقد مرے پیرمغاں کا ہے — صحبت میں بادہ کش بھی ہیں پرہیزگار بھی
موسیٰ نے ہوش کھوئے تری جلوہ گاہ میں — دیکھا بھی مصطفےٰ نے تو رہے ہوشیار بھی
ہستیِ بے ثبات پہ ہنستے ہیں راہ میں — نقشِ قدم بھی دہر کے نقش و نگار بھی
صیاد ہم قفس میں نہ ہوتے اگر اسیر — رنگِ چمن بھی دیکھتے لطفِ بہار بھی
پوچھا کیے وہ شمع سے کچھ میری قبر پہ — پڑھتے رہے نوشتۂ لوحِ مزار بھی

بیٹھے ہیں رکھکے ہاتھ کلیجے پہ ہم جگر — حکیم جگر صدیقی بسوانی
وہ دل کے ساتھ لیگئے صبر و قرار بھی

اخلاق و تصوف کی رباعیاں

(حضرت شفق رضوی عمادپوری کے مجموعۂ دلِ صد پارہ کا ایک غیر مطبوع ٹکڑا)

طلب مولیٰ

دُنیا مانگوں کہ تجھ سے عقبیٰ مانگوں — کوثر مانگوں کہ خُلد و طوبیٰ مانگوں
سب کچھ تیرا، تجھی سے سب کچھ مولا — میں تجھ سے ترے سوا بتا کیا مانگوں

طلب مغفرت

زاہد ہیں، کہ ہم صلے میں جنت مانگیں — مزدور نہیں کہ مُزدِ طاعت مانگیں
آمرزشِ عصیاں ہو بقدرِ رحمت — مانگیں تو باندازۂ ہمت مانگیں

توبہ و ندامت

پڑھ کر کلمہ تائبِ عصیاں ہولوں — شرمندۂ غفلت ہوں پشیماں ہولوں
کہتا ہوں اجل سے کہ ذرا صبر تو کر — مرنا ہی ہے آخر تو مسلماں ہولوں

گریۂ آخرت

ہے دانۂ اشک سبز ہونے کے لیے — نیکی کا تخم دل میں بونے کے لیے
سنبھال کر وہ ان سے آخرت کی کھیتی — آنکھیں پیدا ہوئی ہیں رونے کے لیے

مُزدِ طاعت

لذت دنیا کی جب نہ قسمت میں ملی — راحت عقبیٰ کی مُزدِ طاعت میں ملی
طاعت میں ہوس کو کر لیا ہو شامل — جنت بھی تجھے ملی تو اُجرت میں ملی

گوش و چشم و قلب و زباں

سننے کو بُرا بھلا ملے ہیں دو کان — دو آنکھوں سے نیک و بد کو دیکھ او نادان
مان ایک کو ایک بات ایمان کی بول — سینے میں دل ایک، مُنہ میں ہے ایک زباں

رضائے معبود

جس بندہ سے ہو وہ بندہ پرور راضی — دنیا کے ہوں بندے اُس سے کمتر راضی
ہوں ایک غلام کے اگر دو آقا — دونوں کو وہ رکھ سکے گا کیونکر راضی

تسبیح ربائی

طاعت میں رہا فریب شیطانی ہے — بیفائدہ شغلِ سبحہ گردانی ہے
ناداں نہ بن تو ہو کے دانا زاہد — گننا دانوں کا صرف نادانی ہے

سجدۂ ربائی

اسلام کا ننگ وہ مسلمانی ہے — جس سے بیگانہ ذوقِ ایمانی ہے
دل ہی میں نہ ہو جو نورِ ایماں زاہد — سجدہ ترا صاف داغِ پیشانی ہے

تنبیہ غفلت

غفلت لیے تجکو جا بجا پھرتی ہے — غافل تری گھات میں قضا پھرتی ہے
دانا ہے تو گردشِ فلک سے ہشیار — ناداں ترے سر پہ آسیا پھرتی ہے

وزن تواضع

زیور سے تواضع کے اگر ہو عاری — زردار کو زر سے نہ ملے سرداری
تو عقل کی میزاں میں ذرا تول کے دیکھ — جھکتا ہے جو ہو وزن میں پلّہ بھاری

تونگر بے ہنر

ایسا ہی ہے بے ہنر تونگر خالی — جیسے ہو نگیں سے خاتمِ زر خالی
شکلِ طبلِ تہی ہے ناداں منعم — باہر سے ہے پوست اور اندر خالی

خالی ظرف تہی مایہ

گل سے ہے چمن، چمن سے صحرا خالی — گوہر سے صدف، صدف سے دریا خالی
ہے گنبدِ آسماں تہی مایہ شفق — اتنا بڑا ظرف اور ایسا خالی

خمیر خاکساری

انسان میں کچھ نہیں جو ادراک نہیں — بیکار بشر ہے شر سے جب پاک نہیں
طینت کا خمیر خاکساری ہے شفق — جو خاک نہیں وہ آدمی خاک نہیں

دلیل انکساری

ملتی ہے تیرے کماں بھی جھک کر — دیتے ہیں پیرے جواں بھی جھک کر
دیکھی ہے یہ سب سے انکساری کی دلیل — چلتا ہے زمیں پہ آسماں بھی جھک کر

"ہندوستاں ہمارا"

ہندوستان محض ہمارا ہے۔ یا۔ محض آپ کا؟ —— ہمارا اور آپ کا مشترکا ہے؟ ——
یا۔ (اور یہ ہی زیادہ قرینِ قیاس ہے) نہ ہمارا ہے نہ آپ کا، بلکہ کسی اور کا ہے؟ ——
اِن سوالات کا جواب اگر پیچیدہ نہ ہوتا تو "ہندوستاں ہمارا" کے مصنف کو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر "سارا جہاں ہمارا" کی کینچلی نہ بدلنی پڑتی۔ میں اُس سرزمین کی مردم خیز آب و ہوا کا یقیناً قائل ہوں جہاں "ہندوستاں ہمارا" اور "سارا جہاں ہمارا" کی سرخیوں سے مشہور ہونیوالی نظموں نے جنم لیا ہے۔ میں کیا ہے۔ کوئی ذی فہم اس خطۂ آبدار کی مردم خیزی سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ "امرت دھارا" سے "آبِ حیات" تک۔ اور "خضاب لاجواب" سے "مردمی کے کبس" تک، جس قدر گوناگوں ایجادات و اختراعات اِس صوبے سے وجود میں آئی ہیں اُن کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے۔ مگر اِس اقبالِ خوش اعتقادی کے باوجود سوالاتِ مذکورہ کا جواب غالباً اُس سرزمین پر بھی ابھی تک عنقا ہی ماننا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اِن کا شافی جواب، پنجاب تو درکنار، ہفت اقلیم نہیں دے سکتی؛ غالباً ایک درین لالہ جی اور کوڑی بھر مالو یہ نہیں دے سکتے، ایک سینکڑہ عبدالرحیم اور ایک ہزار جناح نہیں دے سکتے۔

ان سوالات کا جواب نہ دے سکنے کی وجہ سوالات کی اہمیت ہو یا نہ ہو، مگر جواب دینے والوں کا ناقابلِ اعتماد "گرگٹ پن" ضرور ہے۔

+ + + + + + + + +

ہمارا مستقبل ہمیشہ ہمارے سر پر منڈلایا کرتا ہے۔ یا۔ پسِ پشت سیٹی بجاتا معلوم ہوتا ہے۔ ایک بچہ کہانی سننے میں محو ہو کر "ہنستا درخت اور بولتی چڑیا"۔ "سبز پری اور گلفام"۔ غرض ہر دلکش چیز اپنے پسِ پشت موجود تصور کر لیتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات "تنہائی یا اندھیرے میں" کا لے دیو۔ یا "بھوت پلید" کے قرب کا احساس اُسے دفعتاً چیخ اُٹھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ پسندیدہ مستقبل کو اپنے پسِ پشت سمجھنے کا انسان فطرتاً عادی ہے۔

پرستان کو دیکھنے کے لیے ایک بچہ دفعتاً اپنی پیٹھ کی طرف مڑتا ہے، مگر وہ پرستانِ خیالی بھی اُس بچہ کے ساتھ ساتھ اُس کے پسِ پشت بھاگ جاتا ہے —— نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ چکر کھا یا

کرتا ہے اور پرستان ہمیشہ اُس کے پسِ پُشت ہی رہتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اپنی خواہشِ دِلی سے دوچار ہونے کی غرض سے، جس کو وہ پسِ پُشت موجود سمجھتا ہے، مسلسل پُشت کی طرف مُڑنے۔ یا۔ لٹو کی طرح چکر کھانے میں مصروف ہے۔ ممکن ہے کہ خود کرۂ ارض کی محوری گردش کا راز بھی تلاشِ مقصد پر مبنی ہو۔

* * * * * * * *

سائنس اپنے مقاصد و متعلقات کے بُعد پر نازاں ہے اور شاعری و مذہب قربِ مقصد کا اعلان کرتے ہیں۔

سائنس کو ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ کی مسافت، ایک حالت سے دوسری حالت کا عرصہ، ایک شے سے دوسری شے کا بُعد، نہایت بے اعداد میں بیان کرنے میں عظمت نظر آتی ہے۔ شاعری و مذہب کو اس میں لطف آتا ہے کہ قیامت کو فردا کا قُرب حاصل ہو اور کرامًا کاتبین ہر متنفس کے کندھوں پر سوار ہوں۔ سائنس اور شاعری کے باہمی تفاوت کا فیصلہ کسی صورت سے ممکن ہو یا نہ ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ عقل کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔

بذاتِ خود، مجھ کو اسی نظریہ میں لطف آتا ہے کہ میرا مقصدِ حیات میری شہ رگ سے بھی قریب تر ہو۔ اگر میں اُس کو سات سمندر پار تصور کرنے کی کوشش کروں تو تمام زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

قربِ مستقبل کے نظریہ میں سب سے بڑی نزاکت ہے۔ سائنس کی مینک سے حماقت ہو۔ یہ ہے کہ فاقہ مست کو بھی کل صبح جاگنے پر "بیک گردشِ چرخِ یومیہ" مسٹر ہنری فورڈ بنجانے کی اُمید ہو سکتی ہے؛ ایک نابینا کو بھی کسی پُراسرار بینائی کی بدولت سے آنکھوں کے گوہر شبچراغ ہو جانے کی ڈھارس ہو سکتی ہے؛ اور ایک مبتلائے خمارِ آلام کو بھی یقین آ سکتا ہے کہ ساقی کے زیرِ فیض وہ مینا بدست یہ پڑھتا ہوا برآمد ہوگا کہ:——

صد سالہ تو وہ چرخ ہے ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدہ سے تو عالم بدل گیا!!

* * * * * * * *

ان متعلقات کے زیرِ سایہ، اس کا قطعی امکان ہے کہ میں صبح کی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہوں اور شام کو ریل گھر نے پر معلوم ہو کہ پشاور آگیا۔ یا۔ میں شام کو ٹہلتا ہوا حلب کی طرف چلوں اور

دو ایک موڑ کے بعد اپنے آپ کو ٹنکٹو میں پاؤں ؛ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسے اتفاقات کے واقعی پیش آجانے پر مجھے ہرگز حیرت نہیں ہو سکتی ۔ اور غالباً نہیں ہوگی ۔ میرے معتقدات کو اگر صدمۂ عظیم پہونچ سکتا ہے اور ناقابلِ بیان حیرت ہو سکتی ہے تو کسی ایسے واقعۂ عجیب سے کہ میں لاہور کی ٹھنڈی ٹھنڈی سڑکوں پر چہل قدمی کے لیے نکلوں اور دائیں بائیں مڑتا ہوا ، ایک آدھ چکر کے بعد ، اپنے آپ کو فی الحقیقت ہندوستان میں پاؤں !!

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے مستقبلِ سفر وضہ کے قرب میں لطف پاتا ہوں مگر ماحول ماضی کے بُعد میں ۔

* * * * * * * * *

اس اجمال کی تفصیل میں ایک واقعہ کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں ۔

ایک دن ، صبح کے وقت ، میں شکار کی غرض سے باہر جانے کی تیاری میں مصروف تھا کہ ایک بے تکلف عنایت فرما ، مرگِ مفاجات کی طرح نازل ہوئے ۔ اس سے پیشتر کہ میں اُن کی شانِ نزول معلوم کر سکتا ، اُنھوں نے اپنے سوالات کی چاند ماری سے مجھے مغلوب کر لیا ۔ کم و بیش ایک درجن سوالات کے بعد اُنھوں نے پوچھا " کس طرف کا ارادہ ہے ؟ "

" اپنے گھر کا " میں نے جواب دیا ۔

" میں اِس جملے کی شوخی سمجھنے سے قاصر ہوں "

" اس میں کوئی شوخی نہیں ـــــ محض اصلیت ہے " میں نے کہا ۔

" یعنی ؟ "

" یعنی ـــــ میں ایک روز گڑھ پال کے شکار میں تند ہاری کے قرب صرف کروں گا ، دو روز گڈریہ کے جنگل میں گلدار کی خاطر گداز ہوں گا اور چوتھے روز گھر واپس آؤں گا " میں نے جواب دیا ۔

" اب آپ کا پہلا جواب صحیح سمجھا جائے یا غلط ؟ " اُنھوں نے پھر کہا ۔

" قطعی صحیح ! " میں نے جواب دیا " آپ اگر لکھنؤ جانے کے ارادہ سے سفر اختیار کر رہے ہوں تو دریافت کیے جانے پر صرف لکھنؤ کا نام لیں گے ، درمیانی مقامات کے کیے بعد دیگرے گنانے کی آپ سے اُمید نہیں کی جا سکتی ۔ میرا سفر گھر پر ختم ہوتا ہے اس لیے میرا ارادہ گھر کا ہے ۔ "

" مگر منشائے سفر تو شکار ہے جو گھر سے باہر ہوگا ؟ " اُنھوں نے پھر اعتراض کیا ۔

"مجھے اوّل تو منشائے سفر میں بھی اختلاف ہے، دوسرے منشائے سفر کو مقام سفر بیان کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ عارضی طور پر گھر چھوڑنے کی اصلی غرض شکار نہیں ہے بلکہ دراصل گھر کی زندگی میں از سر نو دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ گھر میں رہتے رہتے گھر کی زندگی کا لطف زائل ہو چلا ہے۔ اب چند روز گھر سے باہر رہنے میں، واپسی پر، گھر کا لطف بڑھ جائے گا۔ شکار اور جنگل کے فوائد مقصد سفر نہیں، بلکہ۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا۔ منشائے نقل و حرکت ہے۔"

مجھے احتمال قوی ہے کہ وہ میرا مطلب سمجھ سکے یا نہیں، مگر میں اپنی بندوق اٹھا کر اُن سے رخصت ہو گیا۔

* * * * * *

خدانخواستہ اگر آپ گھر والوں پر، یا آپ پر گھر والے، بار ہونے لگیں تو سب سے سہل نسخہ تبدیلِ مقام ہے ــــ دفعتاً اور بلا اطلاع و اظہارِ ارادہ، پرلے چندے، مفقود الخبر ہو جانا گوارا کیجیے، واپسی پر گھر والے آپ کے لیے اور آپ گھر والوں کے لیے مجموعۂ لطف و انبساط بن جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی دلکشی کا راز بُعد میں مضمر ہے۔ کشتی کی قدر اُسی وقت نظر آتی ہے جب امواج کا شکار رہنے پر کشتی سے بُعد ہو جائے؛ عبادت خانہ کی عظمت اسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ دَیر مینخانہ پر لکلوب مانی کے زیرِ منش رہ کر ایک مدت عبادت خانہ سے بعید رہا جائے؛ راست بازی کی وقعت اسی رنگ سے ذہن نشیں ہو سکتی ہے کہ عرصۂ دراز تک دروغ گوئی شعارِ حیات بنالی جائے؛ حکومت کا صحیح احساس اسی صورت سے پیدا ہو سکتا ہے کہ صدیوں تک غلامی کی زندگی بسر کی جائے!

* * * * * *

ہزاروں مادی اشیاء سے آپ کو اپنی زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے اور اُنکی ظاہری و باطنی صفات آپ کی توجہ کا دامن پکڑا کرتی ہیں، لیکن دلچسپی۔ یا قیامِ توجہ۔ اُن ہی اشیاء سے پیدا ہوتی ہے جو ہر وقت آپ کے پس و پیش نہ منڈلایا کریں۔

مہوبہ کے باشندہ کو مہوبہ کے پان اُسقدر لذیذ نہیں معلوم ہو سکتے جسقدر دلی والے کو معلوم ہوتے ہیں؛ کالنجر کا رہنے والا کالنجر کے قلعہ اور پہاڑیوں میں وہ عظمت نہیں پاتا جو ایک سیاح کی آنکھ کو نظر آتی ہے؛ ہندوستانی کو ہندوستان کی اندرونی خوبیوں کا علم اُس حد تک نہیں

ہو سکتا ہیں حد تک ایک غیر ملکی کو ہو گا ـــــ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ـــــ ہندوستان میں رہنے بسنے والے کو، سرے سے، ہندوستان کے وجود ہی کا احساس باقی نہیں رہتا۔

البتہ ـــــ بمبئی سے رخصت ہوتے ہوئے، جہاز پر سے ساحل ہند کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے مشاہدہ کرنے سے ہندوستان کے احساس وجود کا آغاز ہو سکتا ہے؛ نہر سوئز سے گذرتے ہوئے روشنیوں کا دلکش نظارہ، یا کھڑکی سے فرنچ بندرگاہ مارسیلز پر کھڑے ہوتے سے دکھائی دینے والی رنگ برنگی ریلوے کی روشنیاں اور بجلی کے ہنڈے یاد آسکتے ہیں؛ لندن کی تہ بہ تہ آبادی اور کہر اور دھوئیں سے بھرا ہوا آسمان ہندوستان کی تاروں بھری رات اور کھلی ہوئی فضا پیش نظر کر سکتا ہے ـــــ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہندوستان سے بعد ہو جائے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ لاہور کی سڑکوں پر چہل قدمی کرنے سے اگر مجھ میں ہندوستان کے وجود کا احساس دفعتاً پیدا ہو جائے تو کس قدر حیرت انگیز ہو گا؟

* * * * * * *

ہندوستان کی اندرونی حالت ایک ایسا راز ہے جو کم از کم ہندوستانی آنکھوں سے نظر آنا ناممکن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس راز کو آج تک کوئی کما حقہٗ معلوم ہی نہیں کر سکا ـــــ ہندوستانی تو درکنار، یورپین بھی اندھے ہی رہے ـــــ اس کے صحیح انکشاف کا سہرا امریکہ کے سر رہنے والا تھا جو مس میو کے واقعات نگار قلم نے پہلی مرتبہ حاصل کیا ہے۔ اس ہندی کی چندی نکالنے کی قابلیت پیدا ہونے کا معجزہ صرف اس حقیقت پر مبنی ہے کہ امریکہ کو ہندوستان سے بُعدِ بعید حاصل ہے اور مس میو کی ذاتِ والا صفات کو ہندوستانیوں سے ـــــ بہ استثنائے چند نوجوان نقوس کے ـــــ کوئی قرب میسّر نہیں۔

مس میو کی نگاہِ دُور بیں، ہندوستان کے افرادِ مذکر کے ۲۵ برس سے ۳۵ برس تک کی عمر والے جوانوں کا جائزہ لینے میں، دس میں سے آٹھ کو نامرد پاتی ہے ـــــ اور ـــــ ایک ۸ برس کی ہندوستانی لڑکی کا اپنی ماں سے صرف گھنٹہ بھر کے لیے جدا ہو جانا اُس کی عصمت دری کا مقدمۂ مبرم سمجھتی ہے۔

مجھ کو اپنے ذاتی علم کی بنا پر ان خیالات سے قطعی اختلاف ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ مجھے ہندوستان سے اس قدر بعد نصیب نہیں ہے جو مس میو جیسی دلچسپی آمیز نظر پیدا کر سکے۔ نوجوانانِ ہند کے دس میں سے آٹھ افراد کی نامردی، ایک ایسی واقعیت ہے جس سے کسی ہندوستانی کو فضائے موجودہ میں اختلاف کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ

کے متعلق ہندوستانی گئوصفت بیوی کی شہادت، جس کی تعریفِ مردمی محض اپنے ٹوٹے پھوٹے شوہر کے تجربہ پر مبنی ہوتی ہے، مطلق وقیع نہیں سمجھی جا سکتی۔ ایسے مسئلہ کے لیے اُس آزاد ہستی کی تعریفِ مردمی قولِ فیصل ہو سکتی ہے جسکے تجربات و مشاہدات کافی طور پر وسیع ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس ہندوستانی نامردی کے معاملہ میں مس میو کا علم اپنی ذاتی معلومات کے علاوہ، اُن آزاد منش انگریزی اُٹھتی جوانی والیوں کی تائید پر بھی مبنی ہوگا جن کو ولایت جانے والے ہندوستانی نوجوانوں کی خلوت و جلوت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع لندن یا اُسکے مضافات میں مل چکا ہو۔

اب رہا دوسرا معاملہ ـــــ یعنی ایک ۸ سالہ لڑکی کی محض گھنٹہ بھر کی علیحدگی میں عصمت دری ـــــ اس کے متعلق بھی مس میو کے ذاتی زاویۂ نظر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مغربی کیفیتِ زندگی کی تصویر کھینچنے کے لیے مسٹر آئیر کے قلم کی ضرورت ہوگی۔ میں صرف ایک لطیفہ پر اکتفا کرتا ہوں جو ایک ولایتی اخبار کے توسّل سے میری نظروں تک پہنچا تھا۔

ایک صاحبِ ثروت یورپین کو اپنی حسین بیوی اور اُن کے ایک معصوم دوست کے متعلق کچھ جہالت آمیز شبہات پیدا ہو چلے اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچے کہ اُن صاحب کو اپنی بے گناہ بیوی کو طلاق دینے اور یہ بیچ بیچ دو گوشہ خانہ بدر کر دینے کی دھمکی دینی پڑی۔ بیوی صاحبہ کے لیے میاں سے ۔ اکم از کم میاں کی دولت و ثروت سے ۔ کنارہ کرنا ناقابلِ برداشت تھا اس لیے فسانہ جنگی کا خاتمہ اِس صلح نامہ پر ہوا کہ بیوی نے میاں کی سلامتِ خود اختیاری قطعی طور پر تسلیم کرلی اور آئندہ کے لیے نہایت بیداری بھر کم الفاظ میں اپنے دوست سے یکقلم ترک کر دینے کا عہد و پیمان کیا۔ برسے چندے گھر کی فضا نہایت مسرت انگیز رہی اور میاں کو بیوی کے راہِ راست پر آجانے کا گمان ہو چلا۔ اتفاقاً میاں کو ایک کام کے لیے اپنے وطن سے باہر جانا پڑا اور چلتے وقت بیوی نے نہایت مایوسی اور چشمِ پُرآب کے ساتھ اُنکو خدا کو سونپا۔ اتفاق کہیے یا شومئی قسمت۔ میاں کو دفعتاً آٹھویں روز پردیس سے مکان واپس آنے کی ضرورت درپیش آئی اور گھر پہنچ کر بیوی کو غائب پایا۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا اور محض عدم موجودگی چنداں عتاب انگیز نہ ہوتی، مگر نوکر چاکروں سے یہ معلوم ہونا غضب ہوگیا کہ بیچاری بیوی تنہائی کے عالم میں، محض اوقات کشی کی خاطر، ممنوعہ دوست سے ہی تبادلۂ خیالات میں مصروف رہیں اور آج بھی اُن ہی کے ساتھ تبدیلِ آب و ہوا کی خاطر ایسٹر تشریف لے گئی ہیں۔ میاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، روانہ

سنبھال کر تھیٹر کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچے تو تھیٹر کے دربان نے اِن کی خشم آلود چشم و ابرو سے بہت کچھ بھانپ لیا اور باتوں ہی باتوں میں اِن کا ارادہ دریافت کر لیا۔ اِن کا مقصد قتل معلوم کر لینے پر اُس نے بہ لطائف الحیل اِن کو اندر جانے سے باز رکھا اور اس بات پر راضی کر لیا کہ باہر والے بڑے دروازہ پر انتظار کریں اور جب تماشہ ختم ہونے پر اِن کی بیوی اپنے دوست کے ساتھ باہر نکلیں تو دونوں کو بہ آسانی جہنم واصل کر دیں۔ اِدھر تو یہ دروازہ پر سایۂ دیوار کی طرح قائم ہوئے، اُدھر دربان نے تھیٹر کے منیجر کو اِس مصیبتِ ناگہانی کی خفیہ اطلاع دی۔ منیجر کی طرف سے میاں اور بیوی دونوں بھاڑ میں جائیں، مگر اُس کو اپنے تھیٹر کی بدنامی کا خوف دامنگیر ہوا۔ اس بدنامی کو بچانے کی خاطر اُس نے ڈرامہ بین کے موقعہ پر تھیٹر کے اندر جا کر بہ آوازِ بلند اعلان کیا کہ "ایک صاحب بھرا ہوا ریوالور تھامے بڑے دروازہ پر اِس ارادہ سے موجود ہیں کہ اپنی بیوی اور اُس کے آشنا کو باہر نکلنے کے وقت ٹھنڈا کر دیں؛ اس لیے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ اگر وہ بیوی اور اُن کے آشنا یہاں موجود ہوں تو براہِ مہربانی میرے پاس چلے آئیں تاکہ میں اُن دونوں کو ایک چور دروازہ سے باہر نکال دوں اور وہ بخیریت چلے جائیں"۔

اِس اعلان کے جواب میں، حاضرین کے انبوہ میں سے، صرف ۶۵ جوڑے بیویوں اور آشناؤں کے کھڑے ہو گئے!!

غور کیجیے! ایک ایسے مُلک میں جہاں صرف ایک رات میں، اور صرف ایک تماشہ گاہ کے حدود میں، ۶۵ بیویاں اپنے دوستوں کے ساتھ، خلافِ مرضیِ شوہراں، موجود پائی جائیں۔ اور اُن کی عصمت دری کا کوئی خطرۂ بعید بھی نہ کیا جا سکتا ہو، وہاں ایک ۸ سالہ لڑکی کی ماں کے دماغ میں محض ایک گھنٹہ کی جدائی سے کوئی احتمال پیدا ہو جانا انتہائے جہالت، بلکہ، مقتضائے بربریت نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے؟

* * * * * * * *

ہندوستان کے لیے کوئی متفقہ رائے معلوم کرنا اُسی قدر محال ہے جسقدر طاعون کا حکمی علاج دریافت کرنا۔ ہندوستان کے اندر والے اور باہر والے ہندوستان کو اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہمیشہ مختلف نتائج نکالتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں غلط بیانی - یا - غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اندر والے دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی قابل نہیں گو بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ہم سب قابل ہیں ——

باہر والے یہ جانتے ہیں کہ وہ سب قابل ہیں مگر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ وہ کسی قابل نہیں۔

* * * * * * *

اس سوال کا جواب اب بھی باقی ہے کہ "ہندوستان کس کا ہے"؟ — اور غالباً اس کا جواب دینا سائمن کمیشن کے حق میں محفوظ رہیگا۔

میری ذاتی رائے کی اگر اجازت ہو تو میں ڈنکے کی چوٹ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ

ہندوستان نہ ہمارا ہے اور نہ آپ کا — بلکہ، بلا شرکتِ غیرے، محض بیس بیسوں کی تنہا ملکیت ہے، جنھوں نے "مادرِ ہند" کی بیش بہا تصنیف میں، اس ناکارہ خاک کی صحیح تصویر کھینچنے میں، صداقت و حقیقت نگاری کو اس خوبی کے ساتھ گلِ حکمت کیا ہے کہ بایدو شاید!!

الا یا ساقیا! مے دہ! بجانِ من پیاپے دہ!
دمادم ہے خوروہے دہ کہ می ترسم خمار آید!!

سلطان حیدر۔ جوش

کلامِ اقدس

اُمنڈ جاتا اگر طوفاں بلائے ناگہانی کا
نہ آتا پھر لبِ ساحل سفینہ زندگانی کا

نظر ہر پھر کے پڑتی ہے تجھی پر اب زمانے کی
نکھر جانا قیامت ہوگیا رنگِ جوانی کا

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظار وعدۂ محشر
یہی لے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا

بھیانک رات ہے دریا مہیب اور دور ہے ساحل
تھپیڑوں میں ہے موجوں کے سفینہ زندگانی کا

ہمیں واقف ہیں ایذائیں اُٹھائیں ہر نفس جتنی
بھلا ہو دَور میں اُلفت کے دَور آسمانی کا

خدا معلوم آخر کب چھٹیں گے قید ہستی سے
مقرر ہی نہیں ہے وقت مرگِ ناگہانی کا

ذرا اے بیخودیِ شوق اب مجھکو سنبھلنے دے
کہ پیہم کان میں آتا ہے نغمہ لن ترانی کا

دلِ ناعاقبت اندیش اب تو ہی بتا مجھکو
یہیں پردہ رہے گا راز کب تک زندگانی کا

ہمیں آ جگا و ناوکِ صد رنج و غم ٹھہرے
ہمیں پر تنگ عرصہ ہوگیا ہے زندگانی کا

کوئی پرسانِ حال اپنا نظر آتا نہیں اقدس
گلی کوچوں میں ذکر خیر ہے اُسکی جوانی کا

حیاتِ ابدی

مضمون ذیل، حیدرآباد کے ایک ہونہار نوجوان نے تحریر کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے زیر تعلیم اور فارغ طلباء کی تحریریں خاص ہمت افزائی کی مستحق ہیں۔ اسلیے کہ ان نوجوانوں نے مُلکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کرکے ذہنی ترقی کی منزل کو اپنے اوپر آسان کر لیا ہے۔ اور یہ اُمید بیجا نہ ہوگی کہ مطالعہ میں وسعت اور تحریر میں مہارت پیدا ہو جانے کے بعد یہی لوگ اُردو زبان و ادب کو عروج و کمال پر پہونچا سکیں گے۔

فلسفیانہ تحریروں کے لیے الناظر کے سابق محرر خصوصی مولوی عبدالماجد صاحب اور جامعہ عثمانیہ کے معلم فلسفہ مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا اسلوب تحریر، اگر حیدرآبادی عزیز کے پیش نظر رہے تو اُنکی تحریریں انشاء اللہ زیادہ کامیاب رہیں گی۔ ایڈیٹر

تمام دنیا میں یہ علوم مچی ہوئی ہے کہ علوم مغربیہ اور فلسفہ جدیدہ نے تمام قدیم قیاسات وعقائد کا اس طرح استیصال کر دیا ہے کہ اب انکے جانبر ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی اور قدیم فلسفہ چونکہ زیادہ تر قیاسات و مفروضات پر مبنی تھا لہذا وہ اس معرکہ میں کامیاب نہ ہوسکا اس میں شک نہیں کہ انسان کی باہمی کشمکش کی بدولت آج ہمیں سیکڑوں ایجادات دکھائی دیتے ہیں اور اسکی متجسس نگاہوں اور عقلی کاوشوں کی وجہ سے وہ پنہاں راز جن کا خیال کرتے ہوئے انسان گھبراتا تھا اور جنھیں خطرناک اور مقدس فرض کرتا تھا، آج ہمارے سامنے روز روشن کی طرح منور نہیں تو کم از کم اس طرح عیاں ہیں کہ ہماری کچھ نہ کچھ تشفی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ہماری موجودہ جستجو و سرگردانی کے نتائج متقدمین کے خیالات کے بالکل خلاف اور ہر بات میں برعکس ہیں، ایک حد تک نازیبا ہے کیونکہ بعض وہی باتیں جو عقائد مذہبی کے احکام کی صورت میں زمانۂ سلف میں موجود تھیں، آج بھی جب ہم نئے علوم کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو بجائے اسکے کہ ہم اُنکا انکار کریں بلا خوف تردید اُنھیں تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اہل حقیقت نے اتنے اختلافات کے باوجود بعض مسائل کو کسی نہ کسی طرح بڑے پیچ و تاب کے بعد آخر تسلیم ہی کر لیا۔ فلسفہ نے کئی فرقے پیدا کیے لیکن یہ بحث

حیرت انگیز ہے کہ کم و بیش ہر فرقہ کے فلاسفہ نے ماہرانہ بحث کے بعد بالآخر وہی نتائج نکالے جو پہلے نکل چکے تھے

اس عالم ناپیدا کنار میں ایسے متخالف بلکہ متباین خیالات و عقائد نظر آتے ہیں کہ اگر انسان اُن پر کافی بحث کرتا چلا جائے تو شاید اُس کی محدود عمر وفا نہ کرے لیکن انسانی فکر مضطرب اس نا امیدی پر قرار نہیں لیتی بلکہ کسی نہ کسی خیال کو اپنا مطمح نظر بنا کر اُس پر بحث کرنے کے بعد اپنی پیاس کو بجھا ہی لیتی ہے۔

انسان، خردمند انسان جب عالم طفلی سے وداع ہو کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ اسکے گوناگوں تغیرات اور نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے مستقبل کے متعلق غور کرنے لگتا ہے، کبھی تو یہ مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور کبھی اس کے خیالات ایسی مایوسی کے بھنور میں گرفتار کر دیتے ہیں جس سے وہ گھبراتا ہے اور عدم یقین و شک کی نگاہ سے اپنے ماحول کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ سوچنے والی اور خیال کرنے والی ذات نہیں چاہتی کہ چند روزہ محدود زندگی کے بعد فنا کے گرداب میں پھنس جائے۔ اسکا مجتہدانہ دماغ کبھی فانی ہونے کو قبول نہیں کرتا۔ پس وہ اپنے انجام کے متعلق براہِ راست اور واضح ترین علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر کسی کسی نہ کسی طریقہ سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ وہ فانی نہیں، بلکہ غیر فانی یعنی محدود نہیں بلکہ لامحدود ذات ہے۔ اب ہم اس خیال کی وضاحت کریں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ مختلف دماغوں نے اپنے آپ کو کس طرح تسلی دے لی۔

اگر تاریخ کی ورق گردانی کیجائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ "حیاتِ ابدی" کا خیال نو پیدا نہیں، بلکہ قدیم ہے۔ زمانۂ سابق میں بھی ماہرین فلسفہ نے اس پر کسی نہ کسی طرح سے بحث کرکے زیادہ تر اثبات اور بہت کم انکار کیا ہے۔ اگر انکے خیالات پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے جائیں تو شاید یہ مضمون ایک کتاب کی صورت اختیار کرلے اس لیے ہم متاخرین و متقدمین میں سے بعض کے خیالات و رجحانات کو اجمالاً بیان کریں گے۔

یہ معلوم ہو چکا کہ انسان فنا ہونا نہیں چاہتا، لہذا وہ استدلال کرکے بالآخر مذہبًا یا عقلًا یا وجدانًا بقائیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ "بقائیت" یا "حیاتِ ابدی" نام ہے ایسی حالت یا صفت کا جو ہم کو فنا یا نیست ہونے سے بری کردے۔ کانٹ[1] نے اسکو اپنے الفاظ

---

[1] Kant جرمنی کا مشہور فلسفی (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء)

میں یوں ادا کیا ہے کہ ابدیت یا بقائیت نام ہے استحکام شخصیت کا اور شخصیت سے مراد وہ بقیل شعوری وحدت ہے جو ایک فرد کی زندگی کے مختلف مدارج میں تسلسل قائم رکھتی ہو۔ اس مختصر سی تشریح کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کیوں حیات ابدی کے اثبات پر مجبور ہے۔

دیگر مباحث کی طرح حیاتِ ابدی کی حقیقت عظیم کے انکشاف کا فخر یونانیوں ہی کو حاصل ہے اس لیے کہ ابتداءً بعض یونانی فلاسفہ نے اس پر کسی نہ کسی اسلوب سے بحث کی ہے۔ فیثاغورثیوں[1] کا خیال ہے کہ فرد چونکہ عناصر مادی کے عارضی اتحاد کی ایک نسبت کا نام ہے اس لیے وہ فانی ہے کیونکہ وہ عناصر اتحاد بدلتے رہتے ہیں جسکا نام ہم مرض، انحطاط، اور موت رکھتے ہیں۔ لیکن اس طرف تکستہ کا تصور مظروف جو ایک مستقل اور غیر متغیر عدد ہے فنا سے محفوظ ہے جو موت کے بعد بھی اپنے اعمال کے لحاظ سے بہتر یا بدتر یا مساوی حالت میں ہوتا ہے اور اسی کا نام تناسخ[2] یا آواگون ہے۔ فلاطون[3] اپنی مشہور کتاب جمہوریت[4]، میں لکھتا ہے کہ انسانی روح جسم کی طرح فنا نہیں ہوتی، بلکہ باقی رہتی ہے۔ ارسطو[5] کا خیال ہے کہ عقل فعال[6] یا عقل بسیط غیر فانی ہے جو جسم سے قابل انفکاک ہے اور اسکی توجیہ جسم کے افعال سے نہیں ہو سکتی ہے، وہ فطرت کی مخلوق نہیں بلکہ اس جسم سے پہلے بھی موجود تھی اور قطعاً غیر فانی، غیر مادی، اور ازلی ہے۔ اسکے بعد اپیقوریت[7] والوں کا دعوے ہے، کہ روح تمام تر مادی شے ہے جو فساد مادہ ہی کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، موت کا خوف دراصل ایک مغالطہ پر مبنی ہے یعنی آدمی مرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو مردہ تصور نہیں کرتا، بلکہ خیال کرتا ہے کہ موت کے بعد اسکو لذاتِ زندگی سے محروم ہونا پڑیگا۔ لیکن دراصل موت کا وجود ہی نہیں، اس لیے کہ جب تک ہم زندہ ہیں موت نہیں، اور جب موت آئے گی تو ہم نہ ہونگے۔ ایک دوسرے مسلک رواقیت[8] والوں کا خیال ہے کہ فنا کے معنی یہ نہیں کہ جوہر فنا ہو جاتا ہے بلکہ قطرہ (جزو) دریا (کل) میں مل جاتا ہے۔ ع

قطرہ دریا میں جو ملجائے تو دریا ہو جائے

اب قرون وسطیٰ کے مشہور فلسفی فلاطینوس[9] کا بیان سنیے۔ وہ کہتا ہے کہ عالم ذات مطلق

---

[1] سو کیو کنٹ کی کتاب "انتقاد عقل خالص" (Critique of Pure Reason) کتاب ۲، باب ۱۱، نقرہ ۴۔
Plato [3] Transmigration [2] Pythagorian School [1]
۴۲۹ تا ۳۴۷ ق م۔ قدیم یونانی مشہور فلسفی۔ [5] Republic [4]
Aristotle [6] ۳۸۴ تا ۳۲۲ ق م۔ قدیم یونانی مشہور فلسفی
Plotinus [9] Stoicism [8] Epicureanism [7] Active reason [6]

سے اس طرح پیدا ہوا جس طرح آفتاب سے روشنی، ہر چیز اُسی سے نکلتی اور اُسی کی طرف لوٹتی ہے۔ وہ انسانی ارواح ہمیشہ سے اجسام میں مقید نہ تھے بلکہ یہ سماوی ارواح تھے جن کو خود خدا کے سوا اپنا بھی شعور نہ تھا لیکن خود غرضانہ انفرادیت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے حیات کلی سے اپنے آپ کو منفصل کر لیا۔ یہ انفصال ایک قسم کا تنزل تھا جو آزادانہ فعل کی سزا ہے۔ اب روح کا کمال ترقی یہ ہے کہ اس انفرادیت کے قفس سے آزاد ہو کر کُل میں مل جائے۔

ان مختلف متقدمین فلاسفہ کے خیالات معلوم کرنے کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں 'حیاتِ ابدی' کا خیال کس طرح متغیر اور مستحکم ہوتا گیا۔ اسکے بعد جب مذہب عیسائیت کا ظہور ہوا تو حیات ابدی کے جتانے کا ایک اور طریقہ ایجاد کیا گیا۔ یعنی اُس نے عقل کے بجائے الہام کو اپنا مشعلِ راہ بنایا اور لوگوں کے سامنے دوزخ و جنت کو پیش کر کے اس کا یقین دلایا کہ وہ فانی نہیں بلکہ غیر فانی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اُسکو کسی نہ کسی طرح آنکھیں مل جائیں۔ اور بعض افراد کی اسی طرح تشفی ہو جاتی ہے، لیکن متجسس دماغوں کو اس سے تشفی نہیں ہوتی۔ اور وہ عقل و استدلال سے اسکو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں بہر حال کرۂ ارضی سے لیکر مرکز آفتاب تک ساری کائنات تغیر و بے ثباتی کا تماشہ ہی کیوں نہ نظر آئے، انسان اس سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ ان تغیرات کے باوجود بقا کا متمنی اور اس ابتلا ہی پردہ کے پیچھے ثبات کا امیدوار رہتا ہے۔

موجودہ ترقی یافتہ زمانہ کی ہمہ گیر واقفیت اور وسعت نظر کے لحاظ سے یہ نہایت حیرت انگیز بات ہے کہ جدید حکما و فلاسفہ کے نتائج سے جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے انسان مطمئن نہیں ہوتا بلکہ وہ ترقی کی جس حد تک پہونچ چکا ہے اس سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر لحظہ منزل مقصود کو اگرچہ نظر سے دُور پاتا ہے لیکن اس سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ اپنی کوشش میں اور اضافہ کر کے اسی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔ یہی ہوس ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو کسی زمانہ میں چین نہیں لینے دیتی اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سامان آسایش جو پہلے میسر تھا اب راحت طلبی کا مادہ بڑھنے کی وجہ سے بیکار ہو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ گرد جو ماضی کو تاریک اور مستقبل کو روشن بناتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ دُنیا کا کوئی حصہ چاہے ترقی یافتہ حصے سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو،

اپنے داخلی سوالات کے حل کرنے پر فطرتاً مجبور ہے، عالم ہو یا جاہل، افریقہ کا وحشی ہو یا یورپ کا تعلیم یافتہ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ لیکن انفرادی رائے و خیال، اجتماعی و تمدنی حالات اور منطقی دلائل و استدلالات مختلف انسانوں کو مختلف راستوں پر چلاتے ہیں لیکن یہ بھٹکے ہوئے مسافر جب منزل مقصود پر پہنچتے ہیں تو سب کو ایک جگہ پاتے ہیں۔ اس طرح حیات ابدی کے متعلق بھی مختلف گروہوں نے مختلف نظریات پیش کیے لیکن ان سب کا آخری نتیجہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا۔

اب ہم اجمالاً میلان بقا کے ان نکات کو بیان کریں گے جو فی الوقت مختلف نظریات کی صورت میں موجود ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا مدعیانہ اصرار ہے کہ بقائے دوام کا تصور خود ہی اسکے وجود کا اہم ثبوت ہے جس طرح ڈیکارٹ[۱] کا وجود مطلق کے متعلق استنباطی ثبوت تھا۔ یعنی جس میں مغلول (تصور) سے علت (خدا) کا استنباط کیا گیا تھا۔

(۲) دوسرے گروہ کا خیال جو کسی قدر قدیم ہے یہ ہے کہ روح ایک ایسی جسمانی شے ہے جسکا قیام ہمیشہ کے لیے ایک محدود مادی جسم میں نہیں رہ سکتا۔ پس وہ فنا نہیں ہوتی بلکہ اپنے جسمانی لباد ے کو بدلتی رہتی ہے۔ یہ لوگ فخریہ کہتے ہیں کہ

صد ہزاراں سال بودم در نطاق　　ہیچ ذراتے ہوا بے اختیار

از جمادی مردم و نامی شدم　　وز نما مردم بحیواں سر زدم
مردم از حیوانی و آدم شدم　　پس چہ ترسم کے ز مردم کم شوم
(مولانا روم)

ظاہر ہے کہ تشکیک کا سدباب کلی طور پر ناممکن ہے اس لیے بعض دماغوں کی اس سے تسلی نہیں ہوتی اور وہ اپنی پیاس اس طرح بجھاتے ہیں کہ

(۳) اس کائنات میں روزانہ ہر لحہ غیر شعوری تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کلی تغیر یکایک اور شعوری ہوتا ہے تو اسکو عجیب و غریب تباہ کن لفظ "موت" یعنی فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسان اس سے گھبراتا ہے لیکن اگر حقیقت دریافت کی جائے تو اس

---

[۱] René Descartes فلسفہ جدیدہ کا شوہر فرانسیسی فلاسفر (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء)

موت میں بھی ایک حیاتِ جاوید مضمر ہے جسکو ایک شاعر یوں بیان کرتا ہے کہ

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

(۴) اب چوتھی جماعت بقائے دوام کا اس طرح اثبات کرتی ہے کہ انسان کے خواہشات وجذبات جیسے جیسے وہ اُن پر قابو حاصل کرتا جاتا ہے غیر محدود و نامتناہی دکھائی دیتے ہیں اس کا ماضی تاریک اور مستقبل شاندار نظر آتا ہے اور وہ خود کو گذشتہ کی بہ نسبت زیادہ عقلمند اور دُور اندیش پاتا ہے۔ اب یہ کہنا کہ وہ اپنے نصب العین کو پہونچنے سے پہلے فنا کر دیا جاتا ہے، خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس عالمگیر تاریکی کی پیشین گوئی کو ہرگز قبول نہیں کرتا، بلکہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ فطرت پر یہ الزام لگانا کہ اُس نے پیاس تو پیدا کی لیکن اُسکی تشفی کا سامان مہیا نہ کیا، ایک بمعنی مفروضہ ہے۔ اس بیان کو عقل قبول نہیں کر سکتی کیونکہ تقاضائے فطرت کے پورے ہونے کے لیے بڑے قوانین موجود ہیں اور فطرت کا یہ حال ہے کہ علت کے ساتھ ہی معلول پیدا کر دیتی ہے اور ضروریات کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی آلات بھی پیدا کر دیتی ہے۔ تو پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہماری نامتناہی خواہشات کی تکمیل کا سامان ہمیں میسّر نہیں۔ جدید حیاتیات بھی اس بیان کی اس طرح تائید کرتی ہے کہ قوانینِ فطرت مجبور ہیں کہ علت کے ساتھ لازمی طور پر معلول بھی پیدا کر دیں۔ مثلاً عورت کے پستان میں ضرورت کے وقت فوراً دودھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ہمیں موت نیست نہیں کرتی بلکہ جس طرح ایک تخم کو چند روز کے بعد گلہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اُسی طرح بقول گیٹے[۱] کے روح کی پختگی کے ساتھ جسم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اس قفس سے آزاد ہو کر دوسری جگہ تلاش کر لیتی ہے

اس لحاظ سے مولانا رُوم کا خیال بالکل ٹھیک ہے کہ ہر چیز کائنات میں حاجت سے پیدا ہوتی ہے۔ جرمنی کا مشہور فلسفی ہیگل[۲] لکھتا ہے کہ ہر چیز ایک نظام کے تحت پیدا ہوتی اور متغیر ہوتی رہتی ہے۔ اس بنا پر انسان دنیاوی زندگی کو چھوڑ کر جو خسارہ اُٹھاتا ہے اُسکی تلافی آنے والی ابدی زندگی سے ہو جاتی ہے۔

۱۔ Johann Wolfgang Von Goethe مشہور جرمنی شاعر ۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء

۲۔ G. W. F. Hegel ۱۷۷۰ء تا ۱۸۵۶ء

اس قسم کے اعتراف سے بھی بعض اشخاص کی تشفی نہیں ہوتی اس لیے وہ ایک اور طریقہ سے اس طرح اثبات کرتے ہیں کہ

(۵) فطرت زندگی کے بقا کی سخت کوشش کرتی ہے، وہ لاکھوں بلکہ کروڑوں افراد کو پیدا اور فنا کرتی ہے پس خاص شخصیتیں تو فنا ہو جاتی ہیں لیکن آنے والا چونکہ اپنے پیشرو کا قائم مقام ہوتا ہے اس لیے نوع باقی رہتی ہے۔ تو اب یہ کہنا کہ انسان فنا ہو جاتا ہے کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اسی خیال کو بعضوں نے یوں ادا کیا ہے کہ فطرت حقیقی کامل انسان کی متلاشی ہے۔ لہذا جب وہ اپنی کوشش کے نتیجہ کو نامکمل پاتی ہے تو اُسے مٹا دیتی ہے۔

(۶) ایک اور خیال یہ ہے کہ افراد نوع میں باقی رہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کا نقش دوسروں کے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اب حیات کا کام کرکے اُنکی ابدیت کا باعث ہوتی ہے۔

(۷) اس نوعی بقائیت کے علاوہ ایک اور مشروط خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے عناصر کیمیبی زبردست ہوں تو ہم زیادہ دیر تک باقی رہتے ہیں۔ یعنی یہی وجہ ہے کہ بعض شخصیتیں دنیا کے نشیب و فراز سے متاثر نہ ہو کر خضر ثانی بنی ہوئی ہیں اور بعض طوفان فنا کے ایک جھونکے کے ساتھ اس طرح غائب ہو گئی ہیں کہ ان کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابدیت یا بقائے دوام خلقی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اقبال نے اسی خیال کو موزونیت کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے کہ

بمیری گر بہ تن جانے نداری ۔۔۔ اگر جانے بہ تن داری نہ میری

بعض ہستیوں کو حیات ابدی کے متعلق ان خیالات کے معلوم کرنے کے بعد بھی وہ اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا جسکے حصول کی تمنا بادشاہ سے لیکر گداتک کو ہے۔ لہذا وہ اپنے آپ کو سمندر کا ایک قطرہ فرض کرکے اپنی موت کو سمندر میں جا ملنا قرار دیتے ہیں۔ بہرحال ہر گروہ نے کسی نہ کسی طرح سے ابدیت کی تائید ہی کی ہے۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ جدید تعلیم یافتہ اشخاص بغیر مستند علما و فضلا کی تائید کے ہر بات نے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں چند مستند فلاسفۂ جدید کے خیالات بھی درج کیے جاتے ہیں۔ فلسفۂ جدیدہ کی اہم ہستی اسپنوزا[1] اپنے وحدۃ الوجودی فلسفہ کے باوجود کہتا ہے کہ انسانی ذہن (روح) کلی طور پر فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اُسکا ایک جزو باقی

[1] Baruch Spinoza ۱۶۳۲ء تا ۱۶۷۷ء

رہ جاتا ہے جو ازلی اور ابدی ہوتا ہے۔ لائبنیٹز کا خیال ہے کہ انسان اپنے حکمراں مونادؔ (روح) اور محکوم مناوات (جسم یا مادہ) کا مجموعہ ہوتا ہے، اور ان مناوات میں جو تغائر نظر آتا ہے وہ اسکی توجیہ توافق مقدر سے کرتا ہے اس طرح اس کا دعوے ہے کہ انسان فانی نہیں بلکہ غیر فانی ہے کیونکہ موت نام ہے انفصال مناوات کا۔ ایک دوسرا فلسفی پامپونیزی کہتا ہے کہ بقائے دوام کی نہ تو ہم کلی طور پر تردید کر سکتے ہیں اور نہ اسکو ثابت کر سکتے ہیں۔ جرمنی کی اعلیٰ ہستی ہیگل کا خیال ہے کہ انسان کی حقیقت نفس ہے اور یہ نفس پہلے فرد کی حالت میں ہوتا ہے لیکن جب سیاسی اور اجتماعی زندگی میں وہ اعلیٰ تشفی نہیں پاتی جسکی وہ تلاش کرتا ہے تو وہ روح مطلق بن جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ طبعی میلانات کی رہنمائی سے الگ ہو کر جب انسان عقل کی روشنی میں حقائق کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو یا تو اس کا علم زیادہ روشن اور جلی ہو جاتا ہے یا بجائے اسکے کہ سکون و طمانیت حاصل ہو اسکو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال مادیین کا ہے یعنی وہ اپنی پیچیدہ حیرانیوں میں سرگردانی کے بعد اپنے آپ کو پہلے کی بہ نسبت اور بدتری میں پاتے ہیں۔ یہ مسلک نہایت قدیم ہے اس کے پیرو بقا کے منکر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مختلف مرکبات کے ناپائدار خواص میں تحلیل ہو جاتا ہے اور وہ مرکبات ایک نئی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو بقائے انسانی کے لیے مفید نہیں ہوتے۔ اس مسلک کے علمبردار صرف خارج کو حقیقی سمجھتے ہیں اور روح کے سرے ہی سے قائل نہیں ہوتے کیونکہ انکے یہاں ساری کائنات کی اصل ایک بے شعور بے حس مادہ ہے جسکی ترکیب و تحلیل سے مختلف صورتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

چونکہ یہ خیال ہماری زندگی میں مدد نہیں لہذا اسکے ہیرو دنیا میں بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں اُنکے متعلق بھی ہمیں معلوم نہیں کہ اپنے اس دعوے پر وہ کس قدر کاربند ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ مادیت کے خلاف موجودہ جسکو روحانیت کہا جاتا ہے۔ اسکے معتقدین صرف روح کے وجود کے قائل ہو کر روح کے وجود ہی کو اسکے بقا کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں

بہرحال عام طور پر جب ہم دنیا کی دو رنگی پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض

Pompanazzi ۲ Monades ۲ Leibnitz

انسان ممکنہ کوشش و مشقت کے باوجود آسایش و آرام سے محروم ہیں اور بعض بلا کسی فکر و تردد کے مزے سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اب اگر ان بدنصیبوں سے یہ کہا جائے کہ ان کا مستقبل تاریک ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی کوشش ختم ہو جائیں گی۔ اور اس طرح دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ انکی مشقتوں کا ثمرہ آنے والی ابدی زندگی ہے، تو اس سے اُن کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور اس طرح انکی ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں۔

اس بیان کا یہ مطلب نہیں کہ حیات ابدی کا خیال ہماری خواہش پر مبنی ہے، بلکہ اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی ہر نقطۂ نظر سے قرین عقل ہے۔ کیونکہ اگر یہ پیش نظر نہ ہو تو زندگی بے مزہ ہو جاتی ہے اور ہم کھوئے سے جاتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کا وجود ہیولیٰ کے سوا باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ حق و باطل اور خیر و شر کی تمیز ہی باقی نہیں رہتی۔ آخر میں اورسنٹ ریمان کے اس جملہ پر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے، کہ

"جس روز حیات ابدی کا خیال مٹ جائے گا، اُسی روز اخلاقیت اور روحانیت دونوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

محمد مظہر حسین حیدرآبادی
(متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ)

غزل

کر بند چشم ظاہر۔ پھر دیکھ اگر نظر ہے　　اس جسم و جاں کے اندر کیا نور جلوہ گر ہے
ہستی سے اپنی غافل۔ او ماسوا کے مائل　　ہے کس طرف ترا دل تو جا رہا کدھر ہے
سے سمن ہے تجھ میں۔ رنگ چمن ہے تجھ میں　　ہر بانکپن ہے تجھ میں۔ اپنی تجھے خبر ہے؟
ہم کیا ہیں کچھ نہیں ہیں۔ دل بھی نہیں ہے اپنا　　اُسکو جو دیکھتے ہیں وہ بھی تمہارا گھر ہے
ذرہ ہے بیاباں ہر قطرہ بحر و طوفاں　　اِس دورِ ارتقا میں ہر طفل ابوالبشر ہے
اس صفحۂ جہاں میں پست و بلند یکساں　　صورت بھی ایک سی ہے جو زیر و زبر ہے

تہجور شکل نرگس باغ جہاں میں ہم نے
کھولی ہیں جب سے آنکھیں اللہ پر نظر ہے

سراج الدین احمد تہجور
(جمیرۂ شہبائی مظفرنگری)

آئینِ اُردو

(مولفۂ مولانا محمد زین العابدین صاحب فرجاد کوٹانوی)

کتاب مذکور کی تالیف میں فاضل مولف نے بہت محنت کی ہے، اور اُردو کے غیر آئینی ملک کو آئینی بنانا چاہا ہے جس پر "عظیم دار المصنفین اعظمگڈھ" مولانا سلیمان صاحب ندوی کی بہ ایں الفاظ تائید و تصدیق بھی شایع کی گئی ہے "میں نے ماہ رمضان کی فرصت میں آپ کی پوری کتاب (آئینِ اُردو) دیکھی۔ مجھے تو کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہ ملی۔ زبان سہل اور طرزِ تقریر ادا نہایت آسان ہے"۔ اس موقر ریمارک کو پڑھ کر اور عظیم دار المصنفین اعظمگڈھ کی زبردست شخصیت اور قابلیت پر نظر رکھتے ہوئے مجھ ہیچمداں کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ آئینِ اُردو پر تنقید کرنے کا خیال کروں۔ لیکن تنقید کو رانہ تقلید سے بالکل بیگانہ ہے۔ ہر نقاد کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ناقدینِ عظام کی رائے کا کتاب کے اصل مضمون کو پڑھ کر احترام کرے، اور اگر اسکی ناچیز رائے کچھ مختلف ہو تو اُسکے اظہار میں پس و پیش نہ کرے۔ لہٰذا مولانا الحاج ظفر الملک کا ارشاد بھی اس قابل نہیں کہ میں اُس پر توجہ نہ کروں۔ بہرحال میں تنقید کے اہم فرض کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دینے کی کوشش کروں گا۔ اور عظیم دار المصنفین اعظمگڈھ سے اپنی اس جسارت کی معافی چاہتا ہوں۔

مولانا فرجاد صاحب نے مصباح القواعد اور قواعد اُردو کو صرف و نحو اُردو کے لیے کافی خیال نہیں فرمایا، اس وجہ سے آئینِ اُردو کی تالیف کی زحمت گوارا فرمائی۔ اپنے اس دعوے کو مدلل بنانے کے لیے مولوی فتح محمد خاں صاحب اور مولوی عبدالحق صاحب مؤلفانِ کتب مذکور پر ایک سلسلہ اعتراضات کا بھی شامل آئینِ اُردو فرمایا۔ باقتضائے بشریت اُن مؤلفان سے غلطی کا ہو جانا ناممکن نہیں ہے، لیکن اکثر جگہ اس سلسلۂ تعریض میں فاضل مؤلفِ آئینِ اُردو نے بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ اگر میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک اعتراض کی پڑتال کروں تو یہ تنقید خود ایک ضخیم کتاب بنجائے گی، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے، تاکہ فرجاد صاحب کو معلوم ہو جائے کہ ہر آدمی سے لغزش ہو جانا ممکن ہے، اور کسی دوسرے شخص پر نکتہ چینی کرنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

آئینِ اُردو صفحہ ۳ پر لکھا گیا ہے کہ مصباح القواعد کے صفحہ ۲۶ پر تحریر ہے

واورس کوئی بجز خالق الاصباح نہیں

اس مصرع میں اِصباح کا کسرہ ال کو دیا گیا" فرجاد صاحب فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ اصباح بالکسر باب افعال کا مصدر ہے اور اسکے معنی ہیں صبح کرنا، اور اَصباح بفتح جمع ہے۔ اور اس مصرعہ میں جمع برتی گئی ہے نہ کہ مصدر۔ فی الواقع صبح اور اصباح بالکسر الف دونوں مصدر ہیں اور حاصل مصدر کے معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ فرجاد صاحب کا اعتراض غلط ہے مصرعۂ مذکور میں اَصباح بفتح الف نہیں ہے بلکہ اِصباح بکسرۂ الف ہے۔ سورہ انعام پارہ ۷ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۔ آیۂ مذکورہ میں لفظ اِصباح کو مع لفظ فالق دیکھنے کے بعد یقیناً جناب فرجاد اعتراف فرمائیں گے کہ اُنکا اعتراض غلط تھا۔ لیکن اِصباح بالکسر الف سے مولف مصباح القواعد نے جس قاعدہ کا استنباط کیا ہے وہ صاف لفظوں میں نہیں بیان کیا گیا۔ مولانا فرجاد نے بھی اُس قاعدے پر کوئی اعتراض نہیں کیا ہے ہم بھی اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

آئینِ اُردو صفحہ ۴ پر لکھا گیا ہے کہ مصباح القواعد صفحہ ۴۴ پر تحریر ہے "بعض مصدر ایسے ہیں کہ لازم کچھ ہیں متعدی کچھ، جیسے پڑنا سے ڈالنا" فرجاد صاحب فرماتے ہیں ڈالنا کا لازم ڈلنا بھی آتا ہے۔ میں گزارش کرتا ہوں کہ مولف مصباح القواعد نے یہ نہیں لکھا تھا کہ بعض متعدی کچھ ہیں اور لازم کچھ۔ اس لیے فرجاد صاحب اگر پڑنا کا متعدی پاڑنا (صریحاً غلط ہے) بنا سکتے تو کافی تعاقب ہوتا۔ آپ نے ڈالنا کا لازم ڈلنا تلاش کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ میری محدود معلومات میں یہ صحیح نہیں ہے۔ میں نے پڑی کے بجائے ڈلی، یا پڑا کے بجائے ڈلا بولتے ہوئے کسی کو نہیں سُنا۔ ممکن ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں کسی حصہ میں ڈلنا اور اُس کے مشتقات، پڑنا اور اُسکے مشتقات کے بجائے استعمال کیے جاتے ہوں۔

فاضل مولف آئینِ اُردو نے دیباچہ میں مولانا فتح محمد صاحب پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایرین زبان یعنی اُردو کا لگاؤ سامی زبان یعنی عربی سے ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے" بایں ہمہ پھر بھی آپ نے عربی زبان ہی کے قواعد سے اُردو کو ملبوس کرنے کی کوشش کی ہے اور کہیں کہیں اس کوشش میں شدید ناکامی بھی ہوئی ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۲۳ پر میں (فی) سے (من، وعن) تک (الی حتی) پر۔

پہ - اوپر (علیٰ) واسطے - لیے (لِ) کو کلماتِ جرّ یعنی جار اور اُس کلمہ کو جو اُن سے متأثر ہو، مجرور لکھا ہے - اس مد میں اور الفاظ بھی داخل کیے ہیں - اگر فرحاد صاحب انکو حروفِ روابط میں داخل رہنے دیتے تو اچھا ہوتا - لغوی معنی کی کھینچ تان سے انکا نام اُردو میں جار مجرور قرار دینا صحیح نہیں ہے - عربی اصطلاح میں جر زیر کو کہتے ہیں - چونکہ حرفِ جار اپنے مابعد لفظ کو زیر کا اعراب دیتے ہیں اس لیے ان دونوں کو جار مجرور کہنا صحیح ہے، اُردو میں بلکہ فارسی اور انگریزی میں بھی اعرابی عمل کا پتہ نہیں ہے - اب فرحاد صاحب کی یہ جدت اگر عربی کی کورانہ تقلید نہیں ہے تو اور کیا ہے -

مولانا فرحاد نے اصطلاحی ناموں کے تجویز فرمانے میں اس قدر فراخ حوصلگی سے کام لیا ہے کہ مبتدی یا منتہی کوئی بھی اُنھیں اپنے دماغ میں محفوظ نہیں رکھ سکتا - مثلاً اضافت کے اقسام کو دیکھیے ص۲۲۶ - اضافت مطلق، اضافت بلاک، اضافت انبی اضافت ظرفی، اضافت بادنیٰ تعلق، اضافت توضیحی، اضافتِ مادی، اضافت علّت، اضافتِ شبہی، اضافت استعارہ، اضافتِ وصفی - کیا فارسی اور عربی میں اضافت نہیں ہے، مولف خود ہی غور فرمائیں کہ دیگر اہلِ زبان نے کیا کام کیا ہے اور آپ نے کیا طریقہ اختیار فرمایا ہے، اور آپ کے کام میں اختصار کی کس قدر گنجائش تھی - اسی طرح کلمات کی اصطلاحی افراط توجہ کے قابل ہے - کلمات جر، کلمات شمول، کلماتِ حصر و تخصیص، کلمات تاکید، کلماتِ قسم، کلمات تشبیہ، کلمات تفریع، کلمات تسلسل کلام، کلمات خلاصۂ کلام، کلمات عطف، کلمات تردید، کلمات اضراب، کلمات استدراک، کلمات استثناء، کلماتِ علت، کلمات شرط، کلمات جزا، کلمات ندا، کلمات جواب، کلمات ایجاب، کلمات تفسیر، کلمات تمنا، کلمات تحقیر، کلمات تزئین کلام، کلمات طبعی، کلمات تاسف و ندبہ، کلمات تحسین، کلمات تفرین، کلمات نفرت، کلمات سختی و شدت، کلمات تعجب، کلمات انبساط، کلمات تہنیت، کلمات قدوم، اگر ایسی ہی اولوالعزمی سے کام لیا جائے تو کلمہ کے اصناف و اقسام اس سے کہیں زیادہ پھیلائے جا سکتے ہیں، کیونکہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے اگر با معنی ہے تو کسی نہ کسی کیفیت کو لیے ہوتا ہے، اور اُس کیفیت کی نسبت سے اُسکو ایک نیا نام دیا جا سکتا ہے - لکھنے والا سب کچھ لکھ سکتا ہے لیکن یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ یاد کرنے والے پر کیا گزرے گی - مرکبات میں بھی اسمائے اصطلاحی کی ہی ریل پیل ہے -

---

فاضل مولف آئینِ اُردو نے صفحہ ۲۱ - عربی کے خاص حروف ث - ح - ذ - ص - ض - ط - ظ - ع - ق - درج کیے ہیں اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ وہ حرف ہندی یا فارسی لفظوں میں نہیں

آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بطور حاشیہ ایک نوٹ بھی دیا ہے " بعض فارسی الفاظ میں جو ان حرفوں کے لکھنے کا رواج پڑ گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے جیسے گذرگاہ، گذشتہ، صد، شصت، طپش، طشت، چاقو، درحقیقت انکو یوں لکھنا چاہیے: گزرگاہ، گزشتہ، سد، شست، تشت، چاکو۔ لفظ خانقاہ میں جو کاف ہے: فارسی لفظ گاہ کی جگہ نہیں ہے بلکہ قاہ ترکی لفظ ہے اور خان فارسی۔ خان کے معنی گھر اور قاہ کے معنی عبادت، یعنی عبادت کا گھر۔ اب مقبرہ کے معنی میں مستعمل ہے"۔

اس موقع پر مولانا فرجاد کو زیادہ تفصیل سے کام لینا چاہیے تھا۔ گزرگاہ وغیرہ کی کتابت ذال اور زے، دونوں سے ہوتی ہے، لیکن بہتر ہے۔ (ز) سے لکھنا چاہیے۔ لیکن صد، شصت وغیرہ میں یہ طریقۂ کتابت ضرورتاً اختیار کیا گیا ہے۔ تاکہ یہی الفاظ سد، شست کے دوسرے معانی سے ممیز رہیں۔ اس لیے اس ترمیم کو قطعاً غلط کہنا مناسب نہیں ہے۔ فارسی زبان میں بہت سے الفاظ ترکی شامل ہو گئے ہیں اور اس زبان نے یہاں تک اُن پر تصرف کر لیا ہے کہ اگر اب اُنھیں مفرّس کہیں تو بیجا نہیں ہے۔ خود اُردو میں بھی بکثرت سے ترکی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں حروف مخصوصہ عربی کے موجود ہیں۔ مثلاً چاق چوبند، قاب، قاق، قانون، قرقی، قرمزی رنگ، قزلباش، قشقہ، قندھار وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر آئینِ اُردو کا پڑھنے والا ان الفاظ کو عربی سمجھے گا تو غلطی ہوگی۔ اگر ان پر غلط ہونے کا فتویٰ لگائیگا تو بھی صحیح نہ ہوگا۔ اس وجہ سے فرجاد صاحب کو یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ حروف مخصوصۂ عربی اُردو زبان میں غیر عربی الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چاقو بھی ترکی لفظ ہے اور اہل فارس اسکو نظم و نثر میں چاقو ہی لکھتے ہیں چاکو نہیں لکھتے ہیں۔ خانقاہ کی بھی جو لغوی تحقیق محقق موصوف نے کی ہے اُس سے بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔ صاحب بہارِ عجم اور دیگر مؤلفانِ کتب لغت کی رائے میں گاہ کا قاہ بنایا گیا ہے۔ اور یہ تصرف عرب سیاحوں اور عقیدتمندوں کا معلوم ہوتا ہے۔ خانقاہ اُس قیام گاہ یا نشستگاہ کو کہتے ہیں جس میں درویش لوگ ٹھہرتے ہیں یا مجلس سماع منعقد ہوتی ہے۔ مقبرہ کو خانقاہ نہیں کہا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی خانقاہ میں کسی بزرگ کی قبر ہو جانے کے بعد اُسکو مقبرہ کہنے لگیں۔ لفظ کاغذ کا بھی روزمرہ اُردو میں کثرت سے استعمال ہے، فاضل مولف اسکی بابت کیا کہیں گے۔ کیا اسکی کتابت بھی (ز) سے ہونا چاہیے؟ یہ صحیح ہے کہ اصل میں کاغذ ذال کے ساتھ تھا۔ لیکن اب کاغذ ہو گیا، اور کوئی طاقت لفظ کاغذ سے ذال کو جدا نہیں کر سکتی۔

فاضل مؤلف اگر اس کتاب میں یہ امر بھی پیش نظر رکھتے کہ اُردو زبان کی ترکیب و تعمیر سے عبرت فصیح الفاظ

خارج ہو جائیں یا فصیح اور غیر فصیح الفاظ میں کوئی حد فاصل قائم ہو سکے تو جس آپ کی تالیف کی ضرورت بآسانی ذہن نشین ہو سکتی تھی۔ مگر آپ نے تو لفظ ہار سے اسم فاعل بنانے کا قاعدہ ہی بنا دیا ہے۔ جو کسی وقت صحیح بھی ہو مگر اب موجودہ اُردو اُسکے جذب کرنے کو عموماً تیار نہیں ہے۔ مولانا فرحاد، مرن ہار (مرنے والا) اور جان ہار (جانے والا) کو بھی اُردو زبان سے خارج فرما کر دائرۂ اُردو کو تنگ کرنا نہیں چاہتے۔

اِن ترتیب و تحقیق کی بعض معمولی لغزشوں کے باوجود مولانا فرحاد نے جس محنت سے یہ کتاب تیار کی ہے اُسکی داد نہ دینا حق فراموشی ہے۔

علم ہجا کی تعریف و تقسیم نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ کی ہے۔ اصطلاحیں قائم کرنے میں کچھ طوالت ضرور واقع ہوئی، لیکن کافی ذہانت صرف کی ہے۔ تذکیر و تانیث الفاظ کا کوئی کلیہ قطعی قائم نہیں ہو سکا، نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جس حد تک ہو سکا ہے انتہائی تحقیق سے کام لیا ہے۔ ضمائر پر بھی بلیغ بحث کی ہے۔ اسماء و افعال پر غائر توجہ بذول کی گئی ہے۔ اور اُردو زبان کو ایک سرمایہ دار زبان بنانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اُردو زبان میں آئینِ اُردو ایک اچھا اضافہ ہے خدا مؤلف کی مساعی کو بار آور کرے۔

کتاب کا کاغذ اور طباعت قابلِ تعریف ہے۔ ضخامت ۲۱۶ صفحے کی ہے۔ قیمت ۲ ہے۔

کتاب نامی بکڈپو اورنامی پریس میرٹھ سے مل سکتی ہے۔

امیر نقاد و بدایونی

غزل رقم لکھنوی

جنونِ محبت کو تُو سوا نہ کرنا — کبھی عقل و دانش کا کہنا نہ کرنا
کتابِ محبت کی تعلیم یہ ہے — کبھی فکرِ دُنیا و عقبیٰ نہ کرنا
یہ ہے میرا مسلک یہ ہے میرا مذہب — کسی کو سوا تیرے سجدا نہ کرنا
نہیں خیر اب زُہد اور اِتقا کی — ستم ہے حسینوں کا پروا نہ کرنا
نہ یوں بے محابا نہ پانی میں اُترو — کہیں خضر کو غرقِ دریا نہ کرنا
ہیں گستاخ بادِ بہاری کے جھونکے — کبھی باغ کی سَیر تنہا نہ کرنا
سُنا تا تُو فرہاد و مجنوں کے قصّے — مگر ہنشیں ذکر میرا نہ کرنا
مبارک تمہیں شوقِ قتلِ دو عالم — فقط ایک خونِ تمنّا نہ کرنا
تجھے کیا خبر کس کے ہیں زیرِ سایہ — ہُما ہم فقیروں پہ سایا نہ کرنا
نہیں دل تو لے لیں گے قیمت نہ دیں گے — رقم تا دہندوں سے سودا نہ کرنا

نظرے خوش گزرے

۱۹۲۷ء کا اختتام دو المناک حادثوں پر ہوا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں دہلوی نے رفقۂ رامپور میں انتقال کیا، اور ہندوستان ایک بڑے قومی سردار کی خدمات سے اس نازک وقت میں محروم ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم صاحب مرحوم کی ذات بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ ایک خاندانی نامور اور حاذق طبیب ہونے کے علاوہ، وہ ایک وسیع الخیال و بلند حوصلہ رئیس، روشن خیال و خوش فکر مدبر اور فیاض و باہمت خادم ملک و ملت تھے اور گذشتہ ربع صدی کے اندر اس ملک میں جتنی قومی تحریکات ہوئیں سب میں وہ نمایاں حصہ لیتے رہے اور اپنی ہوشمندی و معاملہ فہمی کے بدولت رفتہ رفتہ مسلمانان ہند کے قافلہ سالار قرار پائے۔

دہلی کا طبیہ کالج، آل انڈیا طبی کانفرنس، دواخانوں کا مدرسہ اور ہندوستانی دواخانہ جن کے انتظامات و نشو و نما میں حکیم صاحب کا بہترین عہد زندگی صرف ہوا، انکی علمی خدمات کے عظیم الشان کارنامے ہیں۔ اور جس فیاضی و ایثار سے انھوں نے ہندوستانی دواخانہ کو جسکی آمدنی سوا، یا ڈیڑھ لاکھ سالانہ ہے، طبی کالج کے اصلاح کے لیے وقف کردیا۔ اسکی بدولت امید ہے کہ انکے معزز پیشہ طبابت کی آنے والی نسلیں ہمیشہ انکے کارناموں پر بجا طور پر افتخار کرسکیں گی۔

عام اسلامی تحریکات میں سے ندوۃ العلماء، مسلم لیگ، ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی سب ہی انکی خدمت و اعانت کے رہین منت ہیں۔ خلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کی تو بنیاد ہی انکے ہاتھوں پڑی تھی۔ اور حق یہ ہے کہ انکی خدمت و اعانت میں حکیم صاحب نے اس درجہ شغف و انہماک ظاہر کیا کہ انکی صحت نے بالآخر جواب دیدیا۔

ہندو مسلمانوں کا باہمی اتحاد، ابتدا ہی سے انکے عزیز ترین مقاصد زندگی میں شامل تھا۔ پھر جب ترکی سلطنت کے مصائب و آلام اور پنجاب کے دردناک و ذلت آفریں واقعات سے متاثر ہوکر وہ سیاسیات ملکی میں ہمہ تن منہمک ہوئے تو اسوقت بھی اس مسلک کے سب سے بڑے علمبردار وہی رہے۔ اور ملکی آزادی کی جنگ میں جو نمایاں حصہ انھوں نے لیا اسکی بدولت وہ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے سردار بن گئے۔ اور اگرچہ گذشتہ چار پانچ سال کے

دردانگیز افتراق اور باہمی خانہ جنگیوں نے مرحوم کو بے حد دل شکستہ کر دیا تھا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نازک سے نازک مواقع پر بھی حکیم صاحب مرحوم نے اتحادِ باہمی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں ہونے دیا اور ہر ممکن ذریعہ سے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے جد و جہد کرنا وہ آخر وقت تک اپنا نصب العین سمجھتے رہے۔

حکیم صاحب مرحوم، خاندانی رئیس تھے، رئیسوں ہی کی صحبت میں رہتے تھے، مگر اُن کا بڑا کمال یہ تھا کہ اُنھوں نے اپنے ماحول کے خراب اثرات کو اپنی طبعی سلامت پسندی و میانہ روی سے ہمیشہ قابو میں رکھا اور اپنے اثر و اقتدار سے نوعِ انسانی اور ملک و ملت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکے۔ انکسار و تواضع، حلم و بردباری، سیر چشمی و فیاضی، متانت و سنجیدگی، اور قدیم مشرقی تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے اُنکی ذات اس دَور انحطاط میں مستثنیات میں سے تھی۔

مبارک ہیں وہ لوگ، جو دنیا میں ایسی اچھی مصروفیتوں میں زندگی بسر کریں اور اتنی عظیم کامیابیاں حاصل کر کے رخصت ہوں۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

کے بموجب، جو کام اُنکے رہ گئے ہیں اُن میں سے فوری توجہ کا مستحق جامعۂ ملیہ اسلامیہ ہے۔ جامعہ کو علی گڈھ سے دہلی اُٹھا لانے کے بعد حکیم صاحب مرحوم نے اسکی ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں اور زندگی وفا کرتی تو اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ علیگ کالج کی طرح یہ قومی یونیورسٹی بھی اُنھیں کے ہاتھوں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جاتی۔ مگر قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا۔ چنانچہ حکیم صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد نہایت بجا طور پر سردارانِ قوم و بہی خواہانِ ملک کی توجہ اس اہم کام کی طرف منعطف ہوئی ہے، اور اُمید کرنا چاہیے کہ انشاء اللہ بہت جلد اسکے لیے ضروری سرمایہ کا انتظام ہو جائے گا۔ حکیم صاحب مرحوم جیسے باکمال بزرگ کے لیے حقیقتاً کسی قسم کی یادگار قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اُنکی زندگی بجائے خود ایک یادگار ہے، لیکن اگر کوئی یادگار قائم کرنا ہے تو پھر اس قومی یونیورسٹی سے بہتر کیا یادگار ہو سکتی ہے۔

حکیم صاحب مرحوم میں منجملہ دوسری خوبیوں کے ایک بڑی صفت یہ تھی کہ سفارش کے ذریعہ سے وہ ہزاروں ضرورتمندوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ راقم الحروف کو بھی مرحوم کی اس صفت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا تھا، اس لیے یہاں اس کا تذکرہ بے موقع نہ ہوگا:

موسیو سیدیو فرانسیسی کی تاریخ عرب کا ترجمہ شائع کرنا منظور تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بھوپال جانے کا

اتفاق ہوا تو نکری محمد امین صاحب مہتمم تاریخ کے مشورہ سے علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں اپنی طباعت کے لیے درخواست امداد پیش کی گئی۔ مگر علیا حضرت نے فرمایا کہ اسوقت موقع نہیں ہے۔ اتفاق سے اُسی دن حکیم صاحب مرحوم بھوپال پہونچے۔ رات کو محمد امین صاحب کی بیٹھک میں میں بھی شرف نیاز حاصل کرنے حاضر ہوا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب محل سلطانی سے واپس تشریف لائے اور اثنائے گفتگو میں محمد امین صاحب سے کہا کہ آپ نے جس کتاب کے لیے درخواست پیش کی تھی سرکار عالیہ نے اُسکے لیے چھ سو روپیہ عطا فرمانے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ بعد کو مرحوم کے بیان سے واضح ہوا کہ اگرچہ انکو اس درخواست کا کوئی علم نہ تھا مگر خدا معلوم کیسے بیگم صاحبہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ حکیم صاحب اس درخواست کے مؤید ہیں اور چونکہ علیا حضرت کو اُن کی خاطرداری کا خاص خیال تھا اس لیے حکیم صاحب سے ملاقات کے دوران میں از خود فرمایا کہ آپ نے جس کتاب کے لیے سفارش کی ہے اُس کے واسطے چھ سو روپے منظور کیے جاتے ہیں۔ حکیم صاحب نے یہ خیال کر کے کہ کسی کا کام بن جانے کا فخر اظہار حضرت کی اس عنایت و توجہ کا شکریہ ادا کیا اور لاعلم ظاہر ہونے کے باوجود یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ انکو اس درخواست سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دل و جان سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت نعیم سے سرفراز کریں اور اُنکے پسماندگان کی الخصوص اُنکے فرزند ارجمند حکیم محمد جمیل خاں صاحب کو توفیق صبر عطا فرمائیں۔ آمین۔

اُمید ہے کہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب بھی اپنے پدر نامدار کے نقش قدم پر چل کر قوم و ملک کی خدمت میں دریغ نہ فرمائیں گے اور اس طرح اہل ہند اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے وہ حکیم صاحب مرحوم کے نعم البدل ثابت ہوں گے۔

دوسرا حادثہ وہ بدبختانہ افتراق ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مسلمان سرداروں میں رونما ہوا۔ ایک طرف سائمن کمیشن کی تحقیر نگیز ٹھوکر نے اگر ہندوؤں کے بعض ایسے سرداروں کو جو ہندو مہاسبھا دکھاوی بن چکے تھے دارانہ جذبات پر انگیختہ کر کے ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و عمل ناممکن بنا دیا اور اس طرح اپنی گم گشتہ راہی نمایاں کر رہے تھے تو دوسری طرف وہ لوگ جو مل تک ہندوؤں سے گفت و شنید کرنے اور اُن سے مسلمانوں کے حقوق منوانے کے لیے دوش بدوش کام کر کے جماعتی یکجہتی کی ایک اچھی مثال پیش کر رہے تھے آج نہایت ہی سطحی اور غیر وقیع بنیادوں پر لڑ بھگڑ رہے اور ساری قوم کو دو گروہوں میں منقسم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں

سر شفیع کی رہنمائی میں، نواب محمد یوسف (وزیر صوبہ متحدہ) ملک فون خاں (وزیر پنجاب) اور مسٹر غزنوی (معزول شدہ وزیر بنگال) اور سرکار دوالاتبار کے دو نامی خدمتگاروں خواجہ حسن نظامی اور اور مولانا انیس احمد موجد آل انڈیا مسلم فنڈریشن کی جد وجہد سے لاہور میں ایک جلسہ مسلم لیگ کے نام سے منعقد کر کے ایک نئی آل انڈیا مسلم لیگ بنائی گئی ہے جس کا مقصد وحید یہ ہوگا کہ حکومت کے منشا و مقصد کے مطابق مسلمانوں کی جانب سے سائمن کمیشن کے مقاطعہ کو ناکامیاب بنایا جائے۔

اس جماعت سے توقع بھی اسی قسم کی حرکتوں کی ہونا چاہیے تھی۔ البتہ افسوس ہوتا ہے کہ حسرت و اقبال کی سی ہستیاں بھی اس تماشہ میں حصہ دار بننے پر رضامند ہوئیں اور لاہور کے جدید روزنامہ انقلاب نے جسکے لائق ایڈیٹروں سے ملک و قوم کی بہترین توقعات وابستہ تھیں اس جماعت کی ہمت افزائی گوارا کی۔

حسرت خدا اُنکی مغفرت کرے، عرصہ ہوا کہ سیاسی حیثیت سے مرحومین میں شمار ہونے کے مستحق ہو گئے ہیں۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی سے تو انکو عداوت تھی ہی، اب مسلم لیگ کے ساتھ بھی وہ اشتراک عمل نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ غریب نے لیڈری کا پیشہ اختیار کر لیا ہے، اس لیے ناممکن ہے کہ خاموشی کی زندگی بسر ہو۔ قوم کی خدمت سیاسی نہیں ہو سکتی تو سیاسی بھوت بنکر قومی سردار کو پریشان کیوں نہ کیا جائے۔ العظمۃ للہ

اقبال کا شاعری کے کمالات پر قناعت نہ کرنا اور سیاسیات کے اکھاڑے میں کود پڑنا مسلمانان ہند کی انتہائی بدنصیبی کی دلیل ہے، اور وضع شئی غیر محلہ کی اس سے واضح تر مثال ملنا آسان نہیں اے خدا ہمیں ہمارے دوستوں سے بچا! ورنہ حسرت کو خان بہادر، اور اقبال کو عدالت العالیہ پنجاب کا جج کر دے!

اس پرچہ میں مسٹر عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی مصنف دنیائے افسانہ کا ایک تنقیدی مضمون بطور مستقل رسالہ کے شایع کیا جا رہا ہے۔ دنیائے افسانہ پر مفصل ریویو کی ابھی نوبت نہیں آئی جس سے اندازہ ہو سکتا کہ جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کے ادبی کارنامے کس قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، اور بوستان خیال جیسی کتابوں کو تعلیمیافتہ اصحاب اب تک قابل اعتنا نہیں سمجھا، بلکہ وہ محض عوام الناس کے دل بہلانے کا ذریعہ سمجھی جاتی رہیں، حالانکہ اگر سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے تو انکے مصنفین کی جاں کاہی اور دماغ سوزی شاید ایسی عبث و بیکار نہ ظاہر ہو۔

عمرو عیار

اُردو ادبیات میں اعلیٰ ظریفانہ تحریروں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جاری ہے۔ ادب لطیف کا دامن بھی اس چیز سے خالی نظر آتا ہے حالانکہ ہمیں اس قسم کی تحریرات کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارے شاعر ہجو کی سرحد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ شاعری کی طرح افسانوں میں بھی اعلیٰ پایہ ظرافت نگاری کے نمونے کمیاب ہیں۔ ادنیٰ درجے کے مذاق تو شاید ہر جگہ دستیاب ہو جائیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی تحریریں بھی ادب عالی میں داخل ہو سکتی ہیں، یا کم سے کم ادبیات ہی کا جزو بدن بننے کی قابلیت رکھتی ہیں؟ اعلیٰ ظریفانہ تحریریں تو ہر زبان میں وہی رتبہ حاصل کر لیتی ہیں جو شاعری یا افسانہ نگاری کو حاصل ہے۔ اور یہ ایک بڑی حد تک ادب اور زبان کی خدمت کرتی ہیں۔ لیکن ادنیٰ مذاق ادبیات کے لیے باعث ننگ بن جاتا ہے۔ اگر کسی زبان کے ادب کو ہم ایک جسم سے تشبیہ دے سکیں، تو ظریفانہ تحریریں یقیناً اُسکی روح رواں کہلانے کی مستحق ہیں۔ جن سے ادب میں لطافت اور زندگی کی ایک لہر پیدا ہو جاتی ہے۔

شاید ہی کوئی دماغ ہوگا جو اعلیٰ مذاق سے حظ نہ حاصل کرتا ہو، لیکن ظریفانہ تحریروں کی اہمیت کا اندازہ کچھ وہی شخص خوب لگا سکتا ہے، جس نے اپنی حیات کے لیے ایک سخت نظام عمل مرتب کر لیا ہو اور جسکے پاس تفریحات کا وقت بمشکل نکل سکتا ہو۔ ایسے دل اور دماغوں کے لیے یہ تحریریں دراصل "زندگی کا وقفہ" ہیں، جو انکو "دم لیکر آگے چلنے" پر مستعد بنا دیتی ہیں۔

اُردو میں ایک جانسن، ایک برک، ایک کارلائل، ایک اسکاٹ وغیرہ تو مل ہی سکیں گے لیکن ایک سوئفٹ، ایک ایڈیسن اور ایک والٹیر کا ملنا مشکل ہے۔ اسکی وجہ شاید یہ ہو، کہ اُردو ادب کو زمانہ نے اس طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ قدیم اخلاقی تعلیمات نے اُردو کے ارباب حل و عقد کے مزاجوں میں اس قدر سنجیدگی پیدا کر دی تھی کہ انکے نزدیک ظرافت، مسخرہ پن کے مترادف، اور اس لیے ایک ذلیل چیز سمجھی جاتی تھی۔ انکی نظروں میں مرزا انشاء اللہ خاں یا جرأت جیسے صاحب قلم کی تحریریں فقرتاً "چوا چاٹی" دکھائی دیتیں۔ جان صاحب اور رنگین وغیرہ تو "نرے بھانڈ" تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فضا کے درمیان لطیف اور ظریف تحریروں کے میدان میں اُترکر، کون ملامت کے تیروں کا ہدف بننا قبول کرتا؟ ایک ادبی حیات کو خطرے میں

ڈال کر، اس میدان میں اُترنے والے کے لیے نہایت قوی اخلاقی جرأت کی ضرورت تھی۔

رنگین، جرأت وغیرہ اور سب سے پیش پیش مرزا انشا نے اس میدان میں اُترنے کی ضرور کوشش کی، لیکن کچھ تو طبیعت کی شدت، بگڑے ماحول اور معیار کے فقدان کی وجہ سے انکی تحریریں انتہائیت کے نقطے تک پہونچ گئیں اور کچھ روشن خیالوں کی بے توجہی نے انکے اس جذبہ کو کماحقہٗ نشو ونما پانے نہیں دیا۔ اگر انشا اور اُنکے معاصرین کو اس کا پورا خدشہ ہوتا کہ انکی ادبی کاوشوں کی وہ سوسائٹی میں کہیں نہیں ملیگی اور انکی متاعِ علمی کو ہر جگہ مقلوب سکہ کی طرح پھیر دیا جائیگا، تو یقیناً انکو ایسی تحریریں پیش کرنے کی خواہش ہی نہ ہوتی۔ بہرحال کچھ بھی ہو، اسکو قسمت کی ستم ظریفی ہی سمجھنا چاہیے جو چیز انشا کی "ہر فنی" قابلیت کے چہرے پر ایک بدنما داغ سمجھی گئی ہے، وہی انکی اصلی متاع اور یہی اُنکا اصلی کردار تھا!

انشا کی انتہا پسندی نے انکے تابین کرام کو، راہ راست سے بھٹکا کر، بدقسمتی سے ہزلیات میں محو کر دیا۔ آغاز اچھا ہوتا، تو اس قسم کی تحریروں کے لیے ایک شاندار مستقبل خیر مقدم کرنے کے لیے یقیناً تیار رہتا۔

ادب لطیف کی پیدائش کا زمانہ عموماً خوش حالی کا ہوا کرتا ہے۔ اُردو ادب میں یہ زمانہ زبان کا ابتدائی دور ہے، جو صاحب مذاق بزرگوں کی بے توجہی اور اپنے اختصار کے سبب ہاتھ سے جاتا رہا۔ اسکے بعد ہی نئی روشنی کی منوفشانیوں اور سرسید کی تحریکات نے ساری اُردو فضا میں ایک ایسی ہلچل پیدا کر دی کہ اگلا جمود و سکون اضطراب سے بدل گیا۔ اس بڑی ہستی نے اپنے معاصرین اور تابین کے آگے اس قدر مشکل اور اہم مسلح نظر نکال کر رکھ دیے، کہ کسی کو ادب لطیف کی طرف توجہ منعطف کرنے کی مہلت ہی نہیں نصیب ہوئی۔ سرسید ہی کے دھکے سے ہم آج تک لڑھکتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کی عمارتوں کے نمونے پر اپنے محلوں میں تبدیلیاں پیدا کرنے میں اس قدر مصروف ہیں، کہ انکی آرائش و زیبائش کی طرف ہمارا ذہن جا ہی نہیں سکا۔ خود ہماری اپنی مزہ رتیں بھی ہماری ان سرگرمیوں میں اضافہ کر رہی ہیں۔

آزاد کا علمی مذاق اُنھیں کی حد تک رہا۔ افسوس ہے کہ خاکی کے "حیوان ظریف" کی ادبی زندگی کے بجائے خانگی زندگی ظرافت میں زیادہ بسر ہوئی، ورنہ ایک اعلیٰ ظریفانہ ادب کا اُردو زبان میں اضافہ یقینی امر تھا۔ اس شعبۂ ادب میں قحط الرجال پر نظر کرتے جو کچھ صاحب مذاق بزرگوں کی اس طرف توجہ کر رہے ہیں وہ مغتنم ہیں۔ سجاد حسین، مرزا رسوا، رشید احمد صدیقی، مسٹر پطرس،

عظمت اللہ خاں، مرزا فرحت اللہ بیگ ("مرزا الم نشرح") نے جس لطیف ادب کی تخلیق پر کمر باندھی ہے وہ اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اور اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو انھیں متذکرہ بالا حضرات کے نقش قدم پر چل کر ایک جدید دنیا کی فتوحات کا سنگ بنیاد رکھیں۔

(۲)

یہ تمہید ایک مقالۂ مترنمہ تھی۔ مقصد اس کا اُردو ادب کے واحد ظریفانہ کردار پر روشنی ڈالنا ہے۔ ان حضرت کی بھی عجب ہستی ہے جنکا اسم گرامی زیب دہ عنوان ہے۔ اُردو زبان کے جاننے والوں میں کون ایسا ہوگا جس نے آپ کے سوانح حیات کو ایک سے زیادہ مرتبہ مزے لے لے کر نہ پڑھا ہوگا۔ عمرو عیار ظریف ادبی کردار کے زندہ نمونوں کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کردار کی پیدائش کے وقت معلوم نہیں کہ مصنفِ قصہ کا طائر تخیل کس بلند پروازی میں مشغول ہوگا کہ حمزہ کی مہمات کی چار ضخیم داستانوں میں اس کا ذکر ہر جگہ یکسانیت کے ساتھ ورائے[1] فطری آن بان میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا؟

یہ کردار اپنی انفرادی نوعیت میں ایسا یکتا ہے کہ اسکی مثال دُنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتی۔ کیونکہ عمرو عیار کا ماحول سوائے اُردو زبان کے اور کونسی زبان میں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ہر دلعزیزی کے لحاظ سے اگر کوئی دوسرا ادبی کردار عمرو عیار کا مدمقابل ہو سکتا ہے تو وہ انگریزی زبان کا فالسٹاف ہے۔ عمرو عیار کی طرح فالسٹاف کی شخصیت بھی صرف نام کی حد تک تاریخ کی ممنون احسان ہے۔ باقی دوسرے واقعات محض افسانہ ہیں۔ فالسٹاف کے کردار نے اپنی ظریفانہ سرشت کی اعلیٰ پائگی کے سبب سے بڑے بڑے ادیبوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ شیکسپیر کا مشہور نقاد مورسن تو فالسٹاف کو "دنیائے ادب کا سب سے زیادہ ظریف کردار" تصور کرتا ہے۔ ہم کیوں اپنی پیداوار کی تعریف میں اس طرح رطب اللساں نہ ہوں؟ ہماری نظریں تو جو عناصر فالسٹاف کے کردار میں مشاہدہ کرتی ہیں، وہی یہاں بھی پاتی ہیں۔ فرق صرف قدیم اصول اور جدید طرز کا ہے۔ ہمارے پاس عمرو عیار کو فالسٹاف سے زیادہ دلچسپ سمجھنے کی بھی ایک وجہ ہے کہ اول الذکر ہماری طرز معاشرت کا آئینہ ہے اگر عمرو عیار کے کردار کی عام دلچسپی پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکے اندر ایک عنصر لگاوٹ ہے

---

[1] اس مضمون کے لکھے جانے کے وقت تک آپ ہمارے ساتھ تھے لیکن افسوس کہ اب خداوند تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں ہیں۔

[2] Preternatural

جو با وجود بعض اسقام کے ہمارے دلوں کو اسکی طرف کھینچ رہی ہے۔ اور یہی دلچسپی ہمارے اخلاقی احساس کو بھی متاثر کرتی ہے۔ جسکی وجہ سے ہم اسکی ان تمام بدمعاشیوں کو بھی مستحسن نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں، جن میں ظرافت کی ذرا سی بھی چاشنی موجود ہوتی ہے۔ عمرو عیار کے کردار کی دلچسپی کا ایک بڑا راز یہ بھی ہے کہ عام حالت سے اسکی بیگانہ روی ہمارے خیالات کو اپنی چالبازیوں میں زیادہ اُلجھا لیتی ہے۔ جب ہم ٹھنڈے دل سے اخلاقی عینک لگا کر اسکے کرداری عناصر کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں، تو مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ حریص، بزدل، شریر اور دغاباز ہے۔ لیکن جب ہم اسکے سامنے ہو کر اسکی حالت کا مطالعہ کرنے لگتے ہیں تو معلوم نہیں کہ ہماری اخلاقی جرأت کہاں چلی جاتی ہے کہ ہم ان اصولوں کا انطباق اُسکے افعال پر نہیں کرنا چاہتے، اسکی کیا وجہ ہے؟ یہی کہ اسکی ظرافت اپنی دلچسپیوں کے ہاتھ ہمیں بیچ دیتی ہے۔

عمرو عیار کا کردار عجیب مختلف اور متضاد صفات کا مجموعہ ہے۔ وہ نوعمر بھی ہے اور بوڑھا بھی، بُزدل بھی ہے مگر مقابلے پر تیار۔ بدمعاش ہے لیکن بدطینت نہیں۔ اسکی زندگی کا کوئی اصول نہیں تاہم وہ ہر کام میں مستعد ہے۔ ظاہر میں تو بُزدل نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ جھوٹ کہنے سے اُسے کوئی عار نہیں، لیکن اسکے ذریعہ کبھی وہ ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں ہوا۔ وہ ایک سپاہی ہے جسکو عزت کا خیال نہیں۔ شریف النفس ہے لیکن شرارت اسکی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہ خلاف توقع صفات کا اجتماع اسکی حیات کے دوران میں ہر جگہ ایک حیرت انگیز فضا پیدا کرتا جاتا ہے۔ جسکی توقع ہم کو پہلے سے نہیں ہوتی۔ جزیرۂ سراندیپ میں اس کے کارنامے کس قدر خوش کن اور حیرت خیز پیرایہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اسکی چالاکی شاید سب سے زیادہ تعجب خیز ہے جسکی بدولت وہ بُرجہر جیسے عالم کو بھی اپنی عمر میں ایک مرتبہ ضرور سبق سکھاتا ہے۔ چالاکی اور ظرافت کا کسی ایک کردار میں باہم موجود ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ ادبی کرداروں میں بہت سے ایسے کردار ملیں گے جن میں متذکرۂ بالا صفات میں سے صرف ایک موجود ہوتی ہے۔ لیکن عمرو عیار کے کردار میں ان دونوں کی آمیزش ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اسکی ظرافت اسکے افعال کو اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔ ایک خاص بات قابل دید یہ ہے کہ ظرافت نہ صرف خود اس کردار میں مضمر ہے، بلکہ اسکے اثر سے دوسرے کردار میں ظرافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے اور بجنگ کے تعلقات اس نظر سے ملاحظہ ہوں۔

عمرو عیار کی زندگی میں اگر کوئی سنجیدہ مقصد ہے تو صرف یہ کہ حمزہ کو خوش کیا جائے۔ بالکل یہی حالت فالستاف کی بھی ہے۔ وہ "شہزادہ ہال" کو مسرور کرنے کی خاطر اپنے آپ کو

بھول جاتا ہے۔

(۳)

ادبی تحریروں، خصوصاً ادبی کرداروں میں ظرافت پیدا کرنے کے تین طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلا اور سب سے آسان طریقہ شخص قصہ کی بول چال میں ظرافت کا پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ اسکی ایک عمدہ مثال آغا صادق[1] کا کردار ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ظرافت اُن الفاظ میں رکھی جاتی ہے جو مصنف خود شخص کے بیانات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسکی توضیح اُن ناولوں سے بخوبی ہو سکتی ہے جو "اودھ پنچ" میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ملا رموزی کی تحریریں بھی ظرافت کی چاشنی الفاظ کے نشست و برخاست سے پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے آخری قسم کی ظرافت کی وہ ہے جو شخص قصہ کے افعال اور اقوال سے بحیثیت مجموعی ظاہر ہو۔ عمرو عیار کے کردار کی ظرافت بھی اسی قسم کی ہے۔ آپ اسکی پوری سوانح عمری پڑھ لیجیے، آپ محسوس فرمائیں گے کہ عمرو عیار کے کردار میں ظرافت کی پیدائش مصنف کے ذاتی بیانات کی بہ نسبت خود اپنے مجموعی حالات پر زیادہ منحصر ہے۔ مصنف کے بیانات کے کسی انفرادی حصہ میں ظرافت پوشیدہ نہیں۔ بلکہ واقعات زندگی بحیثیت مجموعی ایک سادہ مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ خیال کرنا محض غلط ہے کہ ظریفانہ تحریریں وقتی مطالعہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ جن حضرات کا یہ خیال ہے اُن کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ ملا رموزی، رشید احمد صدیقی یا مرزا فرحت اللہ بیگ کی اُن تحریروں کو اپنے مطالعہ میں رکھیں جو سنجیدہ سے سنجیدہ مسائل پر حاوی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ جس طرح سنجیدہ تحریریں ہمارے خیالات کو عمر بھر کے لیے اپنے آپ میں جذب کر لینے کی قابلیت رکھتی ہیں، اسی طرح بعض ظریفانہ تحریریں بھی ہمارے تھکے ماندے دماغوں کو لطف مسرت سے مالا مال کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتی ہیں و کردار عمر و میں جو ظرافت پوشیدہ ہے، وہ ہمیں ہر وقت ایک نئی طرح مسرور کرتی ہے۔ اسکی خاص وجہ یہاں یہ ہے کہ اسکی شرارتوں میں اس قدر رنگا رنگی اور بوقلمونی مدنظر رکھی گئی ہے، اور خود اسکی حیات اس قدر طولانی ہے کہ ہم ایک حصہ کو ختم کر کے دوسرے حصہ تک پہونچتے پہونچتے، پچھلے واقعات کو بھول جاتے ہیں۔ گو اُن کا اثر ہمارے ذہنوں میں محفوظ رہتا ہے۔ یہی ہمارے دلوں کو بہلا دیتی ہے کہ جب ہم داستان ہاتھ میں لیں، ایک دو واقعات صرف اُسکی عیاری کے کارناموں کے ضرور پڑھ لیں۔

---

[1] "آغا صادق کی شادی"

(۴)

داستان کے قصے کا پلاٹ ذاتی اور خاندانی عناد کی وجہ سے دو جماعتوں کی کشمکش کا ایک نتیجہ ہے۔ ظاہر میں یہ عناد نقش (پدر بختک) کے بخت جمال کو مارنے اور بزرجمہر ابن بخت جمال کے نقش کو قتل کرنے کی وجہ سے ان دونوں خاندانوں کے اخلاف یعنی بختک اور بزرجمہر کے درمیان پیدا ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آگے چل کر بزرجمہر کے ساتھ جب حمزہ کی جماعت بھی مل جاتی ہے تو یہ ذاتی اور خاندانی عناد قومی پشت پناہی بھی حاصل کر لیتا ہے۔ غرض یہ دو مخالف اور مرکزی قوتیں آپس میں کشمکش شروع کرتی ہیں۔ جسکے اظہار کے لیے نوشیروان عادل شہنشاہِ ایران کی زبردست شخصیت ایک عجیب افسانوی طرز میں، زمین یا "دنگل" بنائی گئی ہے۔ امیر حمزہ کی پارٹی کا اثر، اسکی خوبیوں کی وجہ سے نوشیرواں پر فطرتاً پڑنے لگتا ہے۔ دوسری طرف بختک متمنی ہے کہ یہ اثر زائل ہو کر خود اپنا عمل دخل ہو جائے۔ بختک کا مطمح نظر ذاتی یا قومی مفاد نہیں بلکہ وہ صرف اُن بدبخت اور حاسد انسانوں کا ایک نمونہ ہے جنکی تمنا محض یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اپنے مدمقابل کو پست کیا جائے، خواہ اس میں خود اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ اُسکی زندگی اُن شریر النفس آدمیوں کی ایک اچھی مثال ہے جو مخالفت کو کسی مقصد کا ذریعہ نہیں، بلکہ خود مقصد بنا کر لوگوں سے اُلجھ جاتے ہیں۔

اگر ان دو مخالف جماعتوں میں سے ایک بھی وجود میں نہ آتی تو پلاٹ موجودہ شکل اختیار ہی نہیں کر سکتا تھا

متذکرۂ بالا کشمکش تو اصلی اور مرکزی ہے، لیکن اسکے علاوہ قصہ نگار نے ایک اور لطیف اور ضمنی کشمکش کے اضافہ سے قصہ کے دلچسپ پہلو کو سہارا دینے کی کوشش کی ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تجربہ کام دے سکتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں قصہ نگار کا یہ مقصد بوجوہ احسن تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔ اس ضمنی کشمکش کی دو مخالف جماعتوں میں ایک طرف جناب عمرو عیار ہیں، اور دوسری جانب بختک کی ذات مشترک ہے۔

عمرو اور بختک کی دشمنی کسی ذاتی، خاندانی یا قومی احساس پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وہ امیر حمزہ کے ساتھ عمرو کی دوستی کا لازمی نتیجہ ہے۔

غرض اس طرح تمام داستان کے اشخاص قصہ کو دو وسیع جماعتوں پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں:-

(۱) بختک کی جماعت (۲) حمزہ کی جماعت۔ ان دونوں کی مساعی کا مرکز و محل نوشیروان عادل کی

ذات ہے۔ قصہ میں کچھ مدارج طے ہو جانے کے بعد عشق و عاشقی کا عنصر بھی داخل ہو جاتا ہے جو افسانوں کا جزو لاینفک ہے۔ اس منزل سے ہماری مرکزی دلچسپی امیر حمزہ اور ملکہ مہرنگار بنت نوشیروانِ عادل کے عشقیہ حالات میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے قصے کے دو اجزاء ایک دوسرے سے ممیز ہو جاتے ہیں۔ حمزہ کا مرکزِ نظر اب نوشیرواں نہیں رہتا، بلکہ اسکی دلچسپی ملکۂ مہرنگار کے ساتھ متعلق ہو جاتی ہے۔ مگر عجنک کا مقصد اب بھی وہی باقی ہے۔ وہ حمزہ اور مہرنگار کے تعلقات سے ڈرتا ہے کہ کہیں یہ شگوفہ رنگ نہ لائے، اور حمزہ نوشیرواں کا داماد بن کر اُسکے دل و دماغ کا مالک نہ بن بیٹھے۔ اسی لیے وہ حمزہ کا بدستور پیچھا کرتا ہے۔ اور چونکہ خود اپنی کوششوں سے حمزہ کو شکست نہیں دے سکتا۔ اس لیے وہ زیردستانہ کارروائیوں یعنی سازشوں کے شرمناک راستوں سے نوشیرواں کی جانب بڑھتا ہے اور اس مہتم بالشان قوت کے ذریعہ اپنے مخالف کو تنگ کرتا ہے جو خود اُسکی اور حمزہ دونوں کی قسمتوں پر حکمراں ہے۔ اسی اندھا دھند حماقت خبط میں جا بجا اُس کی ہمارے ہیرو سے مُٹ بھیڑ ہوتی جاتی ہے۔

اس "شہنشاہ عیاراں" کی مساعی کا حاصل امیر حمزہ کو بامراد دیکھنا ہے۔ حمزہ سے اسکو دلی محبت ہے۔ جسکا تفصیلی ذکر ہم آیندہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے وہ یہ نہیں دیکھ سکتا کہ ایک کمزور سازشی ہستی کا وار امیر حمزہ پر چل جائے۔

ممکن تھا کہ قصہ نگار امیر حمزہ کے اس معاون عنصر کو اُنھیں کے یا اُنکے ساتھی مقبل کے سنجیدہ لباس میں پیش کرتا، لیکن یاد رہے کہ یہ قصے کی موت تھی۔ کیونکہ تمام قصے میں سوائے عمر و عیار کے کردار کے شاید ہی کوئی چیز ایسی ہوگی، جو تمام دنیا اور ہر شخص کے لیے ہر زمانے میں دلچسپی رکھنے والی ہو۔

(۵)

داستان کے اشخاص قصہ کو جماعتوں کی حیثیت سے جانچنے کے بعد ہم انکے مدارج کی اہمیت کے لحاظ سے قائم کریں گے، تاکہ زیر بحث کردار کا وزن ہم آسانی کے ساتھ معلوم کر سکیں۔ اس زاویۂ نظر سے اشخاص قصہ کے حسب ذیل مدارج ہونگے:

(۱) نوشیرواں۔ یہ قصے کے دو مخالف عناصر کا درمیانی واسطہ ہے۔ اسی کی ذات تک پہونچنے کے لیے دونوں جماعتیں مختلف راستوں سے اپنی پوری قوت کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ لیکن یہ دونوں کی قسمتوں کا مالک اور دونوں پر حکمراں ہے۔ حمزہ اور عجنک کے اثبات

اسی کے ذریعہ ایک دوسرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ انکے نفاذ کے لیے اسکی منظوری کی ضرورت ہے۔ وہ دونوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ ایسی ایک اعلیٰ قوت کی قصے کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے سخت ضرورت تھی۔

(۲) نوشیرواں کی حالت ایک صدر جمہوریت کی تھی۔ لیکن اصلی کارکن حمزہ اور بختک ہیں۔ اور حقیقت میں اصلی اشخاص قصہ یہی کہلا سکتے ہیں۔ ان میں سے امیر حمزہ کے کردار کو قصہ نگار زیادہ مہتم بالشان کرکے دکھانا چاہتا تھا۔ اسی لیے بختک کی ذات پر امیر حمزہ کے کمالات کے اظہار کے لیے بطور آئینہ کے استعمال کی گئی ہے۔ قصہ نگار کا اصلی مطمح نظر بھی امیر حمزہ کی مقدس شخصیت ہے۔ اور وہ ہر معرکہ میں انھیں کو فتحمند دکھانا چاہتا ہے۔ اسکے برخلاف بختک کی تمام کوششیں امیر حمزہ کے سامنے اور انکے مقابلہ میں پست اور بے سود ثابت کی گئی ہیں۔ بختک کی ساعی کو دیکھ کر غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

(۳) تیسرے درجے کے کرداروں میں عمرو عیار اور بختک رکھے جاسکتے ہیں۔ کرداروں کا یہ طبقہ محض اول الذکر سنجیدہ قسم کے کرداروں کے موازنہ کی خاطر قائم کیا گیا ہے اور یہی "داستان امیر حمزہ" کا ظریفانہ پہلو ہے۔ اس فضا کی روح رواں اور اس حصۂ داستان کا ہیرو عمرو عیار ہے۔ غریب بختک یہاں بھی عمرو کے کمالات کے لیے [illegible] کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے اور حقیقت میں حمزہ کا صحیح مخاطب بختک نہیں بلکہ نوشیرواں ہے اور عمرو عیار کا مدمقابل بختک ہو سکتا ہے نہ کہ اور کوئی دوسرا۔ عمرو کے اوصاف بلکہ خود اسکے کردار کے ظاہر کرنے میں بختک کی ناعاقبت اندیشیوں کو ایک بڑی حد تک دخل ہے۔

(۶)

یہ امر خاص طور سے توجہ طلب ہے کہ قصہ نگار کا خیال کسی حال میں بھی عمرو عیار کے کردار کو اس قدر اہم صورت عطا کرنے کا نہ تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ امیر حمزہ کی تاریخی شخصیت کو تمام افسانوں اور تصوری کمالات میں ملبوس کرکے دنیا کے سامنے، بلکہ زیادہ صحیح ہوگا کہ "اپنے مخاطب کے سامنے پیش کرے"۔ امیر حمزہ کا ذاتی تقدس بھی اس میں شک نہیں کہ قصے کے اثرات کو مستحکم بنا رہا ہے۔ ہمکو اس کا یقین ہے کہ اپنے زمانے میں قصہ نگار کی یہ کوشش مستحسن نظروں سے دیکھی جاتی ہوگی۔ لیکن اُردو دانوں کی ذہنیت میں اب اس قدر عظیم الشان انقلاب رُونما

ہو چکا ہے کہ وہ اس قسم کے نرے تخیلات کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے کی اپنے آپ میں صلاحیت نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ حمزہ کی تاریخی شخصیت، بہ حیثیت شخص قصہ ہمارے لیے مردہ ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس ہستی کو مصنف صرف ایک افسانوی اور وقتی دلچسپی کا سبب بنانا چاہتا تھا۔ وہ بقائے دوام کے سرمنزل تک پہونچتی نظر آرہی ہے۔ یہ امر بھی ادبیات کے تعجبات میں سے ایک ہے۔ "قبولِ خاطر ولطف سخن خدا داد است"۔

حمزہ کے کردار میں کیا چیز ہے جو موجودہ ذہنیتوں کو اپیل کر سکتی ہے؟ لیکن اسکے خلاف جن عناصر سے عمرو عیار کا کردار پیدا کیا گیا ہے، ان میں زیادہ ایسے ہیں، جو کسی خاص زمانے کے لیے مخصوص یا کسی خاص جماعت کو متاثر کرنے والے نہیں ہیں۔ اور یہی ایک ایسی چیز ہے جو ادبی شہ پاروں کو فنا کے درجے سے بلند کر دیتی ہے۔

ان تفصیلات کو پیش کرنے کے بعد ہم عمرو عیار کے کردار کی عناصر کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ خیال رہے کہ عمرو عیار، ایک داستان کا شخص قصہ ہے۔ تاہم دیکھنا چاہیے کہ جو خوبیاں اس میں مضمر ہیں وہ کہاں تک موجودہ کردار نگاری کے اصول پر ٹھیک اُتر سکتی ہیں؟

(۷)

داستان حمزہ اپنے وسیع معنوں میں تاریخی افسانہ ہے۔ جسکے تمام بڑے بڑے کردار، نوشیرواں، امیر حمزہ، قباد، بزرجمہر، عبدالمطلب وغیرہ تاریخی شخصیتیں ہیں۔ قصہ کا پلاٹ بھی مدائن کا تاریخی شہر رکھا گیا ہے جو ایران قدیم کا ایک عظیم الشان شہر ہے۔ قصہ کی عام فضا پر بھی ایرانی تاریخ کا رنگ غالب ہے۔ شاید یہ کہا جائے کہ زیادہ موزوں ہوگا کہ قدیم ایرانی تمدن کے چوکھٹے میں "مغل ہندی" معاشرت کی تصویریں قائم کیگئی ہیں۔ حمزہ کے کردار کو اُٹھاتے وقت مصنف کے دماغ پر شاید "شاہنامہ" کے ہیرو رستم بن زال کا خیال غالب تھا۔ نوشیرواں ضرورت داستان کو پورا کرنے کی غرض سے ایک عجیب اور اہل سے دُور شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ بزرجمہر کا کردار بھی حقیقت سے دُور جا پڑا ہے۔ غرض قصہ نگار تاریخ سے سوائے چند ناموں کے دوسرے واقعات کا احسان کش ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے داستان کو تاریخی حقائق سے بہت کم سروکار رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ اصول کے اعتبار سے تاریخی اشخاص قصہ میں ہم حسب دلخواہ تبدیلی پیدا کر لینے کے مجاز ہیں، لیکن یہ رعایت محض اُنکی خانگی زندگی تک محدود ہے۔ انکی پبلک زندگی میں ہمکو دست اندازی کرنے سے

محترز رہنا چاہیے

داستان کے تاریخی پہلو کو چھوڑ کر ہم افسانوی پہلو کو جانچتے ہیں۔ یہ حصہ داستان کا نہایت دلچسپ ہے اور محض تخلیقی۔ اس حصہ کا ہیرو عمرو عیار بھی تخلیقی پیداوار ہے۔ قصہ نگار اس حقیقت سے ضرور آشنا ہے کہ تاریخی شخصیت سے زیادہ خیالی مخلوق کے ساتھ اپنے حسب مراد عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اُسکو اس امر کا خوف نہیں تھا کہ ایسے کردار کے متعلق بے سروپا باتیں بیان کرنے سے کوئی اُسکا معترض ہوگا۔ ہر حال جو کچھ بھی ہو، عمرو عیار کے کردار کی پیش کشی میں قصہ نگار کی قابلیتیں بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئیں۔ اُردو ادب کا ظریفانہ شعبہ بھی عمرو کی پیدائش کا ممنون ہے۔ اسکا نہ ہونا اُردو افسانوں کے لیے ایک خسارہ تھا۔

یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ عمرو عیار کا کردار قطعاً فوق فطری ہے، مناسب نہ ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ اسکی حیات میں جو عناصر فوق الفطرت شامل کیے گئے ہیں، اسکی سیرت کو ایک واقعی اور اصلی سیرت سے ممیز اور روحانیت سے پُر حیثیت عطا کرتے ہیں۔ لیکن اس عنصر کے دُور کرنے کے بعد بھی اسکے چند فطری اوصاف ایسے باقی رہ جاتے ہیں کہ جو اگر کسی نئے شخص قصہ سے چسپاں کر کے آجکل کے ناولوں کے ذریعہ پیش کیے جائیں تو یقین ہے کہ یہ ایک نہایت دلچسپ چیز ہوگی اور غالباً ایسے کردار کی بدولت ایک ناول ادبیات میں عرصے تک زندہ رہ سکے گا۔

عمرو عیار کے کردار سے غیر فطری اجزا کو دور کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہتا ہے وہ ایک پیشہ ور "عیار" کی سیرت کا حقیقی، دلچسپ اور نہایت خوبصورت خاکہ ہوگا۔ یہاں اس امر کے واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ "عیاری" ایک پیشہ کی اہمیت رکھتی ہے۔ جسکا رواج قرونِ ماضیہ کی اکثر اقوام میں پایا جاتا ہے۔ اس پیشہ کی بنا محض بادشاہوں اور امیروں کی دلچسپی کے لیے ہوئی تھی۔ ہر جگہ یہ پیشہ ایک نئے نام سے ظاہر ہوا۔ یورپ کے اکثر ممالک خصوصاً انگلستان میں بادشاہی "عیار" "کورٹ جسٹر" کہلاتے تھے۔ اس فرقہ کے دلچسپ کارناموں سے اسکاٹ، شیکسپیر وغیرہ کے قصے اور ڈرامے مملو ہیں۔

ایرانیوں نے اس خاص پیشہ میں کس حد تک ترقی کی تھی؟ اسکا ثبوت ہمکو عمرو عیار کی شکل میں مجسم ملتا ہے۔ عیاروں کی زندگی کے اصول اور ضوابط تک موجود تھے۔ انکی خدمت ہمیشہ بادشاہ کو مسرور کرنا تھا۔ لیکن کبھی کبھی ان سے اہم خدمات بھی لے لیے جاتے تھے۔ وقتاً فوقتاً انھیں صورت تبدیل کرنا بھی پڑتا تھا۔ عیاری میں وہی شخص کامیاب سمجھا جاتا تھا جو چست اور چالاک

اور حاضر دماغ ہو - تیز رفتاری بھی اس طرز زندگی کی لازمی شرط تھی - جنگ کے وقت بادشاہ کے تمام عیار قطار در قطار میدان جنگ میں جمع ہوتے اور دشمن کو شکست دینے میں اپنے ہاتھ جو بن پڑتا کرتے - ان کا ایک سردار ان میں انتظام قائم رکھتا تھا - بے وجہ کسی شخص کو مارنا اُنکے مذہب میں گناہ خیال کیا جاتا تھا - کسی کو صرف اس قدر ستایا جاتا تھا کہ وہ بیزار ہو جائے، نہ کہ تکلیف میں مبتلا - عیاروں کی چال اور خود ہیئت کذائی بھی اس قابل ہوتی تھی کہ اُنکو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آجائے - ان کا لباس بھی عجیب طرح کا اور قیمتی ہوتا تھا، جسکا ذکر قصہ نگار نے نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے[1] - اس قسم کی تمام معلومات کا واحد ذریعہ ہمارے پاس عمرو عیار کا کردار ہے -

جہاں تک ہمارا علم رہبری کرسکتا ہے، ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں عمرو عیار کا کردار نہ صرف اُردو زبان میں کیا حیثیت رکھتا ہے بلکہ شاید یورپ کی وسیع ترین زبان بھی اس کردار کا مماثل نمونہ پیش کرسکے -

(۸)

ادبی کرداروں کی پیدائش کے دو طریقے ممکن ہیں - ایک تو یہ کہ شخصِ قصہ کا مکمل خاکہ پہلے ہی ذہن میں مرتب کرلیا جائے، اور پھر اُسکے مناسب فضا افسانہ میں پیدا کی جائے - دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اشخاص قصہ کے متعلق چند اصولی امور کو پیش نظر رکھ کر قصہ کا آغاز کیا جائے، اور بعد میں حسب ضرورت اور حسب موقع کرداری خصوصیات کا اضافہ ہوتا جائے - پہلی شکل میں قصے کا تمام پلاٹ شخصِ قصہ پر منحصر ہوتا ہے، لیکن دوسری شکل میں شخصِ قصہ پلاٹ کے ارتقا کے ماتحت ہے - پہلی قسم کے قصوں میں افسانہ نگار شخص قصے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے - اس اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو ہم یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ عمرو عیار کا کرداری نقش قصہ نگار کے ذہن میں آغاز داستان سے پہلے ہی مرتب ہوچکا تھا - کیونکہ عمرو کے کردار کی بعض بے ربطیاں ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہیں - ہاں یہ صحیح ہے کہ عمرو کے کردار کی پیدائش میں وقتی اضافوں کو بڑی حد تک دخل ہے -

عمرو عیار سے تعارف کراتے وقت ہی قصہ نگار ایسے قرائن پیدا کردیتا ہے کہ پڑھنے والے چوکنے ہوکر بیٹھ جاتے ہیں کہ کسی انوکھے اور عجیب و غریب شخص سے ملاقات کریں - عمرو عیار کے

[1] یہ بیانات جہاں جہاں داستان کے صفحات کے حوالے درج ہیں وہ نولکشور کے مطبوعہ نسخہ ۱۸۷۱ء میں تصویر ہیں

کے پدر بزرگوار کا تعارف ہم سے اس طرح کرایا گیا ہے :-

"بشیر رخصت ہو کر اپنے گھر کی طرف چلا - راہ میں اُمیہ ضمیری نامی ساربان سے ملاقی ہوا - اُس نے بشیر سے پوچھا کہ کہاں سے آتا ہے اور یہ توڑا اشرفیوں کا کیونکر ہمراہ لاتا ہے ؟ اُس نے مفصل حال بیان کیا - اُمیہ ضمیری خوشی خوشی اپنے گھر میں گیا اور سارا قصہ سنایا - اور وہاں جا کر اپنی جورو سے کہنے لگا کہ " تو ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ میں پیٹ سے ہوں، جلدی لڑکا جن، کہ روپئے اشرفیاں ہاتھ آئیں" اور خوشی خوشی عیش و عشرت میں اٹھائیں" - اُس نے کہا کہ " تجھے خیر ہے ! ہوش کے ناخن لے، مجھے ابھی ساتواں مہینہ شروع ہے، فوج میرے ابھی لڑکا ہوئے میرے دشمنوں کو اندھوں و رد پیر کا دھڑکا ہوئے" اُمیہ نے کہا " تو کھانسنا شروع کر البتہ لڑکا ہوگا - اگر آجکل فرزند تولد ہوا تو خواہ مراد، ورنہ اور دو مہینے کے بعد جو پیدا ہوا تو بخوبی فائدہ کیا ہوگا" - وہ جھنجلا کے کہنے لگی - " مردوے کی عقل ماری گئی ہے بے دردوں لڑکا جنواتا ہے - دور ظلم عقل کی کوتاہی، مجھے آنکھیں دکھاتا ہے" - اُمیہ کو جو غیض آیا ایک لات اُسکے پیٹ پر اس زور سے ماری کہ وہ بیچاری بلبلا کر درد کے مارے لوٹنے لگی - بچہ تو اُسکے پیٹ سے نکل پڑا اور اُسکا دم فنا ہو گیا -" (داستان امیر حمزہ - دفتر اول - صـ۳۶)

یہی حضرت عمرو عیار کے باپ ہیں - جنکے ثبوت ایسے نہ ہوں تو تعجب ہے - عمرو عیار نے حرص اور آز اپنے باپ سے وراثتاً پائی، جسکا ثبوت اپنی حیات کے دوران میں کئی بار طرح دیا ہے - اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو گا کہ اُمیہ ضمیری ہی سے عمرو نے اس سے زیادہ اوصاف حاصل کیے جتنے سرسری نظر میں ہم معلوم کر سکتے ہیں -

(۹)

لالچ، بزدلی، ستم ظریفی، دوراندیشی اور رفاقت و ہمدردی عمرو عیار کے عناصر اربعہ ہیں - ظاہر ہے کہ یہ چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر قریبی تعلق رکھتی ہیں کہ عموماً ایک کا دوسرے کے ساتھ پایا جانا بعید از قیاس نہیں یہ ایک اصولی بات تھی جس پر مصنف داستان حمزہ کی نگاہ ضرور پڑی ہوگی اگر وہ اوصاف کی فہرست میں زیادتی کی خاطر انکے ساتھ ساتھ عمرو میں سخاوت، شجاعت وغیرہ بھی شامل کر دیتا تو یقیناً کردار کو وہ اہمیت ہی نصیب نہیں ہو سکتی تھی جو اب حاصل ہے - یہی ایک بڑا راز ہے جو عمرو کے کردار کو اپنے معاصرین سے زیادہ طولانی حیات بخش رہا ہے - اور حقیقت تو یہ ہے کہ خود عمرو عیار کے مقدس اور محترم مربی امیر حمزہ صاحبقراں سے بھی زیادہ ممتاز

حیثیت عطا کر رہا ہے

ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا تھا کہ بیٹا باپ کا ثانی بلکہ اُس سے افضل ثابت ہوا۔ اور "میراث پدر سے کما حقہٗ استفادہ کرنے کے لیے عمرو نے" علم بدر" کے شرائط کی بھی تکمیل کر لی۔

زمین پر گرتے ہی اُس کا سب سے پہلا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے خواجہ بزرجمہر کی اُنگلی سے انگشتری اُس وقت چُرا لی جبکہ اُنھوں نے اُسکو خاموش کرنے کی غرض سے اُنگلی منہ میں دی تھی۔ انگشتری اگر ڈھیلی ہو تو اُس کا ایک کسن لڑکے کے ہونٹوں کے اشارے سے ایسے شخص کی اُنگلی سے نکل جاتا ہے جو باتوں میں منہمک ہو، چنداں قابل تعجب تو نہیں۔ یہ سب سے پہلا واقعہ ہے جس سے قصہ نگار نے عمرو عیار کے کردار کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ آگے چل کر تو اس عجیب الخلقت لڑکے نے نہ صرف کھانے پینے کے معاملات میں امیر حمزہ اور مقبل کو چارپائی کے نیچے ڈھکیل کر عالیہ بانو کی دونوں چھاتیوں سے دودھ پینے بلکہ امیر کے جھولے کا ہیرا چُرانے اور مہمانوں کے زیورات چھپانے سے بھی اپنی عمر سے بڑھی ہوئی رمز آفرینی کی قوتوں کا ثبوت دیا ہے۔

عمرو عیار کی طمع اس قدر شدید تھی کہ روپیہ پیسہ کے سامنے وہ خود اپنی جان کی بھی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ روپیہ پیسہ اُسکے پاس کسی مقصد کا ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ جارج الیٹ کے مشہور ناول "سلاس مارنر" کے ہیرو سلاس مارنر کی طرح اُسکے پاس بھی دولت بذات خود ایک مقصد اور ایک مطمح نظر تھی۔ اور وہ دولت کو اس لیے جمع کرتا تھا کہ وہ دولت ہی سلاس مارنر اور عمرو عیار کے دولت جمع کرنے کی خواہش میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر اسکو اس لیے چاہتا تھا کہ وہ اسکے دل کے گوشہ محبت کو پُر کرتی۔ لیکن موخر الذکر کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچاتی تھی۔ ہندوستان کے سفر میں جب حمزہ کا جہاز گرداب میں پھنس گیا تو عمرو نے جہاز والوں کے ہاتھ اپنی جان روپوں کے معاوضہ میں فروخت کرنا قبول کر لیا۔ کیا یہ حرص کی انتہائی صورت نہیں ہے؟

ان خلاف عادت مثالوں کو چھوڑ کر بھی اس مجسم حرص و آز کی بعض کارروائیاں ایسی دلچسپ اور حریص انسانوں کی خامکاریوں کا نمونہ ہیں کہ انکو پڑھ کر بلا دیر ہی کوئی شخص دیر تک لطف اندوز نہ ہوا ہو۔ کوہ سراندیپ پر پھرتا پھرتا تھک جاتا ہے اور اس اثنا میں سالم نامی ایک باغبان بزرگ سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ عمرو عیار کو قدم آدم کا راستہ بتلاتے ہیں اور تاکید اً کہدیتے ہیں کہ وہاں کے زر و جواہر پر نگاہ نہ ڈالنا، ورنہ راستہ نہ مل سکے گا۔ میاں عیار وہاں سے تو وعدے وعید کر کے راستہ معلوم کر لیتے ہیں، لیکن زیارت سے واپس ہوتے ہیں تو جواہرات کی معمور لگا شت

انکے دامن دل کو اس شدت کے ساتھ کھینچ لیتی ہے کہ انکے

"منہ میں پانی بھر آیا۔ دل میں لالچ کر آیا۔ سوچا کہ حضرت آدم کے قدم کی زیارت تو تو کر چکا۔ اب ان جواہرات کو لیکر یہاں سے جلدی اپنے لشکر کی راہ لے۔ یہاں کون دیکھتا ہے؟ کون قید کرکے لیجاتا ہے۔ کملی بچھا کر تمام جواہرات کو سمیٹا۔ لیکن جب دروازہ کے پاس پہونچا تو دروازہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ..... عمرو نے پھر اُلٹے پاؤں آکر جہاں جواہر پڑا تھا وہیں ڈال دیا۔ دروازے پر جو نگاہ کی دروازہ بدستور دکھائی دیا۔ عمرو نے پھر تجویز کیا کہ پہلے اس دروازے پر نشان رکھ آیا چاہیے، تب جواہر کو یہاں سے لیجانا چاہیے۔ ..... نیم تاج اپنا دروازے کی چوکھٹ کی زد پر رکھ کر جواہروں کے ڈھیر کے پاس کھڑے ہو کر دروازے کو تاکا، دروازہ اور تاج دکھائی دیا"۔ .... (ص ۱۳۴)

دوسری مثال اسکے حرص و آز کی، جو دلچسپی میں پہلی مثال سے کسی طرح کم نہیں ہے، وہ ہے جہاں اس نے روپئے پیسے کے لالچ میں اپنی جان تک دینا گوارا کر لیا۔ امیر حمزہ کا جہاز سراندیپ کے سفر میں گرداب بلا سے تہ و بالا ہو کر ڈوبنے لگتا ہے۔ بچنے کی صرف ایک تدبیر معلوم ہوئی کہ امیر حمزہ یا اُنکے نائب جب تک "سد سکندری" پر چڑھ کر طبل سکندری نہ بجائیں گے جہاز گرداب سے نکل نہیں سکے گا۔ امیر حمزہ اوپر جانے کے لیے تیار ہوئے تو عمرو کو ایسے موقع سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھانے کی سوجھی۔ اور سب لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا،

"یارو تم لوگوں کا بل بکرا ہوتا ہوں۔ اسوقت تو گرہ کھولتے جاؤ۔ شاید بچ رہوں تو اپنی محنت کا اجورہ پاؤں"

ہر ایک کو جان کی فکر لگی ہوئی تھی اس لیے

"ہر ایک نے ایک کی جگہ سو اور سو کی جگہ لاکھ دینار کا تمسک لکھ کر عمرو کے حوالے کیا۔ عمرو نے یہ شعر پڑھا

دریں دریائے بے پایاں دریغ خان شور افزا دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسہا"

اور دم سادھ کر ایک جست لگائی اور سد سکندری پر بہزار خرابی پہونچ گیا" (ص ۱۳۸)

(۱۰)

عمرو عیار کی بڑوہ نہ حرکتیں اور شرارت کی کوششیں بھی اسکے کردار کو کچھ کم دلچسپ نہیں بنا رہی ہیں۔ عام طور پر یہ چیز کسی کردار کو نہ صرف ساقط از اعتبار اور مضحکہ خیز بلکہ مذموم بنا دیتی ہے

یہ عنصر بنجنک کے کردار کا بھی ایک جزو ہے۔ لیکن اسکی وجہ سے اسکا کردار جس قدر ذلیل معلوم ہوتا ہے، اُسی قدر عمرو عیار کا کردار زیادہ دلچسپ بن جاتا ہے۔ اسی موقع پر کسی فلسفی کا وہ خیال ہمکو یاد آجاتا ہے کہ چیزیں بذاتِ خود اچھی اور بُری نہیں ہوتیں، بلکہ اچھے اور بُرے خود اُنکے استعمال کے طریقے ہوتے ہیں۔ بنجنک کی مثال میں بُزدلی اور نامردی کا اظہار جن واقعات کے اندر کیا گیا ہے وہ اُسکی اس خاص حالت پر ایسے براہِ راست موقر ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کی نظروں میں اسکی صرف بُزدلی ہی بُزدلی دکھائی دیتی ہے، جسکی وجہ سے ہر پڑھنے والا اُسکے متعلق نہایت ذلیل و خوار خیالات قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ ماحول جس کے درمیان اس خصلت کا اظہار ہوا ہے، اسکو نمایاں صورت نہیں دیتا، تو ناظرین کے پاس اسکی کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی اور وہ گرد و پیش کے بہت سے واقعات میں کا ایک معمولی واقعہ بن جاتی ہے۔ اور جب کسی کردار کے بُزدلانہ افعال سے نظر خراش نتیجے کے بجائے مسرت خیز نتیجہ مرتب ہو رہا ہو تو قاری اس خاص خصلت کی بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ذیل میں ہم عمرو عیار اور بنجنک کی بُزدلی کی چند مثالیں پیش کرکے اپنے بیانات کو مصدق بنانا چاہتے ہیں۔ عمرو مکتب کے مُلّا کو ہزار طرح ستا کر اور تکلیفیں پہونچا کر کوہ ابو قبیس پر مع حمزہ اور مقبل جا رہتا ہے۔ عبدالمطلب کے فرمانے پر مُلّا مکتب کے چند لڑکوں کو لیکر اُسکو گرفتار کرنے آتا ہے۔ عمرو نے اس دفعہ تو مُلّا صاحب کا احترام اور تقدس قطعاً بالائے طاق رکھ کر پہلے تو اُن کے چیلے ابوجہل کا منہ سنگریزوں سے زخمی کیا۔ اور اسکے بعد جب خود مُلّا آگے بڑھا تو ایک بڑا سا پتھر پھینک کر اُس کا سر ہی توڑ دیا۔ اس واقعے پر خواجہ عبدالمطلب آگ بگولا ہو کر نکلے اور عمرو کو بھی اسکی خبر پہونچی تو اُسکے پیر اُکھڑ گئے اور سارے ڈر کے ایسا بھاگا کہ خود اپنے یار غار حمزہ کی طرف بھی منہ پھیر کر نہ دیکھا کہ کس حال میں ہے۔

مکہ سے رخصت ہو کر امیر حمزہ مدائن کی طرف پہلی دفعہ کوچ کرتے ہیں۔ راستے میں ایک دوراہا ملتا ہے جہاں سے دو راستے مدائن کو جاتے ہیں۔ لوگوں نے امیر سے کہا کہ پہلا راستہ صاف مگر چکر کا ہے۔ دوسرا راستہ نزدیک کا ایک آدم خوار شیر کی بود و باش کی وجہ سے نہایت خوفناک اور ناقابل گزر بن گیا ہے۔ امیر نے دُور کے صاف راستے سے تو فوج کو روانہ کیا، اور آپ خود عمرو کو ساتھ لے کر پُرخطر راستے سے چل پڑے۔ "بیشۂ فیض" میں پہونچ کر کچھ ستاہے تھے

"دفعتاً نیستاں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی۔ جانور کی آمد کی آہٹ ہویدا ہوئی۔ اور ایک

شیر اُس میں سے نکلا - عمرو نے تمام عمر مٹی کا شیر بھی نہ دیکھا تھا - جوں ہی اُسکو دیکھا خوف سے گھوڑے کو چھوڑ کر ایک عظیم الشان درخت پر چڑھ گیا - اور امیر کو پکار پکار کر کہنے لگا، "حمزہ! ایک شیر بڑا ہی لمبا چوڑا نیستاں سے نکلا ہے اور آپ کی طرف چلا آتا ہے خدا کے واسطے جلدی سے بھاگ کر میرے پاس چلے آئیے یا بھاگ کر کسی درخت پر چڑھ جائیے"

امیر، عمرو کی یہ بات سُن کر بہت ہنسے اور فرمانے لگے، "رواجِ فضلت، کہیں بدحواس ہوا جاتا ہے کچھ دیوانہ اور سودائی ہے، خود اس کے مارنے کے واسطے میں اس راہ سے آیا ہوں ..... وغیرہ"

عمرو عیار کی بزدلی میں اُسکے اعتقادات کو بھی ایک بڑی حد تک دخل ہے - وہ امیر کے ساتھ سرزنیپ جانے سے اس بنا پر صاف انکار کرتا ہے کہ "جن، جادو، اور پانی، تین چیزوں سے اُسے بہت ڈر لگتا ہے" عمرو کے جیسے کردار والے شخص میں بزدلی کا نہ ہونا تعجب سے خالی نہیں ہو سکتا - کیونکہ ایک مکمل طریقانہ کردار پیش کرنے میں جہاں تک ممکن ہو ایسے تمام عناصر سے دامن بچانا مناسب ہے جن سے کردار میں سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے - بزدلی کا نہ ہونا شجاعت کا سبب ہوگا - اور شجیع آدمی ہمیشہ خودسر اور سنجیدہ ہوتا ہے - گویا ایک معمولی نفسیاتی کیفیت پر خیال نہ رکھنے سے ایک بہتر سے بہتر کردار نہایت پست بنایا جا سکتا ہے

اسکے بالکل برعکس حالت بخشک کی بزدلی کی ہے - امیر حمزہ کا مقابلہ کرنے سے ڈر کر جب وہ گستہم پہلوان کو حمزہ سے قوت آزمائی کرنے پر اُبھارتا ہے تو حمزہ بلکہ تمام اشخاص قصہ کے آگے اُس کا کردار بیحد حقیر اور ذلیل معلوم ہونے لگتا ہے - اسکے علاوہ بخشک کی پوشیدہ ریشہ دوانیاں اور خطرناک تدبیریں جو حمزہ کو شکست دینے کے لیے اختیار کی گئیں، اُن سے اُسکا کردار کس قدر ذلیل معلوم ہونے لگتا ہے، اسکا اندازہ خود داستان پڑھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے -

(۱۱)

اب ہم عمرو عیار کے کردار کے ایک مہتم بالشان عنصر یعنی اُسکی شوخ کرداری کو جانچنا چاہتے ہیں، جس میں ظرافت کا بڑا امتزاج ہے - شرارت کبھی تو کسی مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائی جاتی ہے، اور کبھی وہ خود مقصد ہوتی ہے - عمرو کی شوخیاں عموماً پہلی نوعیت کی ہیں - اسکی شرارتیں ہر جگہ سنی خیز اور نتیجہ پیدا کرنے والی ہیں - اس قسم کی شرارتیں اس طرح صادر ہو جاتی ہیں کہ ایک کام جو ایک عام اور معمولی طریقے پر انجام دیا جا سکتا ہو، اُسی کو جدتِ طبع کی آمیزش سے

ایک دلچسپ اور ظریفانہ انداز میں ختم کیا جائے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ عمرو عیار کا مدمقابل، بنجنگ مشخص ہوا ہے۔ اور اسی کو زمین بنا کر عمرو عیار کی شرارتوں کی رنگ آمیزی سے نفس قصہ میں عجیب عجیب شگوفے کھلائے گئے ہیں۔ بنجنگ حمزہ کا دوست تھا، اور بنجنگ اُس کا دشمن۔ عمرو کو فطرتاً اپنے دوست کے بدخواہوں کے ساتھ عداوت ہونی چاہیے تھی۔ لیکن حمزہ کے دشمنوں میں صرف غریب بنجنگ ہی ایسا ہے جو قصہ نگار کے ہتھے چڑھ کر عمرو عیار کا مشق ستم بن گیا ہے۔ لیکن اس تمام محشرستان ظرافت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تخلیق میں خود بنجنگ کی نادانیوں کو بڑی حد تک دخل ہے۔

عمرو کی شوخیوں کو ہم اگر "ستم ظریفی" کہیں تو زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنی شرارتوں کا ہدف ہر وقت کسی نہ کسی کو بناتا اور خود مسرور رہتا اور اپنے ناظرین کو محظوظ کرتا ہے۔ اگر ہم اس عیار کی شرارتوں کا فرداً فرداً حساب لگانا چاہیں تو یقیناً ایک کتاب اتنی ہی ضخیم تیار ہو جائے جتنی خود اسکی سوانحعمری ہو سکتی ہے۔ اسکے رشتۂ حیات میں ظرافت کے تار اس طرح پیوست کیے گئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے جدا کرنا دقت طلب امر ہے۔

عمرو عیار کی شوخیوں کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ وہ نوعیت میں نہایت معمولی بلکہ اکثر عامیانہ ہیں۔ لیکن ہندوستانی لڑکوں کی فطرت کے اس قدر مطابق ہیں کہ خواہ مخواہ انکی وقعت دل میں سما جاتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہندی نوعمر لڑکے اور وہ بھی کتب میں پڑھنے والے، اور ایک ظریف انسان کے کردار کے نقشے اس قدر وسیع اور خوبصورت چلنے پر ہم کو اُردو ادب میں کہیں دستیاب نہیں ہو سکتے۔ اول تو ظریفانہ ادب کی اُردو میں کمی ہے، اور جہاں خال خال حضرات نے اس طرف توجہ کی بھی ہے تو اس قسم کے گھریلو امور اُنکی توجہ کے محتاج رہے۔ حالانکہ آج کل روزانہ زندگی کے معمولی اور گھریلو امور کو خوشگوار انداز میں پیش کرنے کی طرف دماغوں نے جو پلٹا کھایا ہے اسکے اعتبار سے اس صنف کے کردار بھی ضرور پیش کیے جانے چاہیے تھے۔ بہرحال متذکرۂ بالا سبب، اُردو ادب میں ظریفانہ ادبی کرداروں کا فقدان اور کئی دیگر اسباب ہیں جو عمرو عیار کے کردار کو اُردو ادب میں ایک دلچسپ اور ممتاز حیثیت عطا کر رہے ہیں۔

ہم یہاں پر صرف ایک دو ایسے واقعات اس "بابائے دوندگان اور عیاران جہاں" کی حیات انسانوں سے انتخاب کرکے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جن میں کوئی نمایاں خصوصیت مل سکتی ہے

عمرو عیار کی تعلیمی زندگی، غریب مُلّا کی پریشاں حالیوں کا دُکھڑا، اور اسکی جدت طرازانہ شوخیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ فطرتاً آپ بدشوق اور کھیل کود کی طرف مائل، خواجہ عبدالمطلب کے ڈر اور امیر حمزہ کی رفاقت کے خیال نے کتب میں لا بٹھایا تو کیا ہوا۔ روز روز کی شرارتوں سے مُلّا اور تمام لڑکوں کا دم ناک میں آگیا تھا۔ الف، بے، تے پر مُلّا سے اچھی خاصی محبت ہوگئی۔ ایک روز لڑکوں کے کھانے مُلّا کے کپڑوں میں چھپا دیے جاتے ہیں۔ کسی روز خضاب میں ہڑتال شریک کرکے بیچارے مُلّا کے چہرہ کو داڑھی کے بار سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ مُلّا کی ٹوپیٹ کا بدلہ اُسکے جسم کو سوئیوں سے چھلنی کرکے نکالا جاتا ہے۔ ابھی "بابا شملہ" کی مٹھائی کے جانفرسا سانحہ سے مُلّا کی طبیعت عمرو سے صاف نہیں ہوئی تھی کہ دوسرے روز صبح سویرے آپ سب سے اول کتب میں جاکر اُسکو جھاڑ، صاف کرکے پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ حضرت مُلّا صاحب کو دُنیا کی اونچ نیچ کی کیا خبر تھی۔ انھوں نے دل میں کہا کہ اس پر میرا خوف غالب ہے سب سے پہلے آیا ہے۔ آج اسکو کچھ نہ کہا چاہیے۔ بھلا وادیا چاہیے۔" حالانکہ یہ بھی عمرو کی ایک مجہول شرارت تھی۔ اسکی اس تمام کارروائی کا مقصد صرف یہ تھا کہ مُلّا جی کو ایک نفسیاتی مغالطہ دیا جائے۔ اور اسکے دل پر اپنی انفعالیت اور شرمندگی کا نقش جماکر دوسری بڑی شرارت کے لیے راستہ تیار کرلیا جائے۔ چنانچہ

> "مُلّا نے سب کو سبق دیکر..... خضاب تیار کرکے عمرو کے ہاتھ پہلے سے حمام میں بھیجدیا اور پیچھے آپ قصد حمام کا کیا۔ عمرو نے راہ میں فرصت پاکر وہ بھرا ہوا خوب بار یک پیس کر خضاب میں ملا دیا۔ ہرگاہ مُلّا جی حمام میں گئے، وہ خضاب ڈاڑھی و چھوں میں لگا کر ایک ساعت کے بعد گرم پانی سے جو دھویا، تو مونچھ داڑھی کا صفایا ہوگیا" (ص۴۱)

ایک معمولی واقعہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ عمرو کے خیالات کی پرواز کس جہات میں رہتی تھی۔ ظرافت اور شرارت اُسکی زندگی کے اصول بن گئے تھے۔ اور خود اسکی چلبلی، جدت طراز اور مضطرب طبیعت نے اُسکو ہر وقت ایک نئی مہم کے سر کرنے پر اُبھارا۔ اسکے مشاہدے کا زاویہ نگاہ عمومیت سے مختلف تھا۔ ہر وہ واقعہ جو اُسکی نظروں کے سامنے سے گذرتا تھا، وہ اُسکو اس خاص خوض سے مطالعہ کرتا تھا کہ اُسکے کن پہلوؤں سے ظرافت پیدا کی جاسکتی ہے۔

عام طور سے بچپن کی مسرت بخش فضا ضرور اس طرز زندگی کی مؤید ہو سکتی ہے۔ لیکن عمرو کی خاص خاص حالت میں علم و دریات اور اور نظری ایام زندگی میں کسی قسم کا فرق محسوس ہی نہیں ہوتا

نوشیرواں باغ وادیں دعوت کا سامان امیر حمزہ کے لیے فراہم کرکے امیر حمزہ کو مدعو کرتا ہے۔ بنجنگ اور عمرو کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ باغ کے مدخل پر عادی پہلوان کو اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ کسی کو بادشاہ کی اجازت کے بغیر اندر نہ آنے دے۔ عمرو کے لیے ایسی رکاوٹیں کب قطعی ہوسکتی تھیں؟ عادی کی آنکھوں میں خاک جھونک آپ اندر ہو رہے اور اندر پہونچنے کے بعد آپ نے جو جو کام کیے وہ نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں۔

عمرو بشکل سے یا آسانی سے غرض بہرحال اندر تو پہونچ گیا۔ اب نوشیرواں کی محفل عیش میں بارکس طرح پا سکتا تھا؟ امیر کسی طرح اُسکو اپنے پاس نہیں بلا سکتے تھے، کیونکہ بادشاہ کا حکم ان پر قابل پابندی تھا۔ نوشیرواں اسکی فتنہ پردازیوں سے مخوف تھا کہ اسکی موجودگی مجلس عشرت میں ضرور تفرقہ اندازی کا باعث ہوگی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عیار نے اندر آنے سے پہلے ہی مجلس میں داخل ہونے کی تدبیر سوچ لی تھی۔

"گلگشت کرتا ہوا اُس قصر کی طرف گیا جہاں بادشاہ اور امیر بزم افروز تھے۔۔۔۔ متصل اس قصر کے ایک درخت چنار رکا تھا۔ اُسکے نیچے بیٹھ کے دو تار ملا کر گانے لگا۔ عمرو کا گانا مُردے کو جلاتا تھا۔ ۔۔۔۔ امیر کے کان میں جو آواز گئی، مقبل وفادار سے فرمانے لگے کہ "عمرو کی سی آواز آتی ہے ۔۔۔۔ ہم نے عادی کو منع کردیا تھا کہ عمرو کو باغ میں نہ آنے دے ۔۔۔۔ پھر یہ کیونکر آگیا؟ جاؤ عادی کو تو بلا لاؤ۔" بادشاہ نے امیر کو یہ دیکھ کر کہا کہ "عادی کو بلانا کچھ ضرور نہیں۔ ہمنے عمرو کا قصور معاف کیا۔ ہاں عمرو کو بلا لو۔ ۔۔۔۔" (ص ۹۳)

غرض عمرو کے کمال موسیقی نے اُسکو بزم شاہ تک پہونچا دیا۔ لیکن یہاں پہونچ کر ہم کو معلوم ہوتا ہے اسکے اس طرح دھوکے سے باغ میں آنے کی غرض کوئی ذاتی منفعت نہیں تھی، بلکہ امیر سے ملاقات کرنی منظور تھی۔ باغ میں داخل ہونے کے بعد سے اُسکی پیش بینی نے اسکو اس امر کا یقین دلا دیا تھا کہ بنجنگ بھی ضرور اندر آنے کی کوشش کریگا۔ اس خیال نے اُسکو "جھاڑی جھاڑی بگلبن بگلبن بوٹا بوٹا" دیکھنے پر مجبور کردیا۔ اس معائنہ کے دوران میں،

"بدرو پر جو نگاہ پڑی، بفور جو نظر کی، دیکھا کہ کوئی شخص سر نکال کر ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے اور پھر سر کو اندر کھینچ لیتا ہے۔ سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ بنجنگ ہے۔ ۔۔۔۔ خواجہ طلعت پوش سے کہ مہتر باغبانوں کا تھا جا کر کہا کہ تو بڑی غفلت میں سُکھ نیندیں لے رہا ہے اور باغ میں ایک چور بدرو کی راہ سے گھسا چاہتا ہے۔ میں نے آہٹ پائی تجھے خبر دی۔۔۔ اب

تو جان اور تیرا کام جانے اور بادشاہ کا انتظام جانے ۔ ..... وہ گھبرا کے مع چند باغبانوں کے بیلچے لیکر اُٹھا ۔ اور بدر و سے متصل دیوار باغ سے لگ رہا ۔ جو ہیں بجنگ بدرو سے نکلا ، باغبانوں نے لپٹ کر پکڑ لیا ۔ ہر چند اُس نے کہا کہ "میں بجنگ ہوں" کسی نے نہ مانا ۔ ایک درخت کے ٹہنے میں ٹکا کر ہر ایک نے بجائے خود زدوکوب کرنی شروع کی ..... جب خوب ہڈیاں بجنگ کی نرم ہو چکیں ، اور پٹھے اور سلیاں ورم کر گئیں "

تو اُسکو ایک درخت سے بندھوا دیا ۔ اور اِدھر بادشاہ کو اُبھار کر سیر گلگشت پر مائل کیا ، تاکہ وہ سب ارکان دولت کے ساتھ اپنے وزیر بجنگ کی شرمناک صورت دیکھے ۔ غریب بجنگ کی شامت آئی تھی جو یہاں اس طرح چلا آیا ۔ اس فضیحت کے بعد جب دربار میں جگہ ملی اُس نے پھر اپنے کرتوتوں سے اپنے آپ کو عمرو کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکا دیا ۔ امیر حمزہ کی نگاہ جب سے بہزنگار پر پڑی تھی ہر گھڑی اُٹھ کر باہر جاتے اور بام ودر پر نگاہ ڈال آتے ۔ بجنگ تاڑ گیا اور اکو روکنے کی کوشش شروع کی ، اور بادشاہ سے کہا کہ

"لوگ ہر گھڑی محفل سے اُٹھ اُٹھ کر باہر جاتے ہیں ، مجلس کا لطف جاتا ہے ..... حکم دیجیے کہ جو کوئی بلا ضرورت مجلس سے باہر کا قصد کریگا اسکو اس پر سو تمن جرانہ دینا پڑے گا "

امیر نے بھی اسکی تائید کی ۔ لیکن اُٹھنا کم نہ ہوا ، اور جرانے بھرتے رہے ۔ بزرجمہر کے اشارے پر عمرو نے بجنگ کو جن جن طریقوں سے رُسوا کیا اُسکا منظر صفحہ ۱۰۵ ۔ اور ۱۰۶ پر ملاحظہ فرمائیے ۔

(۱۲)

عمرو عیار کا کردار کتنے ہی مضحکہ خیز اور دلچسپ صفات کا مجموعہ کیوں نہ ہو ، لیکن چند عمدہ صفات سے کلیتہً خالی نہیں ہے ۔ عمرو عیار ، لالچی ، چور ، شریر غرض سب کچھ تھا ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت عاقل اور فرزانہ بھی تھا ۔ اسکے دُور اندیش ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ۔ اسکے اس خاص وصف کو ہم اسکے کردار کے عمیق مطالعہ کے بعد اخذ کر سکتے ہیں ۔

عمرو لحاظ نام اور باعتبار کردار ایک عیار ہے ۔ اور عیار بھی کیسا ؟ شاید اسکے جیسے بلند پایہ عیار بہت کم گذرے ہونگے ۔ ظاہر ہے کہ اس پیشہ کی تمام خدمات انجام دینے کے لیے جس قماش کے آدمی کی ضرورت ہوگی وہ نہایت ذکی اور سریع الفہم ہوگا ۔ کیونکہ اسکے بغیر اس پیشہ میں کامیابی ممکن نہیں ۔ بے معنی مذاق اور لغو شرارت بیوقوفی کی علامات ہیں ۔ اس قسم کے مذاق سے عمرو عیار کے کردار کا دامن عموماً پاک ہے ۔ اس کا مذاق موزوں اور نتیجہ خیز ہوتا ہے ۔

وہ تمام فطری افعال بھی جو عمرو سے منسوب کیے گئے ہیں، ایسے نہیں ہیں کہ ہرکس ناکس ان کا سرانجام کرسکے - اس نے اپنی عقل خداداد کی مدد سے امیر حمزہ کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے سے بچایا ہے - امیر حمزہ ایک شجیع اور بہادر انسان ہیں، جنکی طبیعت ہر بہادر انسان کی طرح سادہ اور اپچ پیچ سے بیخبر واقع ہوئی ہے - وہ فتنہ پردازانہ پیچیدگیوں سے کماحقہٗ ناواقف ہیں - کیونکہ انکو اپنی قوتِ بازو پر پورا بھروسہ ہے - وہ کمزور انسان ہوتا ہے جسکی ہمت شرمناک ریشہ دوانیوں میں صرف ہوتی ہے - جب قوت طبیعی سے کامیابی حاصل کرنا اُسکے حصہ میں نہیں ہوتا، تو وہ مجبوراً اور فطرتاً سازشوں پر اُتر آتا ہے - حمزہ جیسے دلیر شخص پر ایک روک تھام کی کل بھی ہونی ضروری تھی، جو اُسکو اونچ نیچ سے آگاہ کرتی رہے - یہ کام عمرو عیار کے سپرد کیا گیا ہے - اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عمرو عیار کی تمام افسانوی حیات کا کس قدر حصہ خود اپنی ذات کے لیے صرف ہوا ہے، اور کتنا امیر حمزہ کے لیے وقف ہے؟ صرف اسکی حرص تو ہم کو کہیں کہیں اس کا شبہہ دلاتی ہے کہ اسکو اپنا خیال ہے - اسکے سوا اور کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرو نے کوئی کام ذاتی نفع کی خاطر انجام دیا ہے -

اس خاص نقطۂ نظر سے بھی عمرو کی حالت واضح ہو جانے کے بعد ہم کو اسکی پیش بینی، ذکاوت اور فراست کی اہمیت کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی - عمرو عیار کی ہوشیاری سے آجکل کے ڈاکٹر بھی سبق لے سکتے ہیں - گستہم پہلوان نے دھوکے سے امیر اور اُنکے رفقا کو اپنے مکان میں دعوت پر بُلایا - بے خبری کے عالم میں چار سو مسلح سپاہی امیر پر آن پڑے - ایسی نازک حالت میں امیر کے جاں نثار رفقا میں سے بہرام نے سینہ سپر کرکے اُس وار کو اپنے شکم پر لیا جو امیر پر اترا چاہتا تھا - اس صدمہ سے اُسکی آنتیں پیٹ کے باہر نکل پڑیں - اور سسکنے لگا - بزرجمہر جنکی ذات میں ایک "قدیم حکیم" کے پورے لوازم جمع تھے نہایت پریشان تھے کہ بہرام "رودۂ دل پر ہاتھ لگانے سے فوراً مر جائے گا" اور یہ غیر ممکن ہے کہ رودۂ دل کو ہاتھ نہ لگایا جائے، اور زخم کے سینے کی کوئی تدبیر عمل میں آئے" -

"عمرو بولا" خواجہ! واقع میں آپ حکیم حاذق ہیں اور میرے اُستاد صادق ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ حکمت بہت مشکل ہے" .... یہ کہکر ایک استرہ جیب سے نکالا - بہرام کو دونوں پاؤں کے درمیان دباکر ہاتھ پیٹ کی طرف بڑھایا - بزرجمہر نے عمرو سے پوچھا کہ ارادہ کیا ہے؟ "عمرو نے کہا کہ" جتنی آنتیں پیٹ کے باہر ہیں انکو ہاتھ کی صفائی سے

صاف کردوں گا ..... پھر مرہم لگا کر اچھا کردوں گا"۔ بہرام نے عمرو کی جو تقریر سنی، سناٹے میں آیا۔ زندگی سے مایوس ہو کر نہایت گھبرایا۔ ٹھنڈی سانس جو حسرت سے بھری، تمام آنتیں پیٹ میں جاتی رہیں"۔ (ص ۹۲)

اس میں شک نہیں کہ بادی النظر میں عمرو کے دانشمندانہ افعال بعض وقت نہایت معمولی نظر آئیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معلوم ہو جانے کے بعد ہر شے آسان ہے۔

نوعیت میں اس سے بالکل مختلف ایک اور مثال اسکی ہوشیاری کی پیش کر کے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امیر حمزہ کا جزیرۂ سراندیپ کو جانا ٹھہر گیا۔ اور بادشاہ نے امیر کی درخواست پر مہرنگار کے ساتھ انکی سنگنی کی رسم ادا کیے جانے کا حکم بھی صادر فرما دیا۔ امیر، محل میں جا رہے تھے کہ بنجنگ کے دل میں شرارت کی سمائی کہ چل کر سننا چاہیے کہ امیر اور مہرنگار میں کیا راز کی باتیں ہوتی ہیں۔ فوراً خچر پر سوار ہو کر نکلا۔ محل کے قریب دونوں کی مٹ بھیڑ ہوئی۔ عمرو نے امیر سے کہا کہ آپ چلیے میں اس سے سمجھ لوں گا۔ آگے بڑھ کر بنجنگ کے خچر کی باگ پکڑلی اور ایک پرانا تمسک اُس کے آگے کر دیا جسکی رُو سے اسکے (۵۰۰) تمن بنجنگ پر واجب الادا تھے۔ عذر کرنے لگا کہ "میں ہندوستان جا رہا ہوں، جیتا واپس ہوتا ہوں یا مُردہ، میری رقم واپس کر دیجیے"۔ بنجنگ کے پاس اُسوقت رقم کہاں تھی، لطائف الحیل ٹالنا چاہا۔ عمرو اُسکے سر ہو رہا اور زخمی کر کے واپس لوٹا۔

محل میں داخل ہونے کی کوشش کی تو دربان لکڑی اُٹھا کر پیچھے دوڑا۔ عمرو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اس زور سے چلایا کہ امیر بدحواس ہو گئے۔ دربان منت سماجت کرنے لگا۔ غرض اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خود امیر دوڑے ہوئے باہر تشریف لائے، اور آنکھوں پر سے ہاتھوں کو علیحدہ کیا تو دیکھا کہ آنکھیں صاف اور تارا سی چمکتی ہیں۔ شرارت کا سبب پوچھا۔ کہنے لگا "آپ کے سر کی قسم دربان نے لکڑی میرے مارنے کو اُٹھائی تھی۔ اگر لکڑی مارتا تو میری آنکھوں ہی میں لگتی، اور آنکھیں پھوڑ ہی ڈالتی"۔ امیر اسکو اندر لے گئے۔

عمرو کی یہ ساری کوشش صرف اس مقصد کے ماتحت عمل میں آئی کہ کسی طرح اندر جا کر اپنی "سرمایہ دار" معشوقہ فتنہ بانو سے ملے اور کچھ نقد مار لے جائے۔

ان چند مثالوں سے نہ صرف عمرو کی دُور اندیشی، ذکاوت اور ہوشیاری کا ثبوت ملتا ہے، بلکہ ان سے اسکی دوستانہ ہمدردی، ایثار، رفاقت اور امیر حمزہ کے ساتھ اسکی خود فراموشانہ

محبت کا بھی پتہ چلتا ہے

(۱۳)

ہمارے اوپر کے بیانات اس امر کے کافی مظہر ہیں کہ عمرو عیار کے کرداری عناصر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے اس میں ایک انفرادیت پیدا کرکے اسکو ادبیات کے زندہ کرداروں میں شامل کر رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہم سے یہ کہے کہ عمرو عیار کے کردار میں جدید کردار نگاری کی تمام خوبیاں موجود ہیں یا یہ کہ اسکے کردار میں کوئی عمق ہے، تو شاید ہم اسکو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوسکیں گے۔ لیکن ہم اس امر سے انکار نہیں کرسکتے کہ عمرو عیار کے جیسے کردار نہ صرف اُردو ادبیات میں مفقود ہیں بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی بمشکل دستیاب ہوسکیں گے۔ اسکی وجہ ہم نے اوپر کسی مقام پر بالتفصیل بیان کردی ہے۔ اسکے کردار کی یہ خصوصیت یا وہ وصف اسکو باقی رہنے والے کرداروں کی فہرست میں نہیں شامل کرا رہے ہیں، بلکہ یہ تمام اوصاف ہیں جن کی ہیئت اجتماعی عمرو عیار کے کردار کو ایک چلتے پھرتے، گوشت اور پوست والے انسان کی طرح ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر رہی ہے۔

عمرو عیار کے کردار کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سارے قصے میں رگ و ریشوں کی طرح چاروں طرف دوڑ گیا ہے۔ گو آخری داستان میں اسکا ذکر کم ہے، لیکن پہلی تین داستانیں اسکے کارناموں سے لبریز ہیں۔

ہم نے کردار نگاری کے اصول میں یہ بیان کیا ہے کہ اشخاص قصہ کی ظاہری شکل اور شباہت کے ساتھ ساتھ جب تک اُنکے لباس اور اُسکی خصوصیات کا بھی ذکر نہ کیا جائے، ہم انسے مانوس ہو ہی نہیں سکتے۔ اور انکو انسانی نمونوں کے محشرستان سے ممیز نہیں کرسکتے۔ یہ دونوں چیزیں خصوصاً لباس اشخاص قصہ کی صورتوں کو ہمارے ذہنوں میں معین اور واضح طور پر مشخص کردیتی ہیں۔ داستانوں میں اشخاص قصہ کے لباس کا ذکر کوئی نئی چیز نہیں۔ لیکن داستان امیر حمزہ کا مصنف برخلاف تمام اصلی اشخاص قصہ کے، عمرو عیار کے لباس کا ذکر بیحد تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اور عیاری کے لباس کا بیان اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ہم کو شاید ہی کہیں دستیاب ہوسکے۔ (ملاحظہ ہو ص۷۴-۷۵) مصنف کی اس دُور بینی کے ہم خاص طور پر ممنون ہیں۔

(۱۴)

اس مقالہ کو ہم اُسوقت تک تشفی کے ساتھ ختم نہیں کرسکتے جب تک کہ ان چند خامیوں

کی طرف بھی ایک اجمالی اشارہ نہ کردیں، جو قصہ نگار نے، بلحاظ کردار نگاری، عمرو کی شخصیت کے پیش کرنے میں کی ہیں۔ اگر فوق الفطرت عناصر سے چشم پوشی اس عذر کی بنا پر کر بھی لی جائے کہ کہ قدیم قصوں کا یہ ایک لازمی اصول تھا، پھر بھی بعض ایسے غیر نفسیاتی اور خلافِ فطرتِ انسانی امور کے پیدا کرنے پر قصہ نگار کسی حال میں بھی معاف نہیں کیا جا سکتا، جو اُس کے روزانہ مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ذرا بھی توجہ کی جاتی تو کوئی وجہ نہیں کہ عمرو کا کردار پندِ معمولی اور پیش پا افتادہ اسقام سے پاک نہ ہو جاتا۔

تمام فوق الفطرت قصوں کی طرح "داستان حمزہ" کے کردار بھی اپنی پیدائش کے وقت سے لیکر آخر وقت تک ایک حالت پر قائم رہتے ہیں۔ حمزہ ہو یا عمرو کسی کے بچپن اور بڑھاپے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جس حالت میں کہ دنیائے قصہ میں وہ وجود پذیر ہوتے ہیں اُسی عالم میں راہی عدم بھی۔ عمرو کی زندگی کے ابتدائی اور آخری واقعات کے مقابلی مطالعہ سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

قصہ نگار نے ایام شیر خوارگی ہی میں عمرو سے ایسے افعال سرزد کرائے ہیں، جو کسی حال میں بھی بے سمجھ لڑکوں سے سرانجام نہیں پا سکتے۔ اگر عمرو کی پہلی شرارت یعنی بزرجمہر کی انگشتری کے چُرا لینے کو ایک اتفاق سمجھ کر ہمارا ذہن تسلیم بھی کرلے، تاہم یہ قرینِ قیاس ہے.... کہ چار راہ کا بچہ دو اپنے سے زیادہ قوی لڑکوں کو قصداً پلنگ سے نیچے گرا کر دایہ کی دونوں چھاتیوں سے آپ اکیلا دودھ پی جائے!

اس مثال سے زیادہ بعید از قیاس عمرو کا حمزہ کے جھولے سے لعل چُرانا ہے۔ عمرو نے مکتب کے مُلّا سے پہلے سبق پر جو حجت کی تھی وہ ایسی ہے کہ شاید آجکل کے بعض انٹرنس کے طالبعلموں کی سمجھ میں بھی اچھی طرح نہ آسکے۔ یہ وہ غلطی ہے جسکا ارتکاب نذیر احمد نے بھی اپنی ہر دلعزیز تصنیف "توبۃ النصوح" میں کیا ہے۔ اور جس کا ذکر ہم نے اپنی کتاب میں بالتفصیل کیا ہے جہاں عُمر اور بکلے میں مطابقت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے[1]۔

"..... عمرو نے جب اُس نے کہا کہ "الف"۔ بولا "راست اور برحق ہے"۔ مُلّا نے کہا کہ "میں کہتا ہوں کہ "الف" کہہ، تو کہتا ہے کہ "راست اور برحق ہے"۔ یہ کیا بات ہے؟ کیسا احمق ہے! عمرو نے کہا کہ "جو آپ کہتے ہیں اُس کا جواب دیتا ہوں۔ جو بات میں سمجھا

---

[1] ملاحظہ ہو "دنیائے افسانہ" ص۹۱۔

ہوں وہی خدمت عالی میں عرض کر رہا ہوں - یعنی آپ کہتے ہیں "الف" میں کہتا ہوں "راست اور برحق ہے" اس میں سرمو فرق نہیں - مطلق ہے - یعنی الف سیدھا ہے - اور الف کا عدد ایک ہے - اور ذات وحدہ لاشریک کی بھی واحد ہے - اگر یہ غلط اور لغو کہتا ہوں تو آپ تادیب اور تنبیہ فرمائیے - مجھے قائل کیجیے - اور کسی طور پر سمجھائیے - آپ اس میں کیا کہتے ہیں ؟ کیا خدا واحد نہیں ہے ؟ اور کوئی بھی اُس سے مشارکت رکھتا ہے ؟ اُس کے سوائے اور کوئی شان وحدانیت رکھتا ہے ؟ ..." وغیرہ - (ص ۴۱-۴۲)

یہاں ہم بخوف طوالت صرف ایک نمونے پر اکتفا کرتے ہیں - ان تمام خلافِ عادت واقعات کو پڑھنے کے بعد قاری کے دل میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوگا کہ جس شخص نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں، اور نہ صرف سیاہ کیے بلکہ ان میں ایسی دلچسپی مضمر رکھی ہے کہ آج تک لوگ داستان کو برابر پڑھے چلے جا رہے ہیں، ایسا کیا ہو گوف تھا کہ اُس میں سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کا شعور نہ تھا ؟ قصے کی سیرتوں کے طویل سلسلے، پلاٹ کا ایک حد تک انتظام، تخیل کی بلندی، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو ایک لغو نگار کے قلم کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں - قصہ نگار غیر معمولی ذہانت کا آدمی نہ تصور کیا جائے، تاہم اُسکے دیوانہ ہونے کا کسی کو شبہہ نہیں ہو سکتا - پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ ایک سمجھدار آدمی بعض وقت کسی خبط کے دورہ میں بے سر و پا باتیں کہنے لگے !

واقعہ یہ ہے کہ قدیم قصہ نگاروں کی ذہنیت موجودہ قصہ نگاروں سے بالکل مختلف تھی ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے اُنکے قصے کا پیش ہونا ہی اُنکی ہر دلعزیزی کے لیے کافی تھا - پڑھنے والے "تنقید کا کوڑا" لیکر تو نہیں بیٹھتے تھے - جو کچھ ایک بلند تخیل کا نتیجہ ہوتا، اُسکے استقبال کے لیے عوام پسندیدہ پیشانی تیار رہتے تھے - یہ اسباب تھے جو قدیم داستانوں کی پیشکشی کا باعث ہوئے

لیکن اس اختلاف کے باوجود قدیم اور جدید قصہ نگاروں کی ذہنیت میں ایک چیز ضرور مشترک بھی پائی جاتی ہے - اور وہ کردار کے مکمل کرنے کے لیے مواد کی جستجو ہے - جس طرح ایک جدید ناول نگار ہیجان خیز اور تعجب انگیز واقعات کے اندر سے ایک شخص قصہ کو بامراد نکال لاتا ہے، اُسی طرح قدما نے بھی اسکی کوشش کی - صرف طریقے مختلف ہیں، جن افسانوی معمول کو ہم معمولی اور مطابق فطرت واقعات کی باریکیوں سے سلجھاتے ہیں، قدما اُسی کو غیر معمولی اور خوق فطری ذریعہ سے سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں - اسکے اس فعل میں بعض وقت خود اُن کے مخاطبین کے اعتقادات کو بھی دخل ہوتا ہے - اگلے لوگوں نے جو کچھ کیا وہ اُنکے زمانے کا

تقاضہ تھا۔ اور ہم جو فطرت کا راگ گا رہے ہیں، یہ نتیجہ ہے ہمارے معاصرین کی اس طرف توجہ کا۔ قدما عجائبات کے تلاشی رہتے تھے۔ یہ چیزیں اب ہماری معاشرۃ کو مسرور کرنے سے قاصر ہیں۔

اس کے علاوہ قدیم اور جدید اصول افسانہ نگاری میں ایک اور بین فرق پڑ گیا ہے۔ قدیم افسانہ نگاری کا اصول تصوریت Idealism تھا، اور موجودہ افسانے حقیقیت Realism کے اصول پر لکھے جاتے ہیں۔ قدیم لوگ تصوری دنیا کی تخلیق کو زیادہ پسند کرتے تھے، جس کی ہر شے اپنی انتہائی کمالات اور قوتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی تھی۔ حقیقیت ایک حد تک افسانہ نگاری کے دائرہ سے باہر تصور کی جاتی تھی۔ اس لیے انکا تخیل جب کبھی ایک مکمل دنیا کے اجزا کی جستجو کی طرف جولانی پاتا، تو وسائل کی کمی کی وجہ سے ایسے راستے اختیار کرتا، جو خود عمرو عیار کی کردار نگاری میں اختیار کیے گئے ہیں۔ قدیم قصوں میں جہاں ایک ہیرو خدائی قوتوں کا مظہر ہوتا ہے، شیطانی طاقتوں کا حامل بھی ہیرو کے مخالف کی شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ اسکے نبرد و برابر کی ٹکریں نہیں ہو سکتیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں عمرو عیار کے کردار کا مطالعہ، اُس کے کردار کے چند اسقام کو یقیناً غیر اہم بنا دے گا۔ کسی کارنامے سے مانوس ہونے اور اُسکی کما حقہ وقعت قائم کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ ہم اسکا مطالعہ اُس اصول کے ماتحت کریں جسکو اسکوتھ Asquith "تاریخی نظریہ تنقید" Historical method of criticism کے نام سے موسوم کرتا ہے[1]۔ اس اصول کی رو سے ہر کارنامے کو اسی خاص ماحول کے درمیان رکھ کر جانچا جاتا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا، کسی ادیب یا مشہور شخص کی اہمیت کا صحیح اندازہ قائم کرنے میں ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو قدیم شاعر کی طرح افسانہ نگار کو بھی مجبوراً یہ کہنا پڑے گا

"قصۂ مرا بدرسہ کہ بُرد؟"

محمد عبدالقادر سروری

ایم اے، ایل ایل بی

---

[1] اوکسفرڈ ایڈریسز۔ اب "تنقید"

احسان اپنے سر پر نہ لینا باعث عدم توجہ کا ہوتا تھا چنانچہ اوس مین دو تین امر کو مین نقل کرتا ہون۔ جس عرصے مین غازی الدین حیدر کے آخر زمانے مین نواب معتمد الدولہ برسرکار تھے اور جناب چھوٹے چچا صاحب بادشاہ اودھ کے سفیر کلکتہ مین تھے تب نواب معتمد الدولہ نے جناب ممدوح سے جب لارڈ ہسٹنگ گورنر جنرل کے ساتھ لکھنؤ مین آئے زبانی کہا کہ مین چاہتا ہون کہ میرے اور تمھارے درمیان مین کوئی شخص میرا اور تمھارا دونون کا معتمد مقرر ہو۔ جناب چچا صاحب نے جناب والد ماجد مغفور کا ذکر کیا کہ اون سے بہتر کوئی شخص نہین ہیگا نواب معتمد الدولہ راضی ہوئے اور یہ قرار دیا کہ ایک نیا عہدہ عدالت کا واسطے انفصال معاملات سرحدی بادشاہی اور انگریزی کے ہزار روپیہ درماہہ کا مقرر کیا جائے وہ جناب ممدوح کے نامزد ہو اس ذریعہ سے جناب والد مغفور دربار مین حاضر رہین گے اور معاملات مخفیہ کی تحریرات حضرت کے ہاتھ سے ہوا کریگی۔ جب اس بندوبست کی جناب والد ماجد مغفور کو اطلاع کی گئی تو آپ نے اس کو قبول اس شرط پر کیا کہ بادشاہ کی طرف سے گورنر جنرل کے نام پر تحریر آپ کے تقرر اور طلب کی کی جائے اور گورنر جنرل بموجب اس کے آپ کو تحریری حکم دیوین۔ اس صورت مین وہ عہدہ آپ کو قبول ہوگا۔ چونکہ اون دنون مین معاملات سرحدی کی بدنظمی کی اکثر گورنر جنرل کی طرف سے شکایت ہوا کرتی تھی نواب معتمد الدولہ اور چھوٹے چچا صاحب کو یہ موقع ملا کہ نواب نے یہان رزیڈنٹ سے اور چچا صاحب نے کلکتہ مین دفتر فارسی کے سکرتر سے اوس کو تذکرہ کر کے منظور کروایا۔ رزیڈنٹ راضی ہوئے کہ بادشاہ کا خط جناب والد ماجد کے طلب اور تقرر کا گورنر جنرل کے پاس بھیج دین گے اور سفارش اوس کی منظوری کی کرین گے اور سکرتر راضی ہوئے کہ جب ایسی درخواست بادشاہ کی آویگی تو حکم تحریری جناب والد ماجد کے نام پر جائے گا۔ یہ امر تو بخوبی طے ہوگیا صرف خط بادشاہ کا گورنر جنرل کے نام پر لکھنا باقی تھا اور اوس کا بھی مسودہ دفتر مین ہوا تھا

بندوبست جناب والد ماجد کے تقرر کا بادشاہ اودھ کی سرکار مین کس صورت مین ہوا اور عہدہ قضا کا اور اس پر مقرر ہونا اور آپ کا قبول کرنا

مگر اجرا اوس کا غازی الدین حیدر بادشاہ کی بیماری کے سبب سے ملتوی رہا اور بادشاہ اوسی بیماری مین قضا کر گئے۔ جب میر فضل علی نصیر الدین حیدر بادشاہ کے نایب ہوئے اور جناب چچا صاحب کی عہدۂ سفارت سے برخاست ہوئی۔ اون کی جگہ پر جناب عاشق علی خان بہادر جو قرابت مین راقم کے ماموں ہوتے تھے مقرر ہوئے۔ میر فضل علی کو جناب والد ماجد سے فی الجملہ محبت تھی۔ جب اون کے ہنگام قیام مین فرخ آباد مین جناب والد ماجد دورۂ عدالت دایر و سایر کے واسطے آتے تھے تو میر فضل علی کی آپ کی فرودگاہ مین کثرت سے آمد و رفت رہتی تھی اور جناب عاشق علی خان صاحب مغفور واسطے رفع شکایت برادرانہ کے کہ جناب چچا صاحب کی موقوفی کے بعد عہدۂ سفارت پر مقرر ہوئے تھے کہ علی العموم موقوف کرانا اوننھین کی طرف منتسب تھا دونون صاحب نے آپس مین مشورہ کر کے یہ تجویز کیا کہ جو بندوبست جناب والد ماجد کے واسطے ہوا تھا اور بنا اوس کی نواب معتمد الدولہ ڈال چکے تھے اوس کی تکمیل کی جائے بموجب لوس کے ایک خط میر فضل علی کا اوسی مضمون کا جناب عاشق علی خان صاحب کے خط مین ملفوف بریلی مین اوس عرصے مین پہونچا کہ جب راقم بھی حضرت کے ہمراہ تھا اور عاشق علی خان صاحب اور سبحان علی خان صاحب کمبوہ جو میر فضل علی کے پیشدست تھے اُن دونون کا خط نہایت اصرار اور مبالغے کا اوس عہدے کے قبول کا آیا اور راقم نے بہت اصرار سے عرض کیا کہ راقم کو یہان اپنا قائم مقام مقرر کروا کے آپ تشریف لیجائین مگر جناب والد ماجد مغفور نے احسان اون سب صاحبون کا ایسی حالت مین کہ چھوٹے چچا صاحب کی معزولی ہوئی ہرگز گوارا نہ کیا اور اون خطوط کا جواب بھی نہ لکھا۔ اور حکیم مہدی علی خان جب پہلے نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد مین اور جب دوسری دفعہ محمد علی شاہ بادشاہ کے عہد مین مدار المہام مقرر ہوئے چونکہ وہ جناب جد امجد مغفور کے شاگرد تھے اس نظر سے اون کو اور ہمارے اعمام کی طرف تو کچھ توجہ نہ تھا مگر جناب والد ماجد مغفور سے بہت

حکیم مہدی علی خان کی مدار المہامی مین کمپنی کی سرکار سے مقرر ہونے کا قطعہ جو مرقوم ہوا ہے

محبت اور تپاک کرتے تھے چنانچہ جب والد ماجد فرخ آباد مین دورے کے واسطے تشریف لاتے تھے ایک کوٹھی اپنے مکانات مین سے آپ کی سکونت کے واسطے خالی کردیا کرتے تھے اور مکرر دعوت بھی کرتے تھے کچھ اس مین شبہ نہ تھا کہ اگر آپ اون کی حالت نیابت اور مدار المہامی مین مجھے سپرد کرتے تو خواہ مخواہ کوئی عہدہ معقول مجھے دیتے باوصف میرے اصرار کے آپ کو اسطرف توجہ نہ ہوئی۔ اور نواب روشن الدولہ کی مدار المہامی مین جب سبحان علی خان صاحب کمبوہ کو نہایت مداخلت تھی ایسی کہ گویا وہی مدار المہام تھے تو اوس عرصے مین خان صاحب ممدوح لکھنؤ مین ایک دن آپ کی ملاقات کے واسطے آئے۔ راقم بھی موجود تھا۔ سبحان علی خان نے ازخود بغیر کچھ ادھر کی تحریک کے جناب والد ماجد مغفور سے کہا کہ ان کو بالفعل یہان وطن مین چھوڑ جائیے مین ان کے واسطے کچھ تجویز کرداؤن آپنے انکار کیا اور فرمایا ان کی مفارقت مجھے منظور نہین ہے۔ اوسی عرصے مین جناب چھوٹے چچا صاحب نے ایک عہدہ لکھنؤ مین میرے واسطے تجویز کروایا اور وہ عہدہ میری اپنی غلطی سے نہ ہاتھ آیا۔ یعنی جناب ممدوح نے مجھ سے اوس کے ظہور تک اوس کے اخفا کی تاکید کی تھی۔ اس خیال سے کہ بعضے اور اعزہ اگر سنین گے تو تمھارے اوپر مجھکو اون کی تقدیم کرنا پڑیگی۔ اور جب دفعۃً تمھارا تقرر ہوجائے گا تو اون کی گفتگو کا محل نہ رہے گا۔ یہ امر مین نے آپ کے ایک مشیر کارسے جس کی طرف میرا گمان تھا کہ وہ اوس راز سے واقف ہین اوس کا ذکر کیا حالانکہ آپ نے اون سے بھی مخفی کیا تھا۔ غرض اونھین کی زبان سے شہرہ ہوگیا اور وہ امر بھی واقع نہ ہوا۔ غرض ان سب خیبت رجا سے جو مکرر واقع ہوئین مین نہایت رنجیدہ اور متفکر رہا کرتا تھا مگر جیسا پیشتر ذکر ہوا ہے وہ سب خیبت رجا موجب بہتری کی میرے واسطے ہوئین اس واسطے کہ اون سب امیدواریون مین ڈیڑھ دوسو روپیہ مہینے سے زیادہ کسی مین امید ملنے کی نہ تھی اور اگر کسی ایک عہدے سے اون مین سے مین متعلق

سبحان علی خان کمبوہ کی مداخلت نواب روشن الدولہ کی مدار المہامی مین

ہو جاتا تو ظہور اوس ترقی کا اور فلاح کا جو میرے واسطے ہوئی ہرگز نہ ہوتا۔ الغرض اسی عرصے
راقم کا نقل آگرہ کی گورنری کے دفتر مین جانا اور شیرنی ترقی کا ہونا
مین کہ مین کان پور مین جناب والد ماجد مغفور کے ساتھ تھا آگرے کی گورنری
بنگالے کی گورنری سے یعنی گورنر جنرل سے علیحدہ مقرر ہوئی۔ اور ایک گورنر مع جمیع
دفاتر کے جداگانہ مقرر ہو کے الہ آباد مین آیا اور پہلے مقرر اوس کا وہی الہ آباد مقرر ہوا
اون کے ہمراہ مسٹر مکسوین جو آگرے کے کمشنر تھے اور جناب بھائی صاحب مغفور سے
بہت مواعید ترقی کے کر کے گئے تھے اور اونھین کے ایما سے بھائی صاحب نے
مجھکو آگرے مین طلب کیا تھا اور کوئی امر میرے واسطے ظہور مین نہ آیا سکرٹری ہو کے آئے اس واسطے
جناب بھائی صاحب مغفور نے اکبر آباد سے مجھکو لکھا کہ تم اس عرصے مین الہ آباد مین جاؤ اور
مسٹر مکسوین سے ملاقات کر کے میرے واسطے بھی یاد دہی کرو اور اپنے تقرر کے واسطے بھی
عرض کرو۔ چنانچہ مین نے الہ آباد کے سفر کی جناب والد ماجد مغفور سے اجازت طلب کی
آپ نے بنظر تحریر بھائی صاحب کے نہایت بکرہ اجازت دی۔ غرض مین الہ آباد مین پہنچا
اور بعد دو تین ملاقات کے حاکم ممدوح سے اگرچہ اوس عرصے مین صورت ترقی اور فلاح
کی بھائی صاحب کے واسطے نہین ہوئی مگر مسٹر مکسوین نے راقم کے تئین اپنے دفتر کے فارسی
کے کام کے واسطے منشی مقرر کیا۔ تقریب میرے تقرر کی عجیب و غریب ہوئی۔ دو تین ملاقات
کے بعد جب معلوم ہوا کہ کچھ مطلب اون سے نہین نکلتا تو ایک دن مین اون سے رخصت
ہونے کے واسطے گیا باتون باتون مین مین نے اپنے تعلق کا حال قایم مقامی مین عہدۂ
افتا کے اکبر آباد مین مذکور کیا۔ کچھ انشا دانگریزی جو اوس عرصے مین متعلق میری کارگزاری
کے تھے اوس کی نقل مین نے اپنے ہاتھ سے کی تھی فی الجملہ اوس مین خامی تھی وہ نقول
مین نے اون کے دیکھنے کے واسطے پیش کین۔ اونھون نے وہ دیکھ کے پوچھا یہ کس کے
ہاتھ کی لکھی ہوئی ہین مین نے اپنے ہاتھ سے لکھنا بیان کیا۔ اون کی میز پر ایک
مسودہ دفتر کی ایک چٹھی کا ظاہرا اونھین کا اپنا لکھا ہوا ہو گا رکھا تھا وہ مجھے دیا کہ اس کو

پڑھو چونکہ ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھیون کے پڑھنے کی کچھ مشق مین نے کی تھی مین اوس کو اول سے آخر تک پڑھ گیا۔ کچھ الفاظ نہین معلوم ہوئے وہ اونھین نے خود بتا دیے چونکہ اوس عرصے مین حکام کی نہایت خواہش تھی کہ یہان کے شرفا انگریزی سیکھین۔ اور خصوص اہل اسلام کے بڑے بڑے خاندانون کے لوگون کی نفرت انگریزی سیکھنے سے سب کے دلون مین تھی۔ اسی قدر میری مشق اور توجہ انگریزی مین موجب نہایت اون کی مسرت کا ہوا اوسی وقت مجھے دفتر مین حکم حاضر رہنے کا کیا اور اوس دن کا فارسی کا کام میرے ہاتھ سے لیا پھر گورنر سے استجازت کرکے مجھکو اپنے دفاتر عدالت اور بال مین میر منشی مقرر کیا۔ رپوٹ میرے تقرر کے واسطے جو گورنر کو لکھا تھا اوس کا مضمون یہ تھا۔ ہمارے دفتر مین فارسی کام اتنا کم ہے کہ دس روپیہ مہینے کا ایک متصدی اوس کو انجام کر سکتا ہے لیکن یہ دفتر بہت عالی ہے۔ کم رتبہ آدمی کا یہان رہنا مصلحت نہین ہے اور فلانا شخص جس کو تین پشت سے مین جانتا ہون اگرچہ وہ اوس خاندان کا ہے کہ اطلاق لقب منشی کا اپنے اوپر عار سمجھے گا لیکن اس بڑے دفتر مین خصوص میرے سکریٹری کے سبب سے البتہ وہ قبول کریگا۔ مین چاہتا ہون کہ سو روپیہ ماہیانہ اوس کے واسطے مین مقرر کرکے ان دفاتر مین منشی مقرر کردون گورنر نے منظور کیا اور ۱۸۳۴ء مین راقم اوس عہدے پر مامور ہوا قریب ایک برس کے اوس زمانے سے وہ سب دفاتر مع گورنر وغیرہ الہ آباد مین مقیم رہے اوس کے بعد گورنری آگرہ کی جو پہلے ولایت سے منظور ہوئی تھی اوس کا تقرر پھر موقوف ہوگیا اور حکم ہوا وہان صرف لفٹنٹ گورنر ہندوستان کے گورنر جنرل کی تبعیت مین رہے چنانچہ کچھ ذکر اوس کا تیسرے باب مین ہندوستان کے ذکر مین ہو چکا ہے مگر اوس کے ساتھ یہ حکم ہوا کہ مقر گورنری کا اکبر آباد مقرر ہو اس سبب سے سارے دفاتر اکبر آباد مین منتقل ہوئے اور راقم چند سال بعیت اپنے بڑے بھائی کے بہت آسایش سے رہا اگرچہ بسبب اپنی فضولیون کے اکثر دیر بار رہا مگر مشہور ہے خاک برداری از تودۂ کلان

بہتر ہے اوس عہدے پر دو تین کام بہت عمدہ میرے ہاتھ سے بن پڑے۔ ایک مرتبہ
کان پور کے حکام نے تحریک کی کہ جناب عم والامقام مولوی حکیم الدین خان بہادر مغفور
کی تبدیلی اوس ضلع سے کی جائے صدر کے حکام نے بموجب اون کی تحریک کے تبدیلی
جناب ممدوح کی میرٹھ کے ضلع مین قرار دی اور گورنر کے پاس رپوٹ کی جناب چچا صاحب
وہان کی تبدیلی سے۔ اتنے ناراض تھے کہ مستعد استعفا دینے پر تھے اوس عرصے مین گورنر
مسٹر الگزنڈر راس نام ایک صاحب تھے راقم اون کے پاس گیا اور دو عرضیان ایک چچا
صاحب کی طرف سے اور ایک حضرت والد ماجد کی طرف سے لکھ کے لے گیا چونکہ صاحب
ممدوح بریلی کی عدالت دایر وسایر مین مدت تک رہے تھے اور وہان جناب والد ماجد
مغفور دایر وسایر کے قاضی تھے اس سبب سے اون کو بہت محبت جناب والد ماجد سے
تھی چنانچہ جب راقم کی اطلاع ہوئی مجھے بلالیا اور پوچھا کہان آئے۔ مین نے عرض کیا کہ
ایک ظلم شدید جناب چچا صاحب اور جناب والد ماجد پر ہوا ہے اوس کی دادرسی کے
واسطے حاضر ہوا ہون۔ جواب مین جناب والد ماجد مغفور کا نام لے کے کہا کہ وہ میرے
بڑے دوست ہین ہرگز مین روانہ رکھون گا کہ اون کو کچھ رنج پہونچے۔ جب راقم نے سب کیفیت
بیان کی تب اون کی میز پر ایک بکس کاغذات کا بھرا رکھا تھا اوس کو کھولا اور وہ رپوٹ
جو صدر عدالت سے اس باب مین آیا تھا دیکھا اور دیکھ کے کہا مجھکو دونون صاحبون کی
دیانت اور امانت مین کچھ شبہ نہین ہے لیکن اون مقدمات مین جو ایک محکمہ کا مرافعہ
دوسرے محکمہ مین ہوا البتہ متخاصمین کو محل گفتگو اور اعتراض کا ہوگا کہ بھائی کی خاطر سے
دوسرے بھائی نے اتفاق اون کی تجویز پر کیا اس سبب سے تبدیلی ایک کسی کی ضرور ہے
بعد اوس کے خود کہا۔ مولوی حکیم الدین خانصاحب کا عذر تبدیلی سے بیان کرو مین نے عرض کیا
بسبب قلت تنخواہ کے اور کثرت مصارف جو اس تبدیلی کے سبب سے پڑین گے اوس کے
تحمل نہین ہو سکتے۔ مین نے بیس برس کے قیام مین کان پور مین ایک مکان سکونت کا بنایا تھا

تبدیلی جناب عم والامقام مولوی حکیم الدین خان صاحب مغفور کا بریلی سے میرٹھ ہونا اور راقم کی مدد سے ملتوی رہنا

وہ ضایع ہوگا اور جہان جائین گے وہان مکان بنانا پڑیگا۔ اور یہان سے بسبب قرب وطن کے بہت مصارف مین تخفیف تھی۔ ان عذرات کو قبول نہ کیا پھر خود کہنے لگے کہ اگر تمھارے چچا کی بدلی ہو تو تمھارے والد کو کیا عذر ہے۔ مین نے عذر کیا کہ حضور کو غالبًا معلوم ہے کہ کان پور کے حکام نے پہلے عہدہ صدر الصدوری کا والد کے واسطے تجویز کیا تھا چونکہ اوس مین استحقاق چچا صاحب کا فوت ہوتا تھا اونھون نے قبول نہ کیا اور اون کے تحت چونکہ بڑے بھائی ہین صدر امینی کے قبول کرنے مین انکار نہ ہوا۔ اب اگر چچا صاحب کی بدلی ہوگی تو غیر صدر الصدور کے تحت رہنا ہوگا۔ یہ امر بعد تیس برس سرکار کی نوکری کرنے کے عمدہ عہدون پر منظور نہین ہے مجبوری سے استعفا دین گے فرمایا البتہ عذر تمھارے والد کا قبول کرنے کے قابل ہے لیکن اگر اون کی اپنی تبدیلی بہ ترقی کسی ضلع مین ہو کہ وہ خود کہین کے صدر الصدور مقرر کیے جائین تو کیا عذر ہے۔ مین نے عرض کیا اس صورت مین کیا عذر کی جگہ ہے یہ تو عین آرزو ہے فرمایا خاطر جمع رکھو اسی طرح سے تبدیلی ہوگی اور اوسی وقت اوس رپوٹ پر حکم لکھا کہ بسبب معذرت قابل قبول مولوی علیم الدین خان کے بالفعل تبدیلی مولوی حکیم الدین خان کی مناسب نہین ہے جب کسی ضلع مین صدر الصدوری کا عہدہ خالی ہو تو وہ اوس عہدے پر مقرر کیے جاوین اس جواب کے جانے سے صدر کے حکام خصوص کان پور کے سب حکام بہت متعجب ہوے جب حقیقت حال منکشف ہوئی تو اوس عرصے مین مسٹر کالڈکٹ نام ایک صاحب کان پور کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے اور ظاہر اوہی بہت محرک چچا صاحب کی تبدیلی کے تھے ایک دن چچا صاحب سے کہنے لگے کہ ایک بیٹے قاضی علیم الدین خان صاحب کے بہت معتبر عہدے پر جو آپ لوگون کے بڑے فائدے کا ہے نوکر ہین۔ اس عرصے سے قریب دو برس کے بعد اٹاوہ مین نیا ضلع قرار پایا کہ وہان جج اور صدر الصدور وغیرہ نئے بھرتی کرنے کا حکم ہوا۔ صدر کے حکام نے مولوی ولایت علی خان نام جو فرخ آباد کے رہنے والے اور وہین کے صدر امین تھے

تقرر جناب والد ماجد مغفور اٹاوہ کی صدر الصدوری پر اور انکی تبدیلی

اون کے واسطے رپوٹ کیا کہ وہ اٹاوہ کے صدر الصدور مقرر ہون۔ جب یہ رپوٹ آیا تو راقم نے ایک عرضی جناب والد ماجد مغفور کی طرف سے لکھ کے اور الگزنڈر راس صاحب کا پچھلا حکم جو چچا صاحب کی بدلی کی رپوٹ پر ہوا تھا دفتر سے نکلوا کے ولایت علی خان کے نام کی پوٹ کے ساتھ شامل کروا کے لفٹنٹ گورنر کے بکس مین رکھدی۔ اس عرصے مین مسٹر شکاف آگرہ کی گورنری کی موقوفی کے بعد بلقب لفٹنٹ گورنر معین ہوے تھے اونھون نے سب کاغذات دیکھ کے حکام صدر سے ایک رپوٹ طلب کی اس مضمون کی کہ باوصف الگزنڈر راس کے حکم کے درباب تقرر مولوی علیم الدین خان جو صدر سے تقدیم مولوی ولایت علی خان کی ہوئی تو کیا اون کا استحقاق اور لیاقت اور دیانت مولوی علیم الدین خان سے زیادہ ہے اس استفسار کی کیفیت جو جناب والد ماجد مغفور نے سنی بہت آزردگی کا خط مجھکو لکھا کہ تم نے عبث یہ تحریک کی اگر حکام صدر نے اپنی پچھلی رائے کے بموجب تقدیم مولوے ولایت علی خان کی کی تو نہایت موجب سبکی کا میرے واسطے ہے لیکن چونکہ اوس وقت مین صدر کے حکام بہت پرانے اور فہمیدہ اور منصف تھے اونھون نے جواب مین لکھا کہ کسی طرح سے مولوی علیم الدین خان پر ولایت علی خان کو ترجیح نہین ہوسکتی اور چونکہ اٹاوہ کے ضلع کی تجویز کے وقت مولوی علیم الدین خان کا نام زیر نظر نہ تھا اور فرخ آباد مین قلت مقدمات صدر امینی کی زیر نظر تھی اس واسطے وہ تجویز کی گئی تھی حقیقت مین تقرر مولوی علیم الدین خان کا اٹاوہ کی صدر الصدوری پر چاہیے چنانچہ جناب ممدوح وہان مامور ہوئے اور تیسرا امر راقم کی کوشش کا تقرر جناب مولوی شہاب الدین خان مغفور کا جو بنی عم حضرت والد ماجد کے تھے سہارن پور کی صدر الصدوری پر ہوا۔ اوس کی حقیقت یہ ہے کہ جناب ممدوح اوس ضلع مین مفتی اور صدر امین پچھلے بندوبست کے تھے جب نیا بندوبست پیش ہوا وہان کے جج کی تحریک سے حکام صدر نے تجویز کیا کہ اوس ضلع مین بسبب قلت مقدمات کے نہ حاجت صدر الصدوری کی ہے نہ صدر امینی کی مفتی عدالت عمدہ افتا اور مفتی شہر

مولوی شہاب الدین خان مغفور والد ماجد کے چچا کا تقرر سہارن پور کی صدر الصدوری پر اور انکی تبدیلی

پر مقرر ہون اور اون کا درماہہ بدستور باقی رہے۔ جناب ممدوح نے ایک عرضی اپنے فوت
استحقاق کی گورنر جنرل کے نام پر میرے پاس بھیجی۔ اوس عرصے مین مسٹر طامسن سکرٹری
آگرے کی لفٹنٹی کے تھے جس کا کام بھی لارڈ آکلنڈ گورنر جنرل شملہ کے مقام مین کرتے تھے
مین نے وہ عرضی طامسن صاحب کے پاس پیش کی۔ اونھون نے کہا بڑا افسوس ہے کہ اوس
ضلع مین بسبب قلت مقدمات کے صدر الصدوری اور صدر امینی تجویز نہین ہے۔ مین نے
عرض کیا کہ صدر الصدوری تجویز نہ ہونے سے صرف تین سو روپیہ مہینے کی تخفیف ہوئی اگر
وہان قلت مقدمات ہے صرف وہان ایک صدر الصدور رہے اور ضلع میرٹھ سے متعلق
ہو جائے تو کئی ہزار روپے مہینے کی تخفیف ہوتی ہے چونکہ طامسن صاحب کے مزاج مین بڑی
کنگاہش تھی یہ امر اون کے دل مین جم گیا اوس رپوٹ کے جواب مین حکام صدر کو لکھا گیا
بالفعل وہان صدر الصدور مقرر کیا جاے اور اوس ضلع کے توڑنے کی فکر اور دیوانی کا کام میرٹھ وغیرہ
سے متعلق کرنے کا بندوبست آیندہ ہوگا۔ چنانچہ جب راقم عہدۂ میر منشی پر فارسی دفتر گورنر جنرل کے
مقرر ہوا اور کلکتہ کے جانے کے وقت رخصت ہونے کے واسطے اٹاوے مین جناب الد ماجد
منفور کے پاس گیا آپ نے ارشاد کیا کہ جناب اقدس الٰہی کو اصل تیرا تقرر اسی عہدے پر منظور
تھا اور پہلے اوس سے جو اکبرابادی کی گورنری کے دفتر پر تیری ماموری ہوئی تھی صرف ان
تینون امور عمدہ کے اہتمام کے لیے ہوئی تھی۔ الغرض ۱۸۳۶ء مین جب لارڈ آکلنڈ گورنر جنرل
نے کلکتہ سے ممالک مغربیہ ہندوستان کا سفر کیا اور دستور کے موافق لفٹنٹ گورنر آگرے کے برخاست ہوے وہ کام
بھی گورنر جنرل کے ذمے پر ہوا اور چونکہ وہ جاڑے کے شملہ پر ٹھہرے تو وہان آگرے کی گورنری کے
دفتر بھی طلب کیئے راقم بھی بموجب طلب کے شاہجہان آباد مین لشکر کے شامل ہوا۔ چونکہ
سفر مین دستور ہے مشاہرۂ معینہ ہر شخص کا جو حضر مین ہوتا ہے گورنری کے دفاتر مین
بڑھ جایا کرتا ہے اس سبب سے اور بسبب سیر و سیاحت کے ایک گونہ تنعم حاصل ہوا مگر
کوہستان پر بسبب تنہائی بحث کے کچھ اور اور اور وظایف بڑھ گئے اور اوس کی برکت سے

..... بموجب طلب حضور گورنر جنرل کے لشکر مین

زندمشربی اور آزادی جو طبیعت مین باقتضاے سن شباب تھی وہ جاتی رہی کچھ تقوے زیادہ ہوگیا۔ اور چونکہ جب سے شادی ہوئی تھی دو لڑکے پیدا ہوئے تھے اور وہ کمسنی مین گذر گئے اوس کے بعد میرے گھر کے لوگون کو ایک ایسا عارضہ پیدا ہوا کہ مکرر سقوط حمل ہوا اور اولاد کی طرف سے ایک صورت یاس کی سی ہوگئی تھی وہین کوہستان مین خبر ولادت ایک لڑکی کی آئی کہ غرۂ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ مین وطن مین پیدا ہوئی۔ یہ خبر سن کے راقم نے نہایت گریہ اور زاری سے جناب اقدس الٰہی کے حضور مین دعا اوس کی حیات کی کی جس سے مین گویا مایوس ہوگیا تھا۔ کہ اللہ تعالے نے اوس کی زندگی مین بھی برکت دی اور اوس کی ولادت اتنی مبارک میرے واسطے ہوئی کہ اوس کے روز ولادت کے چوتھے یا پانچوین دن گورنر جنرل کی طرف سے مجھے خطاب خانی اور بہادری کا عطا ہوا اور پھر روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ تھوڑے دنون کے بعد خلعت کارچوبی اور سر پیچ مرصع عطا ہوا۔ اور اوس کی ولادت سے آٹھ مہینے کے بعد عہدہ میر منشی فارسی دفتر گورنر جنرل کا عطا ہوا اور برکت اور اداد اور ادعیۂ ماثورہ سے اوس عرصے مین طبیعت مین نہایت فرحت اور بشاشت رہتی تھی اور مدت سے جو ایک انقباض اور دل بستگی بسبب زیر باری کے تھی اگرچہ وہ زیر باری کچھ عرصے کے بعد رفع ہوئی مگر قبض اور دل بستگی اوسی عرصے سے رفع ہوئی اور نہایت بسط طبیعت حاصل ہونا شروع ہوا جو لا محالہ میرے عقیدے مین برکت سے اوراد اور وظایف کے اور تقوے کے حاصل ہوا۔ غرض حکم میرے خطاب کے چھاپنے کا ککلکتے کے گورنمنٹ گیازٹ مین اور دہلی گیازٹ مین اور آگرہ کے ایک انگریزی اخبار مین جو اوس عرصے مین بنام آگرہ اخبار مشہور تھا اس مضمون سے گیا کہ فلانے شخص کو خطاب خانی اور بہادری کا بنظر حسن کارگزاری اور دیانت اور امانت ذاتی اور حسن خدمت اور قدامت اون کے جد اقصی الاقتضات قاضی نجم الدین علیخان بہادر اور اون کے والد مولوی علیم الدین خان بہادر آنا وے کے صدر الصدور کے گورنر جنرل بہادر نے عطا کیا تاکہ ہر شخص اون کو اس خطاب کے ساتھ یاد

خطاب خانی اور بہادری کا اور گورنر جنرل نے عطا کیا اور اوس تقریب مین خلعت کارچوبی اور سر پیچ مرصع بھی

کرے۔ چنانچہ دہلی گیازٹ کے آٹھوین اگست ۱۸۳۳ء کے پرچے مین اور آگرہ اخبار کے گیارھوین اوسی مہینے کے پرچے مین اور گورمنٹ گیازٹ کلکتہ کے اٹھارھوین اوسی مہینے کے پرچے مین یہ حکم مشتہر کیا گیا۔ ہر شخص کو اس امر سے بہت تعجب تھا کہ اوس زمانے تک روزگار پیشہ لوگون کو کبھی اس نہج سے خطاب نہین ہوا تھا۔ مجھ سے پیشتر روزگار پیشہ لوگون مین صرف دو آدمیون کو یہ خطاب ملا تھا۔ ایک مولوی صاحب علی خان مرحوم کو جو مجھ سے پیشتر میر منشی تھے۔ اور ایک التفات حسین خان لکھنؤ کی رزیڈنسی کے میر منشی کو مگر اون دونون کو صرف سند ملی تھی گیازٹ وغیرہ مین وہ حکم نہین چھاپا گیا تھا۔ سند جو راقم کو ملی اوس مین آدھے صفحہ مین انگریزی اور آدھے مین فارسی عبارت ہے اور فارسی عبارت کے اوپر گورنر جنرل کی بڑی مہر ہے جو خطوط کے لفافون پر ہوتی ہے اور انگریزی عبارت کے نیچے گورنر جنرل کے اپنے ہاتھ کے دستخط ہین۔ اس مقام پر صرف فارسی عبارت کی نقل مناسب معلوم ہوئی

سند نواب مستطاب معلی القاب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ بنام مولوی مسیح الدین خان بہادر منشی دفاتر عدالت و مال علاقۂ ملک مغرب

چون حسن خدمات و قدامت و نیکنامی بزرگان ایشان و نیز امانت و دیانت خود شان بانجام امور متعلقۂ عہدۂ ایشان پسندیدہ خاطر دریا مقاطر آمدہ بنابران درین زمان از راہ مزید عنایت و الطاف خطاب خانی و بہادری مرحمت گردیدہ سند ہذا سمت امضا پذیرفت لازم کہ بیش از بیش بدیانت و امانت مستعد انجام و انصرام امور متعلقۂ خود باشند و این سند را ذریعۂ فخر و اعزاز بین الامثال خود شناسند تحریر فی التاریخ دوم ماہ اگست ۱۸۳۳ء مطابق یازدہم شہر جمادی الاولی ۱۲۵۹ھ مقام شملہ۔ اب اس مقام پر نقل ایک حکایت عجیب کی ضرور ہوئی جو حقیقت مین وہی واقعہ موجب عطاے خطاب کا مجھکو اور فی الجملہ موجب ترقی کا عہدۂ میر منشی پر ہوا اور بعد اوس کے وہی واقعہ بانضمام بعضے اور وقایع کے موجب بدخاست کا

میر منشی کے عہدے سے ہوا۔ چونکہ اس عرصے مین ہنری طارنس نام ایک ارباب قلم مین سے نائب سکریٹری گورنر جنرل کے تھے اور اہتمام فارسی دفتر کا اونھین سے متعلق تھا اور لارڈ آکلنڈ کو ایک شفقت خاص اون پر تھی اور اون کو بہت معتمد رکھتے تھے شملہ مین اونھون نے الف لیلہ ولیلۂ عربی کی مجھ سے پڑھ کے اوس کا انگریزی مین ترجمہ کیا تھا اس سبب سے اون کو ایک توجہ باطنی میری طرف تھی۔ میرے بہت خیر طلب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی عہدے پر میری ترقی ہو۔ اس عرصے مین لکھنؤ کے اخبار سے معلوم ہوا کہ التفات حسین خان میر منشی لکھنؤ کی رزیڈنٹی کے قضا کر گئے۔ ہنری طارنس نے مجھ سے مطلق کچھ نہین کہا اور ایک اپنی خانگی چٹھی مین کرنیل لو کو جو اوس عرصے مین لکھنؤ کے رزیڈنٹ تھے میری سفارش کی لکھ بھیجی اس مضمون سے کہ مین ایک شخص بڑے عالی خاندان اور فاضل مستعد اور باليافت کی تمکو نشان دیتا ہون جو بالفعل گورنر جنرل کے دفاتر مین متعلق ہے اگر تم اپنا میر منشی اونکو کرو تو وضع شے کی اپنے محل پر ہوگی اور مین بھی تمھاری مہربانی کا ممنون ہونگا۔ مین نے التفات حسین خان کے مرنے کی خبر بھی نہین سنی تھی۔ مولوی صاحب علی خان مرحوم جو اوس عرصے مین میر منشی تھے اونھون نے آکے مجھے اس کی اطلاع کی اور چونکہ اوس عرصے مین ہنری طارنس قائم مقام سکرٹری تھے اس سبب سے کہ ولیم جی مگناٹن سکریٹری مستقل چند عرصے کے واسطے ایک اور کام پر گئے تھے اس سبب سے مولوی ممدوح کو یقین کلی میرے تقرر کا اوس عہدے پر تھا اس واسطے اونھون نے آکے مجھے مبارکباد دی۔ مین نے جاکے ہنری طارنس کے پاس نہایت اپنا امتنان ایسے حفظ الغیب کا بیان کیا اور چونکہ اوس عرصے مین وہ منصب بہت باعتبار اور اعزاز خصوص لکھنؤ کے ارباب اقتدار کے قلوب مین تھا۔ اور کرنل لو نے ظاہر اکسی سے کچھ میرے کو الیف بھی بوجھے ہون گے اور شاید وہ کیفیت سفارش ہنری طارنس کی بھی نقل کی ہوگی کہ بعضے وہان کے معتمد لوگون کے خطوط بطور ائتلاف کے اس واقعے کی اطلاع کے واسطے اور حقیقت حال دریافت کرنے کے واسطے

..... رزیڈنٹی کے میر منشی کا انتقال ہونا ..... کے واسطے نامزد ہونا اور سی آئی ای اور دربار کا خلعت اور مرصع کا جیغہ مرحمت ہونا اور مقرر کے جانے سے عذر کرنا

میرے نام پر آئے۔ اور وہان کی کیفیت یہ بھی کہ کرنل لو نے بجرد التفات حسین خان کے
انتقال کے مولوی اعزالدین مرحوم سندیلہ کے رہنے والے کو جو گوالیر مین رزیڈنٹی کے
سررشتی تھے اور وہان سے استعفا دیکے اور پنشن لے کے چلے آئے تھے اوس عہدے پر
مقرر کر دیا تھا۔ کرنل لو نے ہنری طارنس کے خط کا جواب نہ لکھا اور راقم نے خبر تقرر مولوی
اعزالدین مرحوم کی سن کے اون سے جا کے عرض کیا کہ آپ نے غائبانہ میرے حال پر شفقت
کی مگر اپنی شومی بخت کا کیا علاج ہے اوس عہدے پر دوسرا شخص مقرر ہو گیا چونکہ سررشتہ کے موافق
منظوری اوس عہدے کے تقرر کی گورنر جنرل کی طرف سے ہوتی تھی اور ہنری طارنس نوجوان آدمی
بہت زود رنج تھے اونھون نے فرمایا اب تک تقرر نہین ہوا یہان منظوری کے واسطے رپوٹ نہین آیا ہے
اور کرنل لو بہت عاقل ہے ایسے آدمی کو جسکو کبرسنی سے اور ہاتھ مین رعشہ ہو جانے سے جب طاقت لکھنے کی
باقی نہین رہی اوس وقت پنشن ملی ہے ہرگز ایسے عہدے پر مقرر نہین کریگا مطلب اونکا یہ تھا کہ اگر یہان رپوٹ
بھیجین گے تو وہ نامنظور ہوگی چنانچہ اس امر کو نہایت غصہ مین آکے پھر صاف کہا کہ اونکی وجہ نامنظوری کی
تو کھلی ہوئی ہے کسی کے واسطے رپورٹ وہ کرینگے ہرگز منظور نہین ہوگی مجھے کرنل لو چھوکرا سمجھے ہین ہمارے خط کی کچھ
وقعت نہ کی جواب بھی نہین بھیجا۔ اور فوراً گورنر جنرل کے یہان سے مجھے مخاطب خانی
اور بہادری کے خطاب کا کرا دیا تاکہ کرنل لو کے دل مین میری بہت وقعت ہو جاوے
اور ظاہر ہنری طارنس نے یہ تقریر کرنیل لو کی شکایت کی جو مجھ سے کی تھی کسی اپنے دوست
کو لکھنؤ مین بھی لکھ بھیجی تھی یا کوئی افسر لکھنؤ کا بہاڑون پر آیا تھا اوس سے زبانی کہا ہوگا
یہ خبر کرنل لو کو ہو گئی اون کو خوف اپنی رپوٹ کی نامنظوری کا ہوا اس واسطے مگناٹن صاحب
کی معاودت تک اپنے عہدے پر اونھون نے رپوٹ نہ بھیجی جب وہ پھر اپنے عہدے پر
آئے تب رپوٹ بھیجی اور اوس کے ساتھ ہنری طارنس کے خط کا بھی جواب بھیجا اوس مین
نہایت معذرت لکھی کہ چونکہ قبل آپ کے خط پہونچنے کے ہم نے فلانے شخص کو مقرر کیا
اگر اوس کو برخاست کر کے ہم فلانے شخص کو مقرر کرتے تو علے العموم اہل ہند کے دل مین

آتا کہ گورنر جنرل نے ہماری تجویز کو نامنظور کرکے اپنے دفتر سے ایک شخص کو مقرر کرکے بھیجا
اوس مین قطع نظر میری سبکی کے ہندوستانی ریاست مین ایسے امور کے تصور سے احتمال
مفاسد کا بھی تھا۔ اس واسطے آپ کی مہربانی سے امید ہے کہ ہماری رپوٹ کو منظور
کرواپنے اور میرے اوپر احسان کیجیے۔ اور رپوٹ مین لکھا کہ مولوی اعزالدین کو مین نے اس
نظر سے مقرر کیا کہ میرا بہت اعتماد اون پر تھا۔ اور چونکہ گوالیار مین مخالفت آب وہوا سے
وہ مریض ہوگئے تھے اپنے وطن جب آئے تو اون کو صحت ہوگئی۔ لہذا اون کے تقرر سے سرکار
کا نفع ہے کہ اون کی پنشن تخفیف کی مد مین آجائیگی۔ الغرض جب یہ رپوٹ اور ہنری طارنس
کے خط کا جواب آیا تو پھر وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اب رپوٹ نامنظور کرانا بڑی نامردی ہے
خیر آپ کے واسطے انشاء اللہ تعالی کوئی اور فکر لطیف کی جائیگی۔ اور ظاہرا اوسی وقت
سے اپنے دل مین بتصمیم عزیمت کرلی کہ دفتر فارسی کا میر منشی راقم کو مقرر کرے اس واسطے
کہ مگناٹن صاحب کی روانگی کابل کی طرف زیر تجویز تھی اور وہ مولوی صاحب علی خان
مرحوم کو ساتھ لیجانے کے واسطے باہم قرار دے چکے تھے لیکن چونکہ اوس وقت تک یہ
امر کھلا نہ تھا شرح اوس کی نہین کی۔ اس عرصے مین کرنیل لو رخصت لیکے ولایت کو چلے
گئے اور اون کی جگہ پر کرنیل کالفیلڈ نام ایک صاحب مقرر ہوے اور اتفاقات سے مولوی
اعزالدین بھی قضا کرگئے راقم نے جاکے ہنری طارنس سے بیان کیا اور درخواست کی
کہ اب پھر موقع آیا ہے آپ میرے لیے اوس عہدے کے واسطے کوشش فرمائین میرے
نام پر مقرر ہوجائے گا۔ چونکہ صاحب ممدوح اپنے دل مین عزم مصمم میرے تقرر کا دفتر فارسی
مین کرچکے تھے اس امر کی طرف مین نے اون کو کچھ ملتفت نہ پایا مگر مین نے نہایت اصرار
کیا اس سبب سے کہ اپنے وطن مین ایسے معزز عہدے کے حاصل ہونے کو مین ایک
فوز عظیم جانتا تھا۔ اوس وقت اونھون نے فرمایا کہ ہمارا سفارش کرنے کا جی نہین چاہتا
اس واسطے کہ جو ہماری سفارش نہین مانتا ہے تو اوس سے ہم کو عداوت ہوجاتی ہے

مولوی اعزالدین کا انتقال کرنا اور کرنیل کالفیلڈ
کا بجائے کرنیل لو کے مقرر ہونا اور مولوی
صاحب کی درخواست کرنا

لیکن خیر اگر تمھاری مرضی یہی ہے تو گورنر جنرل کے نام پر درخواست لکھو ہم کوشش کرینگے
کہ تم کو بہین سے مقرر کرکے بھیج دیوین - بموجب اون کے ایما کے مین نے گورنر جنرل کو
درخواست دی - اب میرے اوپر یہ امر منکشف ہوا کہ ہنری طارنس جو عزم مصمم میرے
تقرر کا میر منشی کے عہدے پر کر چکے تھے اس سبب سے اونھون نے اوس سعی مین جس کا
وعدہ کیا تھا قصور کیا یا گورنر جنرل نے خود مقرر کرکے بھیجنے مین مصلحت نہ سمجھی - میری
درخواست پر حکم لکھا جو اونھین ہنری طارنس کے خط کے ذریعے سے مجھے ملا کہ گورنر جنرل
کو میری دیانت اور امانت اور لیاقت اور علو خاندان پر یقین حاصل ہے لیکن چونکہ
اس منصب مین جس کے تقرر کی درخواست مین کرتا ہون اول سفارش رزیڈنٹ کی ضرور
ہے اس واسطے مجھے چاہیے کہ مین رزیڈنٹ سے درخواست کرون یقین ہے کہ وہ بنظر
میرے علم اور فضل اور علو خاندان کے ضرور میرے واسطے رپوٹ کرین گے اوس وقت
نہان سے منظوری ہوگی یہ حکم لاہور مین اواسط نومبر ۱۸۳۵ء مین صادر ہوا - لیکن چونکہ راقم نے
ہنری طارنس کو اس امر مین خوب مستعد نہ پایا بلکہ بعضے قراین سے یہ میری درخواست اون کے
خلاف مزاج معلوم ہوئی مین نے صاحب رزیڈنٹ کے پاس تین مہینے تک درخواست
نہ بھیجی - جب اواسط فبروری مین راقم لشکر کے ساتھ شاہجہان آباد مین پہونچا جناب
بھائی صاحب مغفور جو وہان کے صدر امین مقرر ہوئے تھے وہ میرے اس تامل سے
اس درخواست کے بھیجنے مین رزیڈنٹ کے پاس میری رائے کا تخطیہ کیا اور تاکید کی کہ
اب تک چونکہ رپوٹ نہین آیا ہے مضایقہ نہین ہے اب بھی درخواست بھیج دو جب
یہ میری درخواست لکھنؤ مین پہونچی اوس وقت وہ رپوٹ روانہ کر چکے تھے - مجھے ایک
انگریزی خط لکھا کہ اون کو بڑا افسوس ہے میری درخواست کے پہونچنے سے پیشتر وہ رپوٹ روانہ
کر چکے اور رپوٹ بھی حقیقت مین بھیج چکے تھے لیکن اوسمین لکھا تھا کہ ہمارے پاس اس عہدے کے واسطے بہت سی
درخواستین گذری ہین اوس مین سے چھ آدمیون کا نام ہم نے منتخب کیا ہے جن کی درخواستین اس

ریپوٹ کے ساتھ ملفوف ہین۔ ان چھ درخواستون مین ایک درخواست قاضی محفوظ علیخان مرحوم راقم کے عمہ زاد بھائی کی تھی۔ اور ایک درخواست مولوی مجید الدین خان مرحوم راقم کے والد ماجد کے بنی عم بھائی کے بیٹے کی تھی اور چار درخواستین اور تھین۔ غالب ایسا ہے کہ اگر قبل ریپوٹ روانہ ہونے کے میری درخواست پہونچتی تو میری درخواست بھی وہ بھیج دیتے اور ظن غالب قریب بہ یقین ہے کہ گورنر جنرل میری درخواست کو منظور فرماتے۔ اس واسطے کہ اُن چھ درخواستون مین جس کی درخواست کو کرنل کالفیلڈ نے ترجیح دی تھی وہ گورنر جنرل نے نامنظور کی۔ اوس کی نامنظوری کا عجب قصہ ہے جس کو مین بیان کرتا ہون۔ الغرض جب کرنل کالفیلڈ کی چٹھی میرے نام پر جس کا مین نے اوپر ذکر کیا آئی مین اوس چٹھی کو لیکے مسٹر ہنری طارنس کے پاس گیا اونھون نے وہ چٹھی دیکھ کے فرمایا کہ ہان ریپوٹ آئی مگر جس کے واسطے اونھون نے ریپوٹ کی اوس کا تقرر نامنظور ہوا اب یقین ہے کہ وہ تمھارے واسطے ریپوٹ کرین گے۔ مین نے کہا اگر ارشاد کیجیے تو مین پھر ایک درخواست اون کے پاس بھیج دون اونھون نے نہایت تاکید سے منع کیا کہ تم ہرگز اب درخواست نہ بھیجو رزیڈنٹ اہل فوج سے ہے جو نہایت غصہ ور اور تنک مزاج لوگ ہوتے ہین اوس کی سمجھ مین آوے گا کہ نامنظوری اوس کی ریپوٹ کی تمھارے ہی تقرر کے واسطے تھی تو وہ اپنی رزیڈنسی چھوڑ دیگا مگر تمھین ہرگز نہ مقرر کرے گا۔ میری سمجھ مین اس مسٹر ہنری طارنس کی ممانعت کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ بہ نظر اوس جواب کے جو اوس ریپوٹ کا گیا تھا میری عقل مین یہ آیا کہ اگر مین دوسری درخواست نہ بھیجون گا تو کرنل کالفیلڈ سمجھین گے کہ مین مطمئن ہون کہ گورنر جنرل مجھے مقرر کرین گے اور اگر مین دوسری درخواست بھیجون گا تو اون کے ذہن مین یہ آویگا کہ مجھے یقین ہے کہ بغیر اون کے ریپوٹ کرنے کے مین نہین مقرر ہو سکتا۔ الغرض مین نے دوسری درخواست کرنل کالفیلڈ کے نام پر اس مضمون کی لکھ بھیجی کہ آپ کا عنایت نامہ متضمن اس امر کے کہ آپ کو

مرزا رجب علی سرور مرحوم

فسانہ عجائب ۶ جلد
انشائے سرور ۶
امیر مینائی مرحوم
امیر اللغات تا کمل ۴ جلد
صنم خانہ عشق ۶
مراۃ الغیب ۴
محامد خاتم النبیین ۸
مینائے سخن ۴
مکاتیب امیر مینائی ۶
جلال مرحوم
سہرہ بیان اردو ۶
مطبع نہائے دلکش ۴
نظم نگارین ۴
رسالہ تعمیر و ذہانیت ۸
اذانہ تاریخ ۸
قواعد المنتخب ۴
مرزا محمد عباس شوق مرحوم
فسانہ نادر جہان ۴
پیاری سہیلی ۴
دلترسر ۸
ہیمون ۱۲
منشی افضل حسین ثابت
حیات و سیر ۴
دربار حسین ۴

پنڈت رتن ناتھ سرشار

فسانہ آزاد ۴ جلد
سیر کہسار ۴
خدائی فوجدار ۶
جام سرشار ۶
خدمات ۴
قیس و لیلیٰ ۴
مقدس نازنین ۴
ایام عرب ۶
فتح اندلس ۶
ماہ ملک ۶
حسن کا ڈاکو ۴
دربار جرام پور ۱۰
الفانسو ۸
مفتوح فاتح ۴
مٹھی بھر ہری ۶
طلسمانا ۴
طرحدار لونڈی ۴
زوال بغداد ۴
لعبت چین ۴
طلسمی فانوس ۱۲
کیکی کا پھل ۴
جواب حق ۴
بانکے غزی ۴
طاہرہ ۴
شوقین ملکہ ۴
یوسف و زلیخا ۴
گزشتہ کھنو ۶
شاعرانہ و عاشقانہ مضامین ۶
آغاز و ختم جمال ۴
سیر جمال ۴
آبادی بذریعہ جغرافی مضامین ۴
اردو حسن ۴

مرزا احمد بیگ ہوشیار

خانہ آبادی ۴ جلد
فسانہ شاہی ۴
خدائی فوجدار ۶
جام سرشار ۶
خدمات ۴
قیس و لیلیٰ ۴
مقدس نازنین ۴
ایام عرب ۶
فتح اندلس ۶
ماہ ملک ۶
حسن کا ڈاکو ۴
دربار جرام پور ۱۰
الفانسو ۸
مفتوح فاتح ۴
مٹھی بھر ہری ۶
طلسمانا ۴
طرحدار لونڈی ۴
زوال بغداد ۴
لعبت چین ۴
طلسمی فانوس ۱۲
کیکی کا پھل ۴
جواب حق ۴
بانکے غزی ۴
طاہرہ ۴
شوقین ملکہ ۴
یوسف و زلیخا ۴
گزشتہ کھنو ۶
شاعرانہ و عاشقانہ مضامین ۶
آغاز و ختم جمال ۴
سیر جمال ۴
آبادی بذریعہ جغرافی مضامین ۴
اردو حسن ۴

مولینا عبدالحلیم شرر

سقوط اندلس ۴
خواجہ حسین الدین حیات ۴
تذکرہ مشاہیر عالم ۴
خمدات ۴
قیس و لیلیٰ ۴
مقدس نازنین ۴
ایام عرب ۶
فتح اندلس ۶
ماہ ملک ۶
حسن کا ڈاکو ۴
دربار جرام پور ۱۰
الفانسو ۸
مفتوح فاتح ۴
مٹھی بھر ہری ۶
طلسمانا ۴
طرحدار لونڈی ۴
زوال بغداد ۴
لعبت چین ۴
طلسمی فانوس ۱۲
کیکی کا پھل ۴
جواب حق ۴
بانکے غزی ۴
طاہرہ ۴
شوقین ملکہ ۴
یوسف و زلیخا ۴
گزشتہ کھنو ۶
شاعرانہ و عاشقانہ مضامین ۶
آغاز و ختم جمال ۴
سیر جمال ۴
آبادی بذریعہ جغرافی مضامین ۴
اردو حسن ۴

حکیم محمد علیخان مرحوم

رام پیاری کامل ۴
عبرت کامل ۴
حسن سرور کامل ۴
اختر حسینہ ۴
ڈیول دیوی ۴
جعفر و عباسہ ۱۲

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق ۴
قاسم و زہرہ ۱۲
نیرنگ جمال ۴
کنجینہ ۱۲
میکفرن اور لوی ۱۲

خواجہ عبدالرؤف عشرت

زبان دانی ۶
اصلاح زبان اردو ۶
قواعد میر ۶
اصول اردو ۶
جہان اردو ۶
شاعری کی پہلی کتاب ۴
دوسری کتاب ۴
تیسری کتاب ۴
نغمات اردو ۴

منشی محمد حسن وحشی

محبوس گشت ۴
جامہ ہر ۴

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

یاد ایام ۴
تذکرہ علمائے ہند ۴
خلافت راشدہ ۶
خلافت نبوانیہ ۴
خلافت بنو عباس ۶
عباسیہ بنداد ۶
طلوع عرب ۴
" دوم ۶
" سوم ۶
" چہارم ۶
" پنجم ۶
" ششم ۶
" ہفتم ۶
" ہشتم ۶
" نہم ۶
" دہم ۶
" یازدہم ۶
تاریخ مولدین ۶
مختصر تاریخ اسلامی ۱۲
غدار ۱۲

مولوی خلیل الرحمن

اخبار الاندلس جلد ۴
سیرۃ الرسول ۴
خلافت بنو امیہ ۴
تاریخ ابن خلدون جلد اول ۶
تاریخ ابن خلدون جلد دوم ۶
تاریخ عرب ۴
تاریخ مراکش و مراکش قضی ۶

مولوی محمد اشتیاق اثر

سیرۃ الرسول ۴
تاریخ آل عثمان ۱۲
خلافت شرق و غرب ۶
خلافت قسطنطنیہ ۴
تاریخ مراکش ۴

حافظ اکرم جیراجپوری

سیرۃ المصطفیٰ ۴
تاریخ اسلام ۴
تاریخ ہند ۴
تاریخ عرب ۴
تاریخ مصر ۴
تاریخ ایران ۴
تاریخ یورپ ۴
تاریخ روم ۴
تاریخ یونان ۴
تاریخ فارس ۴
تاریخ ترکستان ۴
تاریخ چین ۴
تاریخ جاپان ۴
تاریخ امریکہ ۴
تاریخ افریقہ ۴
تاریخ آسٹریلیا ۴
تاریخ انگلستان ۴
تاریخ فرانس ۴
تاریخ جرمنی ۴
تاریخ اٹلی ۴
تاریخ اسپین ۴
تاریخ پرتگال ۴
تاریخ ہالینڈ ۴
تاریخ بلجیم ۴
تاریخ سوئٹزرلینڈ ۴
تاریخ سویڈن ۴
تاریخ ناروے ۴
تاریخ ڈنمارک ۴
تاریخ روس ۴
تاریخ پولینڈ ۴
تاریخ ہنگری ۴
تاریخ بوہیمیا ۴
تاریخ سرویا ۴
تاریخ بلغاریا ۴
تاریخ رومانیا ۴
تاریخ یونان ۴
تاریخ البانیا ۴
تاریخ مونٹی نیگرو ۴
تاریخ بوسنیا ۴
تاریخ ہرزیگووینا ۴
تاریخ کریٹ ۴
تاریخ سائپرس ۴
تاریخ مالٹا ۴
تاریخ جبرالٹر ۴
تاریخ ہندوستان ۴
تاریخ ایران ۴
تاریخ افغانستان ۴
تاریخ بلوچستان ۴
تاریخ نیپال ۴
تاریخ تبت ۴
تاریخ چین ۴
تاریخ جاپان ۴
تاریخ کوریا ۴
تاریخ سیام ۴
تاریخ برما ۴
تاریخ ملایا ۴
تاریخ جاوا ۴
تاریخ سماٹرا ۴
تاریخ بورنیو ۴
تاریخ سلیبس ۴
تاریخ فلپائن ۴
تاریخ آسٹریلیا ۴
تاریخ نیوزی لینڈ ۴
تاریخ امریکہ ۴
تاریخ کینیڈا ۴
تاریخ میکسیکو ۴
تاریخ برازیل ۴
تاریخ ارجنٹائن ۴
تاریخ چلی ۴
تاریخ پیرو ۴
تاریخ بولیویا ۴
تاریخ ایکواڈور ۴
تاریخ کولمبیا ۴
تاریخ وینزویلا ۴
تاریخ گیانا ۴
تاریخ سورینام ۴
تاریخ پیراگوئے ۴
تاریخ یوراگوئے ۴
تاریخ افریقہ ۴
تاریخ مصر ۴
تاریخ ابی سینیا ۴
تاریخ لائبیریا ۴
تاریخ ٹرانسوال ۴
تاریخ ٹرانسوال ۴
تاریخ ٹرانسوال

مولوی عزیز مرزا صاحب

خیالات عزیز ۱۲ر
ذکر یار ۱۲ر

خواجہ عبادالدین اختر

صدیق اکبر ۱۲ر
حضرت زید ۶ر
مشاہیر اسلام ۱۲ر
بغداد ۱۲ر
دمشق ۱۲ر
دیوان حافظ مع شرح جدید

مفتی انوارالحق صاحب ایم اے

تاریخ ابوالبشر ۱۲ر
مذہبی کتاب ۱۲ر
حقایق اسلام ۱۲ر

میر دلی اللہ بی اے

بندگی ۱۲ر
کاس الکرام ۱۲ر
انسان الغیب جلد اول ۱۲ر
" " دوم ۱۲ر
" " سوم ۱۲ر
" " چہارم ۱۲ر

سید سعود بی اے

انصاب زرد ۱۲ر
جاپان کا تعلیمی نظم ۱۲ر
انتخاب زرین ۱۲ر

مولانا احسن مہانی

شرح دیوان غالب ۱۲ر
مکمل دیوان حسرت ۱۲ر

سید سجاد حیدر بی اے

خیالستان ۱۲ر
حکایات و احساسات ۱۲ر
زہرا ۱۲ر
جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
تصوف اسلام ۱۲ر
فلسفیانہ مضامین ۱۲ر
زود پشیمان ۸ر

مسٹر ظفر عمر علی بی اے

جوون کا کلب ۹ر
نیلی چھتری ۱۲ر
بہرام کی گرفتاری ۱۲ر
مستقبل اسلام ۱۲ر

پروفیسر فیروز الدین ایم اے

لارڈ کلایو ۱۲ر

پروفیسر نور الہی ایم اے

مصباح الدین ۱۲ر
تذکرۃ المصطفے ۱۲ر
صحت سماوی ۱۲ر
شمع عجم ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

مبادی علم انسانی ۱۲ر
برکلے کا فلسفہ ۱۲ر

حکیم محمد اشتیاق بی اے

باپ کا گناہ ۱۲ر
حسن کی حقیقت ۱۲ر

منشی عبدالمجید مالک بی اے

مصارف علم ۱۲ر
مناظر قدرت ۱۲ر
علم الصحت ۱۲ر

منشی حدعلی بی اے

تاریخ تمدن ۱۲ر
شباب کھنو ۱۲ر

مولوی عبدالماجد بی اے

فلسفہ جذبات ۱۲ر
مکالمات برکلے ۱۲ر
پیام امن ۱۲ر
تصوف اسلام ۱۲ر

منشی محمد لطیف بی اے

اکبر ۱۲ر
اورنگ زیب ۱۲ر
رنکبیت سنگھ ۱۲ر
لارڈ کلایو ۱۲ر

مولوی عبدالباری ندوی

مبادی علم انسانی ۱۲ر
برکلے کا فلسفہ ۱۲ر

مولوی سید صباح الدین

سیر الصحابہ جلد اول ۱۲ر
سیر الصحابہ جلد دوم ۱۲ر
سیر الصحابیات ۱۲ر

مولوی عبدالرزاق ندوی

اسوۂ حسنہ ۱۲ر
کتاب الوسیلہ ۱۲ر
مکی کی مادر لیریہ ۱۲ر

مولوی سلیمان ندوی

ارض القرآن ۱۲ر
سیرۃ عائشہ ۱۲ر
حیات امام مالک ۱۲ر
خلافت عثمانیہ و اسلام ۱۲ر
فاطمی عورت اسلام ۱۲ر
ذکر غوث پاک ۱۲ر
خلافت اور ہندستان ۱۲ر

مولوی عبدالسلام ندوی

شاہی جہاز ۱۲ر
سیاہۂ دل ۱۲ر
مکتوبات ۱۲ر
چکنان اور نگ گدایان ۱۲ر
انالیق خطوط نویسی ۱۲ر

خواجہ حسن نظامی

قرآن آسان قاعدہ ۱۲ر
میلاد نامہ ۱۲ر
محرم نامہ ۱۲ر
شب زندگی ۱۲ر
ذکر غوث پاک ۱۲ر
کرشن جوگن ۱۲ر
شاہی جہاز ۱۲ر
سیاہۂ دل ۱۲ر
مکتوبات ۱۲ر
چکنان اور نگ گدایان ۱۲ر
انالیق خطوط نویسی ۱۲ر
روزہ ناچہ ۱۲ر
بیوی کی تعلیم ۱۲ر
بیوی کی تربیت ۱۲ر
اولاد کی شادی ۱۲ر
جگ بیتی کہانیاں ۱۰ر
آپ بیتی ۱۲ر
پھولوں کی کہانیاں ۱۲ر
سیر دہلی ۱۲ر
سفرنامۂ ملایہ ۱۲ر
عذر دہلی کے افسانے ۱۲ر
یزید نامہ ۱۲ر
طمانچہ بر رخسار یزید ۱۲ر
اربعہ دو عائین ۸ر
تسکین احساس ۸ر
روزنامچہ ہند ۱۲ر
اسلام کا انجام ۶ر
تسخیر مہر و قہر ۱۰ر

مولوی عبدالرشاد الخیری

الزہرا ۱۲ر
صبح زندگی ۱۲ر
شام زندگی ۱۲ر
شب زندگی ۱۲ر
نور و نار زندگی ۱۲ر
در شہوار ۱۰ر
منازل السائرہ ۱۲ر
سراب مغرب ۸ر
بنت الوقت ۸ر
قطرات اشک ۱۲ر
جوہر غلامی ۱۲ر
عروس کربلا ۱۲ر
یاسمین شام ۱۲ر
تیغ کمال ۱۲ر
ماہ عجم ۱۲ر
محمد بن خداوند ۱۲ر
سودرہ ۸ر

نیاز فتح پوری

گلستان جلی ۱۲ر
چند بات بہاشا ۱۲ر
نگارستان ۱۲ر
صحابیات ۱۲ر
تاریخ الدولتین ۱۲ر

یاس عظیم آبادی

چراغ سحر ۱۲ر
نشتر یاس ۸ر

تاریخ اندلس یعنی مورخوں کے استقلال مسلمانوں کی ترقی اور انگریزوں کی حکومت کا آئینہ از خانی خان ۱۲ر

ملنے کا پتہ - المناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ۴۷۰ لے ہوالستان

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ ۱۲ر

قیمت فی پرچہ ۱ر

محصول معاف

عشہ کی روانگی پر آدھا

اور

عشہ کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

ہدیتہً بھیجیے

عشہ کی روانگی پر ناظر ایک سا

اور

تمام کی روانگی پر عشہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم		مولانا آزاد مرحوم		مولانا نذیر احمد مرحوم		مولانا حالی مرحوم		مولانا شبلی مرحوم		مولانا ذکاء اللہ مرحوم	
اُردوئے معلی	عہ	آب حیات	ست	مسائل شریعت ترجمہ	عہ	یادگار غالب	ے	سیرۃ النبی جلد اول	عہ	تاریخ ہندوستان جلد	
عود ہندی	۸ر دو حصہ	دربار اکبری	عہ	الحقوق والفرائض	ے	حیات سعدی	عہ	جلد دوم	ے	تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ	
دیوان غالب بجی	ے	سخندان فارس	ے	بنات النعش	۹	مقدمہ شعر و شاعری	عہ	سوم	عہ دو عہ	آزاد زن	
اکمل دیوان غالب	صہ	نگارستان فارس	ے	مراۃ العروس	۱۲	حیات جاوید	للعہ	الفاروق	صہ دو عہ	آئین قیصری	
		نیرنگ خیال	عہ	توبۃ النصوح	۱۰	دیوان حالی	عہ	سیرۃ النعمان	عہ	صحیفہ فطرت	
سرسید مرحوم		سیر ایران	عہ	موعظہ حسنہ	۴	مسدس حالی	۸ر دو	الفاروق	عہ	تعلیم الانتظام	
خطبات احمدیہ	عہ	ذوالقرنین اکبر	عہ	رویائے صادقہ	۴	مجموعہ نظم حالی	۴	الماموں	عہ	محاربات عظیم	
اکمل مجموعہ کچہری	للعہ	مجموعہ مکتوبات آزاد	۴	ایامیٰ	۴	بیوہ کی مناجات	۲	سوانح مولانا روم	۶	جغرافیہ ریاضیہ	
اسباب بغاوت ہند	۸ر	مجموعہ نظم آزاد	۸	فسانہ بتلا	عہ	شکوۂ ہند	۲	سفرنامہ مصر و روم و شام	۶	جغرافیہ طبعی	
سیرت فریدیہ	۱	نصیحت کا کرنجوں	۸	ابن الوقت	عہ					اہل عرب کا جہو مقابلہ	
خطوط سرسید	۶	جانورستان	۱۰	مصائب غدر	۴	مولوی شہاب الدین احمد				علم الکلام	۶
		بیاض آزاد	عہ	مجموعہ نظم بے نظیر	۴	واقعات دارالحکومت دہلی	عہ			الکلام	۶
خواب محسن الملک مرحوم		تذکرہ علماء	۵	اکمل مجموعہ کچہری	۲ جلد عہ	تاریخ بیتاپور	عہ			رسائل شبلی	عہ
		لغت آزاد	عہ	منتخب الحکایات	۶	حرز اطفال	عہ			مقالات شبلی	عہ
مضامین سید الاخلاق	للعہ	دیوان ذوق مرتبہ آزاد	۴	چند پند	۶	نشاط عمر	۴	شعر العجم جلد اول	ے		
اکمل مجموعہ کچہری	للعہ			ملاے الحکمہ	عہ	عصاے پیری	عہ			سید محمود مرحوم	
تقلید و عمل بالحدیث	۱۲					لخت جگر	۴				
کتاب الحجج الشرق	۱۲			مولانا شہری مرحوم		حسن معاشرت	۴			کتاب الطلاق	۶
مکاتیب	عہ			حیات امیر	۶	اصلاح عیشت	عہ			کتاب الشفعہ	۶
مسلمانوں کی تہذیب	۱۰			خیالات شہاب	عہ	اقبال و زمن	عہ				
				الیشیائی شاعری	عہ	شمع ہدایت	۸			مولوی رشید احمد صاحب	
خلیفہ محمد حسین مرحوم		مولوی سید ممتاز علی		پور رحمان حکیم	۸	انشاے بشیر	عہ			مضامین عالمگیر	عہ
				میسو سلطان	عہ	دیوان بشیر	۴			آغاز اسلام	۸
اعجاز القرآن	للعہ	تذکرۃ الانبیا	عہ	حیدر علی سلطان	عہ			مجموعہ کلام شبلی اردو	۱۲	امدیہ والاسلام	
سفرنامہ بصرہ جلد	للعہ	شیخ حسن	۱۲					کلیات شبلی فارسی	عہ	تحریر المراۃ	

لکھنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

نمبر ۳ — جلد ۳۴

فہرست مضامین بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

ادب اردو کی تاریخ	مرزا محمد عسکری بی اے	۱
الکحل اور شریعت اسلامیہ	مسٹر علی محمد عبد القوی متعلم کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور	۳۰
غزل	منشی سراج الدین احمد بہجور	۳۵
[illegible] کے دو ترانے (نظم)	مولانا حسن مرتضیٰ شفق رضوی عماد پوری	۳۶
[illegible] ڈبلو رینالڈس	ڈاکٹر محمد اعظم کریوی	۳۷
سفارتنامۂ اندلس (۲) ریویو	مولوی محمد خلیل الرحمن مولف اخبار الاندلس	۴۵
[illegible] کل کیا ہوگا؟ (نظم)	حکیم افتخار علی جگر صدیقی ہسوانی	۵۴
[illegible] فہرست کتبخانۂ اندیا آفس	مسٹر سید حسن بی اے (لنک)	۵۶
جام سفال	مسٹر مشیر احمد علوی قادری بی اے (علیگ)	۵۸
نظر خوش گزرے		۵۹
[illegible]	خود نوشت مولوی سمیع الدین خاں بہادر مرحوم	۸۱ تا ۹۶

اب بی اے کے لئے اردو کا پرچہ بھی ضروری ہو گیا ہے

کیونکہ اس کے لئے معقول اور نگارکا سالانہ چندہ صرف [illegible] ہے

موجودہ [illegible] کو ترقی دینے کا ذمہ [illegible]

رسالہ کعبہ

جو اپریل ۱۹۲۸ء [illegible] آب و تاب کے ساتھ علیحدہ [illegible] خلف الرشید سید [illegible] ایڈیٹر مدینہ کے زیر اہتمام نکلنے والا ہے اور اردو زبان میں صنعت و حرفت کا واحد تنہا رسالہ ہوگا جو اردو زبان کی [illegible] کے ساتھ ساتھ [illegible] کی بھی [illegible] کرے گا اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو [illegible] کے سامنے پیش کرے گا اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو [illegible] کے [illegible] کے [illegible] کے

نئی کتابیں

تاریخ فقہ اسلامی ۔ علامہ محمد الخضری کی کتاب التشریع الاسلامی کا ترجمہ ۔ از مولانا عبدالسلام ندوی
جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بتفصیل بیان کی گئی ہیں حجم ۳۰ جزو ۔ قیمت للہ ر

شامہ ۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی اے رکن انجمن خادمان ہند کا دلچسپ ناول، جس پر الناظر کے گزشتہ نمبر میں مولوی عبدالماجد صاحب کا ریویو شایع کیا گیا تھا ۔ قیمت ۱؎

وکلائے مرافعہ ۔ اس فارسی ڈرامہ کا مقدمہ جو الناظر میں شایع ہو چکا ہے ۔ اصل ڈرامہ ترکی زبان میں لکھا گیا تھا ۔ یہ فارسی ترجمہ ہے ۔ جسے مولوی محمد مسلم عظیم آبادی ایم اے ایم او ایل نے مرتب کیا ہے ۔ قیمت ۱؎

صبح پیری کا ستارہ ۔ حضرت شفق عماد پوری کی پچاس رباعیوں کا مجموعہ ۔ سب رباعیاں پیری کے متعلق کہی گئی ہیں ۔ ہر رباعی ایک صفحہ پر چھپی ہے ۔ قیمت ۶ر

دل سی پارہ ۔ حضرت شفق کی تیس رباعیوں کا مجموعہ ۔ سب رباعیاں دل کے متعلق کہی گئی ہیں ۔ ہر رباعی ایک صفحہ پر چھپی ہے ۔ قیمت ۴ر

لمعات اختر ۔ الناظر کے پرانے قلمی معاون حضرت اختر جوناگڑھی کی نظموں کا مجموعہ جن میں سے بعض الناظر میں اور بقیہ دوسرے رسائل میں چھپی ہیں ۔ قیمت ۸ر

خیالات اروِنگ ۔ امریکہ کے مشہور مورخ واشنگٹن اروِنگ کے بعض دلچسپ اور مفید مضامین کا ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل ۔ قیمت ۸ر

تنقیدی مقالات ۔ مولوی سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے مصنف روح تنقید کے دو مضامین جن میں اُن اصولوں کے ماتحت مختلف اساتذہ کے نثر و نظم پر تنقید لکھی گئی ہے ۔ جو اُس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں ۔ قیمت ۴؎

اُردو کے اسالیب بیان ۔ نثر اُردو پر مصنف روح تنقید کا دلچسپ تبصرہ ۔ قیمت ۱؎

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب ۔ عہد محمود غزنوی کے شعرا کے حالات، اُنکے ادبی کارنامے اور محمود کے معاصر حکمرانوں کی ادبی دلچسپیوں کی تفصیل ۔ مصنفہ روح تنقید کے قلم سے ۔ قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۳ جلد ۳۴ مارچ ۱۹۲۸ء

ادبِ اُردو کی تاریخ

نومبر ۲۷ء کے الناظر میں مسٹر رام بابو سکسینہ کی جس انگریزی تالیف کا ذکر کیا گیا تھا اُسکا اُردو ترجمہ کرمی جناب مرزا محمد عسکری صاحب کر رہے ہیں اور نصف کے قریب کتاب چھپ بھی گئی ہے۔ اُردو ترجمہ کا ایک دلچسپ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے، جس کے مطالعہ سے لائق مصنف کی محنت و جانفشانی کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ امید ہے کہ سال رواں کے اندر اندر اُردو ترجمہ شائع ہو جائے گا اور اُردو داں طبقہ میں بہت جلد حسن قبول حاصل کریگا۔

ایڈیٹر

باب ۱۲ - طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ:

دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج

دلی کا ادبی سرنو پھر عروج ہوا۔ صفحاتِ گزشتہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُردو شاعری کا مرکز ترقی دلی سے لکھنؤ منتقل ہو آگیا تھا۔ لیکن قدماء کی تخم ریزی بیکار نہیں گئی، اُنکی کوششیں سرسبز ہوئیں، اور وہ درخت جسکو دلی کے قدیم شاعروں نے بڑی کد و کاوش سے بویا تھا، اب وہ نئے سرے سے پھلنا شروع ہوا۔ دنیا میں مد و جزر، ترقی و تنزل، اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے، یہی دلی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے عرصے کی خاموشی کے بعد شاعری دلی

کی بلبل ہزار داستاں نے پھر نغمہ سرائی شروع کی، اور تمام اُردو داں پبلک کو اپنی خوشنوائیوں کا گرویدہ بنالیا۔ غالب، ظفر، ذوق، مومن وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعرا ہیں۔ غالب کی خدا داد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دُنیا کے بہترین شعرا سے کیا جا سکتا ہے۔ ذوق و مومن گو کہ غالب کے مقابلے میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ ظفر بھی کوئی معمولی درجے کے شاعر نہ تھے، اور چونکہ مشاغل حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے شعر کے مشغلے سے دل بہلاتے رہتے تھے، وہ ذوق و غالب کے شاگرد تھے۔ اُس زمانے کے شعرا دہلی جدید طرز لکھنؤ کے بالکل متبع نہ تھے، جہاں تصنع، تکلف اور رعایتِ لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مملو ہے۔ غالب اور مومن کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں، اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زباندان اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدما کی سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر انکی جگہ فارسی الفاظ رکھ دیے ہیں۔ اس زمانے کا اُن کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہندی لفظ اور محاورے یہ اُسی وقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا حُسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبۂ فارسی میں ایک معتدبہ کمی واقع ہوئی، جملوں کی ترکیبیں سہل ہوگئیں، شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی، اسی وجہ سے غالب و مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے۔ مثال کے لیے حالی، سالک، ظہیر، انور اور مجروح کے کلام کو دیکھنا چاہیے۔

مومن۔ ۱۲۱۵ھ وفات ۱۲۶۸ھ
مطابق ۱۸۰۰ء وفات ۱۸۵۱ء

حکیم مومن خاں، حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ انکے دادا حکیم نامدار خاں جنکی اصل نجابت کشمیر سے تھی، سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں آکر شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ اور شاہ عالم کے زمانے میں چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی تو انکی پنشن مقرر ہوگئی، جسکا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے کی استعداد ان میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا، جو بات سنتے تھے، فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ عربی، فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فنِ طب جو انکا موروثی پیشہ تھا، اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی انھوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا بلکہ بہم پہونچایا تھا، کہ اُنکے احکام (پیشن گوئیاں) سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ اکثر احکام کے صحیح ہونے

کے سبب سے لوگ اُنکے بہت معتقد تھے، اور اکثر آیندہ کی باتیں اُن سے دریافت کیا کرتے تھے۔ شطرنج سے بھی اُنکو کمال مناسبت تھی۔ اور دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے۔ مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو اُنھوں نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ عشقبازی کے لیے دلی ایسا وسیع شہر پایا تھا، جہاں اُنکے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زبان زد تھے۔ جب جوانی کی ہوسناکی ختم ہوگئی تو اُنھوں نے تمام بری باتوں سے توبہ کرلی تھی، اور نماز و روزے کے سختی سے پابند ہوگئے تھے۔ جو کلام اُنکی جوانی اور آزادہ روی کے زمانے کا ہے وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھلاتے تھے، مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی۔ اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پر کمربستہ رکھتے تھے۔ دلّی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور ہر مرتبہ سہسوان، جہانگیر آباد، اور سہارنپور کی سیر کی۔ چنانچہ کہتے ہیں

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا شوق ۔۔۔ ویرانہ چھوڑ، آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

چھوڑ دلّی کو سہسواں آیا ۔۔۔ ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بُلا لیا۔ جب مرزا غالب نے ۱۸۴۲ء میں دلّی کالج کی پرشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا، تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بشاہرۂ اسّی روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں، مومن خاں کو دینا چاہی، مگر اُنھوں نے باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپورتھلہ بھی بشاہرۂ تین سو پچاس نہ گئے، کیونکہ سُن لیا تھا کہ وہاں ایک گویّے کی یہی تنخواہ ہے۔ نواب وزیر الدولہ بہادر والیِ ٹونک نے ایک مرتبہ اُنکو بُلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا، مگر اُنھوں اس بنا پر انکار کردیا کہ ٹونک میں دلّی کی پُرلطف صحبتیں کہاں میسر ہونگی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج، قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی دربارداری اور خوشامد سے اُنکو سخت نفرت اور عار تھا۔ یہی اُنکے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ ان کا دیوان اُمرا کے مدحیّہ قصائد سے خالی ہے، سوائے اُس قصیدہ کے، جسکا مطلع ہے:-

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دُود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

یہ قصیدہ بطور اظہار شکریہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں لکھا تھا، جنھوں نے انکو ایک متعینی بطور تحفے کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا ملکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اسکے مقابلے میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مشہور ہے کہ گلستانِ سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے۔ جب سعدی کی نسبت اُنکا ایسا خیال تھا، تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرے میں لاتے۔ اُنکے کلام کو نگاہِ حقارت سے دیکھتے اور اُنکا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ تاریخ گوئی میں اُنکو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخرجہ اور تعمیہ بُرا سمجھا جاتا ہے، مگر انکی طبع رسا نے اِسکو محسنات میں داخل کر دیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقے سے نکالتے تھے۔ مثلاً اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات کہی :-

خاک بر فرقِ دولتِ دُنیا می فشاندم خزانہ بر سرِ خاک

اس میں "خزانہ" کے اعداد بر سرِ خاک یعنی ۲۶۳ کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ نکلتے ہیں۔ ایک بیٹی کی ولادت کی تاریخ اس طرح کہی :-

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دخترِ مومن

"دخترِ مومن" کے اعداد سے "نال" کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقے سے نکالی ہے :

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے فقر و دیں، فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اس میں دوسرے مصرعے کے الفاظ کے صرف پہلے حروف سے مادّہ تاریخ ۱۲۳۹ھ نکالا ہے۔

تصانیف تصانیف میں ایک دیوان جسمیں چھ مثنویاں شامل ہیں، یادگار چھوڑا۔ دیوان میں جمیع اصناف سخن جو شعرائے اُردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان کی ترتیب اُنکے مشہور شاگرد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے کی تھی، اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب مولفِ تذکرہ شعرائے ہند نے اُسکو شایع کیا۔

رنگِ کلام مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے۔ اُنکی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اُس میں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز اُنکو طرزِ لکھنؤ سے علٰحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ اُستادِ کامل ہیں۔ اُنکی علمی لیاقت اور طباعی اُنکو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں۔ کیونکہ فارسی میں اُنکو بھی وہی تبحر حاصل تھا۔ بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی، اور کلام کو سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ اُنکی مثنویاں سرتیز نشتر ہیں۔ جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوزِ محبت

کا اظہار ہے - وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں، اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ اُن میں یہ کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرز ادا بلند نہیں ہے - اس معنی میں وہ طلسم الفت اور زہر عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جا سکتی ہیں - مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے - اور اسی لفظی پیچ پیچ سے تخیل کے نئے راستے کھلجاتے ہیں - مثلاً چند شعر درج ہیں :-

روز جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پس شکستنِ خمِ زجرِ محتسب معقول — گناہگار نے سمجھا گناہگار رہے مجھے
نقد جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف — خونِ فرہاد بسرِ گردنِ فرہاد رہا
کیوں عشق ہوے دیکھ آئینے کو — کہنے تھے کہ تاب لائیں گے ہم
آئینہ زنگِ غم نے توڑا — کیونکر اُسے مُنہ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ بحیثیتِ شاعر مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں - نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے، بلکہ اس لیے کہ اُنکے معاصرین اُنکی بڑی قدر کرتے تھے، بلکہ اسی وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جنکے پیرو نسیم دہلوی منشی امیر اللہ تسلیم حسرت موہانی وغیرہ ایسے نامور آدمی لوگ ہیں - مومن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں : نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب دیوان و تذکرہ گلشن بے خار، میر حسین تسکین، میر غلام علی وحشت، اصغر علیخاں نسیم وغیرہ - مومن کا انتقال ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا - انھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے، یا پانچ برس میں مرجاؤں گا - چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے - گرنے کی تاریخ خود کہی تھی - وست و بازو بشکست - چونکہ اُسی سال انتقال ہو گیا تھا، لہذا یہی تاریخ انکے مرنے کی سمجھنا چاہیے -

شیفتہ - ۱۲۲۱ھ تا ۱۲۸۶ھ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خاں، جنھوں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے تھے، اور اُسکے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا، علاقہ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب مصطفےٰ خاں صاحب نے خرید کیا - جو اب تک اُنکی اولاد کے قبضے میں ہے - نواب صاحب موصوف کی ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء میں دہلی میں ہوئی - اور غدر ۱۸۵۷ء تک وہیں قیام رہا - اسکے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوے - نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی - پُر گو شاعر تھے - فارسی میں حسرتی اور اُردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے - مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اُردو

میں مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شاید واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے ہوں اور انکے بعد غالب سے جو اُنکے بہت بڑے دوست تھے، رجوع کی ہو۔ شیفتہ کی قابلیت کا نشو و نما علم و فضل اور شعر و سخن کے جھگڑے میں ہوا۔ جس میں مولوی امام بخش صہبائی، عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، غالب، ذوق، شاہ نصیر، احسان، تسکین، حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے۔ مفتی صدرالدین خاں اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے شاعرہ ہوتا تھا۔ اہل کمال اُس میں جمع ہو کر لطف سخن اُٹھاتے تھے۔ نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے، کہتا ہے

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
نوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ اُنکی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

غالب ز حسرتی چہ سرایم کہ در غزل — چوں او تلاش معنی و مضمون نکردہ کس

نواب صاحب کو سفر حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی تھی۔ کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے، زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے، اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ تصانیف میں ایک فارسی دیوان، ایک اُردو دیوان، ایک مجموعۂ انشائے فارسی، جو فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سفرنامہ موسوم بہ ترغیب السالک، الی احسن المسالک، جسکا فارسی نام رہ آورد ہے، اور ایک مبسوط تذکرۂ شعرائے اُردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشنِ بیخار اُنکی یادگار ہیں۔

شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانے میں بھی انکو یہی شہرت حاصل تھی اور اُردو اور فارسی شاعری کے اعلیٰ درجے کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ انکا تذکرہ گلشن بیخار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔ اُردو میں شیفتہ اپنے اُستاد مومن کے پیرو ہیں۔ ان کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے۔ اُنکے کلام میں واردتی مطلق نہیں ہے۔ اُنکے اُردو اشعار گو بہت اعلیٰ درجے کے نہ سہی مگر بلند مضامین، صفات اور با محاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجے کے شعرا میں اُن کا درجہ ممتاز ہے۔ اُنکے صاحبزادہ نواب محمد اسحاق خاں نے اُنکا اُردو و فارسی کلام مع ایک مفید دیباچہ اور حالات کے ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپوا کر

شایع کیا۔

تسکین۔ ۱۲۱۸ھ تا ۱۲۷۶ھ

میر حسین تسکین، میر احسن عرف میرن صاحب کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور سیر ٹھ گئے مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہ ہوئی تو رامپور آ رہے۔ جہاں نواب یوسف علی خاں نے انکی بڑی قدردانی کی۔ چند روز رامپور میں آرام سے بسر کر کے پچاس برس کے سن میں ۱۲۶۸ھ میں رامپور ہی میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اپنے اُستاد کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ بلکہ کلام میں اس قدر ہمرنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کر دیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسی رامپور میں نواب کلب علیخاں کے زمانے تک تھے۔ یہ بھی ایک نام برآوردہ شاعر تھے۔

نسیم دہلوی

۱۷۹۴ء تا ۱۸۴۴ء

مرزا اصغر علیخاں متخلص بہ نسیم، نواب آقا علیخاں کے بیٹے تھے۔ دلی میں ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہو گئی، اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علیخاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کرا کے بلانا چاہا۔ مگر انھوں نے ایک نہ مانا۔ اور پھر دلی نہیں گئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں رہے، مگر کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب، اور احکام قرآنی کے سختی سے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نولکشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی، جو انکو ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ انکے بعد منشی طوطا رام شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جس وقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر تھا اسی وقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بڑے زود گو تھے۔ مگر اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اس قدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اسکی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ جسکی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہو گیا۔ انکا دیوان انکے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا۔ مگر اسکو وہ اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے۔ انکی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود

دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرنے اور اُسکی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہل لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوے - جن میں عبد اللہ خاں نہر، منشی اشرف علی اشرف، منشی امیر اللہ تسلیم مشہور ہیں -

طرز کلام

نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے - اُنکا نہایت ہی لطیف طرز بیان نازکخیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے، جو مومن کا نصیب تھا - نسیم کو تازگی کلام اور صحت محاورات کا بہت خیال تھا - لکھنؤ کے تصنعات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے - انکے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے - اپنے اُستاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے ہیں اور نزاکت خیال اور طرز بندش اور روانی کلام میں بھی اُنھیں کے پیرو ہیں - نسیم کا مرتبہ درجۂ دوم میں بہت بڑا ہے -

ذوق - سنہ ۱۲۰۴ھ تا نہایت سنہ ۱۲۷۱ھ
مطابق سنہ ۱۷۸۹ء تا نہایت سنہ ۱۸۵۴ء

شیخ ابراہیم ذوق، ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے - جن کو نواب لطف علی خاں رئیس دہلی کی حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی - گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے - مگر اپنے جوہر ذاتی اور فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھ کر مشہور ہوے - اُنکی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی، جو معمولی درجے کے شاعر بھی تھے اور جنکے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے - حافظ صاحب کو شعر سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے - اُنھیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوق بھی مشاعروں میں جایا کرتے تھے - جہاں لوگوں کے اشعار سُن کر اُنکو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا - اُس زمانے میں اکثر اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور اُنکو بار بار پڑھا کرتے تھے - اُس زمانے کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور اُنھیں سے اصلاح لیتے تھے - ذوق کے ہم محلہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے - جبکا اُوقت دلی میں بڑا شہرہ تھا - اُنکی دیکھا دیکھی ذوق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں - چنانچہ ایسا ہی گیا، اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جاکر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے - نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طباعی سے تجربہ کار اُستاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرد اُستاد سے بڑھ جائے - اسی خیال سے وہ کبھی اُنکی غزلوں کو بغیر اصلاح پھیر دیتے، کبھی منہ بنا کر کہتے یہ کچھ نہیں، طبیعت پر زور ڈال کر کہو - اُدھر ذوق کو اُنکے دوستوں نے اُستاد کے خلاف اُبھار دیا غرضکہ انھیں وجوہ سے رشتۂ اُستادی و شاگردی منقطع ہو گیا - ذوق اپنے کلام کو بنظر اصلاح خود دیکھنے لگے اور اُسکی درستی و چستی میں بڑی کدوکاوش کرنے لگے - اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنکے کلام نے

جلد شہرت حاصل کرلی اور اُنکی غزلیں محفلوں اور مجلسوں، حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں مرزا ابو المظفر ولیعہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں۔ جس سے شاعرانہ جودت اور تیز ہوتی تھی اور نوآموز شعرا کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ اِن مشاعروں میں اکثر پُرانے اور کہنہ مشق شاعر مثلاً فراق، احسان، شکیبا، قاسم، عظیم، منّت وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے۔ انھیں میں بہ توسط میر کاظم حسین بیقرار ذوق کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانے میں شاہ نصیر دلّی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولیعہد سلطنت ظفر کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی۔ اتفاقاً اُنکو بھی بحیثیت میر منشی جان الفنسٹن صاحب کہیں باہر جانا پڑا۔ اور اب اصلاح کا کام ذوق کے سپرد ہوگیا۔ جس کا صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی، مگر اس کی تلافی اُنکی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہوگئی۔ اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنہ مشق شاعر انکو اُستاد ماننے لگے۔ دلّی میں نواب الٰہی بخش خاں تخلص معروف (مرزا غالب کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے اور علوم ضروری سے باخبر ہونے کے علاوہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے، جب ذوق کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا، اور (بقول مولانا آزاد) ذوق کے شاگرد ہوگئے۔ اُسوقت ذوق کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔ اِن دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوق کی شہرت میں اضافہ ہوا، بلکہ اُنکو اپنے کلام کی پختگی و صفائی کا انتہائی خیال ہوا۔ اور اسی وجہ سے وہ نہایت عمدہ شعر کہنے لگے۔ اور یہی مشق آئندہ اُنکے کام آئی۔ کیونکہ اُنکو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاہش کرنا پڑتی تھی، اور اُنکی غزلوں کو جو کبھی سودا، کبھی جرأت، کبھی درد کے طرز میں ہوتی تھیں، بڑی دقتِ نظر سے بنانا پڑتا تھا[1]۔

شاہ نصیر سے معرکہ جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا علمِ اُستادی پھر بلند کیا۔ ادھر

---

[1] مصنف تذکرہ گلِ رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ "آزاد نے آبِ حیات میں جس طرح سے نظر مرحوم کی کاوش پر پانی پھیرا ہے، انکے (معروف کے) بعض تلامذہ نے اُستاد ذوق کے ذہن کمال سے وابستہ کیا ہے۔ باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اسوقت چھاسٹھ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہونگے۔ مگر ہم اِس بات میں اسکا خیال نہیں کرتے" (تذکرہ گلِ رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۴) اور نیز نواب سید الدین احمد خاں طالب مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلل طریقے سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔

ہوشیار اور ملباع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کد و کاوش نے اور بڑھا دیا تھا مشکل مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشاقی اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمایش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جسکی ردیف تھی "آتش و آب و خاک و باد"۔ وہ غزل دلی کے مشاعرے میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اُسکو میں اُستاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی مبارز طلبی پر ذوق نے مقابلے کا بیڑا اُٹھا لیا۔ اور ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر تیار کیے۔ شاہ صاحب کو شاگرد کی جرأت و گستاخی بہت ناگوار ہوئی، ایک شاگرد سے اعتراض کرایا۔ جسکے جواب میں ذوق نے اکثر اسناد پیش کیے اور اس مقابلے میں ذوق ہی کو کامیابی ہوئی اسکے بعد سے انکی اُستادی مسلم ہو گئی۔

اُنکے اعلیٰ قصائد[1] کے صلے میں اکبر شاہ ثانی نے اُنکو "خاقانی ہند" کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابو المظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا:

روکش ترے رخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق
ہے ذرہ تیرا پرتو انورِ سحر رنگِ شفق

اسکے صلے میں اُنکی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہو گئی اور پانچ سے سات۔ رفتہ رفتہ سو تک اضافہ ہوا تھا۔ اور عید بقرعید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ آخر ایام میں ایکدفعہ بادشاہ بیمار ہوے۔ جب شفا پائی تو اُنھوں نے قصیدہ کہکر گزرانا[2]۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا — مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اسکے صلے میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عنایت ہوا پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلہ میں

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

---

[1] مثلاً وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے

جبکہ سرطان و اسد بھر کا ٹھہرا مسکن — آب و اہلولہ ہوے نشو و نما سے گلشن

[2] غالباً مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہوگی جس کا یہ مطلع ہے:

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوے مہر و مہ تماشائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب — شاہ دیندار نے شفا پائی

ایک گاؤں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے بعمر ارسٹھ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا[1]

ذوق اپنی تیز ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لیے مشہور تھے بڑے خداترس، اور ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ۔ شعر گوئی سب پر حاوی تھی، اس میں انکو فائیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گزرتی گئی انکی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ انکو فقہ، تصوف، تفسیر، حدیث، تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی، دنیاوی ترقی کے حوصلے اُن کو مطلق نہ تھے۔ دلی سے انکو اس قدر محبت تھی کہ جب راجہ چندولال نے جو شاداں تخلص کرتے تھے اور شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مربی تھے۔ انکو حیدرآباد بلوایا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور یہ شعر لکھ کر بھیجدیا

اندنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ جس میں کوئی زیب و زینت، بلکہ آرام و آسایش تک کا سامان مہیا نہ تھا۔ اُسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعر و سخن میں محو و مستغرق، دنیا و مافیہا سے بالکل بیخبر رہتے تھے۔ احکام قرآنی کے پورے عامل، اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دن رات میں اکثر اوقات اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔

تصانیف ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاس برس سے زیادہ شعر و سخن کی مشق میں صرف کیے ہوں، اور سوائے شعر و سخن کے اُسکا کوئی مشغلہ نہ رہا ہو۔ امید کی جاسکتی تھی کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اُس نے یادگار چھوڑے ہونگے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اُنھوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اسوقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہو جاتیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانہ غدر کی لوٹ مار میں ضائع ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اُنکے شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقے سے اپنی کتاب "آب حیات" میں لکھا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اُن کا جس قدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُنکی اور حافظ غلام رسول وَیران کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے[2]۔

---

[1] ظفر نے تاریخ لکھی شب چار شنبہ ماہ صفر بحکم خدا رفت ذوق
ظفر روے اُردو بپا سخن زغم خراشید و فرمود استاد ذوق
۱۲۷۱ھ

[2] مصنف خمخانۂ جاوید اس سمی میں انور اور ظہیر کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھو حال انور دہلوی۔

ذوق غزل اور قصیدہ دونوں کے اُستاد کامل تھے۔ جن کی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جس کا نام "نامۂ جہاں سوز" رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا، ایام غدر کی دست بُرد میں ضایع ہوگیا۔ انھوں نے اکثر مخمس، رباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں، جن میں سے اکثر ضایع ہوگئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفر کے واسطے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے۔ البتہ سلام اور مرثیہ اور ہجو وغیرہ اُن کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

ذوق کی خدمت زبان کے ساتھ ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو خوب صاف کیا۔ اور اس پر جلا دی۔ وہ ایک بہت بڑے صناع تھے، اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہٗ واقف تھے، محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ الفاظ کا برمحل استعمال، فن عروض سے واقفیت، دقیقہ سنجیٔ کلام، زور تخیل اور بلندی مضامین یہ سب چیزیں مل کر اُنکے کلام کا جوہر اعلیٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اس قدر نہیں پائی جاتی۔

انداز کلام ذوق کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہوتا۔ انکے یہاں تشبیہات و استعارات اور دیگر صنایع و بدایع بہت مناسبت سے کامیابی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں جسکی وجہ سے شعر کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ انکے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم بہت ہے۔ اعلیٰ تخیل اور بلندی مضامین کیساتھ الفاظ کی خوبصورتی اور صرف برمحل کے مناسب ہوتی ہے۔ ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے۔ ضرب الامثال اُنکے دیوان میں بکثرت ہیں۔ قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے اُنکا مقابلہ سودا سے کیا جاسکتا ہے اور انھیں کے وہ متبع بھی۔ مگر اُنکے یہاں اور اُستادوں کا بھی رنگ موجود ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد اور جرأت و مصحفی۔ قصیدہ میں وہ کامل اُستاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لیگئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انکے اکثر قصائد ضایع ہوگئے۔ مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں، وہ اُنکی قادرالکلامی، اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بےمثیل نمونے ہیں۔ اس صنف میں وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ انکی غزلیں تازگی مضامین، خوبی محاورہ، سادگی اور صفائی کے لیے مشہور ہیں۔ انکے کلام میں شاہ نصیر، سودا، درد، مصحفی اور جرأت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستۂ گلہائے رنگا رنگ کہنا بیجا نہیں۔ انکی وہ غزلیں جو جرأت کے رنگ میں ہیں مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں، نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں

انکے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے، اور عام لوگوں کے لیے ہے ایسی صورت میں بلکہ اُنکے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی و عربی داں شاعر تھے، جنکا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا، یہ اعتراض بیجا بھی نہیں۔ نازکخیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں، مگر سادگی اور صفائی اور ترنم الفاظ کے لحاظ سے وہ اُن سے بڑھے ہوئے ہیں، اور قصیدہ میں تو اُن سے کہیں زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ آسمان شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارا بن کر چمکے اور اُردو کے بہترین شعرا میں انکا شمار کیا جا سکتا ہے۔

شاگرد انکے سیکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ، ظفر، آزاد، ظہیر اور انور بہت نامور ہیں۔ انکے ایک ہی بیٹے تھے خلیفہ محمد اسمٰعیل جنکے فرزند رمز حافی کی طرح زمانۂ حاضر میں دنیا سے اُٹھ گئے۔

ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء سید ظہیر الدین نام، ظہیر تخلص، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے، دلی کے باشندے تھے۔ انکے والد ابو المظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں اُستاد، مرصع رقم خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کمسنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے، اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع ذوات الانعام میں پائی تھی۔ شعر و سخن کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ چودہ برس کے سن میں اُستاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا۔ جھجھر، سونی پت، نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے، اور یہاں سے لکھنؤ کا ارادہ کیا۔ مگر وہاں کے ابتر حالات سن کے، کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رامپور چلے گئے۔ وہاں چار برس رہے۔ اسکے بعد دلی آئے اور محکمۂ جنگی میں ملازمت مل گئی۔ اسکے تھوڑے عرصہ کے بعد اخبار رہبر ہند طور کے ایڈیٹر ہو گئے جو مراد آباد شہر سے نکلتا تھا۔ انکے مضامین کو مہاراجہ شیو دھان سنگھ والیِ الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ انکو الور بُلوا بھیجا، جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ مجبور ہو کر پھر دلی آئے، اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمۂ پولیس میں انکو ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش اُنیس سال رہے۔ والیِ ریاست کے مرنے پر انکا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علیخاں خلف نواب امیر خاں والیِ ٹونک نے بُلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے انکے ساتھ رہے۔ نواب کے مرنے پر اُنکے صاحبزادے نواب ابراہیم علیخاں نے انکا خلیفہ مقرر کر دیا۔ اس طریقہ سے تقریباً پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لیکر حیدر آباد گئے، جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد ہارپائی ہوئی۔ مگر تنخواہ مقرر ہونے

کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ بیکاری کے زمانہ میں جب پریشان حال ہو گئے تھے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اُنکی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پُرگو شاعر تھے۔ تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّٰی "گلستانِ سخن" آگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم و سوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ جو تھا دیوان، جسمیں بہ قول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدس شامل ہیں، اُنکے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن خاں کا رنگ زیادہ پایا ہے۔ جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود اُنھوں نے کیا ہے:

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھا جبتک کہ ظہیر — سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگِ غزل نے نہ دیا
کیا بنا ہی طرزِ مومن اے ظہیر — طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانے میں زبان اور شاعری دونوں کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ انکے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ہیں جو پہلوان سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

انور سید شجاع الدین عرف اُمراد مرزا تخلص بہ انور، ظہیر مذکورہ بالا کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور یہ بھی ذوق کے شاگرد تھے۔ ذوق کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھلاتے تھے۔ نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ جے پور میں عین جوانی میں بعمر ۳۸ سال انتقال کیا۔ انکے تمام معاصرین انکی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ اور یہ اُن سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں جو غدر کے دس سال بعد دلی میں ہوا کرتے تھے۔ جن میں داغ، حالی، مجروح، سالک، ارشد، شائق وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سناتے تھے۔ انکے دو دیوان ضائع ہو گئے۔ مگر محترمی لالہ سری رام صاحب قابل مصنف خمخانۂ جاوید نے بڑی محنت اور شقت سے متفرق اور پریشان سودوں سے ایک دیوان جمع کر کے چھپوایا ہے۔ انور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوق، غالب، اور مومن تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے۔

غالب۔ سنہ ۱۲۱۲ھ ولادت سنہ ۱۷۹۶ء
سنہ ۱۲۸۵ھ وفات سنہ ۱۸۶۹ء

زبانِ اُردو کے بہت بڑے اور اعظم شاعری کے سب سے درخشندہ تارے، اپنے زمانے کے اُستاد کامل فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں تخلص بہ اسد و غالب سنہ ۱۲۱۲ھ مطابق سنہ ۱۷۹۶ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ لقب مرزا نوشہ تھا۔

اور خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر و ناز تھا۔ جیسا کہ اُنکے اکثر اُردو و فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے لیے یہ چند شعر کافی ہیں

غالب از خاکِ پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژادہمی — بہ سترگان قوم پیوندیم
ایلکیم از جماعتِ اتراک — در تمامی زماندہ چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل کل را مہینہ فرزندیم
تبلا شے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خورسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گریم — ہمہ بر روزگار می خندیم

اشعار مذکورۂ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایک ترکمانوں سے جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے، ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی مرزا کے والد مرزا عبد اللہ بیگ خاں نے ایک متلون زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے، پھر حیدر آباد گئے، جہاں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد گھر آئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی، وہاں کسی سرکش گڑھی کی لڑائی کے موقع پر ۱۲۱۷ھ میں مارے گئے۔ اسوقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا۔ مرزا عبد اللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت انکے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حسن خدمات اور وفاداری کے صلے میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی۔ ان کا انتقال بھی ۱۲۲۱ھ میں ہوگیا۔ اس وقت غالب کی عمر نو برس کی تھی۔ اسکے بعد انکی خبرگیری اُنکے نانہال میں ہوتی رہی اور اپنے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی۔ مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا، جہاں وہ ایک کہنہ مشق اُستاد شیخ معظم سے تعلیم پاتے رہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ جب انکی عمر چودہ برس کی ہوئی تو ہرمز نام ایک پارسی سے جو زند و پاژند کا عالم اور بڑا سیاح تھا، اُنکی ملاقات ہوگئی۔ ہرمز نے آخر میں

مذہب اسلام قبول کر لیا تھا اور عبد الصمد نام رکھا تھا۔ یہ اُنکے ساتھ تقریباً دو برس رہا۔ اور چونکہ فارسی کی طرف اُنکو قدرتی مناسبت تھی لہذا اُس سے اُنھوں نے پوری طرح اکتساب کمال کیا۔ اسکے فیضان صحبت کا مرزا کو فخر تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اُسکی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور بامحاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادہ بخوبی پیدا ہو گیا جو صرف ایک اہل زبان ہی کی مدد سے ہو سکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۲۱۰ھ میں آئے جب اُنکے چچا کی شادی نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہوئی تھی، اور خود انکی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے ساتھ جو نواب فخر الدولہ والیِ لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔ جبکہ اُن کا سن تیرہ برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اسوقت شاعری گونج رہی تھی۔ شاعرے جا بجا ہوا کرتے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، ان سب اسباب سے نوعمر غالب کی فوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر پڑا۔ شروع میں وہ فارسی کہتے تھے اور اس میں بہت کچھ کہا، مگر رفتہ رفتہ اُردو شاعری کی روز افزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اُردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے، جب کسی شخص کا یہ شعر سُنا

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

یہ سُنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ اُن کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ اسم الناس کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت بُرا جانتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انھیں اُسی طرح رہنے دیا۔ مرزا ۱۸۲۷ء میں کلکتہ بھی گئے تھے سلسلہ اپنی پنشن کے جو انکے چچا کو جاگیر ضبط ہو جانے کے عوض ملتی تھی اور آخر میں بند ہو گئی تھی۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی۔ اور ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک شرف وزیر سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچسو روپیہ سال انکے واسطے مقرر ہوئے تھے، مگر دو برس بعد جب انتزاعِ سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہو گئے۔ ۱۲۶۴ھ میں غالب تین ماہ کے واسطے کوتوال شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہو گئے تھے۔ مگر قید میں انکے مرتبہ کے موافق ان کا احترام کیا گیا۔

۱۸۴۲ء میں غالب ایک فارسی پروفیسری کے لیے جو دلی کالج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے

مگر چونکہ ٹامسن صاحب سکرٹری گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا، اس لیے انھوں نے اپنی کسرشان سمجھ کر ملازمت قبول نہ کی۔ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۴۹ء) میں خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، بادشاہ نے دربار میں عطا کیا، اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا، اور پچاس روپیہ مہینہ اسکے صلہ میں مقرر کیا۔ ۱۲۷۰ھ میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا، استاد شہ مقرر ہوئے اور اصلاح کا کام اُنکے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلۂ ملازمت اور تقرب شاہی مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہوگئے تھے۔ پنشن بند ہوگئی اور اُنکے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی۔ آخر میں جب پوری صفائی ہوگئی اور یہ بے گناہ ثابت ہوئے تو انکی پنشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالب نواب یوسف علیخاں والیِ رامپور کے اُستاد بھی تھے، جو انکو سو روپیہ ماہوار بطور پنشن عمر بھر دیتے رہے۔ غالب کا انتقال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء میں بعمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

عام حالات اور طبعی عادات

غالب نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوئے تھے، اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدردانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا جسکو وہ نہایت باقاعدہ طور پر وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ دور و راز کے شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مراسلت ہی کے ذریعے ہوتی تھی۔ اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے۔ اُنکی یہ عادت مرتے دم تک جاری رہی۔ محبت و ہمدردی اُنکے ضمیر میں پڑی تھی۔ جیسا کہ اُنکے خطوط اور اشعار سے تشریح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلوسے کوسوں دُور تھے۔ سچ پوچھو تو انکا مذہب بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ اُنکی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ انکے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے۔ جن میں سب سے زیادہ نامی و گرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے۔ جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔

گو کہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ و ثروت کے اعتبار سے فارغ البال نہیں ہوئے مگر پھر بھی جس قدر اُنکی آمدنی تھی، وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے اُسی طرح وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لیے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان اُنکو ظاہر کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے، مگر اس واقعہ کو اُنھوں نے کبھی نہیں

چھپایا، بلکہ اپنے اشعار اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے تھے۔ اور اس طرح گویا وہ اپنی ندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ انکو اپنی خودداری اور عزت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امراء سے وہ برابری سے ملتے اور اپنی علو شان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے۔ جیسا کہ اُس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب اُنھوں نے دِلّی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی اُن کا یہ خیال حدِ اعتدال سے تجاوز بھی ہو جاتا تھا مگر اپنے وسیع حلقۂ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفق و مدارا اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ اُنکے خانگی تعلقات خاصکر اپنی بیوی کے ساتھ خوشگوار نہ تھے۔ مرزا کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں ہوئی تھیں، مگر وہ سب بچپنے میں مرگئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فاتر العقل تھے اور اُنھیں کے ساتھ رہتے تھے، غدر کے زمانہ میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بہت ہونہار شاعر تھے اور مرزا کے سامنے انکا انتقال ہو گیا تھا۔ انکے دو بچوں سے مرزا کو کمال محبت تھی۔

آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ پھر اُس زمانہ میں اُنکی مالی حالت بھی درست نہ تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوئے تھے، اسی وجہ سے انکے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر بیجا نہیں ہے بلکہ اُس سے حُسنِ شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں اُنکی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے، جسکی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے۔ اسی

خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقے پر ظاہر کرتے ہیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی انکی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے، جس سے مصائب کی تیرگی کافور ہو جاتی ہے۔ اُنکی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بدمزگی نہیں ہوتی بلکہ اُس میں مناسبت اور جدتِ اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں اُنکے اُنکے کلام میں بیزاری کا پرتو ہے مگر یہ کیفیت سفر سے پیدا نہیں ہوتی۔ انکی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوٹا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "ایک اور پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے" اگر آپ اُنکے اس قسم کے لطائف و ظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیے، جس میں ایسی باتیں بکثرت مذکور ہیں۔

غالب بحیثیت شاعر کے مرزا کا پایہ شاعری میں بہت بلند ہے اور اُسکو سب نے تسلیم کیا ہے۔ وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے۔ اور اُنکے معاصرین بھی اس بارے میں اُنکی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُنکو فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے۔ اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اس قدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ اُنکے کلام کا قدردان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیا ورید گرایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہا ے گفتنی دارد

یہ عجیب بات اور نیرنگی قسمت ہے کہ اُنکی شہرت کا باعث اُنکی فارسی شاعری نہیں، بلکہ اُردو شاعری ہوئی، جسکی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے

فارسی بیں تا ببینی نقشہاے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

اُردو وہ کبھی کبھی تبدیلِ ذائقہ کے لیے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہا کرتے تھے۔ مختلف کرتبیں انکی نظر سے گذری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے اُنکو پڑھا تھا۔ قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا اور اُسپر اتنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لیکر پڑھتے اور خود کبھی مول نہ لیتے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی

بھی عادت تھی جیسا کہ اُس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمائش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہہ دیے تھے۔ عربی میں گو انھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فن عروض کے اُستادِ کامل تھے اور اُسکے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کما حقہٗ واقف تھے۔ مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُنکو مطلق دلچسپی نہ تھی۔ گو کہ تعجب یہ ہے کہ دو تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے ہیں۔ اسی طرح مرثیہ اور تاریخگوئی سے بھی اُنکو کوئی لگاؤ نہ تھا[1]۔ البتہ فارسی میں بہت سے نوحے موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور اُنکی ذہانت کے مختلف پہلو تھے۔ جسکی وجہ سے ایک شاعر کا تبحر ایک معمور کی چابکدستی کے ساتھ مل گیا۔

تصانیف | حسب ذیل تصانیف اُنکی یادگار ہیں :-

(۱) عود ہندی (۲) اُردوئے معلّٰی (۳) کلیات نظم فارسی (۴) کلیات نثر فارسی
(۵) دیوان اُردو (۶) لطائف غیبی (۷) تیغ تیز (۸) قاطع برہان
(۹) پنج آہنگ (۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہر نیمروز (۱۲) دستنبو
(۱۳) سبد چین

عود ہندی اور اُردوئے معلّٰی، اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں، جو اُنھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے، اور اول مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شایع ہوئے تھے۔ عود ہندی میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں۔ لطائف غیبی، مباحثہ میں ہے، اور "سیف الحق" کے فرضی نام سے لکھی ہے۔ تیغ تیز اور نامۂ غالب بھی اُسی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

---

[1] یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخگوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یوں تو اُنکے اُردو دیوان میں بھی دو تین تاریخیں موجود ہیں مگر فارسی میں تو مستند و عمدہ تاریخیں اُنکے قطعات میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو تاریخی مادّے لکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے ہیں تاریخ وفات مرزا سبتا بیگ

زسال واقعۂ میرزا سبتا بیگ — آمد راست شمار ائمۂ امجاد
صحیفہ ہائے سماوی مبین از عشرات — صدیقہ ہائے بہشتی مشخص از آحاد
بجرمت دہ و دو ہادی و چہار کتاب — کہ در نشینے از ہشت خلد جایش باد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں :- (دیکھیے صفحہ ۲۱)

پنج آہنگ میں فارسی انشا پردازی کے مختلف نمونے ہیں۔ کلیات نظم فارسی۔ اُنکے فارسی قصائد اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ مہر نیمروز تاریخ ہے۔ مرزا نے اسکو حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا۔ اسکی پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لیکر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد میں لکھیں اور "ماہ نیم ماہ" نام رکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہوگیا اور وہ کتاب رہ گئی۔ دستنبو میں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت تباہی شہر اور اُسکے ساتھ اپنے حالات بیان کیے ہیں۔ سبد چین میں چند قصائد اور قطعات فارسی اور کچھ خطوط ہیں۔

مرزا صاحب سے مباحثے | پہلا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے اُنکے کلام پر کچھ اعتراض کیے اور سند میں تتبع کے اقوال پیش کیے۔ مرزا صاحب جن کا قول تھا

آنکہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد تتبع دو واقف را

(بقیہ ۲۰) جستم از سال رحلتش اثرے — گفت غالب کہ خود زردے شمار
از بروج سپہر جوے نبات — عشرات از کواکب سیار
گفتم آحاد گفت شرمت باد — از خداوند واحد القہار

اس میں بارہ سیکڑے سات واہیاں اور ایک اکائی یعنی کل ۱۷۱۲ نکلتے ہیں۔

۱؎ مرزا کے فارسی قصائد کل چونسٹھ ہیں جن میں سترہ قصیدے حسب ذیل انگریز حکام کی شان میں ہیں۔

نام ممدوح	تعداد قصائد	نام ممدوح	تعداد قصائد
کوئن وکٹوریا	۳	مسٹر اسٹرلنگ	۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱	ولیم فریزر	۱
لارڈ الن برا ایضاً	۲	مسٹر کالون	۱
سر چارلس مٹکاف ایضاً	۱	لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
جیمس ٹامسن	۱	مسٹر ایڈمنسٹن	۱
مسٹر پرنسپ	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
ٹامس مٹیڈک	۱	مسٹر منٹگمری لفٹنٹ گورنر	۱

اسکے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریز حکام کی شان میں ہیں۔

وہ بیدل کو تقلید کو کب ماننے والے تھے، انھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذۂ اہل زبان پیش کیے اور کہا

دامن از کف نکنم ہیچگونہ رہا طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روانِ معنی را آں ظہوری جہانِ معنی را

مخاصمین جو تقلید کے شاگرد تھے اس پر اور برافروختہ ہو گئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وار دکیے، یہ سب واقعات انکی مثنوی "باد مخالف" میں مذکور ہیں۔

دوسرا سانحہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت "برہانِ قاطع" پر اعتراض کیے اور انکو کتابی صورت میں شایع کیا اور "قاطع برہان" نام رکھا۔ اُسکے ایک سال بعد اس کتاب کو ترمیم کرکے اسکا نام "درفش کاویانی" رکھا۔ اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ اسکے اکثر جواب لکھے گئے۔ کلکتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "موید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اسکا جواب "قاطع برہان" سے دیا اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامۂ غالب" سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بیموقع ہے، مگر اتنا ہم ضرور کہینگے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے اُستاد کامل تھے۔ اور اُن کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی، بیدل و حزیں وغیرہ سے بے تکلف کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور

غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جا سکتی ہے جس سے انکی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دور کی خصوصیات کا پتہ بخوبی چل سکتا ہے۔ یہ آپ ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اُردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ اُن کا قول تھا

فارسی بیں تا ببینی نقشہاے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ من است

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اُردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے۔ مگر باایں ہمہ اُنکی ذہانت و طباعی اور اُنکی فطری شاعری کا پورا اثر اُنکے اُردو کلام میں بھی اُسی طرح جلوہ گر ہے جس طرح اُنکے فارسی کلام میں ہے۔ مرزا کا اُردو دیوان تقریباً اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہ ہوگا۔ مگر اُسکو زبان اُردو کا بہترین خزانہ اور اُردو شاعری کا نہایت گراں قدر سرمایہ

سمجھنا چاہیے - مرزا کی شاعری کا پہلا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا - تا عمر پچیس سال جب کہ اُنھوں نے نے اپنے اُردو دیوان کو چھانٹا اور اُس میں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں - اب وہ قدیم کلام جو مروجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا ایک عرصہ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے بہم پہونچا کر چھاپا گیا ہے اور اُسکے مطالعہ سے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں - اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں - نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو اُنھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں انکو پسند تھیں - اس نئے دریافت شدہ کلام کی نازکخیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرون وسطی کے اُن یورپی شعرا سے ملتی جلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح میں "اسکولمن" کہتے ہیں - اس دور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں اور نازکخیالیوں کی بہت کثرت ہے علی الخصوص مرزا عبدالقادر بیدل کا بہت تتبع معلوم ہوتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں

مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب عصا ے خضر صحرائے سخن ہے خامۂ بیدل کا

طرز نازکخیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور زاموری سمجھتے ہیں - بعض اوقات اُنکی یہ بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا رہتا ہے ایسے ہی اشعار پر "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے - یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا اس وجہ سے کہ اُنکے مزاج کی افتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علحدہ رکھنا چاہتے تھے - اسی لیے شاعری میں بھی انھوں نے یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا - اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا - اور فارسی کا ذوق انکی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا - یہ طرز انکے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک بڑا آلۂ کار تھا - مرزا بیدل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ اُنکے معترف بھی بھی ہیں، جیسا کہ مذکورۂ بالا شعروں سے معلوم ہوا - یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا، مگر تھوڑی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا، بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا - جس میں نہ صرف بیدل کی پیروی

ترک کی اور اُس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کردیا۔ اُنکے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔ عجیب و غریب تشبیہیں، ایسی لمبند پرواز یاں جنسے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے لیرا نوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں وہ پختہ کاری، وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو انکے بعد کے کلام میں ہیں، نہیں پائے جاتے۔ انکے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جنمیں اُردو کی آمیزش محض اس وجہ سے ہے کہ شعر اُردو کہا جاسکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہوجاتا ہے۔ گو اُنکے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اُڑایا جاتا تھا، جیسے کہ حکیم آغا جان عیش نے جل کر کہا کہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے (قطعہ) مرزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے مگر اِن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی اُنکے اعلیٰ درجے کی داغی قوت اور آیندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ انکی اس دور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے۔ اور اُنکی اُفتاد طبع سے معلوم ہوجاتا ہے کہ آیندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ انکی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازکخیالیاں، نئی نئی تخیلیں اور پُر لطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اُردو شعرا میں کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتیں۔ اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی اضافت پسند طبیعت کے تقاضہ سے آخر کار یہ رنگ ترک کرکے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دَور میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازکخیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا۔ اس میں زبان صاف ہوگئی ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت ہے۔ اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتدبہ کمی ہے۔ مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک پُر لطف ہیجان پیدا کردیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دَور اُنکے کمال فن کا لب لباب اور ارتقاے کمال کی آخری منزل ہے۔ اس دور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے اس عہد کی غزلوں میں ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے۔ ان میں ایجاز کے ساتھ سلاست و روانی، نازکخیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجہ احسن موجود ہے۔

اور انھیں سے غالب کو شعرائے اُردو کی صف اولیں میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

غالب کے خصوصیات۔ پہلی خصوصیت جدت پسندی

ہماری رائے میں مرزا کے قصر شاعری کی مستحکم بنیاد اُنکی جدت طرازی پر قائم ہے جس میں جدت تخیل، جدت طرز ادا، جدت تشبیہات، جدت استعارات، جدت محاکات، جدت الفاظ، غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کے خاص طرز ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات اک ایسے اسلوب سے بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدت اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہو جاتا ہے اس جدت طرازی اور اُرجنیلٹی کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معمے کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے جسکا حل ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ غالب اور اکثر شعرائے اُردو و نیز بعض شعرائے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اُن لوگوں کے یہاں معاملہ برعکس ہے جس سے اُنکے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسی قسم کے کلام سے اُنکے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں تخیلات انکے تک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

غالب بنود شیوۂ من قافیہ بندی ۔۔۔ غلطے ست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

دوسری خصوصیت نظر فریب طرز تحریر

اسی سے متعلق اور ملتی جلتی اُنکے کلام میں نظر فریبی اور بات سے بات پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک سرچھیڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا راگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجہول الکیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے، بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اُسکے لوازم جمع کر لیتا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طغرائے امتیاز جادۂ عام سے علحدگی ہے جسکا شوق بلکہ عشق اُنکے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے۔ تخلص بدلنے کا واقعہ جسکا ذکر اوپر ہوا، اسکا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس، وضع قطع، بات چیت، طرز تحریر، غرضکہ ہر چیز میں اسی علحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ اُنکے خطوط، اُنکے اشعار، ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا ۔۔۔ ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

اُنکی ابتدائی مشکل پسندی اسی علحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اُنکی شاعری سے

لام و اغ لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ اُنکے الفاظ میں خیالات کا اس قدر زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قید الفاظ کو توڑ ڈالیں گے۔

آگہیئہ تُندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

تیسری خصوصیت ذاتی جذبات کا ادا کرنا

مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انکے اُشعار اُنکے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیاتِ زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنی دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم و الم کے نالے، کہیں اُنکی مایۂ عظمت کا مرقع، کہیں اُنکی حرماں نصیبی، کہیں ہجوم نا امیدی، کہیں جاں کاہ مصائب، کہیں سعی بے حاصل، کہیں دنیا سے تنفر اور بیزاری، کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد، کہیں تعلقات دنیاوی سے دلبستگی اور اُسکی خوشی اور اُسکے آلام کا بیان ہوتا ہے۔ غرضکہ اُنکے لطیف اشعار اُنکی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں صحیح بیرامیٹر ہیں۔

چوتھی خصوصیت فلسفیت اور حقیقت طرازی

مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور اُنکے اکثر اشعار حقائق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ وہ رموز و حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرا تھے۔ فرماتے ہیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اور اُنکے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ ان پر پوری طرح عامل تھے۔ انکی زندگی مذہبی رواداری اور آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی۔ اسی طرح اُن کا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے۔ کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اُس میں نہریں جاری ہونگی اور وہی سب لطف حاصل ہونگے جو دنیا میں ہوتے ہیں، وہ متفق نہیں، بلکہ اسکو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

اُنکے نزدیک معیت علمی خود زندگی ہے۔ جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبدأ سے جدا ہو جاتا ہے۔ نغمۂ زندگی کو ایک نغمہ نے سمجھنا چاہیے، جو نیستاں سے جدا ہونے پر نے بے اختیار نالہ کرتی رہتی ہے اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بحیثیت ایک صوفی منش کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کس قدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ علم ظاہر روح حیات ہے مگر خود روح حیات نہیں ہے۔ بہ قول برگسن کے یہی روح حیات اجسام میں جلوہ گر ہے۔ مگر وہ خود اس عالم سے منزہ ہے۔ غالب کہتے ہیں

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پانچویں خصوصیت جذبات نگاہی

حقائق فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے۔ انکے یہاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابل برداشت مصیبتیں، جولازمۂ زندگی ہیں، نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔ گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جسکے ساتھ دور سے قضا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں:

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غم اگر چہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

شمع ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا کے کلام میں بچوں کی سی امنگ اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شیلے کی طرح تنک مزاجی پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ انکو انکے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔ اور انکے معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بچے کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسکو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جسپہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود انھیں کے آلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ انکے اشعار کو پڑھ کر رنج و غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دور ہو کر اس میں

ایک نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں انتہا درجے کا انکسار اور عاجزی اور دلی پشیمانی اور اپنی بے حقیقتی کا اظہار کس پُراثر اور درد انگیز طریقہ سے کیا ہے:

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

کلام میں شوخی و ظرافت | مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اُس کو اُن کی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دُور کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حُزن و یاس کے ابر میں ظرافت کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ اُنکی ظرافت کی لطافت اور شوخیِ کلام کی نزاکت کو ہم بے تکلف ایک نازک پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں مگر انکی ظرافت کبھی حدِ اعتدال سے بڑھ کر پھکڑ نہیں ہو جاتی اور متین سے متین آدمی اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

انکے اکثر اشعار نفسِ شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کی روح رواں ہیں۔ سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ۔ اُنکی ہر تصویرِ الفاظ کے پیچھے، اُنکے ہر نقشِ خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے رہتے ہیں جنکی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے۔

غالب ایک کامل مصور ہیں اور اُنکو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے

نیند اُسکا ہے داغ اُسکا ہے رات پڑی ہیں اُسکی تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

مرزا کو عجب قوتِ ایجاز حاصل تھی۔ انکے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات پیدا کرنے کے بے مثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حسابِ ایجاز نما ہے

شعر نہایت پُرتاثیر ہے۔ ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر پردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جنکے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نڈر اور صاف گو گنہگار کی تصویر ہے، جو خدا سے بے دھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں، مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ ہے، اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے[1]

[1] مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا، لہٰذا اُنکی حسرت کی بھی داد دی جائے (دیکھیے ص۲۹۰)

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرا سے

علو خیال، فلسفۂ حیات، اور ذہانت و طباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھ کر ہیں، مگر روزمرہ اور زبان کی بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق اُن سے بڑھے ہوئے ہیں، گو کہ مومن اس میں بھی اُن سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو اُنکے ہمعصر یا قریب العہد تھے اُنکے کلام کا تو اُن شعرا سے ذیل سے کلام سے کیا جا سکتا ہے

(۱) رابرٹ براؤننگ سے، جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سینٹسبری براؤننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُسکا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ غزالی تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقائق کی تعلیل دونوں میں ہے۔ اُن کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہے، مگر حقائق اور رموز کا اُنکے کلام میں جا بجا پتہ موجود ہے۔ انکو صوفی براؤننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چند کہ براؤننگ کے کھردرے پن اور اکھڑپن سے انکا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن و یاس میں اُنکا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر انکا مدمقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گیٹے" ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل درّاک، صوفی کی نگاہ دُوربیں، چابکدست مصور کا نازک ہاتھ۔ اُنکی صنعت پُرکاری اور پُرکاری صنعت ہے۔ اور حسن حق ہے اور حق حسن ہے۔ وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور اُن کا یہ قول بالکل صحیح ہے:-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اُن کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں، اور نہ اُنکی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اسکا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص۲۸) یعنی اس کا ثمرہ نیک ہے، اس آیت والی الہدایت سے ہوتی ہے: واما من خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الہوٰی، فان الجنۃ ہی الماوٰی۔

(سورۃ النازعات)

الکحل اور شریعتِ اسلامیہ

دنیائے کیمیا میں الکحل کی حیثیت نہایت اہم ہے۔ کیمیاء الاحیا (organic Chemistry) میں اسکو کسی دوسرے مرکب سے ثانوی حیثیت حاصل نہیں۔ خود کیمیائی تحقیق بہت حد تک اسی کی شرمندۂ احسان ہے۔ اگر یہ محلل محققین و مجربین کے ہاتھوں میں نہ ہوتا، تو بہت سی ایجادات ابھی تک عالم شہود کے بجائے عالم غیب سے متعلق ہوتیں۔ دنیائے طب میں اسکی حیثیت قرابادین کے جزو لاینفک کی ہے۔ قدرتی نباتات، جڑی بوٹیوں، کچی دھاتوں وغیرہ سے دوائی اجزا کے استخراج کے لیے بطور محلل کے استعمال ہوتی ہے۔ سیکڑوں دوائی اجزاء بجز الکحل کے کسی دوسرے بے ضرر محلل میں حل ہی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے بہت سی دواؤں کی ساخت میں اسکو شامل کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ جلد پر نشاد کرنے کی بہت سی دوائیں اسی میں تیار کی جاتی ہیں۔ کاروباری زندگی کی طرف آیئے تو یہاں بھی اسکے بغیر چارہ نہیں۔ نقاش اپنی نقاشی کے لیے اس کا محتاج ہے۔ نجار کو اپنے تیار کردہ فرنیچر پر پالش کرنے کے لیے اس کے استعمال کے بغیر چارہ کار نہیں۔ اور پھر گھروں، دیوان خانوں، جلسہ گاہوں وغیرہ کے علاوہ، مسجدوں، صومعوں، اور خانقاہوں کی آرائش بھی اسکی شمولیت کے بغیر بوجہ احسن نہیں ہو سکتی۔ غرض الکحل ایک ایسی شے ہے، جو نہ صرف تہذیب و تمدن کا لازمہ ہے، بلکہ بہت حد تک ضروریاتِ زندگی سے وابستہ ہیں۔

بعض حلقوں میں نہایت نیک نیتی سے اسلام کی مذہبی روایات کی بنا پر اس کا استعمال مخدوش اور شبہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے، بلکہ حرام تک قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ تہذیب جدید کے متوالے، ابنائے ملت، مذہب کو اپنے متمدن معاشرت سے منافی پاکر اس کی روایات سے بے نیاز و متنفر ہو جاتے ہیں اور انھیں اسلاطیر الاولین سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتے۔ اور یا دوسری طرف مذہب کے نام کے عشاق، تہذیب و تمدن کو دجال کا جال اور شیطان کا چرخہ قرار دیکر اسکے نام سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور کنج تنہائی و عزلت کی طرف فرار کے بغیر اپنے لیے مفر نہیں دیکھتے۔ یہ دونوں انتہا پسندی کی مثالیں ہیں اور انتہا میں خیر نہیں۔ خیر الامور اوساطہا۔ یہ آپس کی کشمکش اور باہمی منافرت، تبدد و تضاد کی خلیج کو خدا جانے کہاں تک وسیع کردے۔ مجھے یقین ہے کہ مذہب اور تہذیب، اور شرع و معاشرت، باہم مخالف و متضاد نہیں، بلکہ ایکدوسرے کی مدد و معاون ہیں

یعنی ان میں کانچ کنکر کا بیر نہیں، بلکہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ یہ دونوں روٹھے ہوئے گروہ من جائیں، انکی غلط فہمیاں رفع ہوں، اور ایک دوسرے سے ہنگیر ہو کر "اُمّۃً وَسَطًا" کی مہربان آغوش میں آبیٹھیں۔ اسی نسبت سے میں نے الکحل کے بارے میں اپنے تحقیقی خیالات کو ترتیب دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ارباب نظر ان کا تدبر و تعمق کی ترازو میں مخالف مواد سے موازنہ کریں۔ علمائے دین اور فقہائے شریعت غرا میری گزارشات کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو ہر وقت اپنی غلطی واپس لینے کے لیے تیار رہوں۔ لیکن اگر میری معروضات صحت کے معیار پر پوری اتریں تو شاید انکی اشاعت مذہب و تہذیب کے درمیان حائل ہونیوالی خلیج کو پاٹنے کی مفید کوشش ثابت ہو۔

اس میں کسی کو بھی اختلاف کی گنجایش نہیں کہ شراب قطعی طور پر حرام ہے اور معنوی حیثیت سے نجاست بلکہ اُم الخبائث ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ شراب نجس اور ناپاک ہے۔ اور چونکہ الکحل شراب سے ماخوذ ہے، اس لیے شراب کے حکم میں ہے۔ اور جس کسی چیز میں اس کی قلیل سے قلیل مقدار بھی پائی جائے وہ حرام، خبیث اور ناپاک ہے۔ اس سے استنباط کا سلسلہ بہت دُور تک چلا جاتا ہے۔ یعنی جس کام میں بھی الکحل استعمال ہو وہ ناجائز، اور بالآخر مغربی علاج اور طب ناجائز و حرام۔ یہ تمام دعاوی اور انکے دلائل غور طلب ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ایک قسم کی الکحل شراب سے مستخرج ہے۔ لیکن اسکو شراب کے حکم میں داخل کرنے کا دعویٰ تشنۂ دلیل ہے۔ قسم اور حکم کا اطلاق عرف پر ہوتا ہے ماہیت پر نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی قسم کھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا تو مچھلی اور بعضۂ مرغ کھانا اُسکی قسم کے منافی نہ ہوگا۔ کیونکہ عرف عام میں بعضۂ مرغ اور مچھلی، گوشت نہیں کہلاتے۔ حالانکہ انکی ماہیت وہی ہے۔ ایک اور مثال لیجیے۔ پیشاب خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس سے ملوث ہو کر کپڑا ناپاک ہو جاتا ہے۔ کیمیائی تحلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیشاب کے ضروری اجزاء پانی، یوریا، نمک وغیرہ ہیں۔ یہ سب اجزاء کم و بیش مقدار میں پسینے میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن پسینہ آنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور نہ ہی پسینے میں شرابور ہو کر بھی کپڑا ناپاک قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ پیشاب کی ماہیت پسینے میں موجود ہے۔ اسی طرح الکحل شراب کا ایک لطیف جزو تو ہے، لیکن شراب کی طرح کبھی حصولِ سرور و نشاط کی غرض سے استعمال نہیں ہوتا۔ اور جو نتائج بد شراب سے پیدا ہوتے ہیں، وہ کبھی الکحل سے حاصل نہیں کیے گئے۔ اس لیے عرفاً اور لہٰذا شرعاً الکحل پر لفظ شراب یا خمر کا اطلاق

نہیں ہو سکتا۔

شراب (خمر) کیا ہے؟ البین النووی میں ہے:

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان عمر قال علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ امابعد ایھا الناس فانہ نزل تحریم الخمر وھی من خمسۃ من العنب والتمر والعسل والحنطۃ والشعیر والخمر ما خامر العقل

یعنی فرمایا کہ شراب حرام ہے اور وہ عام طور پر پانچ چیزوں یعنی انگور، کھجور، شہد، گیہوں، جَو، وغیرہ سے تیار ہوتی ہے۔ اور شراب کی مجمل تعریف یہ ہے کہ وہ عقل کھو دے۔

مذکورہ بالا شکر یا نشاستہ دار اشیاء کو ایک خاص درجۂ حرارت پر جو ابتدائی خمیر کا موجود گی میں خمیر کیا جاتا ہے، تو شکر یا نشاستہ کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ جب اسے کشید کیا جاتا ہے تو یہ تبدیل شدہ نشاستہ یا شکر (یعنی الکحل) اور چند دیگر اجزاء اور خوشبوئیں کھنچ آتی ہیں۔ اس کو زیادہ صاف کر کے اور چند اجزاء مفرحہ کے مزج و آمیزش کے بعد کہنہ کرنے کے لیے بند کر دیا جاتا ہے اور جب آمیں حسب پسند ذائقہ اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے تو اُسے سرور و مستی کے خاطر استعمال کیا جاتا ہے اسی شے کو شراب، خمر، مئے ناب، دخت رز وغیرہ کے نام دیے گئے ہیں۔ اس میں ایک بات یہ ہے کہ یہ جسکے منہ لگ گئی وہ اُسی کا ہو رہا۔ اسی کو پی کر بیخود ہونے والے رفتہ رفتہ خود اسی کے لیے بیخود ہونے لگتے ہیں۔ اور کہیں کے نہیں رہتے۔ اسکے استعمال سے اعتدال کی نہایت نازک حدود کے اندر رہ کر چند فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ذہنی قوی کی جلا، ہاضمہ اور اشتہا کی تیزی وغیرہ۔ لیکن اسکی برائیوں کی فہرست اتنی طویل ہے اور اسکی مضرات کا پلہ اس قدر بھاری ہے کہ اسکے منافع ان کا پاسنگ بھی نہیں ہو سکتے: فیھما اثم کبیر و منافع للناس، واثمھما اکبر من نفعھما۔

غالباً یہاں اس اجمال کی تفصیل کی ضرورت نہیں کہ شراب ناب افراد کے لیے وہ تم شیریں ہے جو اُن پر بیک وقت اخلاقی بیماریوں، جسمانی ہلاکتوں اور مالی تباہیوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ جسم قوم، ملت کے لیے جو قاتلانہ رنگ وہ تیغ شعلہ ریز ہے جو اس کا بند بند اور جوڑ جوڑ جدا کر دینے کے لیے کھلی رہتی ہے۔ انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر۔ اور یہ خمر خمار وہ زہر ہے جو اپنے ابتلا کی روحانی آنکھوں کو اُس رسی کے دیکھنے سے اندھا، اور اُس بندھن (حبل اللہ) کے محسوس کرنے سے بے حس کر دیتی ہے، جو خالق کو مخلوق سے مربوط کیے ہوئے ہے۔ وینھکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ۔

شراب کا اثر براہ راست دماغ کے اُن حصص پر ہوتا ہے، جو عقل و ادراک اور فہم و خرد

یعنی اعلیٰ ملکیت کے خزائن ہیں۔ اسکے عمل سے وہ حصص اس طرح اثر پذیر ہوتے ہیں کہ سب سے پہلے، سب سے اعلیٰ، اور سلسلۂ ارتقاء میں سب سے آخر پیدا ہونیوالی ملکی قوت ماؤف ہو جاتی ہے۔ مثلاً احساس ذمہ داری سب سے اول مفقود ہوتا ہے۔ اس سے بعد اس سے کم درجہ کی ملکی قوت سلب ہوتی ہے اور علیٰ ہذا قانون تنقیص law of dissolution کے ماتحت ایک ایک کرکے سب ملکی قوتے مختل ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفلی، حیوانی و شہوانی قوتے بے لگام ہو جاتے ہیں اور ان میں انتہائی تحریک اور بدترین انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس عقلی بیہوشی کے دوران میں مبتلائے شراب، زنا، چوری، قتل و غارت جیسے ہر بُرے سے بُرے اور خبیث سے خبیث گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اسی باعث شراب کو اُم الخبائث کہا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عثمانؓ وغیرہ سے مروی ہے۔

مسلمانوں کو ان جسمانی، نفسی، روحانی، اقتصادی اور پھر طبی حیثیات سے مضرت رساں شے کے سموم اثرات سے بچانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے پہلے تو یہ کھول کر بتا دیا کہ اس شے میں خوبیاں بھی ہیں، لیکن اسکی برائیاں خوبیوں سے کہیں بڑھی ہوئی ہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر اس کے غیر معتدل استعمال سے روکا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے ہادی علیٰ (کل علم کے علاوہ ہمارے ناقص و محدود تجربہ و مشاہدہ میں بھی یہ بات غیر مشتبہ اور قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ انسان کی کمزور و حریص طبیعت اس بارے میں اعتدال پر نہیں رہ سکتی، تو اس کا استعمال قطعی طور پر حرام اور ناجائز قرار دے دیا گیا۔

شراب کئی طرح سے پی جاتی ہے: کبھی خالص اور کبھی ملاوٹ کے ساتھ۔ ملاوٹ کی چیزیں پانی، سوڈا، برف، عرقیات اور دیگر فرحیات ہیں۔ بعض لوگ شراب کو اس تاویل اور بہانے سے پی سکتے تھے کہ شراب کی مقدار سے زیادہ حلال و طیب لوازم کی آمیزش کریں۔ اور کہہ دیا کہ ہماری مشروب میں حلال جزو غالب اور حرام مغلوب ہے، اس لیے اسکے استعمال میں کون حرج ہے؟ اس لیے رسول خدا (فداہ ابی و امی) نے صاف صاف فرما دیا۔ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرامٌ جس کی قاضی شوکانی اور طحاوی نے کما حقہٗ تفسیر کر دی ہے۔ یعنی خواہ شراب میں کیا کچھ ہو۔ کتنا کچھ بھی ملا کر کیوں نہ پیو، یہ حرام ہے پر حرام ہے۔

رہا نجاست کا سوال! سو اسکا کوئی نقلی ثبوت نہیں۔ بعض لوگ اس فرمان ربی کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں: کہ انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان۔ فاجتنبوہ

لعلکم تفلحون۔ لفظ رجس معنوی پلیدی کے لیے بھی مستعمل ہے اور اس سے بعض اوقات وہ ناپاکی بھی مراد لی جاتی ہے جسکے چھونے سے ہاتھ اور جسکے لگ جانے سے کپڑا ناپاک ہو جاتا ہے۔ یہاں معنی اول تو یقیناً مراد ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں پچھلی تین چیزوں یعنی میسر، انصاب، ازلام کی نسبت جیسی ناپاکی کا معنی تو غالباً فقہاء میں سے کسی نے مراد نہیں لیا، بلکہ ان سب چیزوں کو معنوی برائیوں کے باعث قابل اجتناب قرار دیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی اگلی آیت میں برائیاں کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ رہا "خمر" تو یہ اُم الخبائث ضرور ہے، جسکے سموم کی تشریح اوپر کر چکا ہوں۔ اور اسکو فقہاء نے نجس فرمایا ہے۔ سو یہ نجس ہوا کرے، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہم تو الکحل کے غیر نجس ثابت کرنے کے درپے ہیں۔

اب الکحل کی ماہیت پر غور کریں۔ الکحلوں کی فہرست نہایت طویل ہے جن میں میتھل Methyl ایتھل Ethyl بیوٹل Butal، پروپل وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب آکسیجن، ہائیڈروجن اور کاربن سے مرکب ہیں اور ہر ایک کا مخرج و مبدأ جدا جدا ہے۔ مثلاً اگر میتھل لکڑی سے حاصل ہوتی ہے، تو ایتھل شکر یا نشاستہ سے تیار ہوتی ہے، وقس علی ہذا۔ ان سب کے خواص میں باہمگر مشابہت سی ہے، جیسے ایک خاندان کے مختلف افراد میں ایک گونہ یگانگت سی ہوا کرتی ہے۔ یہاں ہمیں محض ایتھل الکحل سے بحث ہے۔ جسکو بڑے پیمانے پر حاصل کرنے کے لیے شکر یا نشاستہ کی تخمیر کی جاتی اور جو قدرتی طور پر تھوڑی سی مقدار میں انگور، کھجور، نبیذ وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ خمیری روٹی پکانے کے لیے جب آٹے کو خمیر کیا جاتا ہے تو تھوڑا سا نشاستہ تحلیل ہو کر الکحل اور کاربانک ایسڈ گیس پیدا کرتا ہے۔ یہ گیس ہی خمیری روٹی کو مسامدار بناتی ہے۔ اور الکحل خمیری روٹی کے تجزیہ سے الگ نکالی جا سکتی ہے۔ چنانچہ الکحل ایک خالص کیمیائی مرکب ہے۔ جو ایک طرف تو شراب جیسی حرام چیز اور دوسری طرف انگور، خمیری روٹی اور نبیذ جیسی حلال و طیب چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ الکحل کا شراب کے حکم میں نہ ہونے کا ایک مزید ثبوت یہ ہوا کہ شراب کی تو ہر قلیل سے قلیل مقدار حرام ہے۔ لیکن ہر وہ چیز حرام نہیں قرار دی گئی جس میں الکحل موجود ہے۔ نبیذ کا استعمال خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور کیمیائی امتحان سے نبیذ میں ابتدا سے الکحل ثابت ہوتی ہے۔ گرمیوں میں تیسرے دن نبیذ میں الکحل کی مقدار اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس سے سرکہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اُسوقت نبیذ پہلے مکروہ اور پھر حرام ہو جاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی چیز میں الکحل کا پایا جانا اُسے حرام نہیں کر دیتا، بلکہ جس وقت

الکحل کی مقدار اس قدر بڑھ جائے کہ سُکر پیدا ہونے لگے، اُسوقت وہ چیز حرام ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی خمر کی تعریف "ما خامر العقل" تو ابدالاباد تک صحیح ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس کی تفسیر "مافیہ الکحل" سے کرنے لگے تو یہ سراسر غلطی ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) الکحل شراب کے حکم میں نہیں۔ اس لیے کہ:—

(ا) الکحل عرفاً شراب نہیں۔

(ب) کئی ایسی چیزیں جن میں الکحل موجود ہے تصریحاً کتاب وسنت سے حلال ثابت ہیں۔

(۲) حرمت کا معیار سُکر ہے۔

(۳) الکحل اُن معنوں میں نجس و ناپاک نہیں کہ جسکے چھو جانے سے ہاتھ اور لگجانے سے کپڑا مکاناً ناپاک ہو جائے۔

اس سے یہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ (۱) پینے کی ادویہ میں، اگر ناگزیر ہو تو الکحل کا استعمال اتنی مقدار میں جائز ہے جس سے سکر پیدا نہ ہو۔ البتہ شراب ہر مقدار میں حرام ہے۔ اور اسکا سوائے اس صورت کے استعمال جائز نہیں جبکہ اس کے بغیر جان نہ بچ سکے۔ اور وہ بھی محض بقدر ضرورت (غیر باغٍ ولا عادٍ)۔

(۲) چونکہ الکحل یا شراب ناپاک نہیں، اس لیے جلد پر ضماد کرنیوالی دواؤں کو الکحل میں تیار کرنے سے شریعت مانع نہیں۔ اسی طرح فرنیچر کی پالش اور نقاشی کے لیے الکحل کے استعمال کی اجازت بلا خوف تردید دی جاسکتی ہے۔ ان اُرید الا الاصلاح ما استطعت۔ وما توفیقی الا باللہ۔ علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

یحییٰ محمد عبدالقوی (متعلم کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج۔ لاہور)

غزل

جوشِ جنوں میں آج لڑیں گے ہوا سے ہم
چھینٹے بوئے گیسوئے جاناں حبا سے ہم

جاتا ہے تو جہاں ہمیں کھل جائے گا ضرور
اک روز پوچھ لیں گے ترے نقشِ پا سے ہم

کہتے ہیں مجھ سے بڑھکے وہ گیسوئے دلستاں
اتنے بڑے ہوئے ہیں کسی کی دعا سے ہم

پیدا ہوا اثر تو خوشی سے اُچھل پڑے
ہاتھوں کو بلند ہو گئے دستِ دعا سے ہم

شرما کے تم نے حشر میں کیوں سر جھکا لیا
کیا جانے کس کو مانگ رہے تھے خدا سے ہم

مہجور مر کے ہوتے ہیں احباب سے جدا
منہ پھیرتے ہیں آج طریقِ وفا سے ہم

سراج الدین مہجور
(نبیرۂ صہبائی مرحوم دہلوی)

صبح عید کے دو ترانے

دیکھ زاہد کیا سہانی ہے فضائے صبح عید
کم نہیں حوروں سے حسنِ دلکشائے صبح عید

غنچۂ دل روزہ داروں کے کھلے جاتے ہیں کیوں
کیا چلی آتی ہے جنت سے ہوائے صبح عید

کاش وہ دیتی مدینے سے صبا چن چن کے پھول
اور انھیں پھولوں میں بسجاتی قبائے صبح عید

شام سے جسکی خوشی میں جاگتے ہیں رات بھر
صبح ایسی دوسری کب ہے سوائے صبح عید

ساقیا کھلنے کو ہے قفلِ درِ میخانہ کشائے صبح عید
ہے کلیدِ ماہِ نو عقدہ کشائے صبح عید

کھد و رضواں لیکے آئے گلشنِ فردوس سے
نذر کو گلدستۂ تازہ برائے صبح عید

آرزوئے وصل میں ہو جاتی ہیں عمریں تمام
ہے غنیمت سال بھر پر یہ لقائے صبح عید

حوریں جام شیر لے کر آئی ہیں فردوس سے
مرحبا! تیری حلاوت اے دعائے صبح عید

شامِ غربت سے گلے ملتی ہو جن کی بیکسی
اُن غریبوں سے نہ پوچھو ماجرائے صبح عید

اب شفق و کھلا و ہندی قافیوں کی بھی بہار
تا کجا قیدِ اضافت میں ثنائے صبح عید

پھر تمنائے ہم آغوشی بر آئے صبح عید
پھر انھیں کوئی گلے مل کر سنائے صبح عید

مالکِ دیدار کی قسمت جگائے صبح عید
سال بھر پر پھر پیامِ دید لائے صبح عید

ہے کہاں ساقی مہینا بھر کے پیاسوں کے لیے
چشمۂ کوثر سے خم بھر بھر کے لائے صبح عید

سال بھر بچھڑے ہوئے احباب کو لا کر کوئی
صورتِ شیر و شکر باہم ملائے صبح عید

جس سے ہو تکلیف ایسے ملنے جلنے کو سلام
بے تکلف آئے جو ملنے کو آئے صبح عید

جن کی راتیں کٹ گئیں کہ دن تک خوابِ غفلت میں کٹیں
کون ایسے سونے والوں کو جگائے صبح عید

سال بھر پر بھی کسی کا درد جو سنتے نہیں
کون انھیں رودادِ دل کوئی سنائے صبح عید

آنسوؤں سے آپ منہ دھو لیتے ہیں اپنا یتیم
اور انکو کون نہلائے دھلائے صبح عید

جن غریبوں کے ہوا شکوں کو نہ دامن تک نصیب
جامۂ نو کون انھیں لاکر بنائے صبح عید

نغمۂ رنگیں میں رنگِ نالۂ موزوں بھی ہے
پھر شفق تیرا ترانہ کون گائے صبح عید

شفق حماد پوری

جے - ڈبلو - رینالڈس

ہماری اُردو دنیا رینالڈس کے نام سے تو بخوبی واقف ہے لیکن اسکے سوانحی حالات سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہوگی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انگریز مصنفوں نے رینالڈس کے ساتھ سخت تعصب سے کام لیا ہے۔ اس کا ثبوت اسائیکلوپیڈیا سے مل سکتا ہے۔ جس میں معمولی سے معمولی انگریزی ادیب کا تو ذکر ہے، لیکن رینالڈس کا کچھ حال نہیں لکھا۔ حالانکہ وہ دیبنے نانے کا ایک مشہور اور زبردست ناول نویس تھا۔ مختلف کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی سے مجھے جو کچھ بھی رینالڈس کے متعلق معلوم ہو سکا ہے اُس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اعظم کریوی

جارج ولیم میک آرتھر رینالڈس ۲۳ - جولائی ۱۸۱۴ء کو پیدا ہوا - اس کا باپ جارج رینالڈس بحری فوج میں کپتان تھا۔ اس کی ماں "میری" ایک متوسط درجے کے آدمی کی بیٹی تھی اور بقول ایک مؤرخ کے "فرانسیسی عورتوں سے زیادہ نیشن پر جان دیتی تھی" چونکہ انگریزی علم و ادب کے علاوہ لاطینی، یونانی اور فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھی، وہ اکثر اپنے ننھے بچے کو لوتھر اور کلف کی سوانحعمریاں، ملٹن کے کارنامے، گبن اور ہیگ بھری اور بڑی سیاحوں کے حالات، شیکسپیر، میسنجر وغیرہ کے ڈرامے سُنایا کرتی تھی۔ رینالڈس کو بھی خوب دلچسپی ہوتی تھی اور وہ اکثر اپنے دل میں سوچا کرتا "یا اللہ! کیا وہ بھی کوئی دن ہوگا جب میری بنائی ہوئی کہانیاں بھی لوگ پڑھیں گے اور اپنے بچوں کو سُنایا کریں گے"۔

میری نہایت عقلمند اور دُور اندیش عورت تھی۔ اس کا معمول تھا کہ جو کہانیاں وہ رینالڈس کو سُناتی، اُس سے سُن بھی لیا کرتی تھی، اور اسکے انعام میں خوبصورت مجلد کتابیں دیتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ بڑے دن کے موقعے پر "میری" نے رینالڈس کو شیکسپیر کے ڈراموں کا مجموعہ، تصویریں اور ایک سُنہری انجیل انعام میں دی۔ دُنیا کا دستور ہے کہ کھیل کود کے دنوں کے بعد بچوں کو تعلیم دلائی جاتی ہے اسکے برخلاف "میری" نے پیدائش ہی سے رینالڈس کو تعلیم و تربیت دی۔ وہ اس سے بخوبی واقف تھی کہ یہ صرف ماں ہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ لارڈ میکالے نے ایک نظم سات برس کی عمر میں لکھی تھی۔ چنانچہ ماں ہی کی تعلیم نے بچپن ہی سے رینالڈس میں بھی علمی مذاق پیدا کر دیا تھا، اور ابھی وہ چھ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اُس نے "ملٹن" اور "کوپر" کی دو چار نظمیں اور اسکاٹ کے گیت حفظ کر لیے۔

جب ریناالڈس نے اپنی عمر کی چھٹی منزل میں قدم رکھا تو وہ "ایش گر" کے ابتدائی مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں ریناالڈس کا معمول تھا کہ جب اُسکو فرصت ملتی تو وہ اپنے ہم جماعتوں کو "پلگرم پراگرس" "رابن سن کروسو" اور "شیکسپیئر" کی کہانیاں سُنایا کرتا، مختلف مضامین پر لکچر دیتا۔ ایک دن اسکول ماسٹر نے چھپ کر ریناالڈس کا لکچر سُنا تو وہ بہت خوش ہوا، اور بجائے ناراض ہونے کے اُسکو شاباشی دی۔ اُس دن سے ماسٹر صاحب نے سب لڑکوں کو حکم دیا کہ وہ ہر سنیچر کو کوئی مضمون لکھ لایا کریں۔ اس کے لیے اسکول میں ایک علمی اور ادبی انجمن بنائی گئی جس کا سکرٹری سب نے بالاتفاق ریناالڈس کو بنایا۔ دوسرے لڑکوں کے مضامین میں بچوں کے خیالات ہوتے تھے لیکن سکرٹری (ریناالڈس) کے مضامین میں افشا پردازی کے اعلیٰ نمونے ہوتے تھے۔

ماسٹر صاحب نے ایک مرتبہ اعلان کیا کہ مندرجۂ ذیل کسی ایک عنوان پر جس کا سب سے بہتر مضمون ہوگا اُسے عام جلسہ میں انعام دیا جائے گا

(۱) اہل سیف، اہل قلم اور مدبرانِ ملک میں سے ملک کے لیے سب سے زیادہ کون مفید ہے۔

(۲) شیکسپیر اچھا ہے یا ملٹن

(۳) ناول کے مطالعہ سے کوئی اخلاقی یا ملکی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں

(۴) سولزیشن کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترقی ہوتی ہے یا نہیں

(۵) غریب اچھے ہیں یا امیر۔

ریناالڈس نے مضمون نمبر (۴) پر طبع آزمائی کی اور اوّل درجے کا انعام حاصل کیا۔

جب ریناالڈس ابتدائی مدرسہ کی تعلیم ختم کر چکا تو اُس کے باپ نے اسکو سینڈ ہرسٹ کے فوجی کالج میں داخل کرا دیا، لیکن وہاں ریناالڈس کو کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ قواعد پریڈ سے وہ بہت جی چراتا تھا۔ فرصت کے وقت بجائے سبق یاد کرنے کے وہ مشہور انگریزی ناولوں کا مطالعہ کرتا۔ سینڈ ہرسٹ کالج میں اُس زمانے میں کوئی ادبی انجمن نہ تھی لیکن ریناالڈس کی علم دوست طبیعت نے وہاں بھی علم و ادب کا چرچا کر دیا۔ ایک رئیس زادہ مسٹر سنگ سے ریناالڈس گہری دوستی ہو گئی جس سے وہ آزادی کے ساتھ علمی و ادبی گفتگو کیا کرتا۔ ریناالڈس کی خوش قسمتی سے کالج میں ایک علم دوست پروفیسر آ گئے اور اُنھوں نے اعلان کیا کہ "مناظرۂ شمشیر و قلم" پر جس کا مضمون سب سے اچھا ہوگا اُسکو انعام دیا جائے گا۔ بھلا ریناالڈس کا قلم ایسے موقع پر جولانیاں کیوں نہ دکھاتا، اس نے بڑا زبردست مضمون لکھا اور اُسی کو انعام ملا۔

فوجی کالج میں گانا بجانا، تیرنا اور تقریر کرنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ رینالڈس نے دو مرتبہ تیرنے میں انعام پایا اور وہ بہت جلد کالج کا مشہور پیراک ہو گیا۔ وہ بانسری بجانے میں بھی بڑا مشاق تھا۔

سالانہ امتحان قریب تھا اچانک رینالڈس کا دوست ٹیگ بہت بیمار ہو گیا۔ رینالڈس نے اسکی تیمارداری میں اپنے پڑھنے لکھنے کا بھی کچھ خیال نہ کیا اور رات دن اُسی کے پاس رہا۔ جب ٹیگ اچھا ہو گیا تو اُس نے اپنے باپ کو جو خط لکھا اُس میں رینالڈس کی بہت تعریف کی۔ ٹیگ کے باپ نے رینالڈس کا بہت شکریہ ادا کیا اور بڑے دن کے موقع پر جس طرح کے تحفے ٹیگ کے لیے بھیجے ویسے ہی رینالڈس کو بھی بھیجے لیکن "ابراہم کوٹی" کی تصانیف کا مجموعہ رینالڈس کو خاص کر بھیجا۔ رینالڈس نے اس مجموعہ کا حد سے زیادہ شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ جب رینالڈس دُنیا کی اسٹیج پر ناولسٹ کے لباس میں نمودار ہوا تو اُس نے اپنے شہرہ آفاق ناولوں میں اُس مجموعہ کے بھی کچھ اقتباسات دیے۔

ایک مرتبہ ٹیگ کے والد نے رینالڈس کو اپنے یہاں مدعو کیا اور بڑی قدر کی۔ رخصتی کے وقت ٹیگ کی ماں نے ایک موتیوں کی مالا اور شیکسپیر کے کُل ڈراموں کا مجموعہ رینالڈس کو تحفہ میں دیا۔ اُس وقت سے ٹیگ اور رینالڈس یک جان دو قالب بن گئے۔

لطیفہ قواعد کی مشق کے لیے فوجی کالج سے دو میل کے فاصلے پر ایک چوڑی خندق بنوائی گئی تھی حکم تھا کہ جب ڈرل ماسٹر کسی لڑکے کو قواعد کرانے کے لیے کہے تو وہ اپنی جماعت کو "مارچ" کراتا ہوا اس خندق تک لیجائے اور "ہالٹ" (رُک جاؤ) کا حکم دے کر چُپ چاپ ۵ منٹ تک صف بستہ کھڑا رکھے اور پھر کالج کو واپس لائے۔ ڈرل ماسٹر لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن رینالڈس کو قواعد کرانے کا حکم ملا۔ رینالڈس لڑکوں کو کالج سے "مارچ" کراتا ہوا لے چلا۔ راہ میں شاید آپ علمی دنیا کی سیر میں محو ہو گئے۔ جب خندق کے سامنے رینالڈس پہونچا، تو خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور گھبراہٹ میں بجائے "ہالٹ" کے "مارچ" (بڑھے چلو) کا حکم دیدیا۔ جو لوگ کبھی فوج میں رہ چکے ہوں گے وہ فوجی قواعد اور قانون کی سختی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رینالڈس کے حکم کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو لڑکے سب سے آگے تھے وہ تو اوندھے ہو گئے اور دوسری صف والے اُن پر گر پڑے۔ رینالڈس کو اپنی اس حماقت کا کافی خمیازہ اُٹھانا پڑا۔ ڈرل ماسٹر نے انکی خوب مرمت کی۔ رینالڈس نے اسکے جواب میں کہا "میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا یہ فوج "ہالٹ" اور "مارچ" کے معنی سمجھنے پر بھی افسر کے حکم کی تعمیل کر سکتی ہے یا نہیں"۔ ڈرل ماسٹر نے دو سید اور رسید کیے، اور کہا "عذرِ گناہ بدتر از گناہ"۔

اُس دن سے رینالڈس کے دل میں کالج کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ باپ کے ڈر یا لحاظ سے پڑھتا تو رہا لیکن اس موقع کی تلاش میں رہا کہ کالج کو چھوڑ دے۔ "کورٹ مارشل" کا کھیل کھیلنے کے لیے ایک دن کالج میں "جھوٹا کورٹ مارشل" کیا گیا۔ اس کورٹ مارشل کا رینالڈس کے دل پر خاص اثر ہوا۔ اُس نے سوچا کہ "اگر خدانخواستہ میں بھی کسی قصور پر قید ہوا اور مجھے گولی سے اُڑا دینے کی سزا ملی تو بہت بُرا ہوگا ـــــ ایسی سپاہ گری پر لعنت ہے" اُسی دن اُس نے کالج کو چھوڑنے کا قطعی ارادہ کر لیا۔ باپ نے پہلے تو بہت سمجھایا، لیکن مجبوراً اجازت دیدی۔ چنانچہ رینالڈس نے ۱۳۔ ستمبر ۱۸۳۳ء کو کالج چھوڑ دیا اور اپنے دوست ینگ کے ساتھ ۲۷۔ اکتوبر ۱۸۳۳ء کو انگلینڈ کی سیاحت کے لیے روانہ ہوا۔ دو مہینے تک پہاڑی مناظر اور تاریخی مقامات کی سیر کرتا رہا یکم جنوری ۱۸۳۴ء کو لندن پہونچا اور وہاں کے تمام قابل دید مقامات کی سیر کر کے اپنے گھر واپس ہوا۔ کچھ دن ٹھہر کر پھر اپنے دوست ینگ کی ہمراہی میں اسپین کی سیاحت کی۔ اسی سفر میں رینالڈس نے اپنے ایک ناول کے لیے کافی مضمون حاصل کر لیا، جو بعد میں "پوپ جون" (شاہِ عزت و ننز) کے نام سے شایع ہوا۔ اسپین اور جبل طارق کی سیر کے بعد اس کا ارادہ کوہ الپس سے گزر کر روم جانے کا تھا کہ اچانک اس کو ماں کی سخت بیماری کی خبر ملی اور رینالڈس گھر واپس ہوا ویسے پہونچنے کے تھوڑے ہی دن بعد اسکی ماں "میری" نے انتقال کیا۔ اپنی پیاری ماں کی موت پر رینالڈس نے اتنا زبردست مرثیہ لکھا کہ سننے والے اور پڑھنے والے رو دیے۔

"میری" کی وفات کے کچھ عرصہ بعد رینالڈس نے سر والٹر اسکاٹ کے لیڈی آف دی لیک" لارڈ آف دی آئلز" وغیرہ کتابوں کے تاریخی مقامات دیکھنے کے واسطے اسکاٹ لینڈ کا سفر کیا اور وہاں سے فرانس پہونچا۔ پیرس پہونچ کر وہ اپنے دوست ینگ کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرا وہاں ینگ کے باپ کے ایک دوست فرانسیسی سوداگر مسٹر جیک سیورے سے ملاقات ہوئی۔ فرانسیسی سوداگر نے دونوں کی بہت قدر کی۔ رینالڈس نے ینگ کے ساتھ ایک دن پیرس کے مشہور تھیٹر میں ایک فرانسیسی مصنف کا نیا ڈراما دیکھا۔ اسی ڈرامہ سے رینالڈس نے اپنے سب سے پہلے ناول "پیٹر ریڈ سائڈ" کے لیے پلاٹ تیار کیا۔

فرانس کے تاریخی مقامات کی سیر سے فراغت پر دونوں دوست اٹلی پہونچے۔ گریگوری شانزدہم اس وقت پوپ تھے۔ انکے دربار میں پہونچکر انکی زیارت کی۔ مشہور آدمیوں کی قبریں دیکھیں، چند دلفگاروں کی عبادت کا جائزہ لیا۔ بعض ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے والے پادریوں کے کارنامے سُنے

جن کا آگے چل کر ریناڈس نے اپنے ناولوں میں خوب مضحکہ اُڑایا ہے۔ اٹلی کے شہر سے واپس ہو کر دونوں دوستوں نے اپنے گھر پر کچھ دنوں آرام کیا اور پھر روس کی سیاحت پر روانہ ہوئے اور پیٹرس برگ پہونچے۔ اسوقت نکولس جو ایک بڑا ظالم اور جابر بادشاہ تھا تخت سلطنت پر متمکن تھا۔ ۱۸۵۵ء میں یک تاتاریوں نے اتنی لوٹ مار کی کہ روسی انکے ہاتھوں سے تنگ آگئے اور انھوں نے اپنے ایک مقدس پادری سے دعا کرائی کہ اس کے غریب مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ کلمہ گو زندہ جلائے گئے۔ مسجد کو جسکے قریب اگلے فرماں رواؤں کے مزار تھے منہدم کرا کر گرجا کی بنیاد ڈالی گئی۔ شیر خوار بچوں کو تہ تیغ کیا، عورتوں کی بے عزتی کی اور اس مونسٹری (عبادت گاہ) کو جہاں کے پادری کی دعا سے انکے حسب اعتقاد مسلمانوں پر فتح حاصل ہوئی تھی اس قدر عزت دی کہ عرصے تک شاہی خاندان والے اس عبادت گاہ کی زیارت کو پیدل جاتے تھے۔ اس مقام پر جب ریناڈس پہونچا تو روسیوں کا کشدہ، بربادی، اور مسلمانوں کے ساتھ خوں ریزی کی داستانیں سُن کر اُس کا دل بھر آیا اور اپنے دوست نیگ سے کہنے لگا۔

"نیگ! مسیحیوں کے ساتھ مسلمانوں نے ہمیشہ اچھے سلوک کیے ہیں، پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ انھیں مسلمانوں کے ساتھ مسیحیوں نے کیوں ظلم روا رکھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علم و عقل، حق کی وحدت کا سبق بھی ہم نے مسلمانوں ہی سے پڑھا ہے۔ ورنہ ہم تو وہی ہیں جن کے آباؤ اجداد جنگلی درندوں کی طرح درختوں پر رہا کرتے تھے۔"

روس سے براہ فرانس و ڈنمارک دونوں دوست سویڈن پہونچے اور علم نباتات کے مشہور پروفیسر چارلس سن نی" سے ملاقات کر کے انگلینڈ واپس ہوئے۔ وہاں پہونچکر ریناڈس نے مضمون نگاری شروع کی۔ سب سے پہلے اس نے ڈاکٹر جانسن کے ایک ڈرامہ "شی اسٹوپس ٹو کنکر She Stoops to Conquer" پر نکتہ چینیاں کیں۔

ریناڈس کے نکتہ چیں قلم سے مشہور شاعر لارڈ بیرن بھی نہ بچ سکا۔ اس نے ایک مقام پر لکھا کہ "مجھے تسلیم ہے کہ بیرن نے اپنے قلم کے زور سے سر والٹر اسکاٹ کو میدان نظم میں شکست دی ہے لیکن ڈرامے میں وہ شیکسپیر کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتا"۔ اسکے ثبوت میں ریناڈس نے اتنا زبردست مضمون لکھا کہ اسوقت کے بڑے بڑے نقاد دنگ رہ گئے۔

۱۸۳۴ء میں ریناڈس نے اپنے مضامین کا رنگ بدل دیا اور چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ انکو پڑھ کر اُس زمانے کے مشہور نقاد لارڈ فرانسس جیفری کو سخت مغالطہ ہوا۔ اور

انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ "ہو نہ ہو ان کہانیوں کا مصنف یا تو خود اسکاٹ ہے یا "رابرٹ سوتھی" Robert Southey دھوکے میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ رینالڈس کی تصنیف کردہ کہانیوں میں اسکا پورا نام نہ ہوتا تھا بلکہ "گمنام" "ایکس وائی زیڈ" وغیرہ لکھا ہوتا تھا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا کہ "گمنام" کی کہانیاں سر والٹر اسکاٹ کی کہانیوں سے بھی زیادہ سبق آموز اور دلچسپ ہوتی ہیں"۔ جب رینالڈس کو خاص و عام کی باتوں کا پتہ چلا تو اُس نے ناول لکھنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اُس نے اپنا پہلا ناول "پے، رے، سائڈ" (باپ کا قاتل یا ناخلف) ۱۸۳۵ء میں شایع کرایا۔ اُسوقت اسکی عمر کیس برس کی تھی۔ مبصرین نے اسکے ناول پر خوب اعتراضات کیے۔ کسی نے لکھا "صرف و نحو کی بہت غلطیاں ہیں" کسی نے رائے ظاہر کی "زبان کی بہت غلطیاں ہیں۔ انشاپردازی کا طریقہ اچھا نہیں ہے"۔ اسکے برخلاف بہت سے سنجیدہ مضمون نگاروں نے دل کھول کر تعریف کی۔

پہلے ناول کے شایع ہونے کے بعد کچھ عرصے تک رینالڈس خاموش رہا اور اُن نقائص کی اصلاح میں کوشش کرتا رہا جن کی طرف لوگوں نے توجہ دلائی تھی۔ اور پھر یورپ کے اُن ملکوں کی سیر کو نکلا جنکو اسنے پیشتر نہیں دیکھا تھا۔ واپسی پر اس نے "ڈکنس" کی مشہور تصنیف "پک وک پیپر" کے طرز پر لیکن ایک نئے پیرایہ میں "پکوک ابراڈ" ۱۸۳۶ء میں لکھی، جو بہت مقبول ہوئی۔ پھر تو اُسکا رنگ جم گیا اور اس نے یکے بعد دیگرے ایسے ایسے ناول تصنیف کیے کہ ان لوگوں نے بھی جنھوں نے کبھی اسکی بُرائی کی تھی تعریف کرنے لگے۔

جب یورپ کی سیر سے رینالڈس کا دل بھر گیا تو اُس نے تُرکی کا سفر کیا، جہاں سے وہ اپنے ناولوں کے لیے کافی مواد جمع کر لایا۔

۱۸۴۰ء میں رینالڈس نے پالیٹکس کی طرف توجہ کی اور ملکی انتظام پر ایسے زوردار مضامین لکھے کہ وہ پالیٹکس میں بھی مشہور ہو گیا۔

اخبار "لندن ڈسپیچ" کی مالک غیر کی خبروں کا وہ عرصے تک ایڈیٹر رہا۔ اسکا قول تھا کہ "وہ اخبار نویس بے ایمان ہے جو اپنے مخالف کی رائے کو اخبار میں جگہ نہیں دیتا" چنانچہ ایڈیٹری کے زمانہ میں رینالڈس نے اپنے اس قول کو ہر طرح سے نباہا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کے مالک سے رینالڈس نے نبنی اور اُس نے ۱۸۴۶ء میں اخبار سے قطع تعلق کر لیا۔ اور پھر تحریر و تقریر سے اپنے ملک کی خدمت کرنے لگا۔ انگلستان کے سرمایہ دار اپنے یہاں کے غریب مزدوروں سے جبر اور سختی سے کام لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ رینالڈس کو جب اسکی خبر ملی تو اس نے مزدوروں کی حمایت میں "سیمسٹریس" (سوزن عشق)

کے نام سے ایک ناول شایع کیا جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔

پولٹیکل مذاق کے لحاظ سے رینا لڈس لبرل تھا۔ بقول بعض "بریڈلا اور گلیڈ اسٹون کا ہمخیال تھا"۔ انھیں خیالات کی اشاعت کے لیے رینا لڈس نے ایک ہفتہ وار اخبار "ملکی معلم" نکالا۔ پہلا ہی نمبر تین ہزار شائع ہوا۔ ملک نے اُسکی خاص قدر کی۔ لیکن بوجوہات چند، کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد رینا لڈس نے پھر ایک ہفتہ وار اخبار "رینا لڈس ویکلی" نکالا۔ ۵ مئی ۱۸۵۵ء کو اس کا پہلا نمبر نکلا۔ اس میں پولٹیکل معاملات پر بڑے زبردست مضامین تھے۔ وزیر اعظم پر بھی چند اعتراض تھے۔ یہ پرچہ اس قدر مقبول ہوا کہ مینیجر کے پاس فائل کی کاپی کے علاوہ اور کوئی پرچہ باقی نہ رہا۔ وہ چار نمبروں کو دیکھکر" کارلائل پکار اُٹھے کہ" اگر رینا لڈس کا یہی حال رہا تو وہ کسی دن بڑا زبردست اہل قلم ہوگا" گلیڈ اسٹون بھی اکثر رینا لڈس سے ملکی معاملات میں مشورہ لینے لگے۔

انگلستان میں سب سے بڑی معراج پارلیمنٹ کی ممبری ہے۔ رینا لڈس کے دوستوں نے اسکو اسکی ترغیب دی۔ لیکن رینا لڈس نے پسند نہ کیا۔ ایک مرتبہ خود گلیڈ اسٹون نے رینا لڈس سے ممبری کا ذکر کیا تو اُس نے صاف انکار کردیا اور کہا" اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں، مگر میرا خیال ہے کہ جو ملکی خدمت پارلیمنٹ کے باہر رہ کر ہوسکتی ہے وہ اندر بیٹھ کر نہیں ہوسکتی"۔

پیرس کے زمانۂ قیام میں نیگ اور رینا لڈس کو دو قبول صورت معزز فرانسیسی لیڈیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ بڑی کا نام "میری" اور چھوٹی کا "ورجینیا" تھا۔ رینا لڈس کی چرب زبانی اور خوش مزاجی مشہور تھی۔ باتوں ہی باتوں میں پری کو شیشے میں اُتار لیا۔ "میری" نے نیگ کو اور "ورجینیا" نے رینا لڈس کو منتخب کیا۔ عرصہ تک جانبین میں خط و کتابت ہوتی رہی لیکن آگے چل کر "میری" نے وعدہ خلافی کی اور ایک دوسرے فرانسیسی رئیس زادہ سے عقد کرلیا۔ نیگ کو سخت افسوس ہوا اور وہ رینا لڈس کو لیکر فرانس پہونچا۔ لیکن "میری" کسی دوسری جگہ چلی گئی تھی۔ دونوں واپس ہوتے ہی کو تھے کہ "ورجینیا" نے رینا لڈس کو ایک خط لکھا اور قرار پایا کہ ابھی اتوار کو رینا لڈس سے ورجینیا کی شادی ہوگی۔ رینا لڈس خوشی کے مارے جامے سے باہر ہوگئے۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا گرجا میں وقت مقررہ پر "ورجینیا" نے بجائے "رینا لڈس" کے اپنے عقد کا اعلان "نیگ" کے ساتھ کیا۔ اس اعلان سے قدرتی طور پر رینا لڈس کی بہت دلشکنی ہوئی۔ لیکن اس نے ظاہراً طور پر اسکا اظہار اپنے دوست پر نہ ہونے دیا، بلکہ بڑی خوشی سے شادی میں شرکت کی۔

اس واقعے کے دو سال بعد رینا لڈس کی شادی ایک متوسط درجے کی لیڈی سے ہوگئی

ایک سال کے بعد یہ ایک لڑکا پیدا ہوا جو بڑا ہو کر باپ کی طرح ناول نویس ہو کر رینالڈس کے نام سے مشہور رہا۔ لیکن جو بات باپ کے ناولوں میں تھی وہ بیٹے کو نصیب نہ ہوئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ رینالڈس سے زیادہ رینالڈس کی شہرت نہ ہوئی۔

شادی سے دس سال کے بعد رینالڈس کو اپنی بیوی سے علیحدگی ہوئی۔ اور اسی غم نے اسکو بھی ۱۸۶۸ء میں راہی ملک بقا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لڑکا پیدا ہونے کے بعد رینالڈس نے ڈاکخانہ میں ملازمت کر لی تھی اور ترقی کر کے پوسٹماسٹر ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں اس کا معمول تھا کہ وہ خفیہ طریقہ سے خوابوں اور رمسیوں وغیرہ کے خطوط بڑی صفائی سے کھول کر پڑھ لیتا تھا۔ اور پھر احتیاط سے بند کر دیتا تھا۔ اور اس طرح سے اسکو شاہی محلوں کے "راز و نیاز" معلوم ہو گئے۔ چنانچہ وہ اس نے "اسرار دربار لندن" وغیرہ میں فاش کیا۔ لیکن مجھے اس بات کا ثبوت کسی سوانح نگار کی کتاب سے نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ جس طرح سے رینالڈس کی سوانحعمری کے ساتھ تعصب سے کام لیا گیا ہے اسی طرح اس معاملہ کا بھی کچھ ذکر نہیں کیا۔

رینالڈس کے مذہب کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ ایک امریکن سوانح نگار مشہور نقاد لکھتا ہے "میں اسے عیسائی نہیں کہہ سکتا۔ موحد بھی اسے نہیں کہہ سکتا۔ رینالڈس کی تصانیف سے تو مجھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ جس طرح الزبیتھ کے زمانہ کے لبرل آزاد منش اپنے زمانہ کے ڈرامہ نویسوں کی تصانیف سے لطف اٹھاتے تھے۔ جارج رینالڈس کی زبردست خواہش تھی کہ اسی طرح اسکے ناول بھی چند روزہ نہ ہوں بلکہ مستقل بھی اس سے وہی لطف حاصل کر سکیں جو مغرب والوں کو ملتا ہے۔ اس لیے اس نے ایسی شعبدہ بازی سے کام لیا ہے جس سے اسکے مذہب کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ اسکی زندگی کا زیادہ حصہ خیالی دنیا میں بسر ہوا۔ "سندباد" کی سیاحت کا جواب "الہ دین" کی سی خیالی عمارتیں اسکی خیالی دنیا کے عجائب گھر میں بکثرت موجود ہیں افشاپردازی کے ساتھ اس میں شاعرانہ مذاق بھی تھا۔ بذلہ سنجی، فصاحت، سلاست، استعارات و تشبیہات میں اسکا ثانی نہ تھا۔ اسکا روزانہ معمول تھا کہ وہ علی الصبح اٹھتا، ہمیشہ وقت پر کھانا کھاتا اور مطالعہ کے وقت بالکل فانی الکتاب ہو جاتا تھا۔ وہ بڑا نڈر اور راست گو تھا۔ خصائیت اور خود غرضی سے وہ مبرا تھا۔ اسکا قول تھا کہ "ہر کام کا ثمرہ انسان کی خوشیوں کو بڑھاتا اور مصیبتوں کو گھٹاتا ہے"۔ اردو میں رینالڈس کے قریباً سب انگریزی ناولوں کا ترجمہ ہو چکا ہے جس سے ہندوستان میں اسکی ہر دلعزیزی کا ثبوت ملتا ہے

اعظم کریوی (سابق ایڈیٹر اکبر)

سفرنامۂ اندلس

(۲)

موجودہ اسپین

میں نے سفرنامۂ اندلس کے متعلق لکھتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا کہ جن باتوں کا مجھے علم ہے وہ میں عرض کروں گا۔ اُس وعدے کا ایفا کرتا ہوں۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اسپین کے متعلق یہ نہ فرض کر لینا چاہیے کہ چونکہ یہ ملک یورپ میں ہے اس لیے لازماً ترقی یافتہ ہوگا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ملک کا ملک بےہنر و ملعون ہے۔ وہ نہ ترقی یافتہ ہے، نہ اُمید ہے کہ آیندہ ترقی کر سکے گا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ ہندوستان سے بدرجہا بہتر ہے، اور شاید بعض ممالک اسلامی سے بھی اچھا ہو۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ یورپ کے اور ممالک کے مقابلہ میں وہ ملک کیسا ہے۔ ایک یوروپین سیاح کا قول ہے کہ "اشتگان اسپین کو میں قرونِ متوسطہ کی صحیح اور زندہ تصویر سمجھتا ہوں"۔ یہی چند الفاظ موجودہ اسپین کا نقشہ، اور اُس ملک کے تمام تر تمدن کا خلاصہ ہے۔ میں اس قول کی صرف تفصیل کروں گا۔ مگر اسکو یاد رکھنا چاہیے کہ میں اسپین کا مقابلہ ہندوستان سے نہیں کر رہا ہوں جسکا تمغائے امتیاز غلامی ہے، بلکہ اُس ملک کا ذکر کرتا ہوں جو آزاد ہے اور یورپ میں واقع ہے۔

اسپین میں یورپ کے کسی اور ملک سے جائیے تو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ یہ یورپ کا ایک حصہ ہے۔ اور تمام ممالک تہذیب و تمدن میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں یا اپنی فکر ترقی میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر اسپین ہے کہ دنیا و مافیہا سے الگ ایک غرور و تمکنت کے ساتھ بیٹھا ہوا انتظار کر رہا ہے کہ تہذیب و تمدن خود آکر اُسکے پیر چومیں گے۔ نانا کہ بعض بعض شہروں میں زندگی کے کچھ آثار ملتے ہیں؛ کارخانے بھی چل رہے ہیں، تجارت کو بھی کچھ فروغ ہوا ہے، پولیٹیکل حقوق بھی مانگے جا رہے ہیں؛ مگر ذرا غور سے دیکھیے تو تمام ملک ہے کہ یہ تھی نیند سو رہا ہے۔ یہ آثار زندگی بھی دوسرے ملکوں کا اثر ہے! دوسرے ملک والوں کی کوشش کا نتیجہ۔ پرانے زمانے کے اکثر و بیشتر تبرکات زمانۂ حال اپنے پیچھے اتنی دُور چھوڑ آیا ہے کہ وہ نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں؛ مگر اسپین انکو اب تک پکڑے بیٹھا ہے۔

ص۵ - نیلمان ص۴۰۳

Serenos (رات کے چوکیدار) آپ سوا اسپین کے یورپ میں کہیں نہیں دیکھیں گے۔ اُن کا وہی پرانا لباس ہے، وہی پرانی لالٹین۔ ذرا جنگل میں نکل جائیے تو چرواہا رنگین کمبل اوڑھے ایک لمبے عصا پر تکیہ کیے ہوئے اپنی بھیڑ بکریاں چراتا ملے گا۔ کسی چھوٹے سے شہر یا قصبہ میں داخل ہوجیے تو سب سے پہلے آپ کو مسلمانوں کے بنائے ہوئے کسی مضبوط و مہیب پھاٹک میں سے گزرنا پڑے گا جو قرونِ وسطیٰ کی جنگوں کی یاد دلاتا ہوگا۔ اور اُسکے فوراً بعد محصل آکر دامن پکڑے گا۔ اگر کہیں اُسکو شبہہ ہوجائے کہ آپ اپنے اسباب کے متعلق غلط بیانی کر رہے ہیں تو بس "اللہ دے اور بندہ لے"۔ Posada (سرائے ہوٹل) پہونچیے تو عین آپ کے سامنے شراب والے کی چھوٹی سی دوکان نظر آئیگی کہ اگر ناک نہ بند کی تو دردِ سر موجود۔ اُس میں بہت سے سخت وحشت ناک دیہاتی بیٹھے ہوئے اپنی بھرّے کی صراحی سے شراب پیتے نظر آئیں گے۔

اسپین کی ایک خصوصیت "مساوات" ہے۔ ایک بھکاری بھی یہ چاہے گا کہ آپ اسکو اپنے برابر سمجھیں۔ اب خواہ اسکو اسلامی تبرک سمجھیے یا اہلِ اسپین کا سپاہیانہ انگریز یا فرض گنوارپن۔ انتہا ہے، کہ ایک گنوار یہ اُمید رکھے گا کہ آپ اُسے Senor (جناب) کہکر مخاطب کریں۔ حالانکہ اگر یہی لفظ خدا کے نام کے ساتھ بولا جائے تو خدا کو پکارنے والا سخت بے ادب اور بدتہذیب سمجھا جائیگا۔ جس سے آپ کی ذرا سی واقفیت ہوگی وہ آپ کو سلام کے بعد کچھ نہ کچھ دعا ضرور دے گا۔ یہ لوگ بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ جس طرح زمانۂ حال میں ہر شخص اپنے آپ کو دُور کھینچتا ہے وہ بات یہاں بالکل مفقود ہے۔

تجارت اور اُس سے نفع اُٹھانا یہاں تک زندگی نہیں سمجھا جاتا۔ وہ سپاہی ہیں اور سپاہی ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اُنکی بڑی دولت تلوار ہے اور بڑا شغل جنگ و جدل۔ بظاہر وہ سست اور نکمے ہیں، مگر بانکپن اُن کی رگ وپے میں پیوست ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اُنھیں روپیہ دیں اور اُسکے بدلے میں وہ آپ کو کام کرکے دیں۔ باشندۂ اسپین اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے کام کرے گا، روپیہ کمانے کے لیے نہیں۔

اسپین کو دیکھتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک اُس زنجیر کی ایک کڑی ہے جو افریقیہ کو یورپ سے ملاتی ہے۔ طبعی شکل و شباہت اور اپنی خصوصیات میں ہر ایک باشندۂ اسپین شمالی افریقیہ کی خصوصیات رکھتا ہے۔ کسی نے بہت صحیح کہا ہے کہ "اسپین اصل میں یورپین باپ اور افریقی ماں کا فرزند ہے"۔ اُسکے ناک نقشے میں عربیت زیادہ ہے اور یورپ کا اثر کم۔ عورتوں کی شکل و صورت

تو صاف صاف عرب ہے۔ اکثر عورتیں ایسے سانولے رنگ کی ہیں کہ اگر کوئی مجنوں انکو لیلیٰ کہدے تو بیجا نہ ہوگا۔ کپڑے پہنتی ہیں تو برخلاف تمام یورپ کے شوخ رنگوں کے۔ اُس پر ایک قسم کا چھوٹا دوپٹہ سر پر ہوتا ہے یا شال اوڑھتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں فی الحقیقت نقاب و برقعے کا باقیات الصالحات ہیں۔ عورتوں میں اکثر خصوصیات عرب کی ہیں۔ بعض صوبوں میں مردوں کا لباس بھی ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے، خاص کر پاجامہ۔

مکانوں کی تعمیر میں اب تک مسلمانوں کی وضع و قطع قائم ہے۔ صحن ضرور ہوتا ہے اور اُس کے اردگرد کمرے۔ بڑے مکانوں میں ایک حوض اور خانہ باغ کا ہونا ضروری ہے۔ طلیطلہ میں جتنے پائین باغ ہوتے ہیں وہ اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ غیروں کی نگاہ سے محفوظ رہیں یعنی پردہ دار ہوتے ہیں۔

کچھ اسی پر منحصر نہیں، تمدن میں قدم قدم پر مسلمانوں کا اثر نمایاں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ آٹھ سو برس کی بہترین و مہذب ترین قوم کا اثر یہ پانچ سو برس زائل نہیں کرسکے۔ نہ باوجود پوشش کرنے کے۔ ایک انگریز کا قول ہے کہ "مسلمانوں کا قدم اسپین میں تہذیب و تمدن پھیلانے کے لیے آیا تھا۔ نہ کہ ایک وحشی سلطنت کو زیر کرنے کے لیے ..... فاتحین میں بڑا حصہ بربریوں کا تھا۔ یہ لوگ اپنے ملک میں تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بالکل بچے تھے؛ مگر اسپین میں آکر اُنھوں نے حیرت انگیز طریق پر تھوڑے ہی سے زمانے میں وہ ترقی کی کہ اسپین کو اپنے ساتھ ہی مہذب و متمدن بنا دیا اور اس قوم کی زندگی میں بہترین جذبات داخل کردیے جو دیرپا ہیں، اور ممکن ہے کہ کبھی نہ مٹیں۔ دو برس کے عرصے میں وہ تمام سرزمین اُندلس کے مالک ہوگئے۔ .... وہ اپنے ساتھ مذہبی مسامحت لیکر آئے تھے اور صحیح معنی میں مروت کا جذبہ اُن ہی کا یورپ میں پیدا کیا ہوا ہے[1]"۔ گیٹے وٹے نے بہت صحیح کہا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ عرب مسلمانوں کا اثر اسپین سے مفقود ہوگیا ہے۔ وہ حقیقت میں اسپین کے جذبات و کردار کو نہیں سمجھتا۔ یہ صحیح کہ اُنکی سلطنت خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا، کے مصداق ہوئی کہ آئی اور نکل گئی؛ لیکن اُنکی بہترین تہذیب کی روح یہاں باقی رہ گئی ہے۔ اُنکی تہذیب وہ تہذیب ہے کہ جس کا ثانی اب تک دنیا نے نہیں دیکھا۔ مٹتے مٹتے بھی اپنے مٹانے والوں کو اپنے رنگ میں رنگ گئی۔ اہالی اسپین کے گفتار و کردار اور روزانہ مشاغل میں یہ اپنا گھر کیے ہوئے ہے۔ یہ کہنا کسی طرح بیجا نہ ہوگا کہ سرزمین اسپین کی نبض پر اگر ہاتھ رکھ کر دیکھیے تو یہ معلوم ہوگا کہ کسی مسلمان

---

[1] ہارٹے۔

کا خون اُس میں جاری ہے۔"

اسپین میں اب تک باغوں کا شوق چلا آتا ہے۔ مسلمانانِ اندلس کی ارواحِ جنتا کا اثر اگر سب سے زیادہ کہیں نظر آتا ہے تو باغوں کی وضع و قطع میں۔ مسلمانوں کے بنائے ہوئے باغ عیسائیوں کی آتشِ عناد کی نذر ہو چکے ہیں۔ اگر باقی ہیں تو مسجد قرطبہ کا صحن، ناچ، قصر اشبیلیہ اور قصر الحمرا کے باغ۔ یہی ان سنیوش لوگوں کے لیے نمونہ ہیں۔ وہی روشیں ہیں، وہی خیاباں، وہی عربوں کے درخت اور پھول وغیرہ۔

میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ تمام اسپین گویا ایک ناچ گھر ہے۔ ہر شہر اور صوبے کے ناچ الگ الگ ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب ناچ اندلسی تغیر عربوں ہی کے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط کے زمانے میں ان کا وفور ہوا تھا، اور اس وقت تو تمام اندلس رقص و سرود ہی کا ہو رہا ہے۔ انکے متعلق زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اسپین کی سب سے بڑی خصوصیت سانڈوں کی لڑائی ہے۔ مانا کہ جرأت و ہمت و استقلال کا یہ بہترین تماشا ہے، مگر اس میں بے زبانوں کے ساتھ جو بے رحمی ہوتی ہے وہ ایسی ہے کہ ہر شخص اُس سے متأثر ہوتا ہے۔ اہالی اسپین مجموعۂ اضداد ہیں اور یہ تماشا اسی کا ایک جلوہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اسکے بانی بھی مسلمان ہی تھے۔ مگر مجھے اسکے ماننے میں تامل ہے۔ اسکی کچھ قدر تفصیل سفرنامۂ اندلس میں موجود ہے۔ اب تو اس خوں ریز تماشے کے شوق میں کچھ کمی آرہی ہے۔ ہمارے پرنس آف ویلز جو ابھی اسپین ہو کر آئے ہیں، اس تماشے میں شامل نہیں ہوئے۔ اسکا بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ افسوس یہ ہو رہا ہے کہ شاید جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ بالکل ختم ہو جائے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ خدا کرے کہ ہو جائے اور جلدی ہو جائے۔

میں نے یہ باتیں ذرا تفصیل سے اس لیے لکھنی کی ہیں کہ یہ معلوم ہو جائے کہ چار سو تیس برس گزر جانے پر بھی مسلمانوں کے اثرات ہر ہر قدم پر اُس ملک میں معلوم ہوتے ہیں۔ زبان میں جو عربی الفاظ داخل و شامل ہیں اُن کا میں تفصیل سے ذکر نہیں کروں گا۔ مختصر یہ کہ اگر یہ الفاظ کسی طرح نکال دیے جائیں تو زبان بالکل قلاش رہ جائے گی۔ اسپین مسلمانوں کے احسان سے کسی طرح سر نہیں اُٹھا سکتا جو لوگ کہ ہندوستان کو مسلمانوں کے لیے اندلس بنا دینے کے مانع ہیں وہ اگر اسکو نہ بھولیں تو اُن کا احسان ہے۔

اسپین کے لوگ عجیب مجموعۂ اضداد ہیں۔ سست، نکمے، نفع و نقصان کی پروا نہ کرنے والے، عیش و دست، بے رحم اور اُس پر ذی مروت، معاملاتِ مذہبی میں تعصب کا بدترین نمونہ، بت پرست،

زود رنج اُس پر خلیق: غرض عجیب تضادیات کے لوگ ہیں۔ کسی مفید و مفر کام میں لگا رہنا وہ اپنا قال زندگی نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کی اُنکے یہاں قدر نہیں۔ وہ اس مقولہ پر کاربند ہیں کہ "آج کا کام کل پر ضرور ڈالو"۔ جس کام کو کیجیے اُس کا جواب ملے گا کہ "کل"۔ انتہا ہے کہ ریلیں بھی اپنے اوقات کی پابند نہیں۔ لمبا دفعات وقت مقررہ سے گھنٹہ بھر پیشتر ریل ہو پہنچ جاتی ہے۔ اور اکثر و بیشتر تین چار گھنٹے دیر میں پہونچتی ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ یورپ کے مہذب ممالک کا تو کیا کہنا ہے ہندوستان والے بھی اسکو گوارا نہ کریں گے۔ مگر اسپین والوں کے لیے یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اگر ریل وقت سے پہلے آکر نکل گئی تو وہ ۲۴ گھنٹے آئندہ تک اُس کے انتظار میں اسٹیشن پر پڑے رہیں گے۔ اور تین چار گھنٹے انتظار کر لینا اُنکے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

بے رحمی اُنکے خمیر میں ہے۔ کسانوں کا دارومدار بیلوں پر ہے۔ خچر، گدھے، گھوڑے سے بھی وہاں بڑا کام نکلتا ہے۔ وہ اپنے جانوروں کو اتنا مارتے ہیں کہ دیکھنے والے کانپ اٹھتے ہیں۔ اُن سے کہا جائے کہ بے ضرورت کیوں مارتے ہو تو وہ مذاق اُڑاتے ہیں۔

خود تکلیف اُٹھانے کے عادی ہیں۔ شاید اُنکے جسم کی جلد ہی ایسی ہے کہ وہ تکلیف اٹھا سکتے ہیں۔ مگر اس پر غضب تو یہ ہے کہ قدرت نے اُنکو اس قابل بنا دیا ہے کہ اگر وہ دوزخ کا ایندھن بنا دیے جائیں تو اُنکو تکلیف نہ ہوگی۔

خوں ریزی اُن کا ایسا مشغلہ ہے کہ جو جاذب نظر نہیں رہا۔ جو جتنا زیادہ بے رحم اور خوں ریز ہو وہی زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ایک انگریز[1] جو بطور سیاحت اسپین گئی تھیں۔ اور فی الجملہ وہاں کے لوگوں کی مداح ہیں لکھتی ہیں کہ "ایک روز میں نے دیکھا کہ چند لڑکوں نے ایک چڑیا پکڑ رکھی ہے اور اُسکے پاؤں میں دھاگا باندھ کر اُسکو ہوا میں اڑا رہے ہیں۔ میں نے چند پیسوں میں وہ چڑیا اُن سے لے کر اُڑا دی۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ وہی لڑکے پندرہ بیس چڑیوں کے پیروں میں دھاگے باندھے لیے چلے آرہے ہیں۔ اُنھوں نے وہ سب چڑیاں میری نذر کر دیں۔ میں نے معاوضہ میں اُنکو پیسے دینے چاہے تو سب نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم تو اس لیے لے کر آئے ہیں کہ ان چڑیوں کو اڑا کر آپ خوش ہوتی ہیں!" یہ ہیں اُن لوگوں کے جذبات بے رحمی اور نفع سے بیزاری یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ اتفاقی بات تھی، بلکہ یہی اُن کا قریباً روزمرہ ہے!

ایسے لوگوں کو کیا خلق ہونا چاہیے۔ برعکس اسکے وہ خلیق اور مہمان نواز ہیں۔ محتاجوں کی

[1] کونسٹن

دستگیری کرتے ہیں (اسکا ثبوت یہ ہے کہ وہاں گداگروں کا گروہ خیرات کے ٹکڑوں پر پلتا ہے) شفاخانے متعدد ہیں۔ کسی غریب پر کوئی مقدمہ بن جائے تو وکلا بغیر محنتانہ کے پیروی کرویتے ہیں۔ دوستوں کے لیے وہ اپنی جان تک دینے کو تیار رہو جاتے ہیں۔ مجھے شاید حسن عصبیت کا ملزم قرار دیا جائے مگر میں اسکو بھی مسلمانان اندلس کا اثر سمجھتا ہوں۔ جو لوگ وحشیان آسٹریا کے خصائص سے واقف ہونگے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے۔

خانگی جرائم اُنکے یہاں کم ہوتے ہیں۔ ولد الحرام اور اُس کی ماں سے سخت نفرت کیجاتی ہے۔ باوجود اس کے مسٹر ہیوے لاک ایلس کا یہ فقرہ ہے کہ "باشندگان اسپین ہمیشہ سے صحیح معنوں میں وحشی تھے اور اس وقت تک وحشی ہیں"۔

اہالی اسپین کو دیکھنا ہو تو شبیلیہ کے محفل رقص و سرود میں دیکھیے۔ مگر اس کا ذکر سفرنامۂ اندلس میں کافی آگیا ہے، اس لیے میں قلم انداز کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ رقص و سرود بت پرست قوم کے مذہب کا ایک جزو بن گیا ہے۔

اُنکے مذہبی جلوس کا حال بہت طویل ہے مگر ہوتا ہے قابل دید۔ مختصر یہ ہے کہ جمعینی سجدے، بیکار نذور، رقص و سرود، سب ہی کچھ ہے۔ عورت و مرد سب اس میں شامل ہوتے ہیں۔ گرعورتوں کا حصہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بدبختیں گرجاؤں کے علاوہ جہاں کہیں کوئی صلیب لکڑی دیکھتی ہیں وہیں سجدہ کردیتی ہیں۔

پندرہ یا سولہ برس کی عمر ہی میں شادی بیاہ کے چرچے شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر اس عمر میں کسی لڑکے کا تانا نہیں ہوتا تو وہ خاندان انگشت نما ہونے لگتا ہے۔ اگر شادی کے بعد کسی کا ذریعہ معاش نہیں ہوتا تو والدین دولھا دولھن دونوں کے کفیل ہوتے ہیں۔

کسی ملک کی اصل حالت شہر اور شہریوں کے دیکھ لینے سے نہیں معلوم ہوتی۔ اسکے لیے چھوٹے چھوٹے گانوؤں کو دیکھنا چاہیے۔ اسپین کے گانوؤں میں جائیے تو معلوم ہوگا کہ ملک میں کہیں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مضافات کے باشندے بہت ہی مفلس ہیں۔ اور جتنے مفلس ہیں اُتنے ہی گندے۔ (میں یہ بات یورپ کے مقابلے میں کہہ رہا ہوں نہ کہ ہندوستان کے مقابلے میں) وہاں اکثر گانوؤں میں سرائیں (Posada) ہوتی ہیں۔ اوپر کی منزل مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے مخصوص ہوتی ہیں نیچے کی منزل میں اصطبل ہوتا ہے اور شراب کی دوکانیں۔ لید، گوبر، پیشاب کی بُو بے طرح پریشان کرتی ہے۔ شراب کی دوکان میں گانوں کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ شراب تلخ و سیاہ و بدبو۔

دَور اُڑتے ہیں اور وہ شور ہوتا ہے کہ معاذ اللہ۔ مرغیاں الگ چیختی ہیں، بچے الگ شور مچاتے ہیں۔ مسجد کی صورت دُور ہی سے نظر آتی ہے۔ یوں ہونے کو مسافروں کی کوٹھریاں صاف ہوتی ہیں مگر آرام کہاں۔ کھانا بہت اچھا نہیں ملتا، مگر با فراط ہوتا ہے۔

حسب معمول ہر اتوار کا دن گویا گانوں والوں کی عید ہوتی ہے۔ اسی دن انکی شانِ بُت پرستی اچھی طرح معلوم ہوتی ہے۔ رقص و سرود دیوانگی کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔

قریباً ہر گانوں میں ایک مقررہ دن ہفتہ (بازار) لگتا ہے۔ آج یہاں ہے تو کل دوسرے قصبے میں۔ جہاں سایہ دار درخت دیکھے وہیں دوکاندار بیٹھ گئے۔ قرب و جوار کے مواضع کے گنوار خرید و فروخت کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہیں دیسی لباس کی گویا نمائش ہو جاتی ہے۔ مردوں کے نیلے رنگ کی لمبی سی ٹوپیاں، چھوٹے چھوٹے کوٹ، اُس پر سرخ صدریاں، اور چمکدار نیلے رنگ کے پاجامے یا پتلون پہنے ہوتے ہیں۔ عورتیں، مختلف رنگوں کے ریشمی رومال سر پر باندھتی ہیں۔ بھڑکیلے لہنگے (جو اونچے ہوتے ہیں مگر گھیردار) اور بہت چمکیلے کپڑے کی کُرتیاں پہنتی ہیں۔ خریدار اور دوکاندار آٹھ آٹھ دس دس، اور بعض وقت زیادہ، ایک جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہیں باتیں بھی ہوتی جاتی ہیں اور سودے بھی؛ اور وہ بھی اس طرح کہ دوکاندار زیادہ دام کہتا ہے خریدار کم کراتا ہے اور ایک شور ہوتا ہے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے، کہ لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہر شخص تہذیب سے بولتا ہے اور بہت خوشی سے سوال جواب کرتا ہے۔ پنجاب کے دوکاندار رائین کی کیفیت نہیں ہوتی کہ اول تو جواب ہی اُن سے بمشکل ملے گا؛ ملا تو سخت و کرخت، دام ذرا کم کہے اور "مہر" (رائین) صاحب نے جھٹک کر ترکاری چھین لی اور اگر سودا طے ہوا اور گاہک بغیر لیے چلا گیا تو جناب رائین نے دو چار منقطعات نذر کیں۔

ہر بازار کے ایک کونے میں ایک محراب کے نیچے ایک سنگین اَن گھڑ بُت نصب ہوتا ہے، جسکی نہ کوئی صورت بنتی ہے نہ شکل۔ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یہ مسیح یا مریم عذراء کا بُت ہے۔ اس بت کے پیروں کے نیچے ایک چراغ جلتا رہتا ہے۔ مرد ہو یا عورت اُسکے سامنے سے گزرتے ہیں تو پہلے سینے پر اُنگلی کے اشارے سے صلیب بناتے ہیں اور پھر سجدے میں گر پڑتے ہیں (سجدے سے میرا مطلب Kneel down ہے) بت پرستی بھی گویا خرید و فروخت کا ایک جزو ہے۔

خچر بیل گاڑیاں ایک طرف کھڑی رہتی ہیں۔ خچروں کی صورت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو دانہ پانی بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہوگا۔ لیکن اُن کا یہ عیب ساز و یراق سے چھپا لیا جاتا ہے۔

بیل گاڑیاں قریباً ہندوستان کے چھکڑے ہوتے ہیں۔ اُنکے پہیوں میں تیل نہیں دیا جاتا اور جب یہ چلتی ہیں تو اُن کی "چرخ چوں" سے کان بہرے ہوئے جاتے ہیں۔ گنواروں کا اعتقاد ہے کہ اس آواز سے جنگل کے بھوت بھاگ جاتے ہیں۔ کوئی شخص ایسی گاڑی نہیں لیتا جو آواز نہ دے۔

کھیتی باڑی کا کام عورت مرد دونوں مل کر کرتے ہیں۔ آلات زراعت قرون متوسطہ، یا اُس سے بھی پہلے کے استعمال ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے یہ لوگ اتنے مشاق ہوتے ہیں کہ کام بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ نہ صرف اسی موقع پر بلکہ عام طور پر جوتے پہننے کا رواج کم ہے۔ بھیڑیں بہت پالی جاتی ہیں۔ ایک ایک آدمی کے پاس پچاس پچاس ہزار بھیڑوں کا گلہ ہوتا ہے اور کیا جیسا (Cabana) کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر سال ایک ایک آدمی کے یہاں دس لاکھ بچہ (arnobe) بک اُون ہو جاتا ہے (عرابہ = ۲۵ پونڈ) اسپین کا اون یورپ بھر میں زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ اس ملک میں اونی کپڑا بہت کم بنتا ہے؛ تمام ہی اُون یورپ میں بھیجا جاتا ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ ہر عرابہ میں سے کچھ اُون مُردوں کو تواب پہونچانے کی غرض سے الگ کر لیا جاتا ہے۔ بھیڑوں کا پالنا نئی بات نہیں ہے، مرحوم مسلمانوں کے زمانے میں بھی تھیں۔ اُنکے لیے خاص قانون تھا، اور چراگاہیں چھوڑی جاتی تھیں۔ اب تو سارا اسپین اُفتادہ زمین ہے، اُس قانون کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

مزدوری پیشہ لوگ عموماً بہت ہی غریب ہوتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ جتنی مزدوری اُنھیں ملتی ہے اُس سے وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کیونکر پال لیتے ہیں۔ اپنے حال میں خوش ہیں اور اپنی کھال میں مست۔ اکثر کام جو اُنھوں نے اپنے ذمے لیے ہوئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اُنکے لیے کسی مکان میں بیٹھنے یا چھت کے نیچے کام کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مثلاً سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے وہ سینے کی مشین چلاتے نظر آتے ہیں، یا جوتے گانٹھتے، لوہار کا کام کرتے ہیں تو وہیں ایک بھٹی ہوتی ہے۔ مٹی کے برتن بناتے ہیں تو وہیں چاک لگا ہے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو چھوٹے موٹے دوکاندار ہیں؛ اور گانوں کی دوکانداری ہی کیا۔ رسّے، برش، آلات کشاورزی، گھوڑے کے زین وغیرہ۔ بس یہی اُنکی کائنات ہے۔

شاید دنیا بھر میں، اور نہ کم از کم یقیناً ہندوستان بھر میں پنجاب ہی ایسا خوش نصیب ملک ہے کہ جہاں عورتیں مردوں کے برابر مزدوری نہیں کرتیں[1]۔ اسپین اس معاملے میں ہندوستان کے ساتھ ہے

---

[1] چونکہ راقم کو سرزمین پنجاب سے انتساب نسبیت ہے اسلیے اپنے تجربہ سے کہہ سکتا ہے صرف یہی ایک خصوصیت پنجاب کو حاصل نہیں ہے بلکہ اس ملک کے لوگ اگر ہر امر فخر کرتے ہیں تو بجا ہے کہ ہمارے غریب ملک کے دیہاتی بھی جوتے پہننے اور بالوں کی پرستش میں

کہ وہاں کی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ ہر محنت و مزدوری میں برابر کی شریک ہیں - یہ سب بہت چست و چالاک ہوتی ہیں، اور بوڑھی ہوکر بھی مرد کے برابر محنت کرتی ہیں کھیتی باڑی میں بڑا حصہ انکا ہوتا ہے ہل چلاتی ہیں، بوتی ہیں، زمین کو الٹتی پلٹتی ہیں، انگوروں کے باغوں میں مالی کا پورا کام کرتی ہیں، بڑے بڑے بوجھ اٹھاتی ہیں، کشتیوں پر سے مال و اسباب اتارتی چڑھاتی ہیں - بوڑھی بوڑھی عورتیں بھی بھاری بھاری اٹھاریاں اور چارپائیاں اپنے سروں پر آسانی سے اٹھا کر لے جاتی ہیں - عموماً ننگے پیر رہتی ہیں - ایک تعجب خیز امر یہ ہے کہ باوجود اس محنت و مشقت کے انکے حسن پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا - ہر حال میں خوش و خرم نظر آتی ہیں اور ایک قسم کی سکراہٹ، جو اسپین کا خاصہ ہے، انکے چہروں پر رہتی ہے -

میں شاید ابھی کچھ اور عرض کرتا، مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہ تمہید بہت طویل ہوگئی - میں معاف رکھا جاؤں کہ میرے لیے یہ حکایت لذیذ تھی - مولانا الحاج ظفر الملک صاحب کے حکم کی تعمیل ہے، ورنہ مجھے تو یہ بھی توقع نہیں کہ یہ دفتر اطالل توجہ سے پڑھا بھی جائیگا - یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں اپنے سالہا سال کے تجربہ کی بنا پر عرض کر رہا ہوں کہ اندلس اور اسکے ارواح طیبات سے لوگوں کے دل اگر سخت نہیں تو سرد تو ضرور ہوگئے ہیں - میرو پیر قاضی ولی محمد صاحب کے جیسے دکھے ہوئے دل شاید ہندوستان تو کیا غیر ملکوں میں بھی کم ہی ہونگے - یہ واقعہ اسکا شاہد ہے کہ ایک "ملاں خیر" ملک کا بادشاہ (خلد اللہ ملکہ وشکتہ) یورپ جاتا ہے، وہاں کا ہر ملک اسکو آنکھوں پر بٹھاتا ہے، اور نہیں جاتا تو باوجود میرے توجہ دلانے کے اسپین! میں نے عرض کیا تھا کہ نہ جانے سے یقیناً آنکھیں چوندھیا جائینگی، پرانی تہذیب کے مزار کو دیکھنے سے آنکھوں کو کچھ تو ٹھنڈک پہونچیگی - لاکہ مسلمانوں کی قبریں تک وہاں نہ ملیں گی مگر انکی ارواح طیبات ایک ایک کلمہ گو کی دعاے مغفرت کی امید وار ہیں - یہ صحیح ہے کہ ساڑھے چار سو برس ہوئے کہ چراغ تہذیب بجھ چکا، مگر وہ ارواح ہیں کہ بندگان تشکیک کے کثیف جسم میں سانس بنکر موجود و نمودار ہیں -

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا سب شنیدہ ہے، صحیح وہی ہے جو مخدومی قاضی ولی محمد صاحب نے لکھا ہے - شنیدہ کے بود مانند دیدہ - اگلی قسط میں یہ دکھلانے کی کوشش کرونگا کہ اگر اسپین عیسائی ملک اور جناب کا سایۂ عاطفت اسکے سر پر نہ ہوتا تو اسکا انجام وہی ہوگیا ہوتا جو لکھنؤ یا کرناٹک وغیرہ کا ہوا - گو اس میں مجھے تو ذرا سا بھی شک نہیں کہ یہ سب کچھ کس بشنود یا نشنود سن گفتگوے سیکنم

پھول بے پروا ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بیس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

"کل کیا ہوگا"

جانبِ گورِ رواں کس کا جنازہ ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کیا ہوگا

صبح کو پھول مقدر کے کھلیں گے کس کے
اور بچھڑے ہوئے احباب ملیں گے کس کے

کون خنداں نظر آئے گا یہاں گل کی مثال
کون سبزے کی طرح ہوگا چمن میں پامال

ہوگا تاراج خزاں بخت کا گلشن کس کا
گل مقصود سے بھر جائے گا دامن کس کا

جج ادا کرکے فرائض سے ادا ہوگا کون
ظلمتِ کفر میں پابندِ بلا ہوگا کون

کون رو جائے گا تربت پہ کسی کی آکر
کون سو جائے گا آغوشِ لحد میں جا کر

تاجِ شاہی پہ کسے ناز زیادہ ہوگا
کج کلاہی پہ کسے ناز زیادہ ہوگا

نہیں معلوم کہ نظروں سے گرائینگے کسے
لوگ آنکھوں پہ بٹھا ئینگے کسے

راستہ جادۂ قسمت کا یہاں بھولے کون
اس چمن میں نہیں معلوم پھلے پھولے کون

گلشنِ صنعت و حرفت سے ملیں پھل کس کو
شاخِ سرسبز تجارت سے ملیں پھل کس کو

دورِ کل کس کا ہو کل کس کا زمانہ ہو جائے
کس کا دل تیرِ حوادث کا نشانہ ہو جائے

کہہ سکے کون کہ اقبال بڑھے گا کس کا
دولت و عمر و زر و مال بڑھے گا کس کا

کس کو خوشحال کریں گے کسے فاقا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

آج سب جمع ہیں شادی کے ہیں ساماں کیا کیا
محفلِ عیش میں ہے رنگ نمایاں کیا کیا

سازِ عشرت ہے کہیں تو ہے کہیں رنگِ طرب
کہیں نغمہ ہے خوشی کا کہیں آہنگِ طرب

خوش جمالوں کے کہیں ہوش رُبا نغمے ہیں
حسن والوں کے کہیں روح فزا جلسے ہیں

کہیں نوشاہ کے سہرے کے شگفتہ ہیں پھول
کہیں کمخواب مراسم کی سندیں ہیں معقول

کہیں کھانے ہیں چنے اور ہے دعوت کی دھوم
جگمگے اہلِ نظر کے کہیں خوباں کا ہجوم

پھر مغنی بھی کہیں دون میں گاتا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

جو ہے حاضر دردولت پہ دل و جاں سے ہے
آج دربار بڑی دھوم بڑی شان سے ہے

بندہ ایمان بگردیش آرائے ہیں در پہ
چوبدارانِ رفاقیش کھڑے ہیں در پہ

بجتی ہے کوئی کرتا ہے خوشامد کوئی
ساز و سامانِ تکلف کی نہیں حد کوئی
کہہ رہا ہے کوئی دربار سے پیغام انعام
نذر دیتا ہے کوئی تو کوئی کرتا ہے سلام
مرتبہ جس کا ہے جیسا وہیں پایا ہے مقام
دست بستہ صفِ آخر میں کھڑے ہیں خدام
اک صدا آئے گی تو اور ہی نقشا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

اپنی تقدیر پہ نازاں ہے بہت آج کسان
کھیت گندم کے دکھاتے ہیں قیامت کی شان
بالیاں خوب نمو پر ہیں کہ اصل اچھی ہے
لہلہاتے ہیں سبھی کھیت جو فصل اچھی ہے
پھیکے پڑیوں کے ہیں آج ہم آہنگ بہار
پھول سرسوں کے دکھاتے ہیں عجب رنگ بہار
دل میں دہقان کے ہے فصل تو اچھی ہوگی
ہاں اگر آفتِ ارضی و سماوی سے بچی
فائدہ ہوگا اگر فصل خدا کا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

کچھ خواتین مسلمان جو کہلاتی ہیں
بے تکلف ہمیں بے پردہ نظر آتی ہیں
نہ تو برقع ہے نہ چادر ہے نہ گھونگھٹ کا خیال
رہِ ایمان فیشن کا ہے تہذیب کی ہیں زندہ مثال
چشمِ مخمور میں شوخی کی جھلک غیرتِ سوز
سر پہ ہے شال تو ہے پاؤں میں ڈاسن کا شوز
خوش کلامی بھی تبسم بھی اشارا بھی ہے
داغ اسلام کے دامن پہ گوارا بھی ہے
حسن کی جلوہ فروشی کا عجب عالم ہے
پانوں پردے سے جو نکلے ہیں تو پھر کیا غم ہے
حوصلہ روز بروز اور زیادہ ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

سامنے دیکھیے ویرانہ میں دم بھر آکر
خشت کہنہ ہیں کسی جا کہیں کنکر پتھر
اس کی جو ریت ہے بنیاد ہے کاشانے کی
درس عبرت ہیں ہر چیز ہے ویرانے کی
دورِ گردوں سے مٹا گلشنِ شداد کی طرح
کبھی آباد یہی تھا دلِ برباد کی طرح
لوگ پھولوں پہ بصد عیش و طرب سوتے تھے
لطف آتے تھے یہاں جشن یہاں ہوتے تھے
گھر کے مالک نہ رہے اور نہ ہیں گھر باقی
ہڈیاں بھی تو نہیں خاک کے اندر باقی
کچھ نشانات رہے اُنکے گذرنے کے بعد
دہنِ گور کا لقمہ ہوئے مرنے کے بعد
پوچھتے کیا ہو جگر حال جو اپنا ہوگا
یہ کسی کو نہیں معلوم ہے کل کیا ہوگا

حکیم جگر صدیقی بسوانی

فہرست کتبخانۂ انڈیا آفس

مرتبۂ پروفیسر ہرمان ایتھے ایم اے پی ایچ ڈی سنہ ۱۹۰۳ء

یورپ کے کتبخانوں میں مغربی علوم و السنہ کے علاوہ مشرقی زبانوں کی کثرت نایاب اور قیمتی کتابیں ہیں جن میں سے بعض اہل یورپ کی علم دوستی کی بدولت شایع بھی ہوگئی ہیں۔ عرصے خیال تھا کہ اُردو کی یا اُسکے متعلق جو کتابیں یورپ کے کتبخانوں میں ہوں اُن کا پتہ چلے تو شاید اُن میں سے بعض کی اشاعت کا سامان ہو جائے۔ لاہور کے ایک علم دوست کو مہ فرما سے جو دس بارہ سال ہوے ولایت گئے اور بعض دیگر اصحاب سے جو وقتاً فوقتاً یورپ تشریف لیگئے یا وہاں کسی سلسلہ سے مقیم ہیں، اس بارہ میں تحریک کی گئی، مگر افسوس ہے کہ کسی صاحب نے توجہ نہ فرمائی۔ انڈیا آفس کے کتبخانہ کی فہرست ہماری نظر سے گزری تھی مگر اسکا موقع نہ تھا کہ ساری فہرست پڑھ کر اُردو کی کتابوں کے نام علیحدہ کر لیے جاتے۔ مسٹر سید حسن نے یہ خدمت انجام دیدی ہے اور اب ناظر میں اسکی اشاعت کی صرف یہ غرض ہے کہ یورپ میں جو بھی خواہان اُردو اسوقت موجود ہیں وہ توجہ فرما کر دوسرے کتبخانوں کی فہرستوں سے اسی قسم کی فہرستیں مرتب کرکے ارسال فرمائیں، تاکہ یہ فہرست مکمل ہو جائے۔ اُمید ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے لائق نائب مولوی غلام محی الدین زور بھی جو اسی قسم کے کاموں کے لیے لندن گئے ہوے ہیں، اس طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔ ایڈیٹر

نمبر شمار	نمبر فہرست	نام کتاب	مصنف	مضمون	سنہ	کیفیت
۱	۳۲۰	تذکرۂ علی حسینی (ذیل تذکرۂ تاکرد)	علی حسین	تذکرۂ شعراے اردو	سنہ ۱۱۶۵ھ	فارسی میں
۲	۲۹۹	ایضاً	″	″	سنہ ۱۲۱۶ھ	ٹیپو سلطان کے کتبخانہ میں تھی۔ فارسی میں۔
۳	۵۰۳	ایضاً	″	″	سنہ ۱۲۳۰ھ بنگالی	فارسی میں ۱۰۸ شعراء کے حالات درج ہیں
۴	۷۰۱	مخزن نکات (سعدی تا قائم)	محمد تیام الدین جانباز دہلوی	″	سنہ ۱۱۶۰ھ	فارسی میں

۵	۲۰۰۲	عیار الشعراء	خوب چند ذکا	〃	۱۲۰۹ھ حسب فرمائش استاد میر ناصر الدین ناصر۔ فارسی میں
۶	۲۰۰۳	تذکرہ گلشن ہند	مرزا لطف علی	〃	۱۲۱۵ھ اردو میں حسب فرمائش مسٹر گلکرسٹ۔
۷	۱۷۵۸	انتخاب اشعار رنختہ و فارسی	؟	نظم	؟
۸	۱۷۵۹	مثنوی مولود صادق۔ وفات نامہ پیغمبر	؟	〃	؟
۹	۱۷۶۰	قصیدہ شجمہ۔ قصائد مدح عبد القادر و رسول اللہ	؟	〃	؟
۱۰	۱۷۶۸	ایک رنختہ مثنوی	؟	〃	؟
۱۱	۲۰۱۹	ہندوستانی راگوں کا ایک مجموعہ	؟	〃	؟
۱۲		ہندوستانی راگوں کا ایک اور مجموعہ	؟	〃	؟
۱۳	۲۰۳۲	رنختہ نظم کا ایک مجموعہ	؟	〃	؟ سلطان ٹیپو کی فوج کیلئے مرتب ہوا
۱۴	۲۴۴۲	لغت رنختہ ہندی	؟	لغت	؟ ہندوستانی۔ فارسی
۱۵	۲۴۴۳	لغت	؟	〃	؟ فارسی۔ ہندوستانی
۱۶	۲۴۴۴	ایضاً	؟	〃	؟ ہندوستانی۔ فارسی
۱۷	۲۴۴۵	آئین نامہ	؟	〃	؟ فارسی۔ ہندوستانی
۱۸	۲۴۴۶	کتاب اسوختن	؟	〃	؟
۱۹	۲۴۴۷	مطبوع الصبیان (خالق باری)	امیر خسرو؟	〃	؟
۲۰	۲۴۴۸	ایضاً	〃	〃	۱۱۲۴ھ ع دیباچہ
۲۱	۲۴۴۹	ایضاً	〃	〃	؟
۲۲	۲۵۲۸	تحفۂ پنجاب	پنڈت اجودھیا پرشاد	〃	؟ حسب فرمائش جارج پیکر گیم
۲۳	۲۵۳۷	ایک ہندستانی قواعد	بنجامن شولز	قواعد	۱۷۴۷ء کمپنی میں مقدمہ میں زبان اردو کی تاریخ

۲۴	۲۵۳۸	فارسی ہندوستانی عربی اور سنسکرت عہد نامے	؟	تاریخ	؟	
۲۵	۲۶۹۹	ایک مختصر صوفیانہ ہندوستانی مثنوی	؟	نظم	۱۱۳۶ھ	
۲۶	۲۸۰۳	قصہ نادانی تصدیق بندگان علی وغیرہ	سید محمد شریب قادری	"	۱۲۰۶ھ	
۲۷	۲۸۴۹	مجموعہ نغز	قدرت اللہ قادری	تذکرہ شعرای اردو	۱۲۳۱ھ	فارسی میں
۲۸	۲۸۵۰	تذکرہ سرور	سید محمد خاں	"	۱۲۲۲ھ	فارسی میں

سید حسن۔ بی اے (لک)

"جامِ سفال"

(قدرت) آہ سے کیا فائدہ نالہ سے کیا حاصل ہمیں
اُنکے لانے کے لیے کافی ہے جذبِ دل ہمیں

(") پھر تمھیں دیں عمر بھر کی بیوفائی کا جواب
چاہ رہی دن کو خدا دیدے تمہارا دل ہمیں

(") پھر کلیجہ ہم نے تھاما پھر اُٹھا پہلو میں درد
پھر غشی طاری ہوئی، پھر یاد آیا دل ہمیں

(نکہت) غم رسیدہ، خوں شدہ، حسرت نصیب، آفت زدہ
واہ ری تقدیر کیا اچھا ملا ہے دل ہمیں

(اعجاز) اب بہت آکر ستاتا ہے ہمیں اُن کا خیال
اب بہت کرتی ہے مضطر آرزوِ دل ہمیں

(نشتر) غیر سے ایفائے وعدہ ہم سے باتیں بنا دیکھی
دو دلی نے تیری ظالم کر دیا بد دل ہمیں

(وحید) چپکے چپکے مطلب اپنا کہتے ہیں اُنہ رے حجاب
دل ہی دل میں کہہ رہے ہیں آپ بیدل ہمیں

(وحید) کیا کہیں دل ہی نہیں، دے نہ دعا یہ مانگتے
دے ہمارا دل خدا اُنکو اور اُن کا دل ہمیں

(نامعلوم) تاب کی اتنی کہ خنجر ہاتھ سے اُٹھتا محال
شوق اُنکو یہ کہ اِک عالم کے قاتل ہیں

(") ہم نہ ہوں تو آپ کس کی خستہ حالی پر ہنسیں
اپنی محفل میں سمجھیے رونقِ محفل ہمیں

(حمید) آج تو یہ اچلا ہے کوے قاتل کو حمید
آج تو شاید لگا دے گا ٹھکانے دل ہمیں

مشیر احمد علوی قادری کاکوروی (بی اے ملیگ)

نظرے خوش گزرے

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ چانسلر نے جو تحقیقاتی مجلس گذشتہ سال مقرر فرمائی تھی اُسکے نتائج کار منظر عام پر آگئے ہیں۔ اور ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یونیورسٹی کی تمام الزاموں کی تہ میں جو اصلی بنیاد و فساد تھی یعنی فرقہ بندی، اُس کا اعلان نہایت صاف اور واضح الفاظ میں کر دیا گیا ہے۔ تحقیقاتی مجلس نے تقریباً اُن تمام شکایتوں کو تسلیم کیا ہے جنکا ذکر اجمالاً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی اُس یادداشت میں کیا گیا تھا جس پر الناظر میں تفصیلی تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اور اُنکے ہم نواؤں نے صاحبزادہ صاحب کے خلاف جو زہر پھیلانے کی کوشش کی تھی الحمد للہ کہ وہ بیکار ثابت ہوئیں اور صداقت و اخلاص کو بالآخر فتح حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کو مسلم یونیورسٹی سے علیحدہ ہو جانے کا مشورہ دیکر اراکین مجلس نے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ یونیورسٹی کی اصلاح کے لیے بہت بڑے جراحی عمل کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ دوسرے اصحاب کی نشاندہی نام لیکر نہیں کی گئی تاہم تحقیقات کنندگان کا منشا صاف ظاہر ہے کہ وہ یونیورسٹی سے ایسے تمام افراد کو الگ کر دینا چاہتے ہیں جو یونیورسٹی کے تنخواہ دار ملازم ہونے کے باوجود اپنے فرائض منصبی کی ادائی اور یونیورسٹی کی خدمت کے بجائے تمام تر فرقہ بندی میں مصروف رہتے ہیں

بے شبہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے سامنے یہ نہایت اہم و دشوار کام ہے۔ کیونکہ بدنصیبی سے خود اس جماعت کے اندر فرقہ بندی کی روح سرایت کیے ہوئے ہے تاہم اگر یونیورسٹی کو اُس مطمح نظر کے مطابق چلانا ہے جسکا گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں بار بار اعلان کیا جاتا رہا ہے اور واقعتہً اُسے ایک ایسا ادارہ بنانا ہے جسکا وجود مسلمانوں کے لیے مفید و کارآمد ہونے کے ساتھ انکی دینی علمی روایات کو برقرار رکھنے میں معین ہو تو اس اہم اور نازک موقع پر پورے تدبر و ضبط سے کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ حالات اتنے ابتر ہو چکے ہیں اور مزاج قومی اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ دفع فساد کی کوششوں سے نئی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ بھی لگا ہوا ہے۔

یہ نہایت درجہ افسوس کی بات ہے کہ ایسے اہم موقع پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کالج جیسی شدید بیماری میں مبتلا ہو کر یونیورسٹی کے لیے ایک عدد تک بیکار ہو گئے ہیں اور یا دش بخیر ہمارے

محترم عالیجناب سر راجہ صاحب محمود آباد اپنی تمام مقناطیسی و کہربائی قوتوں کے ساتھ یونیورسٹی کے معاملات میں بھرپور دخیل ہو گئے ہیں۔ نفی و اثبات کے یہ دونوں پہلو بہت کچھ تشویش کا باعث ہیں، اور خدا سے دعا ہے کہ مسلمانوں کی پچاہ سالہ جد و جہد کے ثمرات برباد ہونے سے محفوظ رہیں۔

مسلم یونیورسٹی ہی کی طرح ہماری دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بھی فرقہ بندیوں کی بدولت خطرناک دشواریوں میں گھرا ہوا ہے۔ اور اگرچہ اسکی امید نہیں کہ اصلاح طلب فرقہ اور جماعت منتظمین کے درمیان زمانۂ قریب میں کوئی مصالحت ہو سکے اور یہ آپس کی قوتوں میں ختم ہو، تاہم یہ یقینی ہے کہ اس کشمکش کی بدولت دینی تعلیم اور ملت علماء دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچکر رہے گا۔

دینی تعلیم کے لیے زمانہ کی مقتضیات اور ملکی فضا دونوں پہلے سے نا سازوار ہیں اور روز بروز نت نئے فتنے اور مفسدات اسکے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے نمودار ہو رہے اور بیدینوں کی طرف سے پیدا کیے جا رہے ہیں مگر اساتذہ و طلبائے دیوبند کی باہمی آویزش اور مہاجر و انصار کی تبلیغ و اشاعت کے بعد اب کسی نئے مفسدہ یا فتنہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔

سنتے ہیں کبھی ندوۃ العلماء کے قیام کی بنیادی غرض یہ تھی کہ علماء کی باہمی آویزشوں کا سدباب کیا جائے۔ کیا اساتذۂ دیوبند کے اختلافات ابھی اس حد تک نہیں پہونچے کہ علماء ندوہ اصلاح حال کیلیے سعی و جہد کی ضرورت محسوس فرمائیں۔

اخبار رعیت اور اسمبلی یا کونسل کے ممبروں کے مقابلہ میں کیا یہ زیادہ قرین مصلحت نہ ہوگا کہ علماء کی کوئی جماعت اصلاح حال کے لیے ساعی ہو، اور کچھ نہ بن پڑے تو کم سے کم ایک معینہ مدت تک التوائے جنگ پر دونوں فریق کو آمادہ کرکے اُنکے نشر و اشاعت کے اداروں کو بند کرا دے کہ اُنکی وجہ سے علم دین اور علماء ربانی دونوں کی ناقابل برداشت توہین ہو رہی ہے۔

فروری نمبر میں جو معروضات ایڈیٹر صاحب کشاف کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے اُنکی بنا پر بعض احباب کی خواہش ہے، کہ مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک برطانوی حکومت اور انگریزی قوم نے کیا ہے اس پر تفصیل سے الناظر میں لکھا جائے۔ خدا کرے کہ اس فرمائش کی تعمیل کے لیے وقت نکالا جا سکے۔ اسی سلسلے میں مولوی عبد الماجد صاحب نے ۱۰ مارچ کے سچ میں "بڑی غلطی" کے عنوان سے جو مقالہ لکھا ہے اُسکے ضروری اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

"ذرا اُس قوم کی پچھلی اور موجودہ تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے، جسکی وفاداری اور ہوا خواہی کا دعوٰی آج کن کن ترکیبوں اور تدبیروں سے خدا معلوم کتنے مسلمانوں ہی کے زبان و قلم سے کرایا جا رہا ہے! خلافت اسلامیہ پر بار بار حملے کس نے کیے اور کرائے؟ خلیفۃ المسلمین کے مقابلہ میں فوج کشی کس نے کی؟ ترکوں کے سینے پر گولیاں خود مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے کس نے چلوائیں؟ ترکوں کے بدنام کرنے میں سب سے زیادہ حصہ کس قوم نے لیا؟ ترکوں سے یورپ سے بوریا بستر سمیٹ کر بھاگنے کے خواب کس سلطنت کے وزراء دیکھتے رہے؟ استنبول (اسلامی زمین اسلام) کو ہوا بنا کر کس نے دنیا کے سامنے پیش کیا؟ گلیڈسٹن اور لائڈ جارج کس قوم کے مشاہیر میں ہیں؟ ترکوں کی خلافت اسلامیہ کے خلاف ہندوستان اور ساری دنیائے اسلام میں زبردست پروپیگنڈا کس نے کرایا؟ عربوں کو ترکوں کے خلاف کس نے کھڑا کیا؟ شریف حسین کی بغاوت کس کے اشاروں پر ہوئی؟ ایران آج کس کی نوازشوں اور عنایتوں کا زیر بار منت ہے؟ افغانستان کو ۱۹۱۹ء میں مجبور ہو کر کس کے خلاف اعلان جنگ کرنا پڑا؟ عراق، مصر، سوڈان، آج کس کے حق میں دعا گو ہیں؟ عقبہ و معان کو دیکھتے ہی دیکھتے کس نے اپنا لیا؟ ڈائر اور اوڈائر کی عزت کرنے والی آج دنیا کے پردہ پر کون قوم ہے؟ مہدی سوڈانی کی لاش کو قبر سے کھود کر بے حرمت کرنے والے کچنر کا شمار آج کس قوم کے مشاہیر میں ہے؟ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا مٹایا ہوا چراغ بالآخر کس نے بجھایا؟ سلطنت مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ ظفر کو اپنا باغی قرار دینے کی جسارت کس نے کی؟ رنگون کے زندان میں انھیں زندہ درگور کر رکھنے کا کارنامہ کس کے نامہ اعمال میں درج ہوگا؟ دہلی کے تخت و تاج کے جوان جہان وارثوں کو کس نے تنا کے گھاٹ اُتارا؟ بنگالہ میں سراج الدولہ کی ہستی کو کس نے مٹایا؟ مرشد آباد کے نوابوں کے خاندان کو کس نے مٹایا؟ میر جعفر اور میر قاسم دونوں کو اپنی ساری چاپلوسی کے باوجود بالآخر کس کی "حکمت غلیوں" کا شکار ہو جانا پڑا؟ میسور کی اسلامی سلطنت کی کس نے اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھی؟ حیدر علی اور سلطان ٹیپو کا خونچکاں کفن آج کس کا فریادی ہے؟ دکھن گلکنڈہ کی اسلامی حکومت کا چراغ کس نے گل کیا؟ حافظ رحمت خاں اور نجیب الدولہ کے خاندانوں کا خون کس کی گردن پر ہے؟ اودھ کی اسلامی سلطنت سے معاہدے کر کر کے ہر بار کس نے توڑے؟ شجاع الدولہ و آصف الدولہ کی نسل کو تخت شاہی سے اُتار کر در بدر کی ٹھوکریں آج کون

کھلا رہا ہے؟ نظام الملک آصف جاہ دکن کو اپنی ضرورت کے وقت آقا اور بعد کا تسلیم کرنے کے بعد، آج کس حکومت کا کارندہ (لارڈ ریڈنگ) اپنا ایک ادنیٰ ماتحت بنائے ہوئے ہے؟ وہ کابل وزیری، آفریدی، محسود، مسعودی، سرحد کے تمام مسلمان جرگوں اور قبیلوں کی آزادی کا آج کون دشمن ہے؟ اور کون اپنے ملیاروں اور بم کے گولوں سے، اور اپنے خزانے کی تھیلیوں اور اپنی تعلیم گاہوں کے دام و دانہ سے انہیں اپنی غلامی میں پھانس رہا ہے؟"

رسالہ زمانہ کانپور نے جو ۱۹۰۳ء سے مسلسل جاری ہے، ۱۹۲۷ء میں زندگی کے پچیس سال پورے کر لیے، اور اس تقریب مسرت کے موقع پر جوبلی نمبر شائع کیا ہے۔ اردو رسائل کی زود میری کا یہ عالم ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں رسالے ضرور جاری ہوئے، مگر دلگداز کے سوا شاید انیسویں صدی کی کوئی دوسری یادگار اب موجود نہیں۔ اور دلگداز بھی ایک زمانہ مرتبہ چلتے چلتے بند ہو چکا ہے۔ زمانہ کی یہ کامیابی اردو زبان کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ زمانہ کے لائق، مستعد زمانہ شناس اور دکھن کے پہلے اڈیٹر منشی دیا نرائن نگم تمام ہی خواہان اردو کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ صوبہ متحدہ، اردو کا گہوارہ ہے مگر یہاں کے باشندوں میں اہل پنجاب کی سی زندہ دلی اور اولوالعزمی نہیں جسکی بدولت اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی رفتار یہاں نسبتاً بہت سست ہے۔ غنیمت ہے ابھی تک علمی و ادبی جد و جہد میں صرف کمیت، مقداری کے لحاظ سے پنجاب کو تفوق حاصل ہو سکا ہے، کیفیت اور خوبی کی بنا پر فضیلت کے استحقاق سے یہ صوبہ ابھی محروم نہیں ہوا ہے۔

لاہور کے اکثر رسائل ہر سال اور بعض اوقات سال میں متعدد خاص نمبر نکال کر اہل ملک سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں، رسالہ زمانہ بھی ایسے نمبر ابتداء سے شائع کرتا رہا ہے۔ اگر اسکا جوبلی نمبر خاص امتیاز رکھتا ہے۔ الناظر مصوری کے محاسن و معائب کا نقاد نہیں بلکہ اسکا ایڈیٹر اتنا دنیا دنسی واقع ہوا ہے، کہ اس بیسویں صدی میں بھی اُسے آرٹ کی یہ صنف خصوصاً پیکر انسانی کے مرقعے پسند نہیں آتے بلکہ مسلمانوں کے لیے تو وہ ایک مصیبت کبیرہ تصور کرتا ہے، لیکن تصاویر سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی زمانہ کے جوبلی نمبر میں کافی سامان دلکشی موجود ہے۔ اتفاقیہ کہ ایڈیٹر کی لاعلمی یا ناواقفیت کی بنا پر اسمیں ایک مضمون ایسے صاحب کے نام سے شائع ہو گیا ہے جو اسکاٹ، تھیکرے، وکٹر ہیوگو، ڈیوما، جارج الیٹ، ٹالسٹائے، مارک ٹوئن، اسٹیونسن اور انگریزی کے دوسرے مشہور افسانہ نویسوں سے یگانہ ہونے کے باوجود حیرت انگیز دلیری و جسارت سے زمانہ کے اوراق میں اُنکے کارناموں کا ذکر اس انداز میں فرماتے ہیں کہ گویا آپ انگریزی ادب کے ماہر خصوصی ہیں۔ دوسروں سے لکھوا کر نظم و نثر مضامین اپنے نام سے شائع کرنے کی یہ اخلاق کبھی اہل ثروت کے لیے مخصوص تھی، لیکن اب یہ باعام ہوتی جاتی ہے۔ غالب نے اسی دن کیلیے کہا تھا ؎ ہر چہ بادا باد ما کشتی بدریا افگندہ ایم اب آبرو ہے شیوۂ اہل نظر گئی۔

جنرل یا لک لکھنؤ کی رزیڈنسی سے گورنر جنرل کی کونسل مین بھرتی ہوگئے اور وہان کپتان شکسپیر قائم مقام رزیڈنٹ مقرر ہوے۔ ایسے وقت مین سر ہربرٹ ماڈک کچھ عارضہ جسمانی کے سبب سے رخصت لیکے چلے گئے کوئی شخص میرا مربی نہ کونسل مین رہا نہ دفتر مین بلکہ دفتر مین مسٹر اڈورڈ نام ایک صاحب نائب سکریٹر تھے اونکو بھی بعضے ایسے امور سے جن کا ذکر مصلحت نہین ہے میری طرف سے دل مین کینہ تھا ایسی حالت مین جو کچھ مجھکو ضرر نہ پہونچا وہی تعجب تھا مگر محض عنایت الٰہی سے راقم اوس مضرات محتملہ سے محفوظ رہا صرف اتنا ضرر پہونچا کہ عہدہ سے علیحدگی ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ بقا اور قیام اوس عہدہ کا اون اختیارات کے ساتھ جو راقم کو حاصل تھے بدون با اقتدار مربیون کے محالات سے تھا جہان بڑے بڑے رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کے ایجنٹ اور گورنر جنرل کی کونسل کا ایک آدھ ممبر کسی شخص ہندوستانی کے حامی ہون اوس کی عزت اور آبرو کا باقی رہنا بھی موجب تعجب ہے نوکری کی کیا حقیقت ہے اون سب محاسدات کا یہ نتیجہ ہوا کہ بجز راقم کی برخاست کے سیرشتی کے عہدہ کو بالکل خراب کردیا درماہہ بھی گھٹ گیا اور مطلق اختیارات اوس عہدہ کے جو قدیم سے تھے وہ باقی نہ رکھے اور اصل یہ ہے کہ اہل قلم کے عہدون پر دیانت اور امانت اور لیاقت اور متانت اور وضعداری کو کسی سلطنت مین کوئی نہین پوچھتا تعلق اور ترقی اہل قلم کی ہر جگہ رسائی پر اور توجہ خاص ارباب اقتدار پر جن سے وہ متعلق ہین موقوف اور منحصر ہے قدیم سے یہی دستور چلا آیا ہے کچھ نئی بات نہین ہے یہ سلطنت حکیمانہ برطانیہ اعظم کے جہان سیکڑون قاعدے امتحان لیاقت کے جاری ہین اور جاری ہوتے جاتے ہین اور خاص اپنی قوم مین استحقاق کی بھی رعایت مختص ہندوستان مین ہوا کرتی ہے اسی کے ساتھ سیکڑون مثالین راقم کو یاد ہین کہ انگلستان مین بہ کثرت اور ہندوستان مین اوس کی نسبت سے بقلت صرف رسائی سے اور توجہ خاص ارباب اقتدار سے محض نالایق اور خاین بد دیانت نہایت لایق اور دیانتدار مشہور ہوتے ہین اور روز بروز اون کی ترقی ہوتی ہے اور رسائی اور توجہ نہ ہونے سے بڑے عالی خاندان اور بالیاقت اور دیانت دارون کو کوئی نہین پوچھتا یا وہ محض بد دیانت اور نالایق ٹھہر جاتے ہین راقم کے گمان مین یہ امور محض تقدیری ہین کسی کو کسی سے شکایت نہین چاہیے مگر اسی کے ساتھ جبلت سے

محسن اور سیئی کا شکر اور شکایت انسان کی عادت مین ہے الغرض راقم جب تلک اوس منصب
پر رہا نہایت آسایش اور ناموری سے بسر ہوئی لیکن جس طرح سے پچھلے میر منشیون کو تمول حاصل ہوا
اور اتنا اندوختہ اونھون نے جمع کیا کہ پھر مدت العمر اون کو نوکری کی حاجت نہ ہوئی راقم اس نعمت سے
محروم رہا اور اس قدر بے بضاعتی کی نوبت پہونچی کہ برس چھ مہینے بھی خانہ نشینی دشوار تھی جس طرح
سے ہوا اثاث البیت کو بیچ باچ کے تین چار برس بسر ہوئے عمدہ سبب اوس کا یہ تھا کہ بڑا بیٹا میر اسولی
فریدالدین خان سلمہ اللہ تعالی کم سنی سے بسبب استحقاق آبائی کے بادشاہ کی سرکار مین متعلق تھا
اوس کے سبب سے ایک گونہ گھر کے مصارف کی فکر سے مین فارغ تھا اور اون دنون مین یہ تصور
ہوا کہ نوکری کرنا غلامی سے بدتر ہے معیشت اپنی تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیے چنانچہ
اس فکر مین تین چار ہزار روپیہ چھاپہ خانہ مین اور کاغذ کی کل بنوانے مین لگائے لیکن اوس مین کچھ انتفاع
نہ ہوا وہ ساری رقم ضائع ہوئی اور چونکہ اوس وقت تک تدابیر تجارت کے خوب ذہن مین نہ تھے اور سررشتہ بسر
دشوار ہوئی مجبوری سے پھر تلاش روزگار کی ضرورت ہوئی تین جگہ پر درخواست کی ایک جنرل فریزر
حیدرابادکن کے رزیڈنٹ کی معرفت اوس ریاست مین درخواست بھیجی ایک اپنے قدیم مربی مسٹر
ہنری طارنس جو گورنر جنرل کے ایجنٹ مرشدابادمین تھے اون سے درخواست کی کہ نظامت مین کوئی شتر
میرے واسطے پیدا کرین اور جنرل فریزر سے اور مجھ سے ملاقات تھی اون کے پاس بھی درخواست
اونھین مسٹر ہنری طارنس کے ذریعہ سے بھیجی تھی اور چونکہ اوس عرصہ مین سر ہربرٹ ماڈک بنگالہ کے
ڈپٹی گورنر تھے اون سے بھی ستدعی ہوا کہ کوئی عہدہ عدالت یا مال کا مجھے عنایت فرمایئے چونکہ اللہ تعالے
کی عنایت اور شفقت ہمیشہ سے اس سیہ کار کے ازے آیا کی ہے ایک مہینا بھی ان امیدواریون مین نہین
گذرا تھا کہ پہلے جنرل فریزر حیدرابادکن کے رزیڈنٹ کا خط مسٹر ہنری طارنس کے نام پر آیا اس مضمون
کا کہ اونھون نے میری درخواست نواب سراج الملک مرحوم کو دی نواب صاحب ممدوح نے نہایت
خوشی خاطر سے قبول فرمایا کہ اگر مین وہان جاؤن تو کوئی عہدہ معزز موافق میری زی اور لیاقت کے
عطا فرمائین گے اور قبل اون کے خط کے پہونچنے کے مسٹر ہنری طارنس اور سر ہربرٹ ماڈک نے باہم یہ بندوبست

کیا تھا کہ نواب ناظم مرشد آباد کی طرف سے ایک خط بہ خواست میرے تقرر کے نواب امیر النسا بیگم عرف دولھن بیگم کی ڈیوڑھی کی دیوانی پر منگوا کے بنگالے کی گورنمنٹ مین بھیجوایا اور وہان سے منظوری منگوا کے مجھے مقرر کیا اور قبل ظہور اس بندوبست کے سر رہزی ٹامس نے مجھ سے کہا یہ منصب بھی موجود ہے اور حیدرآباد دکن سے بھی تمھاری طلبی ہے جو امر مرجح سمجھو اوس کو اختیار کرو اوس وقت بنظر قرب اپنے مربی قدیم کے اور حیدرآباد دکن کا سفر دور دراز سمجھ کے اور وہان کے کوائف مفصلہ نہ معلوم ہونے سے مرشد آباد کے تعلق کی راقم نے تقدیم کی اور اوس کو قبول کیا اور نواب ناظم نے خلعت فاخرہ عطا فرما کے مجھکو اوس ڈیوڑھی پر مامور کیا یہ نواب امیر النسا بیگم نواسب عالی جاہ نواب مبارک الدولہ کے بیٹے کی بی بی تھین جو اپنے وقت مین نواب ناظم تھے اور بعد اوس کے وہ گدی نشین نواب منی بیگم کی مقرر ہوئین جو کمپنی انگریز کی مان کہلاتی تھین اون کی کہانی ارباب تواریخ کو معلوم ہوگی یہان ذکر اوس کا فضول ہے اس سبب سے یہ عہدہ نہایت معزز تھا اوس کا اعزاز اور امتیاز گورنر جنرل کے دفتر کے میر منشی سے برابر تب زائد تھا ایک لاکھ روپیہ سال اوس ڈیوڑھی کے واسطے نظامت فند سے نقد مقرر تھا اور بہت سی ریاست زمینداری وغیرہ کی تھی لیکن اون کی ڈیوڑھی مین چند بد معاش ایسے گھسے تھے کہ وہان سخت ابتری اور بدنظمی تھی بے انتہا قرضداری تھی برسون کی تنخواہ نوکرون کی پھنسی ہوئی تھی اوسی کے ساتھ جعل اور تلبیس اور بعضے اور حرکات ناگفتہ بہ کی نسبت اوس ڈیوڑھی مین ہوتی تھی ایجنٹ گورنر جنرل نے باتفاق نواب ناظم کے کچھ بد معاشون کو نکالا تھا اور مجھے حکم اوس ڈیوڑھی کے انتظام کا اس طرح سے ہوا تھا کہ مطلق بیگم صاحبہ کی راے مصارف کے باب مین نہ سنون اور اوس پر عمل نہ کرون اور جیسا مناسب سمجھون اپنی راے اور تجویز سے انتظام کرون اور وہ راہ نکالون کہ بدخبرین جو اوس ڈیوڑھی کی مشہور ہوتی ہین وہ نہ ہونے پاوین اور اگرچہ وقوع بعضے مفاسد مین وہان کچھ شبہ نہ تھا لیکن ایک اور امر بھی باعث زیادہ تر رسوائی اور بدنامی اوس ڈیوڑھی کا تھا وہ یہ تھا چونکہ نواب امیر النسا بیگم نواب منی بیگم کی گدی نشین تھین اس سبب سے نواب ناظم کو حکم اون کی تبعیت کا تھا اور یہ حکم تھا کہ تقریبات عیدین وغیرہ مین وہ بیگم صاحبہ کو نذر دیا کرین اس سبب سے تین پشت سے برابر نواب ناظم کو

بیگم صاحبہ پر بہت حسد رہا کرتا تھا اور چونکہ نواب والاجاہ اور نواب ہمایون جاہ بعضے مظالم بیگم صاحبہ پر اور اون کی ڈیوڑھی پر کیا کرتے تھے اس سبب سے اجنٹ گورنر جنرل بیگم صاحبہ کے معین رہتے تھے اور اون کے مظالم سے بچایا کرتے تھے اور بہت سے امور مین اوس ڈیوڑھی کو ایک ریاست مستقلہ نظامت سے جداگانہ بہ لحاظ عظمت شان نواب منی بیگم کے کردی تھی۔ انھین وجوہ سے نواب ناظم کو اور سارے نظامت کے اہلکارون کو شدت سے اوس ڈیوڑھی کے اہلکارون سے بغض اور حسد رہا کرتا تھا ساری نظامت کے لوگ اون کے عیب جوتھے اور ڈیوڑھی مین معاملہ عورات کا اور مداخلت جہال خواجہ سرا اون کی اوٹھون نے جو شہ پائی یعنی گورنر جنرل کے اجنٹ اور اون کے ذریعہ سے ارباب گورنمنٹ اوس ڈیوڑھی کے معین اور حافظ ہو گئے یوم اور کھل کھیلے اس عرصہ مین جب نواب ہمایون جاہ قضا کر گئے اور نواب فریدون جاہ کم سنی مین مسند نشین نظامت کے ہوے اور بندوبست نظامت کا گورنر جنرل کے اجنٹ کے ہاتھ مین آیا بہ تدریج اوس ڈیوڑھی کی بہت سی سبکیان ہوئین نواب ناظم نے نذر دینا موقوف کردیا خواجہ سرا اپنی طرف سے مقرر کیے اونھون نے گویا بیگم صاحبہ کو بطور مقید کے کیا۔ اس حالت مین وہان کا انتظام راقم کو سپرد ہوا جہان تک کوشش ممکن تھی راقم نے درستی کی تنخواہین برسون کی لوگون کی پچھلی چڑھی ہوئی بیباق کی آیندہ مہینے مہینے تقسیم ہونے لگی قرض ادا ہو گیا اجنٹ گورنر جنرل کی طرف سے تاکید کروا کے نواب ناظم کو لیجا کے بیگم صاحبہ کو نذر دلوائی بیگم صاحبہ کو بھی اپنی طرف سے راضی رکھا غرض ڈیوڑھی سے باہر دیوانخانہ سے جو متعلق تھا اوس کا انتظام بخوبی ہو گیا محل کے انتظام کے واسطے بھی خود منتخب کر کے ایک حبشی خواجہ سرا کو نواب ناظر مقرر کروایا۔ ان سب امور سے نظامت کے اہلکارون نے نواب ناظم کو میری طرف سے برہم کردیا مگر مشہور ہے لا یصلح العطار ما افسد الدہر۔ غلام کی ذات بے وفا ہوتی ہے جس خواجہ سرا کو مین نے مقرر کروایا یا تو وہ میرے قدمون پر سر رکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ مین حقیقت مین آپ کا نوکر ہون نہ مین نواب ناظم کو جانتا ہون نہ بیگم صاحبہ کو۔ دو ایک مہینے کے بعد ڈیوڑھی مین پہونچ کے وہ آسمان پر چڑھ گیا اور جو انتظام محل کا مین سوچا تھا وہ اوس نے نہ ہونے دیا ہر امر مین میری مخالفت کرتا رہا اور نظامت کے لوگ میرے حسد سے اوس کے معین ہو گئے اسی کے ساتھ

جس طرح سے ہو سکا چار برس تک برابر ہین سب کو دبائے رہا صرف اتنا فتور رہا کہ محل کے اندر
کا انتظام جیسا مین چاہتا تھا سب بدمعاشون نے نہ ہونے دیا۔ الغرض سیکڑون میری شکایتین
روز نظامت کی طرف سے اجنٹ گورنر جنرل کے پاس پہونچا کین مگر جب تک مسٹر ہنری طارنس
وہان رہے کچھ اونھون نے نہ سنا اس عرصہ مین اونھون نے چھ مہینے کی رخصت لیکے سفر دریا
شور کا اختیار کیا مصر کے ممالک تک گئے اور جو صاحب اون کے قائم مقام اجنٹ گورنر جنرل
مقرر ہوے اون سے خاص میرے باب مین بہت سمجھا گئے کہ ساری نظامت کے لوگ ان کے
دشمن ہین جب تلک مین پھر کے آؤن ان کی حفاظت بخوبی کرنا اس نظر سے اون کی غیبت مین
بہت سے فتورات مجھپر اوٹھے مگر قایم مقام اجنٹ گورنر جنرل برابر میرا معین رہا۔ شرح اور تفصیل
اوس کی محض بے سود ہے جب نظامت کے حمقا نے جو نواب ناظم کے پاس پیش تھے اون مین
سر نکالے ہوے دو حبشی خواجہ سرا تھے یہ دیکھا کہ اون کی کوئی تدبیر میرے گرانے کی پیش رفت
نہ ہوئی اب قائم مقام اجنٹ گورنر جنرل سے مسٹر ہنری طارنس کی شکایت شروع کی یعنی ظاہر کیا
کہ بہت سا روپیہ نظامت کا اونھون نے طبایع کر دیا اور کئی لاکھ روپیہ پر وہ خود متصرف ہو گئے
قائم مقام اجنٹ نے اوس کی اطلاع گورنمنٹ مین بھی ظاہر کی اور جب مسٹر ہنری طارنس پھر کے
اپنے عہدہ پر آئے اون سے یہ تفصیل وہ داستان نقل کر دی۔ مسٹر ہنری طارنس اون دونون
خواجہ سراؤن کے دشمن ہو گئے اور تدبیر اون کے قلع اور قمع کی شروع کی وہ دونون خواجہ سرا
جس مین ایک کا نام امان علی اور ایک کا نام نذیر علی تھا یہی دونون بڑے کارپرداز نظامت
کے تھے اون دونون کو کارپردازی سے موقوف کروا کے اون کی ساری جایداد لاکھون روپیہ
کی قرق اور ضبط کی اور نظامت کے انتظام کے واسطے ایک مجلس بطور پنچایت کے پانچ آدمیون
کی مقرر کروائی اون پانچون مین ایک راقم کو بھی داخل کیا اور اوس مجلس انتظام کی تجویز سے راقم کو
عہدہ عرض بیگی یعنی داروغۂ دیوان خانہ نواب ناظم کا بھی مقرر کروایا جو حقیقت مین مدار المہامی
نظامت کی تھی اور پچھلا عہدہ بھی میرا بدستور قایم رکھوایا۔ اب چونکہ مجھکو حضوری دایمی نواب ناظم کی

ہوگئی وہ نہایت میرے حال پر شفیق ہوگئے اور جو لوگون نے اون کو میری طرف سے متنفر کردیا تھا وہ تنفر اونکا بالکل جاتا رہا۔ اب ایک معاملہ عجیب پیش آیا کہ بموجب نظامت کے قوانین اور دستورات کے نواب ناظم کو قلعہ کے اندر اختیار داروگیر کا جو چاہین حاصل تھا قلعہ سے باہر انگریزی عدالت کے تحت ہے۔ اور اون دونون خواجہ سراؤن مین جن کا اسباب قرق اور ضبط ہوا ایک خواجہ سرا نذیر علی جس کا نام تھا وہ قلعہ سے باہر رہتا تھا اوس کو واقعہ طلب لوگون نے بہکا کے عدالت فوجداری مین قرقی بیجا کی درخواست دلوائی اور مسٹر ہنری طارنس کو اور راقم کو اور جو لوگ قرقی اور ضبطی مین دخیل تھے سب کو مدعا علیہ مقرر کیا مختارون کے ذریعہ سے جوابدہی ہونے لگی۔ مسٹر ہنری طارنس چونکہ اہل یورپ سے تھے بموجب قانون کے مجسٹریٹ اون کو تو ماخوذ نہ کرسکا مگر ہم لوگون پر فی الجملہ نشہ کیا اور مقدمہ طول ہوا مگر بعد اپیل کے صاحب بسٹریٹ کے حکم سے ماخوذہ جو راقم سے اور نظامت کے لوگون سے اوس نے قرقی بیجا کا تجویز کیا تھا وہ منسوخ ہوگیا مگر قرقی سب واگذاشت ہوگئی۔ اور اس حکم سے مسٹر ہنری طارنس کی اور نظامت کی بہت بکی ہوئی۔ غرض جو امور شفقت اور عنایت نواب ناظم کے اوس تھوڑے سے عرصہ مین میری نسبت پیش آئے اور بعد اوس کے دفعۃً معاملہ پلٹ گیا ساری شرح اوس کی بہت طولانی ہے اور ایسے امور خلاف طبیعت کے پیش آئے کہ اب بھی اوس کے یاد کرنے سے ملال خاطر ہوتا ہے حالانکہ اب کسی نہج کا نہ دہان سے تعلق ہے اور نہ آیندہ امید تعلق کی ہے اس نظر سے جی نہین چاہتا کہ اون وقایع کی مفصل شرح کیجیے۔ اسی کے ساتھ بنظر انتظام وقائع نگاری کے جہان تک ممکن ہے باجمال ساری کہانی دہان کی لکھی جاتی ہے۔ غرض عجیب اتفاق ہوا کہ دفعۃً نواب ناظم کا مزاج میری طرف سے برہم ہوگیا اور فی الجملہ مسٹر ہنری طارنس میرے مربی قدیم بھی مجھ سے ناراض ہوگئے۔ اگرچہ یہ دونون امر سحر سے میرے عقیدہ مین واقع ہوے جس کی شرح مین آیندہ کروںگا مگر اس عالم اسباب مین کیونکر اثر سحر کا ہوا پہلے اوس کا نقل کرنا ضرور ہے بعد اوس کے کوائف مفصل اوس سحر کے ہم لکھین گے۔ مسٹر ہنری طارنس نے یہ تجویز کی کہ نظامت کا ایک دیوان مقرر کرانا چاہیے

اس امر کو نواب ناظم سے بیان کیا اور اوسپر اصرار کیا نواب ناظم نے تقرر دیوان کا قبول نہ کیا اسمین کچھ شبہہ نہین ہے کہ اونھون نے جو نہ قبول کیا تو ساری پنچایت کی صلاح سے نہ قبول کیا جس مین راقم بھی داخل تھا لیکن راقم نے نواب ناظم سے یہ عرض کیا تھا کہ میری دانست مین آپ ہرگز صاحب ایجنٹ کی صلاح سے انکار نہ کرین جیسا وہ کہتے ہین دیوان مقرر کر دیجیے اس واسطے کہ آپ متحمل مخالفت کے اون کی صلاح سے نہین ہو سکتے آخرش حضور کو ماننا پڑیگا پھر کیا ضرور ہے اب انکار کرنا پہلے ہی سے قبول کر لیجیے۔ اسپر نواب ناظم نے مجھ سے پوچھا کہ اگر مین نہ قبول کرون تو خلاف میری راے کے سرشتہ کے بموجب صاحب ایجنٹ میرے اوپر جبر کر سکتے ہین اس امر مین یا نہین۔ اوسکے جواب مین راقم نے عرض کیا کہ سرشتہ کے بموجب تو وہ جبر نہین کر سکتے لیکن نظامت مین کون سے پچھلے سرشتہ کی رعایت ہوتی ہے۔ آخرش آپ کو قبول ہی کرنا پڑیگا۔ جس شخص کو صاحب ایجنٹ دیوان مقرر کرانا چاہتے تھے اوس نے اور جو لوگ اوس کے معین اور مددگار تھے سبھون نے مسٹر ہنری طارنس پر یہ ثابت کیا کہ نواب ناظم نے صرف راقم کی صلاح سے اوس امر کو نہ قبول کیا اور قرینہ قوی اس امر پر یہ تھا کہ عرض بیگی کا کچھ اختیار مدار المہامی مین نظامت کے دیوان کے مقرر ہونے سے گھٹ جاتا اس نظر سے مسٹر ہنری طارنس میری طرف سے کچھ برہم ہوے اور جس شخص کو عہدۂ دیوانی کے واسطے مسٹر ہنری طارنس نے طلب کیا تھا اوس نے معزول خواجہ سرا اون سے سازو آمیز کر کے یہ وعدہ کیا کہ اگر نواب اوس کو دیوان مقرر کر دین تو اون کو وہ بحال کر دیگا۔ نواب ناظم نے شیر کے شکار کے واسطے سفر کیا تھا راقم بھی اون کے ہمراہ تھا دفعتہً اون کے انقلاب مزاج سے چند اسباب لغو سے جن کا ذکر فضول اور طول ہے راقم بیماری کا عذر کر کے مرشد اباد مین چلا آیا۔ یہان مسٹر ہنری طارنس نے اپنی بدمزگی طبیعت کا عذر کر کے مجھ سے ملاقات نہ کی اور نواب ناظم نے اون کو ایک خط لکھ بھیجا کہ عرض بیگی بدون ہماری اجازت کے یہان سے اوٹھ گیا۔ اس واسطے مین نے اوس کو معزول کر کے دوسرے شخص کو اوس کی جگہ پر مقرر کیا۔ مسٹر ہنری طارنس نے اس خط کا جواب لاونعم کا کچھ نہ لکھا بعضے کہتے ہین کہ عرض بیگی کے عہدہ سے صاحب ایجنٹ کی

ایا کے بموجب نواب ناظم نے مجھکو معزول کیا مگر بہرصورت وہ ہرگز راضی نہ تھے کہ مین اپنے
قدیم عہدہ سے معزول ہون۔ اگرچہ اب اس واقعہ سے مین خود وہان نہ رہتا لیکن اس مین بھی کچھ
شبہہ نہین ہے کہ مسٹر ہنری طارنس سے جب مجھ سے ملاقات ہوتی تو مین اپنی طرف سے اونکا مزاج بہت صاف
کر دیتا اور وہ ہرگز مجھکو مرشد آباد سے اوٹھنے نہ دیتے لیکن بہ نظر اون بدخیرون کے جن سے میرے
مخالف لوگون نے اون کے کان بھر رکھے تھے وہ چاہتے تھے کہ چند روز اظہار اون کی بدمزگی
مزاج کا میری طرف سے رہے چنانچہ اپنی کچہری کے سرشتہ دار سے جب اوس نے میری معزولی کے
خطوط جو نواب ناظم نے پہلے عرض بیگی کے عہدہ سے اور بعد اوس کے ڈیوڑھی کی دیوانی سے بھیجے
تھے پیش کیے اور جواب پوچھا کہ کیا لکھا جائے اونھون نے کہا اگرچہ فلانے شخص سے خلاف توقع کے
نواب ناظم کو مشورہ دینا میرے مشورہ کے خلاف ظہور مین آیا لیکن مین ہرگز راضی اونکی معزولی
سے خصوصاً اون کے قدیم عہدہ سے نہین ہون۔ خیر ان خطون کو رکھو سمجھ کے جواب لکھا جائے گا۔
اب کوائف سحر کے جو میرے اوپر اور مسٹر ہنری طارنس پر ہوے مین نقل کرتا ہون حقیقت یہ ہے کہ قبل
مرشد آباد جانے کے سحر کی طرف سے میرے دل مین یہ عقیدہ تھا کہ اس زمانہ مین چونکہ جمیع علوم ظاہری
اور باطنی مین کمی ہے کہین اس کا وجود نہین ہے جو کچھ اس زمانہ مین لوگ کہتے ہین اور کرتے ہین نرا دھوکا
ہے اور شعبدے ہین کچھ اثر اوس مین نہین ہے۔ یہ امر مرشد آباد مین میرے دل سے نکل گیا
اور اب مجھے یقین کلی ہے کہ سحر مین اب بھی اوسی طرح کا اثر ہے جیسا پچھلے زمانہ مین سنتے تھے۔ کوائف
توجہ اور عنایت اور شفقت مسٹر ہنری طارنس کے میرے اوپر جو پہلے پچھلے حکایات جو مین ذکر کر چکا ہون
اوس سے ہر ایک کو معلوم ہوگا کہ کس قدر شفقت اور عنایت تھی اور تھوڑی ہی سی صحبت مین جو
نواب ناظم کو عنایت و شفقت شروع ہوئی اوس کی شرح کرنا فضول ہے۔ مجھے خوب عقیدہ
واثق ہے کہ دونون کی طبیعت دفعۃً میری طرف سے صرف جادو کے زور سے پھر گئی۔ پہلے
مدت تک مجھکو اس کا تصور نہ تھا حالانکہ بہ چار برس برابر ایام قیام مرشد آباد مین انواع اقسام طرح
سے میرے اوپر جادو ہوئے کہ میرے پلنگ کے نیچے کبھی تکیون مین کبھی مسند کے نیچے کبھی

آمد و رفت کے راستہ مین عجیب عجیب چیزین پائی گئین۔ لونگین اور سیندور اور الائچی اور سوپاری اور کالی مرچین اور نئی نئی چیزین بنی ہوئین لوہے وغیرہ کی نکلین اور پھینک دی گئین۔ ایک دفعہ پاخانہ مین جس زینہ پر مین اکثر بیٹھتا تھا دیکھا کہ ایک مٹی کا برتن ہے اوسپر دوسرا مٹی کا برتن بند ہے یہ دیکھ کے مین نے رفع حاجت نہ کی اوٹھ کھڑا ہوا اوس کو اوٹھوا کے جو دیکھا تو اوسمین ایک چراغ کسی چیز کے برادہ کا بنایا ہے اور اوس مین کسی جانور کی چربی بھر کے چراغ جلایا ہے اوس کے گرد سیندور اور کچھ اور چیزین ہین اور جس مٹی کے برتن مین وہ رکھا تھا اوس مین اور جو برتن بند تھا دونون مین کسی قسم کے حروف غیر متعارف لکھے ہوے تھے اوس کو اوٹھا کے پھنکوا دیا چونکہ بہت سے لوگ شاگرد پیشہ کے قریب تیس چالیس آدمی بلکہ کچھ زائد نظامت کی طرف سے میری ڈیوڑھی پر متعین رہتے تھے اور پچھلے عہدہ مین بھی چوبدار اور ہرکارے اور پہرہ تلنگون کا متعین تھا اور صبح اور شام ہرکارخانہ سے وردی پہونچانے کو بہت سے لوگ آیا کرتے تھے۔ سیکڑون آدمی سلام کرنے کو اور ملاقات کے واسطے آتے تھے کچھ اس کا بندوبست نہ ہوسکا اور یہ بھی نہ کھلا کہ کون شخص ایسی حرکت کیا کرتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اسما اور اوراد اور تلاوت کلام اللہ کی اور حزب البحر وغیرہ جو مین پڑھتا تھا اوس سے میری حفاظت تھی کسی طرح کا ضرر نہ پہونچ سکا چنانچہ ایک شخص نے میرے ہواخواہون مین مجھکو یہ بھی خبر پہونچائی کہ ایک بڑا جادوگر مشہور یہ کہتا تھا کہ اگر کوئی[1] ..... تھا خدا جانے کیا سبب ہے کہ جو جادو اوپر ہوتا ہے وہ[2] اور جب دفعۃً جناب عالی نواب ناظم اور صاحب ایجنٹ کے مزاج میری جانب سے بدل گئے خوب یقین ہوا کہ سحر نے اثر کیا اس کے ساتھ یہ بھی خوب یقین تھا کہ صاحب ایجنٹ ہرگز میری برخاست جایز نہین رکھین گے۔ اب ایک طرفہ معاملہ پیش آیا جس سے اثر سحر کا آفتاب نیمروز کی طرح سے ظاہر ہوگیا۔ مسٹر ہنری طارنس ہفتہ عشرہ کے واسطے کلکتہ کے عازم ہوے ایک دھنوے کا جہاز نظامت کا تھا وہ آمادہ اون کے لیجانے کے واسطے ہوا جس دن صبح کو وہ سوار ہونگے اُس کے قبل شام کو ایک شخص نے مجھکو آکے خبر دی کہ آپ اسی وقت جاکے صاحب ایجنٹ کو

[1] یہان کاغذ پھٹا ہے اس لیے کچھ عبارت رہ گئی۔ [2] ایضاً۔

منع کیجیے کہ اس جہاز پر نہ سوار ہوں ان دو آدمی ساحر اوس جہاز پر بٹھلائے گئے ہین اور اونھون نے وعدہ مصمم کیا ہے کہ صاحب جنٹ کلکتہ مین پہونچ نہین سکین گے راستہ مین ہم اون کو تمام کر دینگے۔ اگرچہ اب سحر کی تاثیر کا یعنی زمانہ مین اون کے عامل موجود ہونے کا مجھکو یقین ہو گیا تھا لیکن اسکے ساتھ اتنی تاثیر سریع کا مجھے مبالغہ معلوم ہوا اور اوس وقت کبھی عادت صاحب جنٹ کے پاس جانے کی نہ تھی اور وہ میری ملاقات سے انکار بھی کر چکے تھے کچھ وہان جانا اور اون سے اسکی اطلاع کرنا بیہودہ معلوم ہوئی مین نہ گیا صبح کو وہ سوار ہوے جہاز اوسی دن شام کو یا دوسرے دن کلکتہ مین پہونچا جونہین مسٹر ہارنس نے ارادہ جہاز پر سے اوترنے کا کیا دفعۃً مصروع ہو کے گر پڑے اور مجنون ہو گئے دو تین دن کے عرصہ مین قضا کر گئے کسی دوسرے شخص کو یقین ہو یا نہ ہو مجھکو اوس وقت سے عقیدہ واثق ہو گیا کہ زمانہ مین ساحر کامل اب تک موجود ہین۔ اسی مقام کے مناسب ذکر تاثیر اعمال علوی کا ہے چونکہ راقم کو مرشد آباد مین ایسے امور پیش آنے سے نہایت ربح تھا اوسی حالت مین مین نے ایک عمل نہایت تضرع اور زاری کے ساتھ پڑھا اور یہ دعا کی کہ اللہ تعالی سب میرے دشمنون کو جو باعث میرے ایذا کے ہوے ہین ہلاک اور خراب کرے عجیب اتفاق ہوا کہ جناب عالی نواب ناظم ہنوز سفر مین تھے کہ وہان ایک شخص متہم چوری کا کیا گیا یا حقیقت مین کسی خواجہ سرا کی کوئی چیز اوس نے چرائی تھی اوس شخص پر ناظم اور ستم ہوا کہ وہ شخص مر گیا۔ ہر روز ظاہر ہوا تھی کے پاؤن مین باندھ کے سفر مین اوس کو لیجاتے تھے جب لشکر فرودگاہ پر پہونچتا تھا تو اوس پر ضرب اور شلاق ہوتی تھی آخرش وہ شخص متحمل نہ ہوا مر گیا۔ صاحب مجسٹریٹ نے مرشد آباد کے سارے رفقا اور مصاحبین نواب ناظم کی دار و گیر کی۔ خود نواب ناظم چونکہ محکوم عدالت نہین ہین محفوظ رہے اور سب خواجہ سرا اور رفقا ماخوذ ہوے سب پر جرم اوس شخص کے اہلاک کا ثابت ہوا خصوص وہ ذات شریف جو میری جگہ پر عرض بیگی مقرر ہوے تھے سیشن کی عدالت سے سب کے واسطے چودہ چودہ برس کی قید ہوئی عرض بیگی جو ظاہر امرد شریف تھا کہ اپنے تئین

ذکر تاثیر علوی عمل کا جو راقم نے پڑھا

سید کہتا تھا وہ کسی قسم کا زہر اپنے پاس رکھتا تھا جب حکم اوس کے محبس مین لیجانے کا ہوا وہ تو زہر کھا کے مرگیا اور سب دس بارہ آدمی خواجہ سرا وغیرہ پابجولانہ اور مشقت کے ساتھ مقید ہوے بعد مرافعہ کے صدر عدالت مین صرف دو خواجہ سراؤن کی رہائی ہوئی کہتے ہین کہ گواہون کی بہمرسانی مین اور دربار مین قریب ایک لاکھ روپیہ کے اونھون نے خرچ کیا اس سبب سے اون کی رہائی ہوئی مگر جب تک صدر عدالت سے حکم اون کی رہائی کا ہو وہ دونون بھی پابجولانہ اور باشقت مقید رہے اور جب اون کی رہائی ہوئی تب گورنر جنرل کے حکم سے اون کا جناب عالی کی رفاقت سے بلکہ مرشدآباد سے اخراج ہوا اور خود جناب عالی اس امر مین نہایت بدنام ہوے چنانچہ اب پندرہ برس کے بعد جب جناب عالی کچھ اپنے طلب مقاصد کے واسطے ولایت مین گئے ہین وزیر ہندوستان نے بعضے اون کے مطالب کی نامنظوری کے واسطے وہی بدنامی جناب عالی کی پیش کی غرض مجھکو خوب عقیدہ واثق ہے کہ وہ سب کچھ جو واقع ہوا صرف میرے عمل کی تاثیر سے ہوا اس واسطے کہ اوس عمل کی تاثیر مین لکھتے ہین کہ وہ کبریت احمر ہے نالائقون کو اوسے مت سکھاؤ۔ اب بیان ایک اور عنایت اور شفقت ایزدی کو جو ہمیشہ اس نالایق پر مصروف رہی ہے بیان کرنا ضرور ہوا یعنی وہ میری علیحدگی جناب عالی کے پاس سے پھر باقتضاے عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ہوئی اگرچہ مجھکو یقین ہے کہ اگر مین بدستور اپنے عہدے پر جناب عالی کے ہمراہ ہوتا تو ایسی سخافت واقع نہ ہونے پاتی باین ہمہ اگر سب حمقا اور نالایق لوگ میری ممانعت نہ مانتے اوس صورت مین خدانخواستہ راقم بھی اوس بلا مین مبتلا ہو جاتا۔ اس واسطے جناب اقدس الٰہی نے مجھکو اوس سے نجات دی الغرض بعد ان حوادث اور سوانح کے خصوص مسٹر ہنری طامس کی وفات کے بعد اگر مین ہنوز اپنے عہدون پر بحال ہوتا تب بھی بالضرور استعفا دیتا لیکن مجھے ایک بڑا کھٹکا تھا کہ چار برس تک مین نواب امیر النسا بیگم کی ڈیوڑھی پر رہا لاکھون روپیہ میرے ہاتھ سے خرچ ہوا اور عرض بیگی کے اور مدار المہامی نظامت کے عہدے پر اگرچہ تھوڑے دن قیام ہوا وہان بھی بہت

بریکی برخاست نظامت عہدہ مدار المہامی

روپیہ میرے ہاتھ سے اوٹھا ہے واصلات کے بکھیڑے مین سب حمقا مدت تک مجھے جھلاوینگے
اگرچہ مین اس قدر بے لوث تھا کہ اگر عاقلانہ مجھ سے حساب سمجھتے تو دس بیس دن مین فراغت
ہوجاتی لیکن اس کا ہرگز گمان نہ تھا خصوص بعد سر ہنری طامس کے قضا کرنے کے ایک
صاحب مرشد اباد کے جج تھے وہ قائم مقام ایجنٹ گورنر جنرل ہوگئے اور بعضے وجوہ سے جس کی
شرح یہان عبث اور طول ہے وہ مجھ سے کچھ ناراض تھے اونھون نے بجز واجلاس کے جو خطوط
میری معزولی کے باب مین دونون عہدون سے نظامت سے آئے تھے اور مسٹر فارسس نے جواب
اوس کا نہین لکھا تھا منظوری کا جواب لکھ کے بھیجدیا اس سبب سے مجھکو نہایت دغدغہ پیدا
ہوا کہ واصلات کے بکھیڑے مین مجھکو لوگ بہت زحمت دینگے اس عرصہ مین کپتان مگریگر نام
ایک صاحب مستقل گورنر جنرل کے ایجنٹ مقرر ہوے یہ صاحب پچھلے دنون مین لارڈ اکلنڈ کے
مصاحب تھے جب راقم فارسی دفتر کا میر منشی تھا مجھکو خوب جانتے تھے راقم چھ مہینے سے زیادہ
واصلات سمجھانے کے انتظار مین وہان مقیم رہا اور باوصف اون کی تاکید کے کسی نے واصلات
نہ سمجھی اور اونھون نے اہالی دفتر سے بالا بالا تحقیقات کرکے میری بے لوثی پر یقین کیا اور مجھے اجازت
دی کہ تم جہان جی چاہے چلے جاؤ ساری کیفیت اس کی بھی بہت طول ہے کچھ اوس کے ذکر کرنے
سے فائدہ نہین ہے۔ اسی عرصہ مین لکھنؤ سے میری بتاکید طلب ہوئی اور درصورت
تاخیر کے احتمال ضرر کا تھا چنانچہ بنظر نہایت تاکید کے ایک ہزار روپیہ میرے مصارف
راہ کے واسطے گیا مگر اوسی واصلات سمجھانے مین مجھکو اس قدر تاخیر ہوئی کہ موجب
ناراضمندی وہان کے ارباب اقتدار کا ہوا اور وہ ہزار روپیہ پھیر دینا پڑا اور اگر مین
فوراً طلب کے وقت یہان پہونچ جاتا تو ظن غالب بہت ترقی کا تھا سبب تاخیر
کے کچھ ظہور مین نہ آیا۔ قریب دو برس کے مین خانہ نشین رہا کہ اتنے مین اودھ کی
سلطنت سرکار انگریزیہ نے ضبط کرلی جس کی ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر مین تھا
.... بتاکید میری طلب ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلاکے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن

روانگی لکھنؤ سے طلب ہوئی اور ایک ہزار روپیہ راہ کے واسطے گیا مگر واصلات کے بکھیڑے سے تین چار مہینے مین پہونچا

ضبطی کے مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہانتک تاکید تھی کہ اوسی طرف سے مین روانہ ہوجاؤن اور پھر گھر مین نہ جاؤن ایسے اضطراب مین مجھکو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منتشر ہوئی مین منجھی ایک شب کے واسطے اپنے عزیزون سے رخصت ہونے کے لیے گھر مین آیا اوس کی صبح کو کلکتہ کی طرف روانہ ہوا اور بادشاہ کو اون کے خیر طلبون نے صلاح دی تھی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہون اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکہ معظمہ کے حضور مین اور پارلیمنٹ مین بذات خود اصالتاً پیش کرین حقیقت مین یہ راے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے دو برس جو اونھون نے قلعہ مین رہنے سے مصیبت جھیلی اوس سے محفوظ رہتے اور غالب گمان قریب بہ یقین کے ہے کہ جو مال اب بادشاہ کے واسطے ہوا اوس سے بمراتب بہتر ہوتا۔ الغرض پہلے تو بادشاہ نے اسی عزیمت پر کلکتہ کی روانگی کا قصد کیا چنانچہ اسی کے بندوبست کے واسطے پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنون کے بعد خود بھی روانہ ہوے مگر چونکہ جبلت سے ضعیف القلب ہین اور دریا کے سفر سے اون کو نہایت خوف وخطر تھا کلکتہ مین پہونچکے راے بدل گئی اپنی عزیمت موقوف کی ملکہ کشور اپنی والدہ ماجدہ کو اور مرزا حامد علی بہادر ولیعہد کو اور مرزا جواد علی سکندر حشمت اپنے بھائی کو جو اپنے باپ کے وقت مین جنرل کہلاتے تھے ولایت کی روانگی کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر کیا اور حضرت ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے نام پر جو عریضہ لکھا تھا اوس مین یہ لکھا کہ مین نے اپنی والدہ اور اپنے بیٹے اور اپنے بھائی کو صرف حضور کی دیانتداری کے واسطے روانہ کیا ہے اور مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر کو جو اس سیہ کار کا نام ہے اپنا مختار اور وکیل استغاثہ پیش کرنے کے واسطے مقرر کیا ہے اون تینون آدمیون کو مطلق کچھ میرے مقدمہ سے اور دعوے سے علاقہ نہین ہے اوس کا انجام اور فیصلہ صرف میرا وکیل بذات خود کریگا فقط۔ اور قبیل روانگی کے راقم نے بادشاہ کے حضور مین عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلۂ عالم فدوی کو اور اپنے عزیزون اس سفر دور دراز مین بھیجتے ہین بہت صعب امر ہے اور انجام اوس کا

سلطنت اودھ کی ضبطی کے بعد واجد علی شاہ نے غارت پر مقرر کیے جانے کے لیے کلکتہ کی طرف روانہ کیا

ملکہ اور ولیعہد اور جنرل سکندر حشمت ولایت جانے کے واسطے تجویز ہوے اور راقم کو سفیر مقرر کیا اور ملکہ معظمہ کے حضور مین سفیر اخراج دریگا کہ اون تینون کو سفر سے کچھ علاقہ نہین دو مرتبہ سفیر اخراج دریگا

موقوف نہایت صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ پر ہے اگر پیچھے سے گھبرا کے
نقدی قبول کرلینا منظور ہے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ہین مجھے حکم ہوا تم ہمین بہت
اچھا بندوبست سلطان عالم کے واسطے کروادیوے - اسپر ارشاد ہوا کہ مین بھیک مانگون گا اور
دریوزہ گری کرون گا مگر زنہار ایک حبہ نقدی مین نہین قبول کرون گا - زنہار تم اس طرح کی گفتگو
کبھی نہ کیجیو - غرض راقم معہ سارے قافلے کے اٹھارون جون ۱۸۵۶ء کو بنگال نام جہاز پر سوار ہوا اور
جہاز نے کلکتہ سے لنگر اوٹھایا - اب چونکہ وہی سب نالایق لوگ جو سلطنت کی ضبطی کے باعث
ہوئے تھے سب بادشاہ کے ہمراہ تھے اور وہی دراندازیان اور سازشین اور جوڑبندیان بدستور
تھین ملکہ کشور کے ساتھ بعضے مفسد جن کی کرنیل سلیمن نے شکایتین لکھی تھین اور وہ چھپ کے
بلوبک مین ارباب پارلیمنٹ کے پاس پیش تھین کہ وجوہ ضبطی سلطنت مین ایک وجہ مفسدہ پردازی
اون لوگون کی لکھی گئی تھی اون ایک سو چالیس آدمی کے زمرہ مین جو ہمارے ساتھ روانہ ہوئے
شریک ہوگئے - بعضے لوگ جو لکھنؤ مین قدیم سے جعل ساز مشہور تھے اون کو اون مفسدون نے
پیچھے بلالیا کہ دوسرے جہاز پر سوار ہوکے اسکندریہ مین شامل ہوگئے اور بعضے خواجہ سرا جہلا اور
بعضے دو دو پیسے کے آدمی تینون صاحبون کے ہمراہ گئے کہ وہی سب اون تینون سرکارون مین
بیش بیش اور بااقتدار تھے چنانچہ بعد لندن مین پہونچنے کے کرنیل سلیمن جو اوس عرصہ مین
ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیرمین تھے ایک دن وہ راقم سے کہنے لگے کہ مولوی صاحب ہم آپ کے بڑے
شکرگزار ہین کہ آپ ہمارے دعوون کے سب گواہ ہمراہ لیکے آئے ہین پہلا فساد جو مرزا ولیعہد بہادر کے ہمراہیون
سے ہوا وہ یہ تھا کہ بعضے رقوم جواہرات گران بہا کہ جو بادشاہ مغفور حضرت ملکہ معظمہ کی نذر کے واسطے
ہمراہ کیے تھے وہ مرزا ولیعہد بہادر کے مفوض ہوئے تھے اور ایک خواجہ سرا حبشی اون کی
طرف سے خزینہ دار تھا جب بندر سویس مین جہاز کا لنگر ہوا چونکہ وہ بڑا بھاری جہاز
گھاٹ تک نہین جاسکتا تھا اس واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب اتار کے
گھاٹ پر لیجاتے تھے رستہ مین اون خواجہ سرا صاحب نے جو خزینہ دار تھے ظاہر کیا کہ وہ

ایک جواہر نگار صندوقچہ جس مین جواہرات ملکہ معظمہ کی نذر کے واسطے تھے خواجہ سرا صاحب کے حوالے کیا گیا

رقوم جواہرات گران بہا جس کی قیمت واقعی مجھے نہین معلوم تھی مگر میری تخمین مین دو تین لاکھ روپیہ سے زیادہ کے نہ تھے کم کا احتمال ہے اونھون نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت اون کو ایک خاصدان مین رکھ کے اپنے ایک خدمتگار کی تحویل مین سپرد کیا تھا جو ڈیڑھ دو روپیہ مہینے کا اون کے پاس نوکر تھا اوس کے ہاتھ سے وہ خاصدان بحر زخار مین گر پڑا۔ اب اس قضیہ مین خوض کرنا چاہیے اول تو وہ رقوم گران بہا صندوق سے نکال کے خاصدان مین بدون کسی سے صلاح مشورہ پونچھنے کے رکھ لینا۔ بعد اوس کے خزانہ دار صاحب خود اس چھوٹے سے خاصدان کے بوجھ کے کاہے کو متحمل ہوتے اپنے دو پیسے کے خدمتگار کو سپرد کر دیا اور اوس کو بھی اپنی آنکھ کے سامنے نہ رکھا اجازت دی جہاز پر جہان چاہے بیٹھے۔ غرض واقعی حقیقت اس معاملہ کی خدا کو معلوم ہے بعضے کہتے ہین کہ وہ امرا بتداسے بادشاہ کے ایک محل کے بندوبست کے بموجب ظہور مین آیا اور وہ خاصدان بجنس اوس محل کے پاس داخل ہو گیا۔ یا کلکتہ سے وہ مال گیا ہی نہ تھا العیب علی اللہ

لندن مین آنے پر ملکہ کشور کا بادشاہ سے ملاقات کے واسطے آنا

غرض لندن مین پہونچ کے بادشاہ کے مقدمہ کا بہت عمدہ بندوبست ہوا۔ اول ملکہ کشور کا آٹھوین دن دربار مقرر کیا کہ ہز ہنچشنیہ کو سیکرٹون بی بیان تشریف لاتی تھین اور شرف اون کی ملاقات سے ہوتی تھین متوسطین سے لیکے اونچے طبقہ تک کتنے انگلستان وغیرہ کی عورتون مین کوئی باقی ہوگی جو اون کی ملاقات کے واسطے نہین آئی۔ ملکہ معظمہ کی مصاحبین بھی تشریف لائین یہان تک خود ملکہ معظمہ دام اقبالہا و دولتہا کی خواہش ملاقات کی ہوئی اور ایک خوبصورتی سے ملکہ معظمہ سے ملاقات ہوئی کہ جب سے انگلستان کی سلطنت قائم ہوئی ہے کبھی وہان ایسا امر ظہور مین نہین آیا تھا یعنی زنانہ دربار ہوا کہ کوئی مرد وہان نہ تھا اور دربار خاص مین صرف ملکہ کشور اور دونون شہزادے اور راقم گئے ملکہ کشور سے تو ملکہ معظمہ نے ہاتھ ملایا اور خود بیٹھین اور محاذات مین ایک اوسی نہج کی کرسی پر ملکہ کشور بیٹھین اور مرزا ولیعہد بہادر ایک پہلو مین ملکہ کشور کے اور ایک پہلو مین مرزا سکندر حشمت کھڑے ہوئے اور پشت پر ملکہ کشور کے راقم کھڑا ہوا اوس وقت ملکہ کشور نے اپنے چہرہ سے

برقع اوٹھایا اور میری پشت پر سر جارج کلارک کھڑے ہوے اس واسطے کہ اوس
وقت تک مین بخوبی انگریزی مین گفتگو نہین کر سکتا تھا تاکہ میرے ذریعہ سے
ترجمہ ملکۂ کشور کی اور ملکۂ معظمہ کی گفتگو کا کرین اور جب گاڑی سواری ملکۂ کشور
کی قصر سلطانی کے برامدے مین پہونچی مجھے حکم ہوا کہ تم اپنے طور پر بندوبست
زنانہ کا کرکے ملکۂ کشور کو اوتار کے لیجاؤ اس مین ملکۂ معظمہ نے تین چار بڑی بڑی
لیڈیون کو بھیجا نہ وہ ملکۂ کشور کو اوتار کے لے گئین اور جب دونون ملکہ آمنے سامنے
بیٹھین اوس وقت راقم نے خریطہ بادشاہ کا گذرانا۔ اوس کو ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھ مین لے لیا اور
جب تک بیٹھی رہین وہ ہاتھ مین رہا۔ قریب پچیس تیس بڑی بڑی لیڈیان اور سب شاہزادیان
اور چھوٹے چھوٹے شاہزادے ملکۂ معظمہ کے بائین پہلو پر کھڑے رہے۔ اس مین ملکۂ معظمہ نے بعد
گفتگو ذوق شوق ارشاد کیا کہ میرا بڑا بیٹا یعنی پرنس آف ویلس جو ولیعہد سلطنت برطانیہ اعظم ہین چونکہ
پندرہ سولہ برس عمر کے ہین اس واسطے اون کو اجازت یہان آنے کی نہین ہوئی اگر آپ اجازت
دیوین تو وہ بھی آوین۔ ملکۂ کشور نے فرمایا آپ کا بیٹا میرا بیٹا ہے آپ بے تکلف اون کو بلا دین
بعد اوس کے ملکۂ معظمہ نے دونون شاہزادون کو اور راقم کو حکم دیا کہ اوس کے تیسرے دن ہم تینون
آدمی کھانے کی میز پر حاضر ہون اور یہ ایما کی گئی کہ ہر تقریب مین جو ملکۂ معظمہ کے یہان ہوگی۔ ہم
تینون شخصون کی طلب ہوا کریگی لیکن تقدیر نے مجازنہ کیا یعنی دوسرے دن کلکتہ
سے تار برقی پر خبر آئی کہ بادشاہ کو قلعہ مین مقید کیا ہے وہ سارا بندوبست جو
وہان ہوا تھا سب ملتوی ہوگیا اور قبل حضور کے ملکۂ معظمہ کے دربار مین ایک
اور فتور پیدا ہوا کہ کلکتہ مین مفسدون نے بادشاہ کو ورغلانا کہ راقم کو عہدۂ سفارت
سے معزول کرین اور کپتان اوزلی نام ایک شخص جو کسی سخت قصور کے سبب
سے ہندوستان مین معزول ہوگیا تھا اوس کو سفیر مقرر کرین بادشاہ نے میری
معزولی تو قبول نہ کی مگر کپتان اوزلی کو لقب ایجنٹ ان چیف اور خطاب کرنیل کا عطا کرکے

دربار خاص مین گئے اور بادشاہ اور راقم کو اندر بلا لیا اور راقم کو ملکۂ معظمہ کے
ہونٹھا۔ دو واقع ہوا اور راقم نے بارشاہ کا خط گذرانا

دوسرے دن بادشاہ کے خیمہ مین جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ ایک تار برقی آیا کہ بادشاہ کو قلعہ مین مقید کیا ہے

رجسٹرڈ نمبر ۴۷۰ لے

ہو المستعان

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ: قیمت فی پرچہ

محصول معاف

عطیہ کی روانگی پر آدھا

اور

عطیہ کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

ہدیہ دیجیے

عطیہ کی روانگی پر ان ظرف ایک سال

اور

تمام کی روانگی پر عطیہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم

اُردوے معلی عمدہ
عود ہندی ۸ر۸ عدد
دیوان غالب جدید
مکمل دیوان غالب صد

سرسید مرحوم

خطبات احمدیہ عمدہ
مکمل مجموعہ لکچر لطیف
اسباب بغاوت ہند ۸ر
سیرت فریدیہ ۱۰ر
خطوط سرسید عمدہ

نواب محسن الملک مرحوم

مضامین ندوۃ الی اخلاق المسلمین
مکمل مجموعہ لکچر لطیف
تقلید و عمل بالحدیث ۱۲ر
کتاب البعث والنشور ۱۲ر
مکاتیب عمدہ
مسلمانوں کی تہذیب ۶ر

خلیفہ محمد حسین مرحوم

اعجاز التنزیل لطیف
سفرنامہ برنیو جلد لطیف

مولانا آزاد مرحوم

آب حیات عمدہ
دربار اکبری صد
سخندان فارس ۷ر
نگارستان فارس ۷ر
مراۃ العروس ۱۲ر
گلبستہ النصوح ۱۰ر
سیر ایران عمدہ
موعظہ حسنہ ۴ر
رویای صادقہ ۴ر
ایامی ۴ر
فسانہ بتلا ۴ر
ابن الوقت ۴ر
مصائب غدر ۱۲ر
مجموعہ نظم بے نظیر ۴ر
گل بکاؤلی مجلد ۲ جلد ۴ر
نقاب اکھکایات ۶ر
چند پند ۶ر
سلوے المکروب عمدہ

مولانا شہری مرحوم

حیات امیر عمدہ
خیالات شہباز عمدہ

مولوی سید ممتاز علی

تذکرۃ الانبیا عمدہ
شیخ حسن ۱۲ر

مولانا نذیر احمد مرحوم

احکام شریعت مترجم عمدہ
الحقوق والفرائض ۷ر
مراۃ العروس ۱۲ر
توبۃ النصوح ۱۰ر
موعظہ حسنہ ۴ر
رویای صادقہ ۴ر
ایامی ۴ر
فسانہ بتلا ۴ر
ابن الوقت ۴ر
مصائب غدر ۱۲ر
مجموعہ نظم بے نظیر ۴ر
گل بکاؤلی مجلد ۲ جلد ۴ر
نقاب اکھکایات ۶ر
چند پند ۶ر
سلوے المکروب عمدہ

مولانا حالی مرحوم

یادگار غالب ۷ر
حیات سعدی عمدہ
مقدمہ شعر و شاعری عمدہ
حیاتِ جاوید لطیف
دیوان حالی عمدہ
مسدس حالی عمدہ
مجموعہ نظم حالی عمدہ
بچوں کی مناجات ۲ر
شکوۂ ہند ۲ر

مولوی بشیر الدین احمد

واقعات دارالحکومت دہلی ۵ جلد
تاریخ بجاپور ۷ر
حرز اطفال عمدہ
نشاط عمر عمدہ
عصائے پیری عمدہ
لخت جگر عمدہ
حسن معاشرت ۴ر
اصلاح عیشت عمدہ
اقبال زوال عمدہ
شعبدہ ایت ۱۲ر
انشائے بشیر ۱۲ر
دیوان بشیر عمدہ

مولانا شبلی مرحوم

سیرۃ النبی جلد اول ۱۰ر
جلد دوم ۸ر
سوم ۸ر
مقالات شبلی عمدہ
شعر العجم جلد اول ۷ر
دوم ۸ر
سوم ۸ر
چہارم ۷ر
پنجم ۸ر
موازنہ انیس و دبیر ۷ر
مضامین عالمگیر عمدہ
الفاروق صد ۷ر
سیرۃ النعمان عمدہ
الغزالی عمدہ
المامون عمدہ
سوانح مولانا روم ۶ر
سفرنامہ مصر و روم و شام ۶ر
علم الکلام ۶ر
الکلام ۶ر
رسائل شبلی عمدہ
مقالات شبلی عمدہ
شعر العجم جلد اول ۷ر
دوم ۸ر
سوم ۸ر
چہارم ۷ر
پنجم ۸ر
موازنہ انیس و دبیر ۷ر
مضامین عالمگیر عمدہ
الفاروق صد ۷ر
سیرۃ النعمان عمدہ
الغزالی عمدہ
المامون عمدہ
سوانح مولانا روم ۶ر
سفرنامہ مصر و روم و شام ۶ر
علم الکلام ۶ر
الکلام ۶ر
رسالہ علم مناسب ۶ر
معاون الحجاب عمدہ
مساحت زمینہ ۸ر

سید نمود مرحوم

کتاب الاخلاق ۶ر
کتاب الشفعہ ۶ر
کچہری ۶ر
شرح قانون شہادت ۶ر

مولوی رشید احمد

المدخل الی الاسلام ۶ر

تاریخ ہند

تاریخ ہندستان جلد ۱
تاریخ ہند جلد ۲
تزک بابر
آئین قیصری
صحیفہ فطرت
تعلیم الانتظام
محاربات عظیم
جغرافیہ ریاضیہ
جغرافیہ طبعی
اہل عرب کا جہاز مقابلہ
سالہ علم مناسب ۶ر
معاون الحجاب عمدہ
مساحت زمینہ ۸ر

مولانا ذکاء اللہ مرحوم

تاریخ ہندستان جلد ۱
تاریخ ہند جلد ۲
تزک بابر
آئین قیصری
صحیفہ فطرت
تعلیم الانتظام
محاربات عظیم
جغرافیہ ریاضیہ
جغرافیہ طبعی
اہل عرب کا جہاز مقابلہ
سالہ علم مناسب ۶ر
معاون الحجاب عمدہ
مساحت زمینہ ۸ر

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ اپریل ۱۹۲۸ء

جلد ۳۴

[illegible]	مولوی حامد حسن قادری لکچرار سینٹ جانس کالج آگرہ	۱
[illegible]	مسٹر علیل احمد علیل قدوائی بی اے (علیگ)	۱۰
[illegible]	مولوی سید عتیق حسن موسوی فاضل فقہ	۱۱
[illegible]	حکیم انتظار علی جگر صدیقی بسوانی	۱۶
[illegible]	مولوی محمد نسیل الرحمن مترجم اخبار الاندلس	۱۷
[illegible]	اقدس حیدرآبادی مرحوم	۳۹
[illegible]	ڈاکٹر محمد اعظم کریوی	۴۰
[illegible]	مسٹر شبیر احمد علوی بی اے (علیگ)	۴۱
نظرے خوش گزرے		۶۰
[illegible]	خودنوشت مولوی سراج الدین خاں بہادر مرحوم	۹۷ / ۱۱۲

ظ

سفرنامۂ اندلس

مرتبہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم سکرٹری ایجوکیشنل کونسل بھوپال، جس میں اندلس کی تقریباً ایک سو مشہور اسلامی بستیوں قرطبہ، غرناطہ، مالقہ، طلیطلہ، اشبیلیہ، بلنسیہ، شلوبہ، قادس وغیرہ کے چشمدید حالات اور فتوحات طارق و موسیٰ، منصور و ابن رقیہ وغیرہ کے واقعات مع آثار و مناظر اسلامی درج ہیں۔ اور کتاب کو دلچسپ و مفید بنانے کیلئے متعدد نقشے اور قصور و محلات، مساجد و قلعہ جات وغیرہ کی ۹۶ عکسی تصویریں اضافہ کی گئی ہیں۔ کتاب کی طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ قیمت مبلغ

منیجر المناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب فرمایئے۔

نئی کتابیں

ترجمۂ تاریخ ابن خلدون کی گیارہ جلدیں عرصہ ہوا مکمل ہوگئی تھیں اور سالہا سال سے فراہم کی جارہی ہیں۔ حال میں دو جلدیں اور شایع ہوئی ہیں۔ بارہویں جلد میں علاوہ دیگر حکمرانان اسلام کے یمین الدولہ سلطان محمود بن امیر سبکتگین کے حالات ہیں، جے پال، انندپال، بھیجے راؤ، رکالی چند، برم دیو، اور چند پال جیسے سورما راجاؤں کی جان توڑ کوشش مقاومت اور بھٹنیر، ملتان، گوالیار، کالنجر، نگرکوٹ، تھانیسر، کشمیر، قنوج، متھرا، مہابن، نہروالہ اور سومنات کی لڑائیوں کا تذکرہ ہے۔ قیمت ۔ر

تیرہویں جلد میں سلاطین غوریہ کے انساب و حالات، دہلی، اجمیر، بنارس، گوالیار، میرٹھ، علیگڈھ، کالپی اور بدایوں وغیرہ کی فتوحات، کھانڈے راؤ، پتھورا، بھیم دیو، جے چند، اور ہیمراج جیسے سورما راجاؤں کی جان توڑ کوششیں، سلطان شہاب الدین غوری کے مجاہدات، اور سپہ سالاران دیلم، کوک بنو بویہ، حکمرانان آذربائیجان، فرمانروایان بطیحا اور شاہان دنبور وصاحبان کے سچے واقعات ہیں قیمت ۔ر

ذکرے۔ خواجہ محمد عبدالحی فاروقی استاذ تفسیر جامعہ ملیہ کی مشہور تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کی تازہ ترین جلد جس میں پارۂ عم کی تفسیر ہے۔ قیمت ۔ر

عربوں کا تمدن۔ ڈاکٹر جوزف ہیل، ایک قابل جرمن مستشرق نے عربوں کے تمدنی حالات کے متعلق جسقدر معلومات مغربی زبانوں میں مہیا ہے، سب کو اس رسالہ میں جمع کردیا ہے۔ جسکا ترجمہ سید نذیر نیازی بی اے (جامعی) نے کیا ہے۔ قیمت ۔ر

صلاح کار۔ چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار ردولوی نے، جنکا انداز تحریر بالکل مخصوص ہے، یہ کتاب اس غرض سے لکھی ہے کہ زن وشو کے تعلقات پر اب سنجیدگی کے ساتھ نئی روشنی کے ماتحت غور و خوض ہونے لگا ہے اور لوگ اس بارے میں نیک مشورہ کے حاجتمند ہیں۔ صلاح کار کے مشورے ہمکو کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کے لیے لابق پذیرائی نہ ہوں، لیکن اگر اس مسئلہ پر کسی قسم کی رائے قائم کرنا منظور ہے، تو اس کتاب سے ہر شخص کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ جن لوگوں کو اس کی فکر نہیں کہ بی بی کیسی ہو، کب ملے، اور اسکے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا یا اس سے کیا توقعات رکھنا چاہیے۔ وہ اس کتاب کے مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائیں۔ قیمت ۔ر

منیجر الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۴ جلد ۳۴ — اپریل سنہ ۱۹۲۸ء

مستشرقین انگلستان کی سب سے پہلی انجمن

(از مولوی حامد حسن قادری لکچرار فارسی سینٹ جانس کالج - آگرہ)

انگلستان کا تعلق ممالک مشرقی سے بہت قدیم ہے - لیکن حکومت ہندوستان نے اس تعلق کو جتنا قریب و وسیع کر دیا وہ پہلے میسر نہ تھا - ہندوستان نے نہ صرف انگریزوں کے جیبوں کے لیے اپنے خزانے کھول دیے بلکہ اُنکے تشنہ دلوں کی بھی اپنے علوم و فنون کے چشموں کی طرف رہنمائی کی - البتہ جس ذوق و شوق اور ہمت و مردانگی سے اُن تشنگان علم و ادب نے آبحیات تک راستہ پایا اور ظلمات سے نکال کر پیاس بجھائی وہ لائق صد آفریں ہے -

اِنھیں کوششوں کا ایک قدم یہ تھا جو غالباً اپنی نوع کا قدم اولیں بھی تھا کہ انگلستان میں سنہ ۱۸۲۳ء میں ایک سوسائٹی بنام "اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ" قائم کی گئی - جس کا مقصد تمام ممالک مشرقی کے علم و حکمت کے موتی رول لینا تھا - اسکے مربی و سرپرست انگلستان کے بادشاہ ولیم چہارم تھے - نائبان مربی میں بائیس علما و امرا کے نام ہیں جن میں چند یہ ہیں :-

ہز مجسٹی بادشاہ بلجیم
ہز رائل ہائنس ڈیوک آف سکس
ہز رائل ہائنس ڈیوک آف کیمبرج

ہز رائل ہائینس ڈیوک آف گلاسسٹر
ہز گریس لارڈ آرچ بشپ آف کینٹربری
ہز گریس ڈیوک آف ویلنگٹن
لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل ہندوستان
سر رابرٹ پیل ممبر پارلیمنٹ
سر جان ہالکم گورنر بمبئی۔

اس انجمن کے صدر مشہور مستشرق سر گور اوزلے تھے۔ نائبان صدر پانچ اشخاص تھے جن میں پہلا نام ارل آف منسٹر کا ہے۔ آنریری سکرٹری جے۔ سی۔ ہائن اسکوائر ایم اے تھے۔

اس "فنڈ" کے ممبر بنانے اور چندہ وصول کرنے کے لیے کلکتہ، مدراس، اور روم (اٹلی) میں شاخیں قائم کی گئیں۔

ہمارے سامنے اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی جو فہرست مطبوعات ہے وہ صرف چار سال (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۲ء) کا کارنامہ ہے۔ اس میں ۳۰ کتابیں طبع ہو کر شایع ہو چکی ہیں۔ سات کتابیں زیر طبع ہیں، اور ۲۷ کتابیں زیر ترجمہ و تدوین ہیں۔ چار سالہ کارروائی کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، چینی، سنگالی (سیلونی)، جاپانی، تامل، بنگالی، تبتین، سیریک (شامی) زبانوں سے ترجمے کیے گئے۔

۲۔ اصلی کتابوں اور نایاب قلمی نسخوں کی تدوین و تصحیح کر کے شایع کیا گیا۔

۳۔ علم ادب، تاریخ، فلسفہ، ریاضی، سیرت، سفرنامہ، جغرافیہ، شاعری، فسانہ وغیرہ سب قسم کے مضامین کی کتابیں ترجمہ و تالیف کے لیے انتخاب کی گئیں۔

۴۔ بلحاظ السنہ منتخب کتابوں کی تعداد یہ ہے

(۱)	عربی	۱۴
(۲)	فارسی	۲۱
(۳)	ترکی	۷
(۴)	سنسکرت	۴
(۵)	چینی و جاپانی	۱

(۶)　باقی سب زبانیں　　۱۰

۶۴

۶- بعض نادر مطبوعات مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) سفرنامۂ ابن بطوطہ - عربی مسودہ سے ترجمہ کیا گیا جو کیمبرج پبلک لائبریری میں موجود ہے اور جس پر تاریخ، جغرافیہ، نباتات، اثریات کے متعلق تشریحی حواشی درج ہیں - مترجمہ ریورنڈ ایس ٹی بی - ڈی پروفیسر زبان عبرانی کیمبرج یونیورسٹی -

(۲) سفرنامۂ میکرلیس پادری الظاکیہ جو اس کے رفیق سفر آرچ ڈیکن پال حلبی نے عربی میں لکھا حصہ اول سفرنامہ انا طولیہ، رومیلیا، مالدیویا - حصہ دوم سفر ولیشیا، مالدیویا - وممالک کا سلک - مترجمۂ ایس - سی - بلیفور -

(۳) ہن کونگ سو - ایک چینی افسانۂ غم - اصلی زبان سے ترجمہ کیا گیا - مع حواشی و نمونۂ اصل کتاب مترجمہ جان فرانسس ڈیوس، ایف آر ایس -

(۴) ملفوظات تیموری - یعنی تیمور بادشاہ کے خودنوشت حالات - جو اصل چغتائی ترکی زبان سے ابو طالب حسینی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیے - مترجمۂ میجر چارلس اسٹیوارٹ سابق پروفیسر السنۂ مشرقیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کالج

(۵) سیرت حافظ الملک حافظ رحمت خاں موسوم بہ "گلستان رحمت" نوشتۂ نواب مستجاب خان بہادر ابن حافظ رحمت خاں - مترجمۂ چارلس ایلیٹ -

(۶) جبر و مقابلۂ محمد بن موسیٰ - مرتبۂ و مترجمۂ فریڈرک روسن -

(۷) تذکرۃ الواقعات - یعنی حالات شہنشاہ ہمایوں - نوشتۂ جوہر آفتابچی خادم شاہی - مترجمۂ چارلس اسٹیوارٹ موصوف الصدر -

(۸) جغرافیۂ اورسیی - مترجمۂ ریورنڈ ہی - سی - رنیوارڈ - یہ کتاب عربی میں ۱۵۵۴ء میں لکھی گئی تھی - جس میں ایک نقرئی کرۂ ارض (جو رومی شاہ سلیمان کے لیے بنایا گیا تھا) کی جغرافیائی تشریح کی گئی ہے، اور یونانی جغرافیہ دانوں کی مجوزہ ہفت اقلیم بیان کی گئی ہیں -

(۹) سانکھیا کاریکا - سنسکرت نظم کے ۷۲ بند جن میں سانکھیا فلسفہ مابعد الطبیعات کے اصول نظم کیے گئے ہیں - مترجمۂ ہنری طامس کول بروک -

(۱۰) لی کی - ایک قدیم چینی تصنیف جو کنفوشس کی طرف منسوب ہے، اور ملک چین کے اخلاق

و رسوم کی بنیاد ہے اور اب تک اس ملک میں سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے۔

(۱۱) تاریخ ابوالفتح ابن ابوالحسن السامری۔ یہ نادر عربی تصنیف جس کا واحد مکمل نسخہ یورپ میں موجود ہے۔ سامریہ فلسطین کی ابتدائے آفرینش سے وسط صدی چہاردہم تک کی تاریخ ہے

(۱۲) تاریخ بربری۔ مصنفہ ابن خلدون۔ مترجمہ ریوزنڈ پروفیسر لی۔ یہ نہایت نادر و قیمتی کتاب ہے جس میں ان شاہی خاندانوں کے حالات عروج و زوال درج ہیں جنھوں نے افریقہ کے مشرقی ساحل پر حکومت کی۔

اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کی مترجمات مطبوعہ میں سے ایک کتاب "تذکرۃ الواقعات" (کے مندرجہ فہرست بالا) اسوقت میرے سامنے ہے۔ اسکا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتا ہوں۔ اسکے متعلق مترجم انگریزی میجر چارلس اسٹیوارٹ نے لکھا ہے کہ اسکا صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے اور وہ انگلستان میں موجود ہے۔ لیکن میری خوش قسمتی سے اس کا دوسرا نسخہ ہندوستان کے ایک قدیم کتب خانہ میں مل گیا۔ میں اُس زمانہ میں علامہ شبلی کے مشورہ سے تذکرۃ الواقعات کے انگریزی ترجمہ کا اُردو میں ترجمہ کر رہا تھا۔ اصل قلمی فارسی نسخہ کو دیکھا۔ اُس سے مقابلہ کیا۔ ضروری نوٹ لیے۔

ٹرانسلیشن فنڈ کے مطبوعہ ترجمۂ تذکرۃ الواقعات میں ٹائٹل پیج سے پہلے ایک اور سرورق لگایا گیا ہے۔ جس پر فنڈ کا نام، سنہ تاسیس، نام سرپرست درج ہے۔ اور لکھا ہے کہ "یہ کاپی مارکوئس کولمنڈی ممبر اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کے لیے طبع کی گئی"۔ اس سرورق پر نہایت خوبصورت مشرقی وضع کی چوڑی بیل چھاپی گئی ہے۔ سرورق کے بعد شہنشاہ ہمایوں کی تصویر ہے جو معمولی مطبوعہ تصویروں سے کسی قدر غیر ہے۔ اگرچہ مشابہت وہی ہے۔ پورے قد کی تصویر ہے۔ تصویر کے مقابل دوسرا صفحہ ٹائٹل پیج ہے۔ جس پر نام کتاب و مصنف کے علاوہ سنہ طباعت ۱۹۳۲ء درج ہے۔ اسکے بعد پہلے صفحہ پر انتساب ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:-

بجناب

رائٹ آنریبل ارل آف منسٹر

مائی لارڈ

میں نہایت فخر و اعزاز کے ساتھ ہمایوں شہنشاہ ہندوستان کے حالات جسکے انقلابات سلطنت ہمارے شاہی اسٹوارٹ خاندان اور سابق بوربن خاندان

کے انقلابات سے مشابہت تام رکھتے ہیں، جناب والا کے نام پر معنون کرتا ہوں۔
مجھے نہایت مسرت ہے کہ ان اوراق کا ایسی مقتدر ہستی سے انتساب کرنے
کا موقع حاصل ہوا ہے جو السنۂ مشرقیہ سے واقف ہونے کی وجہ سے ان دشواریوں
کا صحیح اندازہ کرسکتی ہے جو ایران و ہندوستان کے خیالات و محاورات کو
یورپین زبانوں کا جامہ پہنانے میں پیش آتی ہیں۔
میں خلوص قلب کے ساتھ دست بدعا ہوں کہ جناب والا اس قابل قدر
محکمۂ تراجم (جسکے حضور والا بانی ہیں) کی سرپرستی ہمیشہ فرماتے ہیں۔

رائل کرسینٹ باتھ — جناب والا کا نہایت مطیع وادنیٰ خادم
یکم مارچ ۱۸۳۲ء — چارلس اسٹیوارٹ

ڈیڈیکیشن کے بعد مترجم کا دیباچہ درج ہے۔ جسکا ترجمہ یہ ہے۔

دیباچہ مترجم انگریزی

میں جس زمانہ میں شہنشاہ تیمور کے حالات کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھا میرے دوست مسٹر ولیم پول نے مجھے ایک فارسی قلمی کتاب بھیجی جس میں شہنشاہ ہمایوں کے حالات درج تھے۔ ہمایوں مشہور بادشاہ بابر کا بیٹا اور اس سے زیادہ مشہور شہنشاہ اکبر کا باپ تھا۔ میرے دوست نے اس کتاب کے ترجمہ کی فرمایش کی۔ چنانچہ اپنے دوست کی فرمایش اور اورینٹل ٹرانسلیشن فنڈ کمیٹی کی درخواست پر میں نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔

چونکہ اس کتاب کا مصنف کوئی عالم آدمی نہیں ہے اس لیے یہ عالمانہ رنگ کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے میں نے اصل فارسی کتاب کا نمونہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مصنف نے اپنے زمانہ کے دستور کے موافق کتاب کو جا بجا آیات قرآنی، اشعار فارسی اور تمثیلات تاریخی سے آراستہ کیا ہے۔ لیکن میں نے ترجمہ میں ان طویل اضافات کے اتباع کی تکلیف گوارا کرنا غیر ضروری سمجھا۔

یہ کتاب اس قدر خلوص و صداقت اور فطری سادگی و بے تکلفی سے لکھی گئی ہے کہ بعض ایسے واقعات بھی درج کردیے ہیں جس سے بادشاہ کی کسرشان ہوتی ہے۔ اسلیے مجھے اس کتاب کے مستند و صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کتاب کا قلمی نسخہ لکھنؤ دارالسلطنت اودھ میں خریدا گیا تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی یہی ایک کاپی دنیا میں ہے، جو اسوقت انگلستان میں... موجود ہے۔ بڑی تقطیع کی کتاب ہے۔ خط معمولی ہے۔ اور تقریباً ایک صدی قبل کی لکھی ہوئی ہے۔

اس موقع پر میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے کسی یورپین شاعر کا کوئی خیال اور کسی مورخ کا کوئی مضمون ایسا نہیں ملا جسکا تقابل و تراجم مشرقی مصنفوں کے ہاں نہ ملا ہو۔ میں اُن ناظرین سے جو اس کتاب یا میرے دوسرے تراجم پر جرح و قدح کرنا چاہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اول اُن ترجمہ کا اُسی زمانی انگریزی تصنیفات سے مقابلہ کرلیں۔ زمانہ حال کی مصنفات سے مقابلہ نہ کریں"۔

اسکے بعد مترجم نے مختصر مقدمہ لکھا ہے۔ جسکا ترجمہ پیش کرتا ہوں:۔

مقدمہ مترجم انگریزی

"ہمایوں شہنشاہ ہندوستان کا سلسلۂ نسب تیمور تک یہ ہے۔ ہمایوں بن بابر بن عمر شیخ بن ابوسعید بن محمد مرزا بن میران حسین بن تیمور۔

ہمایوں کی اولاد اور جانشین یہ تھے۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں۔ عالمگیر اورنگ زیب۔ بہادر شاہ فرخ سیر۔ محمد۔ احمد۔ عالمگیر ثانی۔ شاہ عالم۔ اکبر ثانی۔

ہمایوں کابل میں ۹۱۳ھ/۱۵۰۸ء میں پیدا ہوا۔ اسی سال اسکے باپ بابر نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ ہمایوں کا دوسرا بھائی کامران تھا۔ تیسرا ہندال۔ چوتھا عسکری۔ ان سب کے ساتھ میرزا کا لقب ہے۔

جس وقت بابر نے ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء میں ہندوستان پر حملہ کیا، تو اپنی فوج کے میمنہ کا افسر ہمایوں کو بنایا۔ افغانوں کے مقابلہ میں بھی پہلا جنرل ہمایوں ہی بنایا گیا تھا۔ جنگ پانی پت کے بعد ہمایوں کو شہر آگرہ اور خزائن سلطان ابراہیم پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ جو فوج ممالک مشرقی روانہ کی گئی اُس کا سپہ سالار بھی ہمایوں ہی تھا۔ ان تمام معرکوں کے امرا کی متحدہ فوج کے مقابلہ کے لیے بھیجی گئی اُس کا سپہ سالار بھی ہمایوں ہی تھا۔ ان تمام معرکوں میں ہمایوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی، اور باپ نے صلہ میں ایک کرور ستر لاکھ دام[1] اور آگرہ میں ایک محل مع ساز و سامان عنایت کیا۔ اس کے بعد ہمایوں نے شہر جون پور فتح کیا۔ اور وہاں سے واپس ہوکر قبل اسکے کہ بابر کے قریب ہندو راجاؤں کے ساتھ جنگ شروع ہو، شاہی فوج سے آکر مل گیا۔ اور اس میدان میں بھی بڑی شہرت و کامیابی حاصل کی۔

ان واقعات کا بیان کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس کتاب (تذکرۃ الواقعات) میں ہمایوں کو تخت نشینی کے بعد کے حالات درج ہیں۔ اور اُس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بحیثیت بادشاہ کے

---

[1] چالیس دام کا ایک روپیہ۔

نہایت سست وجاہلیت کا انسان واقع ہوا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر وہ بحیثیت انسان کے بدتر ہوتا، تو بہتر بادشاہ ثابت ہوتا۔

چونکہ مصنف تذکرۃ الواقعات (جوہر آفتابچی) نے کتاب میں واقعات کے سنہ درج نہیں کیے ہیں اس لیے میں نے مختلف کتابوں سے تلاش کرکے اس کمی کو پورا کیا ہے

ہندوستان میں خاندان تیموریہ "مغل" کہلاتا ہے۔ لیکن یہ خاندان خود اپنے آپ کو مغل نہیں کہتا۔ یہ لوگ غالباً چغتائی ترک تھے جو مغلوں یا تاتاریوں سے زیادہ معزز قبیلہ ہے۔ لیکن ترکانِ قسطنطنیہ سے تمیز کرنے کے خیال سے اس کتاب میں اور "حالات تیمور" میں خاندان تیمور کے لیے مغل کا لقب قائم رکھا گیا ہے۔

اسکے بعد کتاب کا ترجمہ شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلے مصنف کا یہ مختصر دیباچہ ہے:۔

دیباچہ مصنف

"اپنی عہد دولت و بخت اقتباب کتاب بنام شہنشاہ ہمایوں خادم شاہی جوہر عرض کرتا ہے کہ مجھے خوش قسمتی سے آغاز شباب میں خدمت شاہی کا فخر حاصل ہوا۔ بادشاہ کی ولایت تک عنایت کی سعادت نصیب رہی۔ اور ہر وقت و ہر حالت میں بادشاہ کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا۔ اسلیے مجھے خیال آیا کہ ان تمام واقعات کو بعد تحریر میں لے آؤں جن کا میں عینی شاہد ہوں۔ تاکہ ان دلچسپ کوائف کی یاد باقی رہ جائے۔ میں نے اپنی بساط تک حوادث انکو لکھنے کی کوشش کی ہے اگرچہ میری تحریر ان حالات کی عظمت و شان سے فروتر ہے۔ میں نے یہ کتاب ۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء) میں شروع کی اور تذکرۃ الواقعات نام رکھا۔

میرا یہ ارادہ نہیں کہ میں ہمایوں کے تمام حالات لکھوں بلکہ صرف وہی واقعات لکھوں گا جنکا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہے۔ اس لیے بادشاہ کی تخت نشینی کے زمانہ سے شروع کروں گا اور بادشاہ کی ایران سے مراجعت اور دوبارہ حصول سلطنت ہند پر ختم کردوں گا۔ میں اس تحریر میں دکھاؤں گا کہ بادشاہ نے کس ہمت و استقلال سے گوناگوں شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا۔ اور خدائے عزوجل کے

لہ اگرچہ اس جگہ مصنف اپنے عہدہ کا نام نہیں لیتا لیکن آگے چل کر اس نے بتایا ہے کہ وہ شاہی آفتابچی تھا۔ یہ آفتابہ برداری کا عہدہ قدیم زمانہ میں تمام یورپ میں رائج و متعارف تھا۔ اور اب بھی ہمارے بادشاہ کے خلعہ خانگی میں قائم ہے۔ (مترجم انگریزی)

فضل وکرم سے دوبارہ سلطنت حاصل کی۔ امید ہے کہ یہ کتاب خاکسار مصنف کا نام زندہ اور اس عجیب واقعات کی یاد کو تازہ رکھے گی۔"

بیجر اسٹیوارٹ مترجم انگریزی نے کاتب نسخۂ فارسی کا نام نذیر بن طالب حسینی اور تاریخ کتابت ۱۰ جمادی الاول سنہ ۹ جلوس لکھی ہے۔ اس سنہ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا جبکہ بیجر نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ ایک صدی پرانا ہے۔ یہ نسخہ مصنف کتاب جوہر کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہو سکتا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں کسی نے نقل کیا ہوگا اور وہ زمانہ اورنگ زیب کے بعد کا ہونا چاہیے میں نے جو فارسی نسخہ دیکھا ہے اُس میں کاتب کا نام نہیں ہے لیکن آخر میں لکھا ہے:

"در سلخ شہر رجب المرجب ۱۰۷۲ھ از مقابلۂ ایں کتاب کہ آن ہم غلط بود فراغ حاصل شد"

یہ نسخہ بیجر کے نسخہ سے بہت بعد کا اور اب سے صرف ستر سال قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کے دیباچہ میں جوہر نے سنہ تصنیف وہی بتایا ہے جو بیجر نے لکھا ہے۔ جوہر کا فقرہ یہ ہے:

"شروع ایں قصہ در ابتدائے سنہ خمس وتسعین وتسعمائۃ افتاد"

جوہر نے ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء (سال تخت نشینی ہمایوں) سے ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء (سال وفات ہمایوں) تک کے واقعات لکھے ہیں، اور تذکرہ کے آخری واقعہ سے ۳۳ برس بعد تصنیف شروع کی ہے۔

بیجر نے ترجمہ کتاب کے دو حصے کر دیے ہیں۔ ہمایوں کے ایران پہونچنے پر ایک حصہ ختم کر دیا ہے اور قیام ایران وما بعد کے حالات دوسرے حصہ میں رکھے ہیں۔ حصہ اول کے آخر میں تاریخ عالم آرائے عباسی کے اس حصہ کا ترجمہ شامل کر دیا ہے جس میں شاہ طہماسپ (جسکے عہد میں ہمایوں ایران پہونچا تھا) کے حالات درج ہیں۔

تذکرۃ الواقعات کی فارسی زبان نہایت معمولی لیکن صاف اور مطلب خیز ہے۔ البتہ گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کی عبارت اسکے مقابلہ میں کہیں کہیں پیچیدہ وکاواک ہو جاتی ہے تاہم تذکرۃ الواقعات اغلاط سے پاک نہیں۔ ایک جگہ عنوان فصل یوں درج ہے:

"فصل پانزدہم در رنجش کردن ہمایوں بادشاہ را ملازمان میرزا کامران نزد شاہ عالم پناہ"

یہ عبارت اس طرح ہونا چاہیے تھی "در رنجش کردن ملازمانِ میرزا کامران ہمایوں بادشاہ را" لیکن چونکہ کتاب غلط در غلط نقل ہوتی چلی آئی ہے، اس لیے اس طرح کی اغلاط کا ذمہ دار ناقل کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب میں جو آیاتِ قرآنی اور اشعار فارسی درج کیے ہیں وہ سب کے سب مترجم انگریزی نے چھوڑ دیے ہیں، اُن میں سے عام تمثیلی اشعار کے ترک کا تو کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن بعض وہ قطعات پر جو ہر نے ہمایوں کے اشعار بھی درج کیے ہیں، ان کا لکھنا یا کم سے کم انکا ترجمہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس کمی کو اپنے دریافت کردہ نسخہ سے پورا کر دیا ہے۔

مثلاً جب ہمایوں بادشاہ سیستان علاقۂ ایران میں پہونچا تو خدام شاہی نے عرض کیا کہ چونکہ ہم اس ملک میں مکمراں کی بغیر اجازت آئے ہیں، ممکن ہے شاہِ ایران کو یہ امر ناگوار ہو، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے اجازت منگائی جائے۔ چنانچہ ہمایوں نے شاہ طہماسپ کو خط لکھا اور اُس میں یہ قطعہ بھی لکھ کر شامل کیا

خسروا عمریست تا عنقائے عالی ہمتم — قلۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است
روزگار سفلۂ گندم نما دُو جو فروش — طوطیِ طبعِ مرا قانع بہ ارزن کردہ است
دشمنم شیر است و عمرے پشت با من کردہ بود — ایں دم از روئے عداوت روبا من کردہ است
التماسِ ایں زشہ دارم کہ با من آں کند — آنچہ با سلماں علیؑ در دشت ارزن کردہ است

جب ہمایوں شاہِ ایران کا مہمان ہوگیا تو میرزا کامراں برادر ہمایوں نے شاہ ایران کے پاس اپنے آدمی بھیجے اور یہ کہہ کر کہ ہمایوں آپ کے مذہب (تشیع) کا مخالف ہے، شاہ ایران کے دل کو ہمایوں کی طرف سے کدر کرنا چاہا۔ بادشاہ کی بہن ہمایوں کی طرفدار تھی، اُس نے ہمایوں کی طرف سے شاہ کا دل صاف کرنے کی غرض سے ایک موقع پر ہمایوں کی یہ رباعی سنائی

ما ہیم زبان بندہ اولادِ علی — ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علی
چوں سرِّ ولایت ز علی ظاہر شد — کردیم ہمیشہ ورد خود نادِ علی

میجر اسٹیوارٹ نے ہمایوں کی وفات کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ واقعہ دہلی میں ۱۱۔ ماہ ربیع الاول ۹۶۳ھ ۲۱ جنوری ۱۵۵۶ء کو پیش آیا" اور فٹ نوٹ میں تاریخ ہندوستان مصنفۂ ڈوسے مفصل واقعہ لکھا ہے۔ جوہر نے تاریخ نہیں بتائی بلکہ کاہی کا قطعہ تاریخ لکھدیا ہے جس سے ۹۶۲ھ نکلتا ہے۔ اور یہی صحیح ہونا چاہیے۔

لکھتا ہے "تاریخ وفاتِ ہمایوں بادشاہ کاہی گفتہ:۔

ہمایوں بادشاہ آں آفتابے — کہ فیضش شاملِ او عام افتاد
بناے دولتش چوں بانت نہضت — اساسِ عمرش از انجام افتاد

چو خورشید جہانتاب بلندی بپایاں در نماز شام اُفتاد
جہاں تاریک شد در چشم مردم خلل در کار خاص و عام اُفتاد
پے تاریخ او گاہی رقم زد
ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد
۹۶۲ ھ

انشاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں تذکرۃ الواقعات کی تاریخی خصوصیتیں اور دلچسپیاں اور ایک دو باب کا ترجمہ پیش کروں گا۔

زاہدہ

(اپنی ہفت سالہ بھتیجی کی نذر)

زاہدہ! تو سراسر اک پیکرِ اخلاص ہے — گود میں آ بیٹھنا تیری ادا سے خاص ہے
تو ہنسا تی ہے مجھے مغموم و تنہا دیکھ کر — بھول جاتا ہوں غم دل تجھ کو ہنستا دیکھ کر
وہ ترا رہ رہ کے مجھ سے پوچھنا ہر بات کا — اور بتانے میں وہ تیرا رک رکنا جذبات کا
چپکے چپکے مجھ سے کچھ کہکر وہ زیرِ لب ہنسی — سچ بتا، سیکھی ہے کس سے یہ ادا اے دلبری؟
کس چمن کا روپ ہے کس دیس کا یہ آب و رنگ؟ — دیکھ کر صورت کو تیری، عقلِ انسانی ہے دنگ!
سادگی ہے تیری نظروں میں مروت دل میں ہے — اس دلِ مایوس کی تسکیں اسی منزل میں ہے

اشکِ غم سے دُور، دردِ ہجر کے نالوں سے دُور — اپنے پیاروں، اپنے سارے چاہنے والوں سے دُور
دُور سب احباب سے اس شہرِ غم آباد میں — ایک گوشہ میں پڑا ہوں، محو تیری یاد میں
تو کلی ہے گر تو میں اک بلبل بھجو رہوں — جس چمن میں کھل رہی ہے تو میں اس سے دُور ہوں
دُور رہ کر مجھ سے کتنا مجھکو تڑپاتی ہے تُو — تجھکو مدت سے نہیں دیکھا ہے یاد آتی ہے تُو
خوب ہیں یہ بھی ادائیں دل لبھانے کے لیے — مضطرب ہوں تجھکو سینے سے لگانے کے لیے
نوشگفتہ پھول! آ، آنکھوں میں میری کھُب کے بیٹھ — پردۂ دل میں نہاں ہو، اور دل میں چھپ کے بیٹھ

ہاں، مری قندیل تیری یاد سے معمور ہے — جلیل قدوائی بی اے
میرے دل سے تو بہت نزدیک ہے گو دور ہے!
(علیگ)

تنظیم الحیوٰۃ

ترجمۂ اکانومی آف ہیومن لائف

اس نام سے ایک مثنوی میری نظر سے گزری، جو جناب صفی لکھنوی رکن رکین شیعہ کانفرنس کی نتیجۂ فکر ہے۔ اس مثنوی کے اکثر مقامات پڑھے۔ مضامین کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ وہ حرف بحرف ترجمہ ہیں۔ جیسا کہ مترجم صاحب خود فرماتے ہیں:-

اس ترجمہ کو بطرز نیکو — شاکر نے لکھا بطرز اردو
بتلا رہا تھا صاحب سلیقہ — ترتیب دیا نیا طریقہ

اسکے بعد فرماتے ہیں

میں نے وہ گلِ فرنگ چن کے — بہرِ احباب ہار گوندھے

پھر یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں

یہ نظم نہیں ہے شاعرانہ — دلکش ہو جس کا ہر ترانہ
تھا اصل کتاب کا جو مطلب — چھوٹا نہیں نظم ہو گیا سب

مثنوی میں پہلے مخاطبہ و مناجات ہے، اسکے بعد حمد و منقبت اُسی فرسودہ رنگ پر جیسے قدماء کا دستور تھا۔ مگر ایک پختہ کار شاعر سے جس قدر توقع ہو سکتی تھی وہ ان مضامین کے بیشتر اشعار میں ہے۔ اسکے بعد استحاذِ مذہب و اخلاق اور موجودہ زمانہ کی حالت کا اظہار ہے، جس میں اس ترجمہ کا سبب اور ارکینِ اکاڈمی کی مدح سرائی ہے جو صفی صاحب کا خاص رنگ ہے۔ اسکے بعد یہ کتاب صفحہ ۴۹ پر ختم ہوئی ہے۔ اور اس میں فقط ترجمہ ہے۔ کہیں کہیں مصنف صاحب نے بھی ضرورت شعری کی وجہ سے کچھ اضافہ فرما دیا ہے۔ اس مثنوی کے بجا بجا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ ایک قابل شاعر سے جس قدر توقعات تھے اُسکے خلاف بہت سی باتیں مجھکو نظر آئیں۔ چونکہ میں جناب صفی کی شاعری کا پایہ بلند سمجھتا ہوں، اس لیے اکثر وہ مقامات جو اس نظم میں کھٹکتے ہیں، بطور استفسار دریافت کرتا ہوں۔

جناب صفی فرماتے ہیں

لہ نثر میں جو ترجمہ ہوا ہے اُس کا نام حدیقۃ الاخلاق ہے۔

گو نظم میں کی ہے ترجمانی کچھ نثر سے کم نہیں روانی

(۱) اشعار ذیل کی سلاست و روانی کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے

ایک جنبہ بہیمیت سے ملحق ایک جنبہ فرشتگی سے ملصق
اقرار کو زعم کبریائی انفار کو دعوے خدائی

یونہیں تن تیرہ بخت میں روح رہتی ہے ہمیشہ غیر مقبوح
آساں اسکی تلاش اسکو اور اس میں اک انتعاش اسکو

ضائع جو کرے نفوس موجود کرتا ہے وہ راہ خیر مسدود
ہے وجہ مسرت اسکو تدقیق یہ تشنۂ علم ہے بہ تحقیق

ہے جبکہ مزاج میں تلوّن گہہ اسکو خوشی کبھی تحزن
ڈالی اوس پہ کاوش پر دہ پیش بیگانہ نہ کھینچ گرد ہ پیش

خوف و شرم و حجاب یہ سب گویا کہ میں اسکی شرط اول ہیں
پیمانہ انتقاد احوال اندازۂ حسن و قبح اعمال

اسی طرح سے بہت سے اشعار ہیں۔ ممکن ہے سلاست و روانی کی تعریف ان اشعار پر صادق آتی ہو۔

(۲) افریقہ و ایشیا و یورپ ہر خطہ سواد کفر سے گھپ

گھپ۔ نہایت تاریکی کی تعریف میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ مگر اہل زبان تنہا اس لفظ کا استعمال نہیں کرتے، ہمیشہ اندھیرا گھپ کہتے ہیں۔

(۳) صفحہ ۴۲ پر نہایت جلی عنوان سے "چھٹواں باب" لکھا ہوا ہے۔ واں۔ ہندی کلمہ نسبت ہے پانچواں، ساتواں، آٹھواں، نواں وغیرہ یہ سب تو درست ہیں مگر یہ "چھٹواں" کہاں کی زبان ہے؟ اور اگر انھیں الفاظ پر قیاس کیا جائے تو لغت میں قیاس درست نہیں۔ کیا چوتھے کو چوتھواں اور تیسرے کو تیسواں کہہ سکتے ہیں۔

(۴) مکھی کو شہد گدھ کو مردار جس طرح سے ہے پسند لے یار

ہندی میں گِدھ۔ ھ۔ کے ساتھ بولتے ہوں مگر اردو میں تو صرف گِد کہتے ہیں۔ جلال لکھنوی نے اپنے لغت میں اسی طرح لکھا ہے۔ "جس طرح سے" میں "سے" حشو ہے، اور "لے یار بھی آپ کی زبان نہ ہونا چاہیے۔

(۵) مچھلی کھاتی کبھی نہ آٹا گر جانتی چارے میں ہے کانٹا

اہل زباں کا اتفاق ہے کہ آمنا ذن کے ساتھ نہیں۔ لغاتِ اُردو میں بھی دیکھا گیا۔ ممکن ہے جناب مصنف لسان القوم کے نزدیک صحیح ہو۔ مگر چونکہ زبان پر جمہور کا اتفاق ضروری ہے، اسلیے محتاج سند ہے۔

(۶) کیوں اپنے عدو پہ خندہ زن ہو — خود اپنے ہی حق میں زہر کیوں ہو

لکھنؤ کے حضرات تو ایسے موقع پر کانٹے بونا بولتے ہیں۔

(۷) ثابت قدم اس طرح کا انسان — بحرِ تلاطم میں جیسے چٹان

چٹان مشکوک نہیں۔ جناب لسان القوم اُردو لغات کی طرف توجہ کریں۔

(۸) اُگتی نہیں جب چری چریں کیا — رہتا ہے مواشیوں کو فاقہ

چری لکھنؤ کی زبان میں چرنے کے معنی میں مستعمل ہے، جیسے آتش نے کہا

سبزہ مری تربت کا ہرا خوب ہوا ہے — ایسے میں ہرن آئیں تو موقع ہی چری کا

گو اراالبتہ جوار یا جوے یا مکئی کے ہرے درخت کو کہتے ہیں۔ جناب لسان القوم دہقانیوں کی زبان کبھی نہ نظم فرمائیں گے۔ بلکہ اس میں کوئی خاص رمز ہوگا۔

(۹) رہ خواہشِ انتقام سے دُور — نقصان رساں ہو تیرا شکور

کیا شکور اس معنی میں صحیح ہے؟

(۱۰) اس میں نہیں دوسرے کا کچھ بس — تا کس نہ فغیں خواہ تو نا کس

کیا "کس" بنانا اُردو کا کوئی محاورہ ہے؟ علاوہ اسکے ایک خواہ کی اس مصرعہ میں اور ضرورت ہی نہیں؟

(۱۱) ہوگا وہ اسی قدر کا شایق — جس مدح و ثنا کے خود ہے لائق

کیا شایق فاعل کے معنی میں آیا ہے۔ صاحبِ صراح و قاموس لکھتے ہیں الشائق ھوللشوق یعنے یہ فاعل مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ عوام میں بمعنی مشتاق مشہور ہے۔ ثقات شعرا کا عوام کی پیروی کرنا کیسا ہے۔ اسکے علاوہ "ہوگا وہ اسی قدر کا شایق" یہ مصرعہ بھی مجھے آپ کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے

(۱۲) عیباں تیری عیوب تیرے — مرجائیں تمام تجھ سے پہلے

عیباں مرنا عیوب مرنا کیا زبانِ اُردو میں مستعمل ہے۔

(۱۳) ضعفِ تالیف و ایطا بھی اکثر اشعار میں ہے۔ مثلاً

اُس دوست کو جسمیں رستی ہو — فوق اُسپہ ہے جو خوشامدی ہو

یہ ایطا جلی ہے۔ مگر اسکی نسبت استفسار مطلوب نہیں۔ اسلیے کہ اس خامی اور عاجزی کا خود مترجم صاحب نے اظہار فرما دیا ہے:۔

لفظاً ہو چا ہے صنفِ تالیف — معناً نہیں اک ذرا بھی تحریف
کچھ لفظ برائے بیت بھی ہیں — کیا کیجیے بر محل وہی ہیں

کیا برائے بیت الفاظ بھی برمحل ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت جناب صفی کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام اساتذہ کے واسطے ہے۔ عیب ہر حالت میں عیب ہے۔ یہ لازم نہیں کہ بغیر غلطی کے کوئی اشعار کہہ ہی نہ سکے۔ خیر ایسے تمام اشعار سے قطع نظر کی جاتی ہے۔

(۱۴) بیم بشریت آب و گل میں — مانند ملک رجائیں دل میں

"رجائیں" کیا۔ یہ جمع اُردو میں صحیح ہے؟ اسی طرح ہمیں بھی کہیے۔

(۱۵) ہر فوش کے ساتھ ہے یہاں نیش — قہر درویش و جانِ درویش

ارسال المثل میں ادنیٰ تصرف بھی جائز نہیں۔ مثل تو یوں ہے قہر درویش بجانِ درویش۔ خیر جب وقت نظم مسلم ہے تو یہ اعتراض بھی بیکار ہے۔

(۱۶) بہت سے متروکات استعمال کیے ہیں جو اتفاقِ جمہور کے خلاف ہیں۔ "لے کاشکہ دس ہزار مجرم" صرف لے کاش مستعمل ہے۔

سچائی سے جب . . واقفیت — تب عدل کی ہوگی قابلیت

تب، متروک۔

لیکن پاؤ گے سب سے بڑھکر — اس کو بے رحم اپنے اوپر

اوپر متروک۔

(۱۷) حشو و زوائد کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

جس طرح سے بال تیرے سر کے — یا چرخ زمرد یں پہ تارے
ہر شخص کو خلق میں سراسم — اک روح ملی ہے اور اک پیشم
باتیں ایسی جو ہوں ضروری — پھر لوں سکھائے تجھکو پوری
پھر اس نے خریدے بے تکاشا — سامان آرائشِ مکاں کا

(۱۸) تعقید لفظی:۔

یا تجربہ کاریوں میں کامل — جنکو۔ کر چند اُن سے حاصل

تجربہ کاریوں میں جسکو کامل یا اُن سے چند حاصل کر۔

ہے باپ کا نام خوف اسکے — وحشت ماں اسکی خوب سُن لے

اس کے باپ کا نام خوف ہے۔

جو شخص اپنے سکون دل کو دیتا ہے تلاش مال میں کھو

(۱۹) قافیہ :-

کم ہے اعلیٰ صفات میں یوں در پردہ ہے ورنہ گھات میں کیوں

کیا تلفظ کے اعتبار سے دونوں قافیے صحیح ہیں

جس سے بچلے ہے کوٹ گوٹا ہے بعد میں اُسپہ بڑبڑانا

(۲۰) زبان کے پہلوؤں پر نظر کرتے ہوئے اشعار ملاحظہ ہوں :-

دے اُسکے خلاف کیوں گواہی لا اُسکے جلن پہ کیوں تباہی

رنج خلقی ۔ فیق تیرا عشرت کا کبھی کبھار پھیرا

کیا کبھی کبھار ثقات اور فصحا کی زبان ہے ؟

" جس کے اعزاز سے کہ ہر دم اُمڈے ترے دل پہ غصہ و غم

یہاں کاف بیانیہ کا کیا محل ہے ؟

دنیا کی بسا کے ہستیوں کو کرنے لگے ..... پرستیوں کو

واجب باتوں میں کرنہ اہمال ہو موت کا خوف بھی تو کر ڈال

(۲۱) خوش طعم بُھنا ہوا وہ قیمہ کھالے تو ہو حاملہ عقیمہ

بُھنا ہوا قیمہ کھا لینے سے عقیمہ حاملہ بھی ہو سکتی ہے ؟

(۲۲) پیاری وہ کشش وہ مسکراہٹ شرمائے لجائے پاکے آہٹ

شیریں وہ اُن لبوں کے بوسے زنبور عسل بھی دل مسوسے

سینے پہ اودھا ہلکے ہلکے وہ پھول دھرے ہوئے کنول کے

حسینہ کے صفات حسن بیان فرماتے ہوئے یہ شعر بھی ارشاد ہوئے ہیں۔ کسی عشقیہ مثنوی میں یہ اشعار شاید بے محل نہ ہوتے، مگر ایک اخلاقی کتاب میں جسکی نسبت ارکان اکیڈمی سے یہ خواہش بھی کی گئی ہے کہ

بن کر جزو نصاب تعلیم کارآمد خلق ہوں مفاہیم

بیشک سب بچے پڑھیں گے اور لطف اندوز ہونگے۔ اور مدرسین بھی نہایت بیباکی اور وضاحت سے سمجھائیں گے۔ کاش عفت و حیا کی تعریف پہ اکتفا کی گئی ہوتی۔

(۲۳) اُردو کے حروف تقطیع سے گرنا جائز ہیں، مگر ایک کہنہ مشق شاعر ہمیشہ اپنی نظم کو سلاست کا

کا لباس پہنانے کے لیے اس سے پرہیز کرتا ہے۔ مگر اس مثنوی میں بکثرت یہ خامی پائی جاتی ہے۔ بیشتر اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تکلف ترجمہ کیا گیا ہے۔ تعقید، ایطا، حشو، ضعفِ تالیف، استعمالِ متروکات، یہ سب اس میں کثرت سے موجود ہیں۔

جناب حنفی کا کلام اسوقت تک نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر نہیں کسا گیا، دیوان وغیرہ شایع ہو تو حقیقت کا انکشاف ہو۔ اسوقت تک کانفرنس کے پنڈال کی آوازیں صوت کے دل و دماغ میں گونج رہی ہیں۔

یہ مثنوی ایک دوست سے عاریۃً لی تھی۔ چنانچہ انکی طلب پر انہیں واپس کردی۔ اب پھر مل جائے تو اول سے آخر تک پڑھ کر اپنی ناچیز رائے ہدیۂ ناظرین کروں۔

سید مجتبیٰ حسن موسوی فاضل غازیپوری

غزل حکیم جگر صدیقی بسوانی

رو کے ہم گو رغربیاں کا سماں دیکھا کیے
دیر تک یارانِ رفتہ کے مکاں دیکھا کیے

دُور سے اے قاتلِ نامہرباں دیکھا کیے
قتل سب ہوتے رہے ہم ناتواں دیکھا کیے

باغباں تو نے جلایا آشیاں جلتا رہا
اور ہم حسرت سے سوئے آشیاں دیکھا کیے

دَم نکلنے کا تماشا دیکھنا منظور تھا
دَم نکلتا تھا ہمارے مہرباں دیکھا کیے

قیدیِ کنجِ قفس ہیں کیا رہائی کی اُمید
حسرتِ گلشن میں خوابِ آشیاں دیکھا کیے

حشر میں پھر کچھ اشارہ اپنی رحمت سے کیا
پہلے وہ فردِ گناہ عاصیاں دیکھا کیے

لاکھ پردوں میں چھپایا تو نے اپنے حُسن کو
دیکھنے والے تجھے اے جانجاں دیکھا کیے

دل نہیں زخمی ہوا ناوک کلیجے پر پڑا
دیکھنا لازم کدھر تھا تم کہاں دیکھا کیے

نزع کا عالم رہا ہم کروٹیں لیتے رہے
اور بالیں پر مسیح مہرباں دیکھا کیے

رفتہ رفتہ ہو چلا پیدا نشیمن کا خیال
چند کچھ دن ہم نگاہِ باغباں دیکھا کیے

شمعِ جاں افروز ہو کر چارہ سازی کیوں نہ کی
آپ گُل ہوتے چراغِ بزمِ جاں دیکھا کیے

دل کے ٹکڑے ہم تو رو رو کر جگر چنتے رہے
اور ہنس ہنس کر ہمارے مہرباں دیکھا کیے

سفرنامۂ اندلس

نمبر (۳)

اصل مضمون کو ہاتھ لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر چند ابتدائی باتیں ایسی بیان کر دی جائیں کہ وہ اُس کو سمجھنے میں کچھ مُؤید ہوں۔

مالک الملک حقیقی نے اسپین کو کچھ ایسی خصوصیات عطا فرمائی ہیں کہ اور ملک اُس سے محروم ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ قرنہا قرن گزر گئے کہ اس مُلک کے حدود اربعہ وہی ہیں جو شاید ازل سے مقرر ہو چکے ہیں۔ اسکو قدرت کاملہ نے وہ فوائد عطا فرمائے ہیں جنکی مثال اور ملکوں میں کم ملتی ہے۔ ایشیا اور یورپ کے تمام مال تجارت کو اس ملک سے ہو کر جانا ناگزیر ہے۔ چونکہ اسکو تین طرف سے سمندر نے گھیر رکھا ہے اس لیے یہاں کے باشندوں کو صرف ملاح بننا بلکہ سپاہی رہنا پڑتا ہے۔ اراضی سیر حاصل ہیں اور آب و ہوا بقابلہ یورپ کے گرم۔

۱۹۲۰ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار نہیں ملے۔ ۱۹۱۰ء میں یہاں کی آبادی ایک کروڑ ننانوے لاکھ پچاس ہزار (یا دو کروڑ) تھی۔

پنجاب کے مقابلہ میں کم اور اور ممالکِ ارض کے مقابلہ میں یہاں دریا زیادہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اور ممالک کسی تعداد پر بھی اپنے دریاؤں سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اہالی اسپین بہت ہی کم کام لیتے ہیں۔ یہی حالت یہاں کے بنادر کی ہے کہ باوجود ضرورت انکو تجارت بحری کے کام کا نہیں بنا سکے ہیں۔

پہاڑ بھی بہت ہیں اور بڑے کام کے۔ اُن سے فینیقیہ والوں اور مسلمانوں نے جو کچھ کام لیلیا وہ لیلیا۔ آج کل تو وہ بیکار پڑے ہیں۔ یہی حال مسطح زمین کا ہے کہ بقول مولوی حالی مرحوم کے

"خدا کی زمیں بن جُتی سر بسر ہے"

وحشی اقوام کا تو حال معلوم نہیں کہ اُنکی کیا حالت تھی؛ مگر مہذب اقوام میں سے سب سے پہلے حضرت مسیحؑ سے ایک ہزار برس پیشتر فینیقیہ والوں نے اس سرزمین پر قبضہ کیا اور یہاں کی قدرتی دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔ ایک وقت آیا کہ انکو یونانیوں سے لڑنا پڑا۔ مگر یہ ہو ہی رہا تھا، کہ رومیوں کی بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں "نہ ادھر بجا نہ ادھری" نہ فینیقی رہے نہ یونانی، رومی

اس ملک پر مسلط ہو گئے۔ لیکن حقیقی معنوں میں وہ پوری طور سے اس ملک سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے تھے کہ شمال کی طرف سے وحشی گاتھوں نے آکر انکو نکال باہر کیا۔ گاتھوں کو بہت کچھ لڑنا بھڑنا پڑا۔ اور اس میں اب تک قبطی صنعت و حرفت ملک میں پیدا ہو گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تین سو برس تک گاتھ سپین کے لیے بلائے بے درماں بنے رہے۔ اس طویل عرصے میں ملک نے صرف کچھ اُبھارا ہی لیا۔ گاتھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف اتنا تھا کہ اسپین کی عورتوں سے شادیاں کر لیں جس سے ملک کا کچھ کایا پلٹ ہو گیا

ایک مثل مشہور ہے کہ بارہ برس کے بعد گھورے کے بھی نصیب کھلتے ہیں، یکایک غیرت حق کو جوش آیا اور اس سرزمین پر وہ رحمت الٰہی نازل ہوئی کہ جس کے نشان نہ صرف اس زمین سے بلکہ تمام یورپ، بلکہ تمام دنیا سے نہ مٹنے والے ہیں نہ مٹیں گے۔ یعنی ۷۱۱ء میں مسلمان یہاں پہونچے اور انھوں نے جو کچھ کیا، یہ مجھ سے نہ پوچھیے مسیحیین سے دریافت کیجیے۔ نہ معلوم وہ کیا گناہ تھے کہ آخر ۱۴۹۲ء میں اُنھوں نے کوس رحلت بجایا۔ عیسائی قوم کو پھر عنان دولت عطا فرما دی گئی۔ یہ بدبخت آئے تو اذ لطشتم لبشتم جباریں کے پورے مصداق بنے ہوئے۔ انھوں نے اپنی مفتوح قوم کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ آج وہی لوگ کہہ رہے ہیں کہ ایچہ اکردیم برخود ہیچ نابینا نکرد۔ اس کا شمہ اگر معلوم ہو سکتا ہے تو میری کتاب "مولدین" سے۔

جس سلطنت کی بنیاد ظلم و ستم پر رکھی گئی ہو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتی ہے! جبار و قہار احکم الحاکمین نے انکو ڈھیل دی، حلم الٰہی نے عجیب و غریب اسباب تباہی پیدا کیے۔ ایک مسیح و مسوخ دین کا غلو ہوا۔ امریکہ دریافت ہوا۔ صنعت و حرفت و تجارت سے عقلت اور محض سپاہیانہ شیخی پیدا ہوئی۔ بادشاہ کے دل میں اپنی عظمت کا غرور پیدا ہوا۔ اسکی کسی کو خبر نہ تھی کہ دیر گیر و سخت گیر و مرتزا۔ اسپین نے ملکہ ایزبیتھ کے زمانے میں ایک بیڑہ انگلستان کے خلاف روانہ کیا، جو ایسا تباہ ہوا کہ اسپین ہی کو لے ڈوبا۔ یہ تاریخ سو فراسام ملک کیلیے خونیں حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ وہ دن اور آج کا دن کہ سلطنت نہ اُبھر سکی ہے نہ اُبھر سکے گی! اب چاہے اس میں پرپوڈی ریویرا پیدا ہوں فرانسس سے اتحاد ہو یا غازی عبدالکریم کو بے دست و پا کر کے بٹھا دیا جائے (انشاء اللہ تعالیٰ) بندگان اسباب و سبب اور حلقہ بگوشان علت و معلول اس ادبار کی کچھ ہی توجیہ کریں، لیکن اصلیت ہے تو صرف یہ کہ یہ سب کچھ رد عمل اور رجعت ہے۔ بیگناہوں کا خون رنگ لا کر رہتا ہے اور مظلوموں کی آہیں رد صدا کی طرح بلش الٰہی کو ساتھ لاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان بلشن ریک شدید۔

وَكَاَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُّكْرًا۔ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا

مختلف فاتحین نے ملک پر اپنا اثر چھوڑا۔ سب سے زیادہ مسلمانوں نے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ہی کی تباہی نے اس ملک کو تباہ کر دیا۔ اس پر غضب ہوا تعصب و غلوءِ مذہبی کہ آدھی سے زیادہ خلقت اندھی ہو کر خانقاہوں میں چھپ گئی۔ امریکہ دریافت ہوئی اور وہاں آبادی کا بڑا حصہ بھیجنا پڑا۔ اس سے انکار نہیں کہ وہاں سے دولت آئی، مگر اس نے تعیش کو ترقی دی اور غفلت کو بڑھایا۔ اسکا نتیجہ افلاس ہوا، اور افلاس کا نتیجہ رشوت ستانی اور ملک کے فوائد سے چشم پوشی۔

سطور ذیل میں جو کچھ عرض کیا جائیگا وہ ۱۹۲۴ء کی سہ ماہی اول تک کی حالت کا صحیح نقشہ ہے اُسکے بعد سے اب تک کہ قریباً چار برس گزر چکے ہیں "داماں خیالِ یار" کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ تاہم انشاء اللہ اس زمانے کے متعلق بھی جو کچھ آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ صحیح ہی ہوگا۔ اب میں سب سے پہلے ملک و قوم کی سب سے بڑی اور ضروری ضرورت تعلیم سے شروع کرتا ہوں۔

تعلیم

کسی ملک میں ان پڑھوں کی تعداد کی زیادتی کے یہ معنی ہیں کہ اُس ملک کی سوسائٹی، من حیث المجموع، ایک گناہ کبیرہ کی مرتکب ہو رہی ہے، اور اُسکی اُسے سزا ملنی چاہیے۔ اگر اسکو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کو اور حیوانات سے ممیز کرنے کے لیے اگر کوئی چیز ہے تو وہ نطق ہے، تو پھر یہ فتوے دینے میں کوئی بھی تامل نہ کرنا چاہیے کہ ملک کو جاہل رکھنا قانونِ الٰہی ہے۔ کیونکہ ہم اُس میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہونے دیتے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پہچانے۔ پھر مخلوق الٰہی میں رذیلہ تبادلۂ خیالات، استحادہ نہ ہونے دینے سے سلطنت کا گناہ ہے اور اس سب کا بارِ جوابدہی سلطنت کے ذمہ آتا ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا ہے، جلد یا دیر میں۔

اسپین میں ابتدائی تعلیم کی کمی کے متعلق جنوری ۱۹۲۱ء میں سیڈرڈ کے ایک اخبار نے نہایت ماقل و دل طریقے سے لکھا تھا کہ

"سرکاری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ مملکت اسپین میں اسوقت دس ہزار ایک سو اڑتالیس ابتدائی مدارس کی کمی ہے۔ ان میں سے ۵۷۱ پرسلونہ میں، ۴۳۰ میڈرڈ میں اور ۵۶۱ مرسیہ میں کھلنے چاہییں۔ اور جلیقیہ میں تو ۲۲۸۰ مدارس کی کمی ہے۔"

یہ وہ کمی ہے جو گورنمنٹ کے ایکٹ متعلقہ تعلیم عامہ کے موافق ایک یا دو سال کے اندر اندر کھلنے چاہئے

ضروری تھے، مگر ۱۹۲۴ء تک کھلے نہ اس پر کسی نے توجہ کی - مدارس کی یہ کمی ایسی نہیں ہے جو نظرانداز کی جاسکے، اسی سے تو ملک کی تعلیم کا اندازہ لگ سکتا ہے - بلاشبہ اسکے ذمہ دار سلطنت کے ارباب حل وعقد ہیں کہ اعداد وشمار کے چابک سے بھی انکی آنکھیں نہیں کھلتیں - اپنے فرائض سے غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ ان پڑھوں کی تعداد گھٹنا تو ایک طرف رہا، بڑھتی چلی جاتی ہے - چنانچہ ۱۹۲۱ء میں صوبہ وار تعداد ان پڑھوں کی حسب ذیل تھی :-

صوبہ	فی صد آبادی
سان سلمان ڈیر	۲۶٫۱
بلباؤ	۲۷٫۳
میڈرڈ	۲۸٫۳
ولاڈالڈ	۳۲٫۹
برشلونہ	۳۴٫۹
ساراگوسا	۴۲٫۸
سیویل	۴۸٫۲
بلنسیہ	۵۲٫۴
مرسیہ	۷۲٫۰
لورکا	۸۲٫۵

۱۹۲۱ء میں جب اس کا اخباروں میں بہت شور مچا تو اسکا سوا اسکے کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ بجٹ سے یہ جملہ ہی اڑادی گئی اور اب جو کوئی اس مضمون پر اطلاع حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو سخت سرگردانی کرنا پڑتی ہے -

ابتدائی تعلیم کے متعلق ذیل کے اعداد بہت دلچسپ ہیں -

مقام	خرچ تعلیم فی باشندہ	ان پڑھوں کی اوسط
جزائر کناری	۶ آنہ	۵۴
سیوٹہ شہر	۶٫۸ آنہ	۲۵
قاویز	۱۳ آنہ	۴۴
جیان	۱۴٫۸ آنہ	۲۹

مرسیہ	۱۵ر	۵
برشلونہ (شہر)	۶ء۱۹	۸
برگوس	۳ء۴۶	۳
الاوا	۲ء۴۹	۵
لیون	۴ء۵۷	۷
سوریا	۷ء۶۰	۱۰

اگرچہ دارالسلطنت (میڈرڈ) میں ان پڑھوں کی تعداد ۲۵ فی صدی ہونا خود شرم کی بات ہے، مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کمی گورنمنٹ کی سعی و کوشش کی وجہ سے ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ عوام الناس نے اپنی مدد خود کی۔ یہی حالت اور مقامات، مثلاً جیاں، برشلونہ، برگوس کی ہے، کہ لوگوں نے پرائیوٹ اسکول کھول رکھے ہیں اور ان کا خرچ خود برداشت کرتے ہیں۔

یہ تو ابتدائی تعلیم کی کیفیت تھی، ثانوی تعلیم کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۹۲۳ء میں ثانوی مدارس .... میں طلبہ کی تعداد ۵۲۱۶۹ تھی۔ ان میں سے ۳۱ فی صدی مدارس سرکاری میں پڑھتے تھے۔ اور ۶۹ فی صدی پرائیوٹ اسکولوں میں۔ خود میڈرڈ میں کل ۱۵ فی صدی طالب علم گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اتنے بڑے دارالسلطنت میں صرف تین گورنمنٹ اسکول ہیں، حالانکہ ضابطہ کے موافق کم از کم دس اسکول ہونے چاہییں۔ اگرچہ اسپین اور انگلستان کا مقابلہ کرنا بیکار ہے، کیونکہ اگر ایک ذرہ ہے تو دوسرا آفتاب، لیکن صرف اندازہ لگانے کے لیے میں آنا عرض کرتا ہوں، کہ انگلستان کی تعداد آبادی اسپین سے دوگنے کے قریب ہے۔ لیکن وہاں گورنمنٹ اسکولوں کی وہ کثرت ہے کہ کم از کم دس لاکھ طلبہ صرف گورنمنٹ اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ پرائیوٹ اسکول، یعنی وہ جو چندہ سے چل رہے ہیں اُن میں تعداد متعلمین بہت زیادہ ہے۔

بقول سینور لورنیزو کے یہ ظاہر ہے کہ صرف امراء کے لڑکے، یا وہ کمبختی کے مارے جو یونیورسٹیوں میں پڑھنا چاہتے ہیں وہ تو ثانوی تعلیم حاصل کرتے ہیں باقی ابتدائی تعلیم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور اسکی حالت آپ کے سامنے موجود ہی ہے۔

اب اعلیٰ تعلیم کی کیفیت دیکھیے۔ ملک محروسہ اسپین میں بارہ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان سب یونیورسٹیوں کے طالبعلموں کی مجموعی تعداد ۲۲۳۳۳ ہے۔ میڈرڈ کی یونیورسٹی میں سب سے زیادہ تعداد طلبہ ہے، یعنی ۸۳۳۰۔ اور اُوبیڈو میں سب سے کم، یعنی کل ۵۸۱۔

اساتذہ کی قابلیت کا بظاہر کوئی معیار مقرر نہیں ہے۔ کچھ خوشامد، کچھ چرب زبانی اور بہت کچھ فرقہ بندی پر دار و مدار ہے۔ بہت سے لوگ محض اس لیے پروفیسری تک ترقی یاب ہوگئے کہ وہ ایک خاص پولیٹکل خیالات کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اسوقت برسرعروج تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جیسے ہی انکا زوال ہوا یہ پروفیسر بھی ختم ہو جائیں گے۔ ۱۹۲۳ء میں وزیر تعلیم نے اساتذہ کے تقرر وغیرہ کے لیے کچھ قواعد جاری کیے اور ایک بورڈ بنایا ہے۔ مگر جو لوگ کہ اسپین کے نظم و نسق کا تجربہ رکھتے ہیں وہ بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی بالکل بے نتیجہ رہے گا۔

جن عمارات میں کہ اسکول ہیں اُنکے متعلق ایک اخبار نے بہت صحیح لکھا تھا کہ "یہ عمارات کیا ہیں خاصے اچھے مکروہ قید خانے ہیں، بہت تاریک، سخت گندے، ہیں طرح طرح کی وباؤں اور بیماریوں کے کیڑے پلتے ہیں اور ہماری تازہ نسلیں اُنکا شکار ہوتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سرٹیفکیٹ وغیرہ یہ طالب علم ان مدارس سے محنت کے بعد حاصل کرتے ہیں وہ اُنکے کس کام کے ہیں۔ کیونکہ ان عمارتوں سے نکل کر اُنکی عمر ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ جو لوگ ان مدارس کو جانتے ہیں وہ انکے طلبہ کو سخت ذلیل سمجھتے ہیں۔ مجبوری تو صرف یہ ہے کہ ملک میں صرف یہی مدارس ہیں اور یہی طلبہ کہ انھیں کو ملازم رکھنا پڑتا ہے ....."

۱۹۲۱ء میں ملک محروسہ کے سرکاری اسکولوں کے ۱۹۰ انسپکٹر تھے۔ اتفاق سے یہ لوگ بہت دیانتدار اور محنتی لوگ تھے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے میڈرڈ میں ایک کمیٹی کرکے بہت سی اصلاحات تجویز کیں۔ عوام الناس سے بھی بہت سے اُنکے ساتھ شامل ہوگئے اور مختلف مقامات پر اس موضوع پر انھوں نے لکچر بھی دیے۔ لیکن شروع ۱۹۲۵ء تک تو یہ سب کچھ بے نتیجہ ہی رہا۔

دوران بحث و تمحیص میں ان انسپکٹروں نے یہ امر ثابت کر دیا، کہ ۱۹۲۱ء میں اسپین نے بقابلہ ۱۸۵۰ء کے کوئی ترقی نہیں کی، بلکہ رجعت کی ہے۔

۱۹۲۱ء کے آخر میں کل ۱۸ گورنمنٹ اسکول دوبخ فہرست تھے۔ اسی فہرست میں ہر ایک اسکول کے اساتذہ کے نام بھی تھے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے شاید ایک ہی دو کو عالم وجود میں آنے کا فخر حاصل ہوا ہو۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ اُنکے لیے مکان ہی کوئی نہ تھا۔ (صحیح یا غلط) اندازہ یہ ہے کہ اکیلے میڈرڈ میں بیس ہزار طالب علم ایسے ہیں کہ وہ اس وجہ سے اسکول نہیں جا سکتے کہ اُنکے بٹھانے اور پڑھانے کی جگہ نہیں ہے۔

اب صنعتی تعلیم کو لیجیے۔ میڈرڈ کا ٹیکنیکل اسکول بہت اچھا ہے، اور اُسکا عملہ بھی لائق ہے اور سامان بھی بُرا نہیں۔ مگر اس میں صرف کتابی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک کتبخانہ میں، جو تنگ ہونے کے علاوہ اتنا پُرانا ہے کہ برسات میں یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں پروفیسر اور طالب علم اُسی کے نیچے دب کر نہ رہ جائیں۔ عملی تعلیم کے لیے ورکشاپ اسکول کے قریب ہی ہونا چاہیے اور یہاں شاید ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور وہ بھی اتنا تنگ ہے کہ اُس میں مکمل کلیں نہیں لگائی جاسکتیں۔

اسپین میں بڑی مصیبت فرقہ بندی کی چلی آتی ہے۔ ہر چیز اور ہر عمل اُسی سے وابستہ ہے۔ غریب اساتذہ کی حالت اس فرقہ بندی کی وجہ سے متزلزل رہتی ہے۔ اس پر غضب ہے تعصباتِ مذہبی، کہ جن کی وجہ سے اکثر مقامات پر اُستادوں کو اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اُستانی ہو یا اُستاد، تنخواہ اچھی نہیں پاتے، اور جس مقام میں اسکول ہے وہاں کے رہنے والے اُنکی کوئی قدر نہیں کرتے، بلکہ انکو نابُود کرنا چاہتے ہیں۔ ان غریب اُستادوں کو بہت کچھ اپنی ہی جیب سے اسکول اور طالب علموں پر خرچ کرنا پڑتا ہے اور وہ رقم انکو بمشکل ہی ملتی ہے نہ گانوں والوں سے وصول ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اساتذہ اگر کچھ روپیہ اپنی گرہ سے خرچ کریں تو کس امید پر۔

یہ ساری خواریاں تو دورانِ ملازمت کی ہیں۔ آدمی انکو بھی اس امید پر برداشت کرلیتا ہے کہ بوڑھاپا ہی بے فکری سے گزریگا۔ اُسکی یہ گت ہوتی ہے کہ ایک اُستاد کو مرمینیہ واقع صوبۂ اشبیلیہ سے ۴۹ برس کی ملازمت کے بعد پنشن ملی۔ اُنکی بدقسمتی کہ اُن کے اور گورنر صوبہ کے پولیٹیکل خیالات نہیں ملتے تھے۔ یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ باوجود کوشش انکو زر پنشن وصول نہیں ہوا۔ اس سے زیادہ بدقسمتی یہ کہ یہ گورنر دس برس اُس صوبہ میں رہے۔ آخر جب بیچارے بُڈھے کے بھلے دن آئے اور وہ گورنر تبدیل ہوئے تو انکو پنشن ملنے لگی، مگر نصف، اور وہ بھی ایک شخص کی ذمہ داری پر لے لینے پر، کیونکہ دفتر خزانہ کو باوجود تلاش انکے کاغذاتِ پنشن نہیں ملے۔

ایک اور بڑا جرم پرٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم ہے۔ انگریزوں، جرمنوں، فرانسیسیوں وغیرہ نے اسکول جاری کر رکھے ہیں۔ یہ سارے اسکول ملکی اسکولوں سے ہر طرح اچھے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ سارے پرٹسٹنٹوں کے ہیں۔ دو سال اسی شور و شغب میں بیکار صرف ہوگئے کہ گورنمنٹ کو چاہیے کہ ان تمام اسکولوں کو خود لے لے۔ اس میں ناکامی لازمی تھی اور ہوئی۔

تعلیم کی مصیبت تو الگ رہی اور اسکو غیر مذہب کے لوگوں سے حاصل کرنا کسی قدر خطرناک ہے، مگر لطف یہ ہے کہ اسپین والے اپنے ملک میں Y. M. C. A. محض اس بنا پر نہیں قائم

ہونے دیتے کہ وہ پراٹسٹنٹ لوگوں کی تحریک ہے۔ اس ایسوسی ایشن نے اسپین میں اپنے پانوں پھیلانے شروع کیے تھے کہ جناب پوپ نے ایک فتوے صادر کرکے اسکے خطرات سے ملک کو آگاہ کردیا اور ایسی مفید ایسوسی ایشن کو وہاں نہیں چلنے دیا گیا۔ مذہبی خیالات کے متعلق شاید مجھے اور کچھ کہنے کی ضرورت پڑے۔

غرض تعلیم کی یہ صورت ہے اور یہ امیدیں ہیں۔ اس پر قسطنطنیہ میں سوراخ کا شور مچا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسی لیاقت پر ملک اُنکے حوالہ کیا جا سکتا ہے؟ آہ! یہ وہی ملک ہے کہ جہاں علم کا دریا بہہ رہا تھا، اور ہر کس و ناکس بلا لحاظ مذہب و قومیت و رنگ اُس سے مستفیض ہوتا تھا۔ اسی ملک کے سائنس و فلسفہ سے یورپ اب تک سیراب ہو رہا ہے۔ یہاں کے علماء کے قدموں میں آنکھیں بچھائی جاتی تھیں اور طالب علم آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔

حفظان صحت، مکانات اور صفائی

کسی قوم کی شائستگی کا اندازہ اُنکے مکانات، حفظ صحت اور صفائی دیکھ کر لگ سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اہالی اسپین اس معیار پر بھی پورے نہیں اُترتے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس سے راجا اور پرجا کی حالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ بہت دلچسپ مضمون ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ اسپین کا یورپ میں کیا درجہ ہونا چاہیے۔ میں ایک مرتبہ پھر یاد دلاتا ہوں کہ میں اسپین کا مقابلہ یورپ سے کر رہا ہوں، نہ کہ ہندوستان سے، جو غلاموں کا ملک ہے، اور یقیناً اکثر باتوں میں اسپین سے بھی بدتر ہے۔ میں ذیل میں صرف میڈرڈ کا ذکر کروں گا اُسی سے اور شہروں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پچھلی جنگ میں دو ہی ملکوں نے سب سے زیادہ نفع اُٹھایا؛ جاپان اور اسپین نے۔ غنیمت یہ ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کمایا اُسکو بیشتر اپنے قصبوں یا شہروں کی تزئین میں لگایا۔ چنانچہ چنانچہ قبل از جنگ کے میڈرڈ اور موجودہ میڈرڈ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسپین کے ماتھے پر جو کلنک کا ٹیکہ اُسکے بدنما دار السلطنت کی وجہ سے لگا ہوا تھا وہ بہت کچھ دُھل گیا ہے۔ عالیشان خوبصورت مکانات بن گئے ہیں؛ کشادہ سڑکیں نکل آئی ہیں؛ پرانے مکانات کی مرمت اور تبدیلیاں ہوگئی ہیں؛ بجلی کی روشنی، بجلی کے لفٹ، ٹیلیفون وغیرہ لگ گئے ہیں؛ میونسپلٹی جیسی لکھنؤ کی ویسی ہی میڈرڈ کی۔ میڈرڈ اور لکھنؤ کی سڑکوں میں بہت کم فرق تھا۔ اب ان دونوں

میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ میڈرڈ کی میونسپلٹی بہت جلد جاگ اُٹھی کہ اُس نے میڈرڈ کو شہر بنا دیا اور لکھنؤ کی میونسپلٹی ابھی خراٹے ہی لے رہی ہے، اور شہر کو گانوں سے بدتر بنائے ہوئے ہے۔ میڈرڈ کے ہوٹل جنگ سے پہلے لکھنؤ کی سرائیں تھیں اور اب حقیقی معنوں میں ہوٹل ہیں۔ غرض ہر چیز "بسا غنیمت" معلوم ہوتی ہے۔

لیکن یہ جو کچھ ہے بیرونی و سطحی نمائش اور فریب نظر بندی ہے۔ کوئی شخص اگر کوئی مکان کرایہ پر لینے کے لیے بہت سے مکانوں کو دیکھتا ہے تو ہر جگہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتا ہے کہ اس مکان میں وہ اور اُسکا خاندان تندرست بھی رہ سکتا ہے یا نہیں؟ اسی سوال سے تمام ترقیات کی قلعی کھل جاتی ہے۔

۲۳۔ نومبر ۱۹۲۱ء کے ایک اخبار میں ایک مشہور شخص نے ایک مضمون لکھا تھا۔ میں اُس کا خلاصہ لکھتا ہوں۔ اس سے ان تمام ترقیات کی کیفیت معلوم ہوگی:۔

"جو مکانات کہ آج کل شہر (میڈرڈ) میں اتنی جلدی جلدی بن رہے ہیں، وہ فی الحقیقۃ پنجرے ہیں۔ ان پنجروں کی اکثر چار چار منزلیں ہیں۔ ان میں ایسا ناقص مسالا لگایا گیا ہے کہ اکثر یہ خیال کرنا پڑتا ہے کہ یہ چار منزلیں کس چیز کے زور پر کھڑی ہیں۔ ان میں لفٹ، ٹیلیفون اور غسل خانہ سب کچھ ہیں لیکن یہی آرام دہ چیزیں تکلیف اور مایوسی کا باعث ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لفٹ میں اُتر یا چڑھ رہا ہے کہ بجلی بند ہو گئی۔ اب یہ شخص ہوا میں معلق لٹک رہا ہے، کیونکہ کوئی اور ذریعہ بوقت ضرورت لفٹ سے کام لینے کا نہیں بنایا گیا ہے۔ ٹیلیفون پر باری آنی مشکل ہے، اسکے استعمال کے لیے وقت کی کوئی تحدید نہیں۔ راسپین کے لوگ ٹھیرے باتونی، اب جو اُنھوں نے باتیں شروع کیں تو کسی طرح ٹیلیفون چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ غسل خانہ یا حمام کی یہ کیفیت ہے کہ ایک پورا تھیلا کوئلوں کا خرچ کیجیے تو اُس سے فائدہ اُٹھائیے۔ ایک عورت دیوار میں کیل ٹھونک رہی تھی کہ دیوار میں آر پار سوراخ ہو گیا اور اسکے ساتھ ہی سیروں مٹی فرش پر آ رہی۔ دیواریں اور چھتیں اتنی پتلی بنائی جا رہی ہیں کہ ایک گھر میں جو باتیں ہو رہی ہوں وہ دوسرے گھروں میں بے تکلف اور بخوبی سُنی جاتی ہیں۔ گانے بجانے کی آواز تو سردردِ خانہ ہمسایہ سمجھ کر قابل معافی ہو سکتا ہے، مگر بچوں کے کھیلنے، کودنے، شور مچانے، ہر قسم کی شرارت کرنے کی آواز تو نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان نازک مکانات سے ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اب میاں بیویوں میں لڑائی ذرا سوچ سمجھ کر ہوتی ہے"

بعض محلہ کی آبادی کی یہ حالت ہے کہ ایک جگہ کے متعلق رپورٹ ہے کہ ۱۵ مکانوں میں ۶۲۲۵ آدمی رہتے ہیں! اس پر صفائی کی طرف سے بے اعتنائی جو نتیجہ پیدا کرے گی اُسکے قیاس سے بھی گھن آتی ہے! نتیجہ کیا ہے؟ یہ کہ تپ محرقہ کے جراثیم میڈرڈ میں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں تپ محرقہ سے جو اموات دار السلطنت میں ہوئیں وہ اوہاء حسب ذیل ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ صحیح تعداد نہیں کہی جا سکتی، کیونکہ وہاں اس مرض کو بہت کچھ چھپایا جاتا ہے:-

جنوری	۶۲	جولائی	۲۹
فروری	۲۹	اگست	۵۸
مارچ	۴۱	ستمبر	۴۲
اپریل	۶۵	اکتوبر	۴۱
مئی	۳۵	نومبر	۲۵
جون	۲۹	دسمبر	۳۹
میزان کل	۵۰۵	میزان کل	۵۰۵

میری رلے ناقص میں ایک ہزار آدمی سالانہ تپ محرقہ سے میڈرڈ میں مرتے ہیں۔ اور یہ سب نتیجہ ہے صفائی سے بے پروائی کا۔ لطف یہ ہے کہ اس پر بھی میڈرڈ بہت صحت افزا شہر سمجھا جاتا ہے! لاہور صاف شہروں میں نہیں سمجھا جاتا۔ میڈرڈ اور لاہور کی آبادی میں کچھ بہت فرق نہ ہوگا۔ لیکن مجھے امید نہیں پڑتی کہ وہاں اتنی اموات تپ محرقہ سے ہوتی ہوں۔ مگر یہ شرف صرف میڈرڈ ہی کو حاصل نہیں، تمام اسپین میں تپ محرقہ کی یہی حالت ہے۔ اسی سال (علاوہ میڈرڈ کے) تمام اسپین میں تعداد اموات اس مرض سے ۳۹۰۰ تھی۔ اب اس صاف شہر کے پانی کا حال سُنیئے۔ ۲۹۔ دسمبر ۱۹۲۱ء کو ایک اخبار نے لکھا کہ "جس پانی کا پانی ایسے مقام سے لیا جاتا ہے کہ جہاں تمام میڈرڈ کے گندے نالے آکر ملتے ہیں۔ اس پانی کو صاف بھی نہیں کیا جاتا، بلکہ شہر کی امانت سمجھ کر شہر ہی کو پہونچا دیا جاتا ہے"۔ یہ شکایت برسوں سے چلی آتی ہے اور کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ۱۹۲۱ء میں اس پر توجہ دلائی گئی معلوم نہیں کہ انجام کیا ہوا۔

چھچھوندے اور کچے گھروندے کوڑے کرکٹ کے لیے اب تک اکثر و بیشتر مکانات میں موجود ہیں۔ انھیں میں پیشاب و پاخانہ جمع ہوتا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک حکم جاری ہوا تھا کہ چھ مہینے کے اندر اندر انکو ہٹا دیا جائے۔ مگر ۱۹۲۳ء تک اسکی تعمیل نہیں ہوئی اور یقیناً اب تک نہیں ہوئی ہوگی۔ صفائی کا طریقہ یہ ہے کہ ہر روز گاڑیاں آتی ہیں اور وہی اُٹھا کر لے جاتی ہیں۔ گندگی اور بدبو پھیلتی ہے۔

تو مجبوری ہے اور بیماری بڑھتی ہے تو بڑھا کرے۔ جو لوگ کہ لاہور میں رہتے ہیں یا وہ آئے ہیں، وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ کیا مصیبت لاتا ہے۔ ہندوستان گندوں کا ملک ہے اور لاہور غلاموں کے ملک کا ایک حصہ۔ یہاں تو ہندوستانیوں کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے اگر یورپ کے ایک دار السلطنت کے لیے تو یہ جتنا کچھ شرمناک ہے وہ قابل بیان نہیں۔

یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ اسپین میں مہترانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ غریب اپنے سروں پر کوڑا اٹھا کر لے جاتی ہیں، اور کوڑیوں پر پھینکنے سے پہلے اپنے ہاتھوں سے ایسی چیزیں نکال کر الگ کر لیتی ہیں جو بازار میں بک سکیں۔ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ناظرین اسکو گوارا نہ کریں گے تو میں بتلاتا کہ کیا کیا چیزیں علیحدہ علیحدہ نکلی جاتی ہیں لیکن سب صاحبوں سے معافی مانگ کر اتنا مجھے بتلانے دیجیے کہ وہاں یہ دستور ہے کہ باسی کھانا کوڑے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ مہتر کوڑے میں سے کھانا الگ کر لیتے ہیں، اور مزے سے وہیں بیٹھ کر اس کو کھاتے ہیں۔ مسٹر ڈیکن کہتے ہیں کہ یہ ملک اسپین کے افلاس کی دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسیحیت کے بھی تو بہت سے نام ہو سکتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہی مسیحی اتنے سخت مسیحی ہوتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ مذہب کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ تاہم گراں چہ رسد۔ اس خصوص میں ایک یہ بات قابل تعریف ہے کہ ہندوستان کی طرح یہ لوگ اچھوت نہیں سمجھے جاتے! کوڑے کی گاڑیوں کے مالک اور اُن پر کام کرنے والے پنجاب میں رائیں ہوتے ہیں اور اسپین میں مالی۔ بات ایک ہی ہے، صرف نام کا فرق ہے۔ دونوں جگہ اس سے کھاد کا کام لیا جاتا ہے۔

۱۹۲۱ء میں سینور گاریسا کو ریس نے اپنے ایک لکچر میں بتلایا تھا کہ "حدود شہر میڈرڈ کے باہر ایک لاکھ آدمی آباد ہیں، اور یہ آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ باوجود اسکے وہاں ایک بھی گندہ نالہ نہیں ہے۔ نہ گندگی جلانے کا کوئی انتظام"۔ وہ وہاں کے باشندوں، گورنمنٹ اور میونسپلٹی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور شرم دلاتے ہیں کہ تم لوگ ایک یورپین سلطنت کے رہنے والے ہو مگر کون سنتا ہے کہانی میری۔

اس گھناؤنے مضمون کو ختم کرنے سے پہلے مجھے ڈون رابرٹو کاسٹرو ویڈو کے مضمون کا ایک فقرہ نقل کر لینے دیجیے۔ یہ مضمون لاوز ۲۵ء کے اخبار میں چھپا تھا جو میڈرڈ سے نکلتا ہے:—

"باشندگان شہر (میڈرڈ) گندے اور گھناؤنے ہیں میں اپنے شہر کے رہنے والوں کو ناخوش نہیں کرنا چاہتا، ورنہ میں کہتا کہ انکی عادتیں سوروں کی ایسی ہیں۔ کھڑکیوں اور چھجوں کے اوپر سے

چٹائیاں (دریاں) قالین، بستر جھاڑے جاتے ہیں۔ یہ بستر اور دریاں اکثر اُن لوگوں کی ہوتی ہیں جو تپ محرقہ، سل، خسرہ[1] یا لال بخار کے مریض ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف گندگی بلکہ جراثیم روئیوں کے ٹوکروں اور مٹھائیوں کی قابوں پر دانستہ ڈالتے ہیں، جو کھلے منہ رہتے ہیں۔ جو سکانات یا دوکانیں پہلی منزل پر ہوتی ہیں اور دوسری منزل کی کھڑکیوں وغیرہ سے گلیوں اور راستوں میں باسی کھانا، لیڈیوں اور بچوں کے بال، ہر قسم کے پھلوں کے چھلکے .... پھینکے جاتے ہیں۔ صفائی کی سخت ضرورت ہے؛ مگر جھاڑو سے نہیں، بلکہ لوگوں کو صفائی کی تعلیم دیکر۔ مدارس میں اسکے لیے خاص انتظام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور پھر نگرانی کی۔ جرمانے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ اکثر یا اکثر لوگ جرمانہ نہیں ادا کرتے اور سفارشوں کے ذریعہ سے دوسروں کو ادا نہیں کرنے دیتے"۔

شرح اموات اگر حکام دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں رکھتے۔ یہی شرح اُنکی نا قابلیت اور لاپروائی کا پورا ثبوت ہیں۔ اب خواہ اس میں گورنمنٹ کے حکام ہوں یا میونسپلٹی کے۔

میڈرڈ کی شرح اموات کی یہ کیفیت ہے کہ ۱۹۱۱ء میں ۲۳٫۴ فی ہزار تھی اور ۱۹۱۴ء میں ۲۶٫۲۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۵ء تک اوسط اموات ۲۴٫۸ فی ہزار رہی ہے۔ اگلے پانچ برس میں ۱۹۱۶ء میں ۲۴٫۲۔ اور ۱۹۱۸ء میں ۲۹٫۲۔ اور اوسط اموات ۲۶٫۷ فی ہزار رہی ہے؛ یعنی بقدر دو موتوں کے بڑھ گئی ہے۔ ان ہی سالوں میں یورپ کے اور تمام دارالسلطنتوں کی شرح اموات میں برابر کمی آتی رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں سیڈرڈ کی شرح اموات ۲۲٫۳۹ تھی اور لندن کی ۱۲٫۶۔ اس سنہ میں کل تعداد اموات ۱۶۱۱۸ تھی۔ ان میں سے ۳۰۹۸ صرف ایک سال سے کم کے بچے تھے۔

میڈرڈ کی آبادی کم و بیش دس لاکھ کی ہے۔ اس میں ایک بھی حمام نہیں؛ اور ہو بھی کیونکر سکتے ہیں۔ یہ تو کفار (یعنی مسلمانوں) کی نشانیاں ہیں۔

ایک زمانہ میں، جو خواب و خیال ہوگیا ہے، قرطبہ بھی دارالسلطنت تھا۔ اُسکی صفائی وغیرہ کا حال دیکھنا ہو تو میری کتاب اخبار الاندلس ملاحظہ کیجیے۔ مختصر یہ ہے کہ یہی زمانہ تھا کہ جب اہالی اندلس کہا کرتے تھے کہ "یہ مسلمان بھی عجب احمق لوگ ہیں کہ عاقبت میں جنت کے

---

[1] میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ مجھے "خسرہ" کہنا چاہیے یا "کسرہ"۔ کوئی صاحب اسکو صحیح کریں۔

[2] شاید اصل لفظ "قب" ہے۔

امیدوار ہیں۔ کیا قرطبہ اور اشبیلیہ میں انکے مکان ہیں زندگی ہی میں جنت اور انکی عورتیں حوریں ہیں! سچ ہے۔
ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔

سیاسیات اور رعایا

(۱)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھی اپنی ایک عجیب و غریب مخلوق بنایا ہے۔ یہ کمزور و مظلوم و مجہول مخلوق کسی کے قابو میں نہیں آتی۔ دُور کیوں جائیے، جب خدا کی نہیں تو اور کس کی ہوگی۔ اگر اسکو ڈھیل دیجیے تو اسکو بغاوت کی سوجھتی ہے، اور اگر ذرا ہیچ کس دیجیے تو شکایتوں کی بھرمار کرتی ہے ان تحلہ لیٹ اوتنز کہ لیٹ۔ اتنے بڑے ہاتھی کے لیے بڑے انکس کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کا رجحان وحشت کی طرف ہوتا ہے؛ گو یہ نہ سوچے کہ وہاں بھی آزادی نہیں ہے۔ (آزادگی حرفے است یہاں ہے نہ وہاں ہے) اس کی خیریت اسی میں ہے کہ یہ پابند ہو کر رہے۔ اور اسکے جکڑ بند سخت رہیں۔

اسپین میں دفورِ جہالت کی کیفیت معلوم ہو ہی چکی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں "پیشہ ور سیاست داں" بہت زیادہ ہیں۔ اور وہ لوگ ضرورتِ وقت کا احساس نہیں رکھتے کنزرویٹو، لبرل، ری پبلکن تو ہیں ہی۔ کلیسا کے اقتدار نے اور بھی کافر ادائی پیدا کر رکھی ہے۔ اول تو ہوشدار لیڈر۔ وہاں آٹے میں نمک ہیں، اور جو ہیں وہ سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بہرحال سیاسی معاملات میں کچھ نہ کچھ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ وہاں کا کانسٹی ٹیوشن ایسا عجیب غریب ہے کہ دنیا میں اپنی آپ مثال ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے دماغ پر سخت زور ڈالنا پڑتا ہے۔ میں اس سے قطع نظر کرکے موٹی موٹی باتیں اور اصلی حالت بیان کرتا ہوں۔

وہاں ایک گروہ نئے خیالات کو لے کر، بڑے بڑے دعووں اور اچھی اچھی امیدوں کا سبز باغ دکھلا کر پیدا ہوا اور اپنی عظمت کا مرثیہ پڑھ چکا۔ ڈوبتے کو ایک تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ دعویٰ یہ تھا کہ ہم غرباء کی مدد کریں گے اور لوگوں کی تکالیف و مصائب کم کریں گے۔ اتنا وعدہ بھی کافی تھا۔ غول کے غول اُنکے جھنڈے تلے آگئے۔ گرچند ہی روز بعد اُنکا پول کھل گیا۔ اور لوگ اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہے۔ ردِ عمل پھر شروع ہوا۔ جو لوگ طاقتور تھے وہ پھر برسرِ کار آگئے۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن لوگوں نے اس اُمید کو صبر نہیں کیا کہ ہمیں ظلموں سے نجات ملیگی اور

اطمینان نصیب ہوگا۔ چنانچہ سوشلسٹ گروہ پیدا ہوا۔ انھوں نے ناکامیاب ری پبلیکن سے بیزاری و بے تعلقی ظاہر کی۔ خصوصاً اس لیے کہ ان کا طرز عمل شاہی اقتدار قائم رکھنے کی طرف مائل تھا، اور انکے دعوے کا صریح منافی تھا۔ اس نئے گروہ میں وہ لوگ زیادہ تھے جو کمیونسٹ فرقہ کے خیالات رکھتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کا اثر بہت طویل تھا، اور یہ اسپین جیسے ملک کے مناسب حال نہ تھا۔ آخر انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ امن و امان کے ساتھ اصلاحوں کا حاصل کرلینا ناممکن محض ہے۔

ری پبلیکن پارٹی ضعیف ہوچکی تھی گو انکا دعویٰ اور دم خم وہی تھا، مگر ان میں سے جو ہوشیار آدمی تھے انھوں نے اسی میں خیریت دیکھی کہ وہ "آزاد خیال و پسند" ہو کر رہیں۔ اسکی وجہ بظاہر وہی تھی کہ انھوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ کنسرویٹو گروہ کے فولادی پنجے سے وہ چھوٹ نہیں سکتے کیونکہ یہ گروہ جو کچھ کرتا تھا قانون کے اندر رہ کر۔ پچھلی لبرل گورنمنٹ یکایک برروئے کار آگئی، اسکے لیے کوئی امید تو تھی نہیں، مگر کنسرویٹو حکومت کی بے اعتدالیوں نے انکی پاس کو آس سے بدل دیا۔ یہ لبرل لوگ کلیسیا اور کلیسائیوں کے اقتدار کی تو چنداں پروا نہیں کرتے، مگر ایک مشکل یہ ہے کہ ان میں سے بعض اتنے متمول ہیں کہ وہ اصلاحات سے بھی بے اعتنائی کرتے ہیں۔ اور تا وقتیکہ اصلاح نہ ہوجائے غربا پر جو ٹیکسوں کا بار ہے وہ کم نہیں ہوسکتا۔ مزدور گروہ کو مطمئن کرنے کی امید ایسی ہے کہ نہ وہ لبرل گورنمنٹ کرے گی نہ کنسرویٹو، اشتراکیوں کے لیے کسی قانون کا پیش کردینا اور چیز ہے، مگر جب یہ ہوگا تب ہی ان دونوں (لبرل اور کنسرویٹو) کے درمیان میں پوری گفتگو شروع ہوجائیگی۔ اس لڑائی کا نتیجہ مزدور پارٹی کے حق میں اچھا ہوگا اور وہ فوراً برسر حکومت آجائے گی۔ مگر کب؟ اس کا جواب مشکل ہے۔

اگرچہ اسپین کے لبرل لیڈر کلیسا کے اثرات سے بہت کچھ اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں، لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ بعض اتنے متمول ہیں کہ وہ اصلاحوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے کیونکہ اس کا بڑا اثر یہ ہوگا کہ ٹیکس زیادہ بڑھے گا۔ اور یہ تو امید ہی نہیں ہونا چاہیے کہ مزدور پارٹی کی تسکین کے لیے کوئی قدم کسی کا بڑھے گا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مزدور پارٹی کو کوئی امید باقی ہی نہیں رہی۔

اسباب کچھ ایسے ہیں کہ کوئی شخص یا اشخاص اسپین کو ایک خاص وقت میں جو آنیوالا ہے، بدامنی اور بغاوت سے بچالے۔ اسکے بعد جو فرقے پیدا ہونے والے ہیں انکی نسبت

پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ انکا رجحان کیا ہوگا۔ اسوقت تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کے کمیونسٹ فرقہ کو بہت کچھ کامیابی ہو جائیگی۔ یہ امر آخر ہے کہ آیا وہ اسکو سنبھال سکیں یا نہیں۔

میں نے کہیں اوپر کہا ہے کہ اسپین کی سیاسیات میں کلیسیا اور کلیسیائیوں کا دخل عجیب غریب چیز ہے۔ یہاں کا کلیسیا ہر وقت جناب پوپ کا دست نگر رہتا ہے اور اپنے ملک کے حالات سے روزانہ پوپ کو خبر پہنچاتا اور اسکی ہدایت کا منتظر رہتا ہے۔ یہ لوگ، جیسا کہ انسے توقع کی جاتی ہے، اسی فکر میں رہتے ہیں کہ سیاسیات کو دین سے وابستہ، بلکہ اس کا تابع فرمان رکھیں۔ حالانکہ مسیحیت، جو عاجز فقیروں کا دین ہے، اسکا متحمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ اس فرقہ میں بھی اکثر ہوشیار لوگ ہیں، اس واسطے کئی مرتبہ یہ ہوا ہے کہ انھوں نے قبل از وقت خطرات کو محسوس کیا اور پوپ کے رعب و اقتدار کے ذریعہ سے اُس کا ازالہ کر دیا۔ ایک بڑا کام ان لوگوں نے یہ کیا کہ اپنے اثر سے کام لے کر کیتھولک ٹریڈ یونین قائم کرا دیں اور اس سے وفاداری کی طرف مائل مزدوروں، بالخصوص زراعت پیشہ مزدوروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ کیونکہ یہ فرقہ جاہل مطلق ہے۔ اسکا نہ سیاسیات و تمدنی معاملات سے تعلق ہے نہ وہ ان چیزوں کو سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کی عقل و تمیز سے بہت بعید ہے۔ انکے نزدیک بہترین تدبیر یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کلیسیائیوں کے ہاتھ میں دیدیں۔ یوں دونوں کی طاقت بڑھ رہی ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت رنگ لائے؛ گو ہوشیار لوگ اب بھی اسی قول پر عامل ہیں کہ "العلماء ابعد عن السیاسۃ"۔ بہرحال سیاسی اکھاڑے میں دو پہلوان خم ٹھوکتے نظر آتے ہیں: ایک کی وردی زرد ہے، یعنی کلیسیائی فرقہ اور دوسرے کی سرخ، یعنی کمیونسٹ۔ اب تک تو زرد پہلوان نے صرف انتظامی کام کیا ہے کہ جہاں کہیں ہڑتال ہوتی ہے وہ اسکا خاتمہ کر دیتا ہے۔ یوں دونوں کی رقابت بڑھتی جاتی ہے۔ اسپین جیسے اجہل ملک میں بظاہر پوپ کی پارٹی کو زیادہ کامیابی ہوتی نظر آتی ہے۔ اس سے لبرل خائف ہیں اور کنسرویٹو مطمئن۔

شاہ پرستی کے جذبات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسکی وجہ خواہ کچھ ہو۔ بظاہر تو یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی جان لینے کے لیے بہت سے حملے ہوئے۔ گو وہ ایسا سخت جان نکلا ہے کہ ہر دفعہ بال بال بچ جاتا ہے۔ لیکن اگر قاتلانہ حملے والے زندہ ہیں تو ہمیں میدان ہمیں چوگاں ہیں گو، موجود رہیگا، وہ ہر دفعہ موچھوں پر تاؤ دے کر کہتے رہیں گے کہ یار باقی صحبت باقی۔ بہرحال بادشاہ کی حالت ہر وقت اتنی مخدوش رہتی ہے کہ شبے اندر شب دیگر نمی ماند۔ انسان ہمیشہ مظلوم

کا ہمدرد و حامی ہوتا ہے، اسی لیے جذبات شاہ پرستی کو تقویت ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کنسرویٹو چونکہ غلام شاہ ہیں، اس لیے انکی حالت اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ امیر عبدالکریم "زادہ اللہ" کی جنگوں میں ناکامی کی وجہ سے انکو ناکامی ہوئی اور انکی وقعت گھٹ گئی تھی؛ لیکن انکے دم خم چند روز ہی رہے۔ آخر ایک بلائے بے درماں ایسی آئی کہ جس نے بادشاہ کو شاہ شطرنج بنا دیا اور کنسرویٹو کو غلام گردش میں بیٹھنے والے ادنیٰ غلام۔ وہ بلا ہے ڈکٹے ٹر پیوڈی ریویرا، جسنے فرانس کی مدد سے امیر عبدالکریم پر فتح پائی۔ گو خزانہ خالی ہو چکا اور سلطنت پر وہ بار پڑا ہے کہ جسکا خمیازہ کم از کم پچاس برس آئندہ تک اسپین اٹھائے گا۔ تلونیہ والے تاک میں ہیں، اور وہ انشاءاللہ بہت جلد ری پبلک کرا کے رہیں گے جسکا تجربہ پہلے ہو چکا ہے کہ اسکی چند ساعت کی زندگی ہوئی اور اب بھی ہوگی انشاءاللہ۔

یوں ملک آناً فاناً بد امنی و بدنظمی کی طرف جا رہا ہے، اور یہ ہو کر رہیگی، خواہ پیوکے بعد ہو یا اُس کی زندگی میں۔

موجودہ سیاسی حالت اسپین کی یہ ہے کہ تمام فرقے، کنسرویٹو، لبرل، کمیونسٹ، کلیسیائی موجود ہیں، مگر معطل۔ ملک بھر میں پیوڈی ریویرا کی دوہائی ہے اور وہ اپنے دشمن بڑھا رہا ہے۔ بادشاہ ایک فرمان پر دستخط کر کے اطمینان سے پیرس کے ہوٹلوں میں شراب پیتا اور وہاں کے قمار خانوں میں جُوا کھیلتا ہے۔ تلونیہ والے اپنی فکر میں بدستور لگے ہوئے ہیں۔ "زندہ باد امیر عبدالکریم"

انتخابِ ممبراں

(۲)

ہندوستان میں ہر تیسرے برس جو میونسپل کمیٹی اور لیجسلیٹو کونسلوں کے انتخابات کے زمانے میں ہوتی ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ مہینوں پہلے تیاریاں شروع ہوتی ہیں۔ کمیٹیاں کی جاتی ہیں، بھرتی دیے جاتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، منتخب کرنے والوں کی خوشامدیں ہوتی ہیں، عین وقت پر تواضع و مدارات کا انتظام کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ اسپین میں ایسی کوئی "تموینت" نہیں ہوتی۔ کینیٹ وغیرہ کے انتخاب کے موقعوں پر بھی اتنی رونق اور اتنا جوش نہیں ہوتا جتنا ہندوستان میں میونسپل کمیٹی کے لیے ہوتا ہے۔ جو امیدوار ہوتے ہیں وہ نہیں بتلاتے کہ ہمارا پروگرام کیا ہوگا اور ہم کس مقصد کے لیے انتخاب ہونا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہاں

جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ کہ امیدوار یہ ظاہر کرتا ہے کہ میں فلاں پولیٹکل گروہ یا شخص یا فلاں نمود کے آدمی سے تعلق رکھتا ہوں۔ کمیٹیاں نہیں ہوتیں، تقریریں نہیں ہوتیں، کیونکہ اُسکی ضرورت نہیں کیونکہ ان لوگوں کو کہنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں، اور اگر ہو بھی تو سننے والے کہاں سے آئیں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ریاندار اور ہوشدار پولیٹکل آدمی وہاں بھی ہوتے ہیں، لیکن ایسے لوگ عوام الناس کے معاملات میں دخل ہی نہیں دیتے اُنکو یہی پسند ہے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں۔ زمینداروں کا فرقہ ایسا ہے کہ اسے پولیٹکل معاملات میں زیادہ دخل دینا چاہیئے لیکن وہ ایسا جاہل فرقہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس تکلیف و کشاکش میں پڑنا ہی بیکار ہے۔ حالانکہ ووٹ حاصل کرنے میں انکو زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ ایک وقت یہ ہے کہ آمد و رفت کی آسانیاں ملک میں بہت کم ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کی اراضی یا جاگیریں ایک دوسرے سے دُور دُور ہیں۔ غریب کاشتکاروں کو جو تکلیفات سفر میں پیش آتی ہیں وہ ظاہر ہیں۔ عدالتوں میں بہت دیر لگتی ہے اور کسانوں کو شکایات رفع کرانے میں سخت مصیبت جھیلنی پڑتی ہے۔ وہ اسی مصیبت میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں، اور بجائے اسکے کہ وہ کسی امیدوار کا ساتھ دیں انکو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹ لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائیں اور وہی رویہ اختیار کریں جو چند سال ہوئے کسانوں نے ہندوستان میں اختیار کیا تھا۔ یہ کہہ دینا کہ کسانوں کو اگر کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ اپنی حالت پر قانع ہیں، بالکل غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انکی بیچینی اور آئے دن کے خلاف قانون مظاہرات کیوں ہوتے۔ انتہا یہ ہے کہ اندیشہ یہ ہے کہ وہ کسی روز بغاوت نہ کر بیٹھیں۔ کمیونسٹ اسی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ یہ کرا کے رہیں۔

باستثنا چند، عام طور پر زمیندار، اور بالخصوص اُن زمینداروں کو جو پشتہا پشت سے جاگیردار چلے آتے ہیں اپنے مزارعین سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ مزارعین اپنی حالت درست کریں یا آرام سے رہیں۔ بلکہ اُنکو اس طرف مائل کرتے ہیں کہ جو روپیہ اُنکے ہاتھ آئے اُسکو فضولیات میں اُڑا دیں۔ مختصر یہ ہے کہ زمیندار ہرگز اسکو گوارا نہیں کرتے کہ اُنکے کاشتکار منتخب ہو کر کینیٹ وغیرہ میں اُنکے برابر بیٹھیں۔

ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کے زمانہ سے ہزاروں میل پیچھے ہے۔ امرائے ملک کا اس میں ذرا سا بھی حصہ نہیں، بلکہ وہ ان کاموں میں پڑنے کو اپنا ہتک سمجھتے ہیں۔ وہ اسکو ہرگز گوارا نہیں کریں گے کہ کوئی کارخانہ دار یا کاریگر یا تاجر اُنکے برابر بیٹھے۔ چند عمائد ایسے ہیں کہ جنھوں نے صنعت و حرفت و تجارت کو اپنی دولت بڑھانے کا ذریعہ بنایا ہے؛

مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی برادری کی نظروں سے ایسے گر گئے ہیں کہ وہ برابری و ہمسری کا دعوے نہیں کر سکتے - یہ صورت ایسی ہے کہ اوروں کو اُن ہی کی راہ پر چلنے سے مانع آتی ہے مگر یہ کوشش انکی طرف سے جاری ہے کہ وہ اثر و نفوذ پیدا کرلیں، اور اسکا اُنھوں نے یہ ذریعہ اختیار کیا ہے کہ ملک کی سیاست میں دخل دیگر اپنی دقت بڑھائیں مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ کسی اور سے بھی ہمدردی کریں - وہ خود بُری نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس کا وہ انتقام یوں لیتے ہیں کہ وہ سب کے دشمن ہیں - اس کا آخری اثر پھر غربا اور بالخصوص مزارعین پر پڑتا ہے - یہ چیزیں اصلاح ملکی کے لیے سدِ راہ ہیں - ان لوگوں کی بےچینی بڑھتی جاتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ بہت جلد بغاوت ہو جائے امیر عبدالکریم (جزاہ اللہ) کی وجہ سے ملک میں ہمدردی کی روح پیدا ہو گئی تھی - اور اب ڈکٹیٹر کی چیرہ دستیوں نے رعایا کو روک رکھا ہے ورنہ اس وقت مملکت اسپین بغاوت رفع کرنے کی فکر میں لگی ہوتی - اب بھی اگر خاص صورت مبتری کی نہ پیدا ہوئی تو بغاوت موجود ہے - نتیجہ جو کچھ ہو -

ایک اور خرابی یہ ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو شخص منتخب ہونے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہے وہ انتخاب ہو کر ذاتی نفع اُٹھانا چاہتا ہے - جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ شخص عوام کو یہ یقین نہیں دلا سکتا کہ میں اُنکے فائدہ کی کیا کیا بات کروں گا - اسکے علاوہ لوگوں کا تجربہ بھی ہے کہ یہ لوگ سوائے اسکے کہ ذاتی نفع اُٹھائیں اُنکے کسی مصرف کے نہیں، اس لیے اُنکو امیدوار سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی - وہ ووٹ دیتے ہیں تو محض کسی دباؤ میں آکر - اسکے علاوہ ایک اور شکل یہ ہے کہ اسپین میں رشوت کی وہ گرم بازاری ہے کہ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس صوبہ متحدہ میں اُس کا عشر عشیر بھی نہیں، حالانکہ پنجاب کے مقابلہ میں یہاں عمال کی رشوت ستانی بڑھی ہوئی ہے - اس صوبہ متحدہ میں ہر شخص کے حق بندھے ہوئے ہیں جو اُسکو گھر بیٹھے پہونچ جاتے ہیں - اسپین میں ہر چیز اور ہر بات کے لیے گویا قیمت مقرر ہے - اس میں وہاں کے حکام نک آلودہ ہیں چہ جائیکہ عمال - یہ کہنا بالکل بیجا نہ ہوگا کہ وہاں ایک بڑے وزیر سے لیکر ایک چپراسی تک اپنی قیمت مقرر کیے ہوئے ہیں اور اُن کو بے منت (صوبہ متحدہ کے "حق" کی طرح) گھر بیٹھے مل جاتی ہے - نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ واقعی ملک کی خدمت کر سکتے ہیں وہ خرچ کی زیادتی کی وجہ سے میدان عمل میں نہیں نکلتے - دوسری طرف رعایا یہ سمجھتی ہے کہ امیدوار انتخاب خود رشوت ستانی کا مرتکب ہو جائیگا -

یہ تمام خرابیاں ایسی ہیں کہ کسی کے روکے نہیں رُک سکتیں، اب اس میں چاہے خود سرکار ہو یا کوئی پولیٹکل فرقہ - اگر اس کا علاج کوئی کر سکتا ہے تو خود رعایا، اور وہ اس قدر غافل و جاہل ہے کہ

کچھ نہ کریگی۔

پولٹیکل خیالات و طریق کار

(۳)

جو کچھ کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، وہ اس امر کی کافی شہادت ہے کہ اسپین میں پولٹیکل اصلاح ہونا بہت مشکل ہے۔ اسکے علاوہ اور باتیں بھی اسکی مؤید ہیں کہ نہ صرف اسپین میں، بلکہ اُن علاقوں میں بھی جو امریکہ میں واقع ہیں اور اب تک بدقسمتی سے اسپین کے قبضے میں ہیں، اسی حال میں گرفتار ہیں۔ یا تو وہاں پولٹیکل معاملات میں اتنی زیادتی ہوتی ہے کہ بدہضمی ہو جاتی ہے، یا اتنا پرہیز کیا جاتا ہے کہ بھوک کی تکلیف لاحق ہو جاتی ہے۔ سیاسیات کی طرف توجہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر "پیشہ ور سیاسی پیشہ" کی کچھ کمی ہے۔ اُن لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ووٹ دے سکتے ہیں، مگر وہ بہت کم ووٹ دیتے ہیں، یا بالکل دیتے ہی نہیں۔ وہاں یہ سوال نہیں ہے کہ منتخب شدگان اصولاً کیا کرینگے بلکہ پوچھا یہ جاتا ہے کہ اُنکی ذاتیات کی کیا کیفیت ہے۔ اسکی ضرورت نہیں ہے کہ اس شخص نے ملک کی کیا خدمت کی ہے یا اُسکے پولٹیکل خیالات کیسے ہیں، وہی شخص کامیاب ہوگا جو روپیہ زیادہ خرچ کریگا، جسکے مزارعین زیادہ ہونگے۔ باقی رہا یہ امر کہ اُس کا کیا پروگرام ہے یا وہ کیا بات دا ضعان قانون یا محکمۂ سیاسی سے منظور کرانا چاہتا ہے، ایک فضول سا سوال ہے، کیونکہ فی الحقیقت وہ کوئی خاص غرض لیکر انتخاب کے لیے کھڑا ہی نہیں ہوتا۔ انکی کامیابی کا کوئی ذریعہ ہے تو خود اُن کا ذاتی دباؤ اور رعب، نہ کہ قابلیت ذاتی۔ مگر آخر منتخب شدگان کا مقصد اصلی کیا ہے؟ صرف اپنی ذاتی وجاہت کو بڑھا کر روپیہ کمانا! باقی رہا ملک کا نفع و نقصان، اس سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں! اسکا علاج ڈکٹیٹرشپ کے پاس نہیں۔

ان حالات کا نتیجہ اسپین جیسے ملک میں (کہ جہاں سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ملک کی نصف آبادی بالکل جاہل ہے) یہ ہے کہ جال کا ہر تار یا زنجیر کی ہر کڑی اس امید میں رہتی ہے کہ اُس کا ہر کامیاب امیدوار یا ملک کا مربی اسکی خوراک کا حصہ گھر بیٹھے پہونچا دیگا۔ زنجیر کی ہر کڑی جو اصل زنجیر سے زیادہ ملحق ہے، اس قابل سمجھی جاتی ہے کہ اسکو اچھی طرح پکڑ لیا جائے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کامیابی کے لیے قابلیت و نا قابلیت کا کوئی لحاظ نہیں رہتا، اور کامیاب آدمی اپنا اور اپنے ہاوست مربیوں کا خرچ خود نکالتا ہے۔

کامیاب امیدوار ہی نہیں کہ خود نفع اُٹھاتا ہے، بلکہ اپنی کامیابی سے اپنے عزیزوں، دوستوں، ہموطنوں کو فائدہ پہونچاتا ہے۔ اُسکے وطن میں ترقیں ہوجاتی ہیں، لالٹینیں لگ جاتی ہیں، صفائی بڑھ جاتی ہے۔ اور بعض وقت کوئی نیا مدرسہ کھل جاتا ہے یا کسی مدرسہ کے نصیب کھل جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کیا یہ ملک اور اہل ملک کا فائدہ نہیں ہے؟ مگر اس سے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمت میں کتنے نالایقوں کا اضافہ ہوجاتا ہے، کتنی بیوہ گیاں بڑھ جاتی ہیں اور اُسکے اعزا و اقارب اپنے داب ناجائز سے خود کتنا فائدہ اُٹھاتے اور دوسروں کو نقصان پہونچاتے ہیں کسی دوسرے مقامات کو، جہاں سڑکیں وغیرہ اشد ضروری ہیں محروم کرکے ایک خاص شہر یا قصبہ میں روپیہ کا ضیاع کرنا، اگر ترقی کہلائے تو کہلائے، ورنہ نہ تجارت کو اُس سے نفع پہونچتا ہے نہ زراعت کو۔ باقی رہ گئے مدارس کا کھل جانا یا کسی مدرس کو فائدہ پہونچ جانا، یہ اس لیے بیکار ہے کہ طالب علم ہی اُس شہر میں نہیں ہوتے، اسکے مقابلہ میں وہ مقام محروم رہ جاتے ہیں جہاں طالبعلموں کی کثرت ہے اور تعلیم کا انتظام نہیں۔ غرض نہ کوئی پولیٹیکل خیالات ہیں نہ کوئی طریق کار!

اسپین کے ہوشیار لوگ اس اُمید پر جی رہے ہیں کہ شاید کبھی وہ وقت آجائے کہ ہمارا ملک بھی اور مہذب و متمدن ملکوں کے طریق کار اختیار کرلے۔ یہ وقت آسکتا ہے ضرور، کل آجائے یا دس برس کے بعد: بشرطیکہ کوئی اور امیر عبدالکریم نہ پیدا ہوجائے جس سے ہم مایوس نہیں ہوسکتے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

قانون، تمدنی ترقی سے غفلت، دفتری حکومت اور اسپین

(۴)

جن حضرات نے کہ میری کتاب "سولدین" ملاحظہ فرمائی ہے انکو اندازہ ہوگا کہ ملک اسپین میں قانون بنا دینا یا احکام نافذ کردینا کتنا آسان ہے؟ مگر اُن پر عمل ہونا کس قدر مشکل بلکہ ناممکن بات ہے۔ اہالی اسپین کی سستی اور بے حسی یورپ میں ضرب المثل ہے۔ اُسکی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ اُن میں عربی خون ملا ہوا ہے اور یہ اُس کا اثر ہے۔ "سولدین" کے ناظرین یقیناً اس توجیہ کی تردید میں میرا ساتھ دینگے۔ تشریح بہت طولانی ہے۔ بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ قانون و قواعد وہاں لاحاصل ہیں اور کاہلی اُنکا روزمرہ۔ قریباً ساڑھے چار سو برس کا تو تجربہ ہمارا بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسپین کے قوانین بہت سی صورتوں میں بہترین قوانین اور [illegible]

ہندوستان تو کیا یورپ کے اکثر ممالک کو چاہیے کہ اُنکو اپنے لیے نمونہ بنائیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ ملک ہی ایسا ہے کہ جہاں ہر بات میں تضاد موجود ہے۔ قانون بنا دینا اور چیز ہے مگر اُس کا نفاذ یا اُس پر عمل کرنا شے دیگر ہے۔ یہ مسلم کہ وہاں تعلیم کی کمی ہے، مگر جتنی اور جیسی بھی ہے وہ بُری نہیں۔ ذہانت و دور اندیشی کی وہاں کمی نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ملک کے قابل لوگ عضو معطل ہیں۔ یا اُن سے وہ کام لیا جاتا ہے جو اُنکے لیے غیر موزوں ہے۔ جہاں حرفت و تجارت کی کمی ہو وہاں بہترین چیز قانونی تعلیم ہے۔ قانون وہ چیز ہے کہ اُسکے گریجوائٹ ہر عہدہ پر لگائے جا سکتے ہیں۔ اہالی اسپین اکثر و بیشتر قانون کی طرف مائل اور اُس کی ڈگریاں لیتے ہیں۔ لیکن اُنکو کسی طرح یہ امید نہیں ہے کہ وہ وکالت کرکے اپنا پیٹ پال لیں گے۔ اسکی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہاں مقدمہ بازوں کی کمی ہے، بلکہ فریقین مقدمہ وکیل سے مدد لیتے ہیں نہ عدالتیں اسکو پسند کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عدم مزاولت قانونی سے وکیل کچھ لائق نہیں ہوتے پاتے۔ اصل میں عدم واقفیت قانون کوئی عذر نہیں بن سکتا۔ بلکہ خرابی یہ ہے کہ جو کچھ بھی علم ہے وہ محض نظری ہے، عملی نہیں۔ ان لوگوں سے گفتگو کی جائے تو یہ عالم متبحر معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذرا اُن سے کام لیکر دیکھیے تو نالائق محض ثابت ہوتے ہیں۔ اصول قانون کو سمجھتے ہیں، ملکی ضرورت کو جانتے ہیں، جو نقائص ہیں اُن کا احساس ہے، لیکن اُن سے ذرا قانون کا مسودہ کرائیے تو دیکھیے؛ یقین جانیے کہ دو چار ابتدائی دفعات بھی نہیں لکھ سکیں گے۔ ہزار خرابی مسودہ بھی تیار ہو گیا؛ مجلس و اعضان قوانین میں بھی پہنچا؛ وہاں جو اُس پر بحث و اعتراضات ہوئے تو مسودہ کرنے والے حضرات کھوئے گئے۔ جواب ہی نہیں بن پڑتا۔ بدقت تمام قانون بن بھی گیا، نافذ بھی ہو گیا تو انجام یہ ہوا کہ وہ بھول بسر گیا اور اُسکو اُن ہی حضرات نے دیدہ و دانستہ توڑا اور خلاف ورزی کی، جنھوں نے اسکو بنایا، پاس کرایا۔ اس سے انکار نہیں کہ چند اور محض چند روز کے لیے اُس پر عمل ہوا، اُسکے بعد وہی وسیع تظلم ہے اور وہی فریاد اب کسی کو، یہاں تک کہ خود قانون بنانے والے کو یہ یاد نہیں آتا کہ اس خرابی کے انسداد کے لیے فلاں قانون بن چکا ہے۔

ان خرابیوں کے اسباب بہت سے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) گورنمنٹ سخت پست حالت میں ہے اور اُس پر بے حد کمزور

(۲) ملک میں کمی تعلیم۔

(۳) اُن کا جو کانسٹی ٹیوشن ہے وہ اتنا لغو اور پیچیدہ ہے کہ ناقابل عمل ہے۔ اُسکی بنیاد جمہوریت پر ہے مگر نہ کوئی اسکو سمجھتا ہے، نہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کانسٹی ٹیوشن میں

۱۸۷۶ء سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، نہ کسی نے اسکی پروا کی

(۴) ملک میں ذرائع آمدورفت اور تبادلۂ خیالات اتنے کم ہیں کہ ایک کو دوسرے کی تکلیف کی خبر نہیں ہوتی۔

(۵) خود اہل ملک سست اور غافل ہیں۔

(۶) فوجی طاقت اتنی اور ایسی نہیں کہ ملک پر اُس کا دباؤ پڑ سکے۔

(۷) یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے یہ ملک بہت کچھ محفوظ و مصئون ہے اور ہر شخص کو اطمینان ہے کہ ملک کو زوال نہیں آسکتا۔ پابندیٔ قانون لاحاصل ہے

۱۸۹۸ء میں اسپین اور امریکہ کی لڑائی ہوئی تھی۔ اُسوقت اہالی اسپین کو اپنی حیثیت اور کمزوری پوری طرح پر واضح ہوگئی تھی۔ امید یہ تھی کہ وہ اصلاح حال کرلیں گے۔ کچھ حرکت ذبوحی ہوئی بھی تھی۔ مگر سستی اور غفلت کا بھلا ہو کہ سب کچھ طاق نسیاں کے سپرد ہوگیا۔ پھوس کی آگ تھی کہ یکا یک بھڑکی اور راکھ کا ڈھیر۔ جتنے پولٹیکل راہبر تھے اُن کا نفع ہی اس میں تھا کہ یہ آگ پھر نہ سلگنے پائے۔ رہ گئے مصلحین، بہی خواہان ملک، اُنھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ملک میں کچھ اصلاح کرنا یا کرانا ہے، تو اس کا علاج بذریعہ بغاوت انقلاب ہے۔ اسکے لیے وہ بوجوہ تیار نہ تھے۔ یوں وفتری حکومت کو پھر فتح ہوئی۔

بہرحال جو کچھ بھی ہوا، نتیجہ بُرا نہ نکلا۔ تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، نوجوانانِ ملک کے دلوں میں آگ لگ گئی، اور وہ اپنے ملک کی بہبودی کی طرف مائل ہیں۔ اب کچھ امید ہے تو ان ہی سے۔ امیر عبدالکریم کے مقابلہ میں کچھ کیا تو ان ہی نے، ملک کو اگر کچھ امید رکھنا چاہیے تو ان ہی سے۔

یہ قصہ میری اُمید اور میرے ارادہ سے زیادہ لمبا ہوگیا۔ لیکن اس سے کم از کم یہ ضرور معلوم ہو جائیگا کہ اسپین کی سلطنت نقش برآب ہے اور دُور کا ڈھول۔ اگر ایک عبدالکریم اور پیدا ہوگئے اور اُنھوں نے اس عمارت کو ذرا سا بھی دھکا دیدیا تو یہ سب زمین پر آرہیگی۔ گو یہ یقینی بات ہے کہ اسپانی سلطنتیں ہرگز اسکو گوارا نہ کرینگی کہ مسلمان اس سرزمین پر فاتحانہ قدم رکھکر یورپ پھر کو پھر سرسبز کردے۔ آپس کی رقابتیں بھی اُسوقت بھلا دی جائیں گی، جیسا کہ تجربہ ہو چکا ہے۔ اور جناب پوپ کی مشین اُسی طرح حرکت میں آجائے گی جیسی کہ کئی مرتبہ آچکی ہے۔ مگر خدائے تعالیٰ کی حکمتوں اور قدرتوں کو کون جانتا ہے۔ وہ الذی یحیی الارض بعد موتہا۔ مسلمان تو خود اپنے مرثیہ خوان ہیں۔ یقین ہے کہ وہ

رب الافواج اسی مردہ قوم میں جان ڈال دے۔ اس میں کسی طرح کا کلام نہیں کہ وہاں اگر کسی کو امید فلاح ہو سکتی ہے تو مسلمانوں کو۔ وہاں کے درد کا علاج اگر کوئی ہے تو مسلمان۔ کامیاب ہو سکتے ہیں تو مسلمان۔

مجھ پر ایک بجا اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ میں نے ناظرین کا اتنا وقت ضایع کیا مگر اسپین کا کانسٹی ٹیوشن نہیں بتایا۔ مجھے اپنی ناقابلیت کا اعتراف ہے کہ میں اسکو نہیں سمجھا۔ وہ ہے ہی اتنا معقد بیچیدہ کہ اسکو سمجھنا مشکل ہے اور اس کے بوسیدہ و فرسودہ ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔

محمد خلیل الرحمن

خوابِ طفلی

میں سوگوار غم ہوں اس عہدِ کمسنی کا — جس میں کہ تھا مہیا سامان دل لگی کا
وہ جلوہ ریز راتیں وہ عشوہ بار راتیں — اے زندگی کہاں ہیں وہ خوشگوار راتیں
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

مٹی کی مورتوں سے دل بستگی مجھے تھی — دل جانتا ہے اسکو جو کچھ خوشی مجھے تھی
بچپن کی زندگی کی راحت کہاں ملے گی — ایسی سجی سجائی جنت کہاں ملے گی
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

بچپن کے سیر گل کی پھر مجھ کو جستجو ہے — پھر باغ کی روش پر چلنے کی آرزو ہے
شبنم کی وہ طراوت سبزے کا لہلہانا — وہ اول سحر میں تاروں کا جھلملانا
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

مجھ سے بگڑ گیا ہے عشرت نواز بچپن — یاد آ رہا ہے مجھ کو راحت نواز بچپن

گلہائے عیش سے تھا پُر دامنِ تمنا کیسا ہرا بھرا تھا وہ گلشنِ تمنا
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگِ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

عیش و طرب کے ساماں کیا کیا تھے اس فضا میں تھیں گلشنِ ارم کی رنگینیاں ہوا میں
وہ وجد کا سماں تھا یا عید کا سماں تھا لبریز گل زمیں تھی پُر جلوہ آسماں تھا
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگِ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

اک پل میں ہو گئی وہ بزمِ نشاط برہم عیش و سرور کیسا ہے دل میں درد پیہم
اب اپنی زندگی کا جو گیت گا رہا ہوں یوں اہلِ درد کو تیں دکھڑا سنا رہا ہوں
راحت نصیب دل تھا ڈوبا ہوا خوشی میں
رنگِ طرب بھرا تھا فطرت کی سادگی میں

(اقدس حیدرآبادی
(مرحوم)

کلامِ اعظم

آنکھیں دِکھا کے وہ پسِ دیوار ہو گئے بیمارِ چشم اور بھی بیمار ہو گئے
کانٹے بھی راہِ شوق کے تھے ناوکِ نگاہ تلووں میں چُبھ کے دل کے مرے پار ہو گئے
کیا جلے دل مرا چمنِ روزگار میں جو پھول تھے نظر میں وہ اب خار ہو گئے
کرتے علاجِ دردِ محبت محال تھا بیمار کو وہ دیکھ کے بیمار ہو گئے
آئینہ دیکھ لیجیے آرائشوں کے بعد اب تو کچھ اور ہی مرے سرکار ہو گئے
اب تاک جھانک کی بھی توقع نہ رہ گئی لو بند اُن کے روزنِ دیوار ہو گئے
کیا دل میں اب رہا نہیں اے چارہ گر لہو کیوں خشک میرے دیدۂ خونبار ہو گئے
اے ضعف تو نے جامہ دری سے خجل کیا یعنی ہمارے ہاتھ ہی بے کار ہو گئے
میں اس سے دیکھتا ہوں جھلک حُسنِ یار کی ناسور دل بھی روزنِ دیوار ہو گئے
اِن میں کچھ اور سنگدلی کے سوا نہیں اعظم بتوں سے اس لیے بیزار ہو گئے

اعظم گروی (سابق مدیر

کرشن کنور

— ایک ماخوذ ڈراما —

(ایک ایکٹ میں)

اشخاص ڈراما

(عورتیں)

مہارانی اودیپور	کرشن کنور کی ماں
مہارانی جودھپور	مان سنگھ، بھیم سنگھ کی ماں
چاند کنور	مہارانا اودے پور کی بہن
کرشن کنور	"کشتۂ نعرت عشاق"
لیلا وتی	رانا جے پور کی بہن
چندر کنور	رانا جودھپور کی لڑکی
سیتا	کرشن کنور کی سہیلی
سہیلیاں	
خادمہ	

(مرد)

ہلکر جسونت راؤ	مہاراجہ اندور
سیندھیا	مہاراجہ گوالیار
مان سنگھ	مہاراجہ میواڑ
امیر خاں سنبھلی	نواب ٹونک

+ اس ڈراما میں تاریخ اودھ صفحہ خانی خاں مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ سے مدد لی گئی ہے۔ اس لیے اگر اس کتاب کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بہت بڑا اخلاقی جرم متصور ہوگا۔ (مرتب)

بھیم سنگھ ... ... راجا جودھپور
مان سنگھ ... ... ولیعہد جودھپور
جگت سنگھ ... ... راجا جے پور
ایسٹ انڈیا کمپنی۔
اجیت سنگھ ... ... سردار اودیپور
بہت سے سردار۔
طبیب شاہی اور پروہت
وزیر۔ بخشی۔ نورتن۔
ہرکارہ۔
قاصد۔
حاجب۔
سپہ سالار۔
دکنی رسالہ۔

وقت۔ ۱۸۰۵ء نہایت ۱۸۱۰ء عیسوی
مقام۔ راجپوتانہ

[اپنے والد ماجد ادیب شہیر منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے کے نام پر]

کمپنی بہادر کا آفتاب اقبال عروج پر ہے۔ بھرت پور کے تاریخی اور مشہور قلعہ پر کمپنی کے نشان آویزاں ہو رہے ہیں۔ جنگ میں سچی افواج کو شاندار پسپائی نصیب ہوتی ہے۔ راجہ بھرت پور کو صلح و آشتی کے پیام دیے جاتے ہیں۔ ہلکر بھرت پور سے رخصت ہو کر سندھیا کی طرف عنانِ خیال موڑتا ہے امید سے زیادہ آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ ہلکر تازہ دم جرار فوج لیکر ٹانک کی قابل فخر امارت اور ہلالی پرچم کے ظل حمایت میں دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے۔ پانسہ پلٹتا ہے۔ صلحنامہ لکھنے کی نوبت آتی ہے۔ مالوہ اور دکن کی سلطنتیں واپس کی جاتی ہیں۔ مسلسل لڑائیوں سے ہلکر کو نقصان عظیم ہوتا ہے اور وہ بھی

عزت اسلاف بال بال بچاتا ہوا ہے پور کی مجلس میں قیام کرتا ہے۔ ہلکر قسمت کا دھنی ہے، اپنے تیز بان سے بھی کافی رقم وصول کرتا ہے۔ اس عرصے میں اُسکے اہل و عیال بھی آکر ہے پور کے محل شاہی میں اُس سے ملتے ہیں۔

ایک زرنگار آراستہ کمرہ۔ نیچے کے بڑے دروازہ سے سنگِ موسیٰ کے زینے کا کٹہرا اور پائین باغ کا ایک گوشہ۔ شب کا وقت۔ چاندپوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ ہلکر ہلکر اپنے اہل و عیال سے گفتگو میں مشغول ہے کہ یہ خبر آتی ہے کہ مانسنگھ والی میواڑ ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

منظر اول۔ مجلس اول

ہلکر۔ مان سنگھ۔ منتری۔ نورتن

[ہلکر دلچسپی میں مشغول ہے۔ ایک حاجب آتا ہے]

حاجب۔ اَن داتا! مہاراجہ مان سنگھ والیِ میواڑ تشریف لائے ہیں

ہلکر۔ مہاراجہ مان سنگھ اِسوقت شب میں آئے ہیں؟

حاجب۔ ان داتا۔ مہاراجہ کو کوئی ضروری کام ہے۔

ہلکر۔ اچھا جاؤ بُلا لاؤ۔ شب کے وقت کیا کام ہو سکتا ہے

[ہلکر تنہا رہ جاتا ہے، اُسکے اہل و عیال ہٹ جاتے ہیں۔ راجہ مان سنگھ ہلکر کے منتری و نورتن کے ساتھ شرف باریابی حاصل کرتا ہے اور ہلکر استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے]

ہلکر۔ مہاراجہ صاحب تشریف لائیے۔ مزاج تو اچھا ہے۔ کہیے شب میں کیسے تکلیف کی ——— خیریت؟ کوئی ضروری کام؟

مان سنگھ۔ مہاراج۔ اسوقت ایک ضروری کام سے حاضر ہوا ہوں، اجازت ہو تو عرض کروں

ہلکر۔ مہاراج شرمندہ نہ کیجیے۔ میں خانہ بدوش ہوں، آپ راج گدی کے مالک ہیں ——— اسکے علاوہ بھی آپ میرے محسن ہیں۔ کیونکہ آپ میرے بال بچوں کو میرے پاس واپس لے آئیے ——— جلد فرمائیے میں کس طرح آپ کی خدمت کر سکتا ہوں ——— آپ کا احسان بڑا ہے۔

مان سنگھ ——— مہاراج آپ تلک دھاری ہیں، شرمندہ نہ کیجیے۔ اس سے اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے سہائتہ کی پرارتھنا کروں ———

ہلکر ——— مہاراجہ تبلائیے کس کے خلاف فوج کشی کا ارادہ ہے؟ کیا کمپنی بہادر کے؟

مان سنگھ ——— نہیں ——— راجہ جے پور کے

ہلکر ——— پرماتما ——— کیا سن رہا ہوں ——— مہاراج کس کے خلاف؟

مان سنگھ ——— مہاراج، جگت سنگھ والیِ جے پور کے خلاف!

ہلکر ——— کیا محسن کشی جائز ہے؟

مان سنگھ۔ کیا وعدہ خلافی جائز ہے؟

ہلکر ——— نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ تلک دھاری کی بات پلٹ نہیں سکتی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میری سہایتہ کی ضرورت کیوں پیش آئی ——— ؟

مان سنگھ۔ ——— مہاراج آپ کو معلوم ہوگا کہ مہاراناؤدے پور کی ایک لڑکی حسن میں لاثانی ہے۔ اس سے مہاراجہ جودھپور کو عشق ہوگیا ہے۔ اور مہاراج جے پور بھی اسی فکر میں مبتلا ہیں ——— بس اتنی حقیر شے آپ سے میں طلب کرتا ہوں ——— کیا آپ اس سیری پرارتھنا کو ٹھکرا دیں گے!!

ہلکر (قہقہہ لگا کر) جے پور کے خلاف امداد! لڑائی بھی کیسی پوتر۔ محسن کشی و وعدہ خلافی ہلکر کے شایانِ شان نہیں ——— میں مہاراج آپکے غیر متوقع "صلہ" کو سنکر ششدر ہوں

[دربار میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ یہ خبر لمحات میں ماشیہ نشینانِ سلطنت راجہ جے پور کو پہونچاتے ہیں جے پور کا راجہ ہلکر کو رقم مطلوبہ سے کہیں زیادہ رقم دے کر جان بچانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر۔ ہاتھی لکھے ہزار پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ ہلکر کا اب بھی وہ دبدبہ ہے کہ اسکی امداد پیشوا کا راناؤدے پور کا اصرار کر رہا ہے ——— ہلکر خود پس و پیش میں ہے کہیں محسن کشی کہیں وعدہ خلافی اور کبھی مطلوبہ رقم میں اضافہ مزید کا دلفریب تخیل، اور کبھی راناؤدے پور جودھپور اور مہاراجہ جے پور کی آرزوؤں کا خیال ——— کچھ سوچ کر مان سنگھ سے کہتا ہے]

"..... رانا، آپ کا مطالبہ بہت ہی اہم ہے، آپ کی سرفروشانہ خدمات میرے سر آنکھوں پر ہیں۔ میں بات کا دھنی ہوں، آپ کا سوال یقیناً پورا ہوگا۔ پر تو اس میں آپ کچھ تبدیلی

بھی پسند کریں گے ——— ؟

مان سنگھ - راجپوتی خون میری رگ وپے میں دوڑ رہا ہے - کیا ایک چھتری بلواں اپنی بات سے پلٹ جائے - جان جائے لیکن آن نہ جائے "

[پھر چند لمحات کے لیے سناٹا چھا جاتا ہے]

ہلکر ——— شاباش مہاراجہ شاباش - میں تمہاری ہمت کا امتحان لینا چاہتا تھا - آپکا قول پورا ہوگا - (تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھکر) اس قسم کھاتا ہوں آپ کی بات پوری ہو کر رہیگی - پر تو ایک شرط ہے میری اس شرط کو آپ بھی منظور کریں گے ——— ؟

مان سنگھ ——— مہاراج - شوق سے فرمائیے ——— ؟

ہلکر ——— صرف یہی کہ کچھ مہلت دیجیے

مان سنگھ ——— مہاراج منظور ——— [مان سنگھ ، منتری و نورتن جاتے ہیں]

[اس مکالمہ کے بعد دربار برخاست ہوتا ہے اور ہلکر اپنے دربار میں تنہا متفکر رہ جاتا ہے]

منظر دوم مجلس دوم

[حضرت سکراتی ہے اور ہلکر متفکر خیمہ میں داخل ہوتا ہے - پریشانیوں اور شکست کی وجہ سے وہ رسالہ کو برخاست کرنا چاہتا ہے - اس خبر سے بغاوت کے اثرات رونما ہوتے ہیں - باغی جماعت ہلکر کے برادر زادہ کو راجگدی کے سبز باغ دکھاتی ہے اور ہلکر کو شیاری سے انکار کر دیتا ہے - ہلکر کو خبر ملتی ہے وہ اُس رقم سے جو جیپور سے ملی ہے بغاوت کو فرو کرتا ہے اور قومی بغاوت سے فائدہ اُٹھا کر اپنی رہی سہی حالت درست کرنے کے بہانہ سے طرفین کی امداد سے انکار کر دیتا ہے - جے پور سے روانہ ہو جاتا ہے - اسوقت ایک شاداب دامن کوہ میں خیمہ زن ہے - اس وقت راجستان کی سیاسی بساط پر ایک نیا مہرہ امیر خاں سنبھلی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے - امیر خاں کے ہلکر پر بہت کچھ حقوق ہیں - اس بغاوت سے وہ بھی مستفید ہونا چاہتا ہے - اس وقت وہی ہلکر سے ملنے آیا ہے - اور ہلکر کو اُسکا دیرینہ وعدہ یاد دلاتا ہے]

(ایک شخص امیر خاں کے آنے کی اطلاع کرتا ہے)

امیر خاں : ہلکر : سپہ سالار

ایک شخص - مہاراج ! امیر خاں سنبھلی ملاقات کرنا چاہتے ہیں -

ہلکر ——— اں ہاں ، فوراً بلا لو ——— [نوکر جاتا ہے اور امیر خاں آتا ہے]

امیر خاں ، ہلکر ، سپہ سالار

ہلکر دوست کیا بتائیں، آجکل پریشان ہیں ـــــ تم نے بھی وقت پر ساتھ چھوڑ دیا۔
ـــــ کاش ـــــ

امیر خاں۔ خیریت؟ کیا ہوا۔ کمپنی بہادر سے کیا پھر چھڑی! کیا ہوا؟

ہلکر۔ دوست کیا بتائیں۔ دکنی رسالہ کو برطرف کرنا چاہا تھا، بدامنی پھیل گئی ہے ـــــ پریشان ہوں ـــــ لوگ دوسرا راجہ مقرر کرنا چاہتے ہیں ـــــ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ جس قدر رقمیں جے پور سے ملی تھیں سب اسی مد میں صرف ہوگئیں۔

[وہی شخص دوبارہ اندر آتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ سپہ سالار صاحب تشریف لائے ہیں۔ ایما پاکر سپہ سالار کو اندر لاتا ہے]

ہلکر۔ سپہ سالار صاحب کیسے کیا ہوا ـــ سب کو توپ دم کرا دیجیے۔

سپہ سالار۔ آن وآنا کا بول بالا رہے۔ سرکار کے اقبال سے بدامنی دور کردی گئی ہے ـــــ کچھ فکر کی بات نہیں ہے ـــــ

ہلکر (خوش ہوکر) میں بہت خوش ہوں۔ جاؤ منتری سے ایک جاگیر لے لو

[سپہ سالار خوش ہوکر سلام کرتا ہوا خادم کے ساتھ باہر جاتا ہے]

امیر خاں۔ مبارک۔ مہاراجہ صاحب مبارک۔ فرمائیے، کچھ ہماری خدمات کا بھی صلہ دلوائیے گا

ہلکر۔ دوست۔ میری حالت سے واقف ہو۔ پھر بھی جو کچھ میرے امکان میں ہوگا اُس سے دریغ نہ کروں گا ـــــ بولو ـــــ

امیر خاں۔ حضور کی یہ (ایک تحریر پیش کرتے ہوئے) تحریر موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ہلکر (تحریر پڑھ کر) منظور ہے۔ امیر خاں تمہاری لازوال، بے ریا، مخلصانہ سرفروشیوں کے صلہ میں ٹونک کی جاگیر مع خراج کوٹہ تم کو عطا کی جاتی ہے۔ لیکن ـــــ

امیر خاں۔ مہاراج۔ اگر آپ اپنے وعدہ کا ایفا کرسکتے ہیں، تو پٹھان بھی اپنی بات سے نہ ٹلے گا۔ مہاراج کہیے ـــــ تکلف نہ کیجیے

ہلکر (اٹک اٹک کر) لیکن ـــــ شرم معلوم ہوتی ہے ـــــ امیر خاں تم میرے دوست ہو تم میرے ہزاروں رازہائے پنہاں سے واقف ہو اس لیے تم سے یہ واقعہ بیان کرتا ہوں میں نے مان سنگھ راجہ سیوائے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں انکی امداد راجہ جے پور کے خلاف کروں گا ـــــ لیکن تم جانتے ہو، جے پور کا میں مہمان رہا ہوں، اُس نے مجھے

بغاوت فرو کرنے کے لیے رقم دی تھی ——— کس طرح اُسکے خلاف ان سنگھ کی مدد کر سکتا ہوں۔
سُنا امیر سُنا ——— سمجھ گئے ———

امیر خاں - سمجھا ——— کیا میں ان سنگھ کی امداد سے اودیپور کی لڑکی جودھپور کے راجہ ان سنگھ کو دلواؤں؟

واہ امیر خاں، خوب سمجھے ——— میں نے کہا بھی نہیں تم خود ہی سمجھے
بس یہی لیکن ——— کے بعد میں کہنا چاہتا تھا لیکن شرم سے زبان سے یہ الفاظ ادا نہ ہوتے تھے - میں موقع و وقت کو تلاش کر رہا تھا، میرے دل میں سچ مانو امیر خاں یہ خیال اُس ٹوٹے ہوئے تیر کی طرح کھٹک رہا تھا جو قلب کے اندر رہ گیا ہو ——— میں وعدہ کرکے مکر رہا ہوں ——— امیر خاں واقعی تم میرے دوست ہو

امیر خاں ——— مہاراج ——— فکر نہ کیجیے دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔

[امیر خاں جاتا ہے]

منظر اول - مجلس سوم

[مہاراناؤدیپور اپنے عالیشان محل میں موجود ہیں۔ کرشن کنور کی نسبت کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے]

چاند کنور - مہاراناؤدیپور - مہارانی اودیپور

مہارانی - مہاراج - آخر میں کہتی ہوں۔ کرشن کنور کا بیاہ کب رچے گا۔

چاند کنور - مہاراج - اب، تو کرشن کنور سولہ برس کی ہوگئی ہے کیا عمر بھر بٹھا رکھیے گا - بھابھی سچ تو کہتی ہیں - کنیا کا دھن ہی بُرا ہوتا ہے - آخر آپ نے بھی کچھ سوچا؟ کہیں سے کوئی بات چیت ہوئی؟

مہارانی - چاند کنور، بات چیت کا کیا کہنا جس گھر میں بیری ہوتی ہے وہاں ڈھیلے آتے ہی ہیں۔ جودھپور سے پیام سلام ہوئے ہیں ———

مہاراناؤدیپور - تم سچ کہتی ہو، میں بھی اکثر یہی سوچتا رہتا ہوں - کرشن کنور کا اب بیاہ رچانا چاہیے اب تم ہی بتلاؤ کہ کس کے ساتھ کرشن کنور بیاہی جائے ———

چاند کنور - میں نے مہاراج بھیم سنگھ جودھپور والے کی بڑی تعریف سُنی ہے - میرے خیال میں تو کرشن کنور کو جودھپور کے سنگھاسن پر بیٹھنا چاہیے، یوں جو مرضی بھابھی کی ———

مہارانی ——— میری رائے تھا کیا، تم لوگ سوچ بچار کرکے طے کرلو ویسا انتظام کیا جائے مہاراج بھی تو اپنی منشا بتلائیں ———

مہاراج - میری منشا تو سچ پوچھو بھیم سنگھ ہی کی ہے ——
چاند کنور - مہاراج میرا دل تو یہی چاہتا ہے ——
مہارانی - پھر پروہت کو بلا کر جنم پترا وغیرہ دکھا لیجیے -
چاند کنور - مہاراج یہ سب اُتم ہے - پروہت جی کو بلا لیجیے -
[چاند بائی خادمہ کو پکارتی ہے اور منتری کو بلانے کے لیے کہتی ہے]
مہاراج - چاند کنور تم کو بہت جلدی ہے - دیکھو اس بیاہ کا سہرا چاند کنور ہی کے سر رہیگا - پرمیشور نجام اُتم کرے -
مہارانی - بھگوان چاہیں انجام اچھا ہی ہوگا —— [منتری آتا ہے]
منتری - آن داتا، حکم ؟
مہاراج - منتری جی، یہ طے پایا ہے کہ مہاراج بھیم سنگھ کے ساتھ ہماری راجکماری کرشن کنور کا سمبندھ کیا جائے - آپ پروہت کو بلا کر جنم پترا، کنڈلی سب بچار لیجیے اور ایک خط مہاراجہ بھیم سنگھ کی ماں کو لکھ دیجیے کہ انکی بات پکی ہوگئی ہے اور فلاں فلاں مہینے میں پرمیشور چاہیں یہ سمبندھ ہو جائے گا -
منتری - آن داتا ایسا ہی ہوگا -
[منتری باہر جاتا ہے اور چاند کنور بھی چلی جاتی ہے مہاراجہ اور مہارانی میں انتظامات کے متعلق گفتگو ہوتی ہے]

منظر اول مجلس سوم

اودے پور کی حور نژاد، راجکماری کرشن کنور حسن و جمال کا مجسمہ تھی - اُسکو دیکھ کر زنانہ ناضیہ کی ہونہار پدمنی، شکنتلا اور چندر کنور کی یاد تازہ ہو جاتی تھی - اُس کا نازک بدن، لانبے گیسو، شہابی رنگ، گھنی بھویں، سیاہ آنکھیں، رخساروں کی ارغوانی رنگت، ارباب کیف کے لیے کافی دلچسپی کا سامان تھا - اُسکے حسن خداداد کے افسانے نسیم سحری کے دوش پر دُور دُور پہونچ چکے تھے، اور شعرا کے دواوین ثنا خوانی کی وجہ سے کرشن کنور کے عالم سوز و محشر آفرین حسن سے مملو تھے —— چنانچہ اسوقت مہاراجہ بھیم سنگھ خوش ہے کہ راجپوتانہ کی سب سے زیادہ حسین عورت اسکی انیس عشرت بننے والی ہے -

بھیم سنگھ - مہارانی جوہر بھیم

بھیم سنگھ - ماتا جی - آپ نے کس کام کے لیے آج بُلایا ہے - میں ابھی شکار میں جا رہا تھا -

مہارانی ۔ مہاراج اودے پور سے پتّر ہو گیا
بھیم سنگھ (بیتاب ہو کر) اودے پور سے ! پتّر آگیا ؟
مہارانی ۔ ہاں مہاراج پتّر آگیا ۔ میں تم کو آشرباد دیتی ہوں
بھیم سنگھ ۔ ماتا جی ۔ مہاراج اودے پور نے کیا لکھا ؟
مہارانی ۔ مہاراج انکو منظور ہے
بھیم سنگھ (خوشی میں) منظور ! منظور !! کب تک ؟
مہارانی ۔ یہ کچھ نہیں لکھا ہے ۔ پر وہ ماتا جی سے بچار کر وقت مقرر کرینگے ۔ اسی لیے میں نے اس قدر سویرے تم کو تکلیف دی تھی ۔ جاؤ پھولو پھلو ۔
بھیم سنگھ (ماں کے قدموں پر سر رکھتے ہوئے) ماتا جی ، میں آپ کی ان کوششوں کا کیا بدلہ دے سکتا ہوں ۔
مہارانی ۔ تم نے میرے دودھ کا کیا بدلہ دیا ہے ۔ جاؤ بھیم جاؤ ، ماتا کی محبت کا کوئی صلہ نہیں ہوتا ۔ جو کچھ کیا میں نے اپنا حق سمجھ کر کیا ۔ جاؤ سر اٹھاؤ ۔ میرے شیر (ہاتھوں سے سر اٹھا کر اپنے سینہ پر رکھ لیتی ہے) میں آشرباد دیتی ہوں ہمیشہ خوش رہو ، پھولو پھلو ۔ [مہارانہ بھیم سنگھ جاتا ہے]

منظر اول مجلس چہارم

کرشن کنور ۔ سیتا ۔ سہیلیاں

راجکماری اودے پور ایک آراستہ کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے ۔ اسکے چاروں طرف سہیلیاں جمع ہیں ۔ وہ سب راجکماری کو چھیڑتی ہیں ۔ راجکماری شرمندہ ہوتی ہے ۔ آخر میں گانا شروع ہوتا ہے ۔

سیتا ۔ راجکماری صاحبہ مبارک ۔
دوسری سہیلی ۔ راجکماری صاحبہ مبارک ۔
تیسری ۔ جودھپور کی رانی ہونا مبارک ۔
چوتھی ۔ ہاں میں تو بھول گئی تھی ۔ مبارک ۔ رانی ہونا مبارک ۔
پانچویں ۔ مبارک ہو مبارک بھیم سنگھ کی پدمنی مبارک ۔

سب سہیلیاں ۔ ہاں ہاں مبارک مبارک ۔ راجکماری صاحبہ مبارک ۔
واج کماری ۔ کیا مبارک مبارک لگا رکھی ہے (شرمندہ ہوکر) کوئی اور کام نہیں ہے ۔ ہٹو جاؤ ۔ واہ
ہر وقت دق کرتا ۔ میں اماجی سے کہہ دونگی ۔ سیتا تم نے کہاں کی ڈائنوں کو بلا لیا ہے
(آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر جھینپتے ہوئے)
راجکماری صاحبہ ۔ خفا نہ ہوجیے ۔ مبارک باد ایسے ہی دی جاتی ہے ——— پرمیشور
کریں آپ جو دیپور کی رانی ہوں ——— ہم لوگوں کے بھی دن پھر جائیں ۔
سب سہیلیاں ۔ راجکماری صاحبہ مبارک ۔ مبارک ۔
[آہ ۔ قدرت کھڑی سر ہانے مسکرا رہی ہے ۔ طرفین کی مہر جواز "محضر نسبت" پر ثبت ہو چکی
ہے ۔ صرف وقت کی موزونیت کا انتظار ہے ——— اور طرفین اس غمناک متلاطم نغمہ کو کرشن کنور
کے پردہ میں مضراب حیات پر سننے کے لیے ہمہ تن تیار ہیں ۔ وہ نظرت انگیز سنانے والی ہے]
سیتا ۔ اچھا بہنو! ہم سب مل کر ایک مبارک باد گائیں ۔ راجکماری کو خوب دق کریں ———
ابھی تو موقع ملا ہے ۔
سب ۔ مبارک ۔ راجکماری صاحبہ مبارک [گانا ہوتا ہے]

منظر اول مجلس پنجم

منتری ۔ رانا بھیم سنگھ ۔ مہارانی ۔ طبیب شاہی ۔ مان سنگھ
[رانا بھیم سنگھ بہت سخت علیل ہیں ۔ مہارانی سرہانے ہے ۔ طبیب شاہی موجود ہے]
مہارانی ۔ حکیم صاحب تبلائیے میں بہت پریشان ہوں ۔ میرے بھیم کا کیا حال ہے ——— جلدی کیجیے
کیا آپ ماں کی ممتا سے واقف نہیں ہیں ——— بولیے جلدی بولیے
حکیم ۔ مہارانی صاحبہ ۔ آپ واقف ہیں کہ مرض خطرناک ہے لیکن انشاء اللہ مہاراجہ اچھے
ہو جائیں گے ——— مگر نہ کہیے ———"
مہارانی ۔ کوئی ناامیدی کی بات تو نہیں ہے ؟
حکیم ۔ میرے خیال میں ذرا بھی نہیں ——— [منتری طبیب سے علیحدہ دریافت کرتا ہے]
منتری ۔ حکیم صاحب تبلائیے کیا حال ہے ۔ زندگی کی آس ہے یا نہیں ؟
حکیم صاحب ۔ منتری صاحب سچ پوچھیے تو یہ مرض لاعلاج ہوگیا ہے زندگی کی امید کم ہے ——— (روتے ہوئے)

منتری　کیا واقعہ ہے؟
حکیم صاحب　یہ مذاق کا کونسا موقعہ ہے؟
منتری　کیا میں راجہ مان سنگھ ولی عہد کو اطلاع دیدوں؟
حکیم صاحب　——— ضرور ——— علالت کو آج دو ماہ ہو گئے ——— اب تو چند گھنٹوں کا معاملہ ہے ——— خدا کرے بچ جائیں۔ میں تو یہی دعا کرتا ہوں ——— خدا میری سُن لے۔ ایسا راجہ تو جودھپور میں اب نہ ہوگا ———
مہارانی　حکیم صاحب۔ میرا بھیم کیا ہو گیا؟ ——— دوا دیجئے
بھیم سنگھ　(رُک رُک کر) اب۔ کیے۔ کیے۔ کیا فائدہ۔ وقت۔ وقت پورا ہو گیا۔
(مہارانی رونے لگتی ہے)
حکیم صاحب　فکر نہ کیجیے، انشاء اللہ اچھے ہو جائینگے۔ ضعف بہت ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔
[مان سنگھ و بھیم۔ جودھپور آتا ہے]
حکیم صاحب۔ راجکمار صاحب۔ مزاج اچھا ہے۔
راجکمار۔ ہاں۔ یہ تو کہیے، کیا حالت ہے؟ مہاراج کیسے ہیں؟
[اسی عرصہ میں بھیم سنگھ کو استغراق ہوا]
مہارانی۔ مان سنگھ! دیکھو مہاراجہ کو کیا ہوا ہے؟ (مہارانی رونے لگتی ہے)
مانسنگھ۔ تاتا جی، میں بھی تو یہی دیکھ رہا ہوں ——— (وہ بھی روتا ہے)
بھیم سنگھ۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) تاتا جی، تاتا جی ——— (کہتے ہوئے ہچکی آئی ———)
تاتا جی، تاتا جی ——— (دوبارہ ہچکی آئی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا)
[رو پیٹ گیا۔ خبر شہر میں ہو گئی]
بھیم سنگھ مہاراجہ جودھپور چل بسے، ولیعہد مان سنگھ راجگدی پر بیٹھ گئے ———

منظر اول مجلس ششم

کرشن کنور، سینا، سہیلیاں

شب کے تین پہر گزر چکے ہیں۔ چاند اپنے انتہائی جمال و کمال سے کائنات کو معجزۂ ربانی سے جگمگا رہا ہے۔ قلعۂ جودھپور کی فراز گاہ "کرشن کنور" پائیں باغ میں غیر معمولی، منتظر و سراسیمہ بیٹھی ہے

اسکے پریشان کھلے ہوئے بالوں سے فرشتہ تجلی (قمر) کی زریں شعاعیں شوخیاں کر رہی ہیں اور نسیم سحری کے خوش آیند سرد و لطیف جھونکے ساری کے آنچلوں سے اٹکھیلیاں کر رہے ہیں ——— کرشن کنور چاندنی میں سر جھکائے ستار پر نغمہ سنجی شروع کرتی ہے ——— اُسکی آواز میں بلا کی کشش ہے کہ جملہ حاضرات محو ہیں۔ ایک عجیب و غریب سکون فضائے لطیف میں جاری و ساری ہے۔ گویا معلوم ہو رہا ہے کہ ایک ساحرہ سحر کر رہی ہے اور اُسکے اثر سے کائنات کی روحیں جامد و ساکت ہو گئی ہیں

دفعتاً وہ بے اختیاری سے مسکراتی ہے ——— اُسکے صاف موتی سے زیادہ آبدار دانت بہت شان و شوکت سے چمکتے ہیں ——— حاضرات کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحہ سطحی لہر بجلی سی کوند جاتی ہے ——— آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ العظمۃ للہ۔ کہیں حسن کے دیوتا نے تو اوتار نہیں لیا ہے!

کرشن کنور سیتا سے کہتی ہے]

"سیتا" "سیتا" ——— کچھ سُنا؟

سیتا راجکماری، حکم؟

کرشن کنور سُنو ——— (کہتے کہتے آنسو جاری ہو گئے)

سیتا راجکماری، کچھ کہیے بھی کیا ہوا؟ خیر ہے؟

سہیلیاں۔ اسی لیے تو رانی جی آدھی رات کو باغ میں آنے سے منع کرتی ہیں۔ ہوا کیا ———

شاید کسی چھپی کا سایہ ہو گیا

سیتا ——— خاموش رہو ——— راجکماری بولیے کچھ ——— تو میں جا کر رانی جی کو خبر کرتی ہوں ——— [جانے لگتی ہے۔ راجکماری پکڑتی ہے]

کرشن کنور (روتے ہوئے سسکیاں لیکر) میں اسی لیے تم لوگوں کو منع کرتی تھی کہ زیادہ خوشی نہ کرو ——— دیکھا ——— (روکر) ——— انجام ——— مہاراج ——— سُرگباش ہوئے

[سب سہیلیاں مغموم ہو کر کرشن کنور کے ساتھ غم میں شریک ہوتی ہیں]

اب سنا ہے ان سنگھ ——— کا پتر آیا ہے ——— کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ———

مہاراج بیکنٹھ باشی کے بعد ——— جودھپور کے سنگھاسن پر راج کروں؟

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ——— کبھی نہیں۔ میں جودھپور کبھی بھی نہ جاؤنگی

چاہے ادھر کی سنسار اُدھر ہو جائے ——— کیا راجستان کی دیویاں میرا ٹھٹھا نہ کریں گی ———

سیتا ۔ مہاراناکے گزر جانے کا ہم سب ہی کو افسوس ہے ۔ اُنکے بعد ——— جودھپور جانا بہت بے غیرتی ہے ۔ ایسے جوراجا رانی چاہیں ——— ہوگا وہی جو ایشور چاہیں ۔

کرشن کنور ——— تم کل پتاجی کو میرا یہ سندیس ضرور پہونچا دینا ۔

سیتا ——— کل میں نے رانی چاند کنور سے سُنا ہے کہ مہاراج جگت سنگھ کا بھی کوئی پتر آیا ہے ۔ سنا ہے مہاراج بلینٹھ باشی کے بعد اس راجستان میں مہاراج جگت سنگھ سا سندر سجیلا سورما دوسرا نہیں ہے ۔ ———

کرشن کنور ——— "میں اپنی جان سے عاجز آگئی ہوں ——— کچھ ہوئیں جودھپور نہ جاؤنگی ——— چاہے پران جائے ۔ سیتا ۔ سیتا ، سنو ——— یہ کُتے اسوقت کیوں بھونک رہے ہیں ——— میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے ——— رام خیر کرے کچھ آثار اچھے نہیں ہیں ———"

سیتا راجکماری آپ ان وسواسوں کا چنتا نہ کیجیے ——— اب آپ محل میں چلیں ——— (سورج کا ستارہ دکھلیے (اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) نکل آیا ہے ——— چلیے ——— محل میں چلیے ——— آپ فکر نہ کیجیے ۔ میں یہ سندیس مہاراجہ کو بھور ہوتے ہی پہنچا دونگی ۔

کرشن کنور ——— سیتا جاؤ ——— نہیں ، سہیلو تم جاؤ ——— سیتا تم سے باتیں کرتی میں ساتھ چلونگی ———

[خوبصورت مجمع منتشر ہوگیا ۔ گو ستاروں کا جھمگٹ غائب ہوگیا اور ماہتاب چمکنا شروع ہوا]

[کرشن کنور اور سیتا ، دونوں پر محل کو گفتگو کرتی ہوئی چور دروازہ سے محل میں داخل ہو جاتی ہیں]

(پردہ)

منظر دوم ۔ مجلس اول

[مہاراناجودھپور کے انتقال سے اُدے پور میں تہلکہ پڑگیا ——— مہاراجہ جے پور اور مہاراجہ جودھپور (جانشین) نے پیامات دیے ۔ یہی نہیں بلکہ سندھیا کی امداد ان سنگھ مہاراجہ جودھپور نے حاصل کی ، اور جے پور نے امیر خاں نواب ٹونک کی امداد سے ایک دوسرے پر چڑھائی کردی ۔ ان سنگھ کو شکست ہوئی ۔ راج پاٹ چھن گیا ۔ دوبارہ امیر خاں نے ہلکر کے قبال سے ان سنگھ کا ساتھ دیا ، راجگدی دوبارہ ملی ——— اسوقت مہاراجہ اودیپور دربار میں جلوہ افروز ہیں ۔ اُنکے وزراء اور ارکان دربار ۔

میں موجود ہیں - مہاراجہ جودھپور کا خط قاصد لاتا ہے]

وزیر - مہاراناؤدیپور - مان سنگھ مہاراجہ جودھپور کا خط

مہاراناؤ - مہاراناؤ جودھپور کی موت نے میرا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا - سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے - مہاراجہ جے پور کا پیام آیا ہے - خیال ہوتا ہے منظور کر لیا جائے - راجپوتانہ میں بھیم سنگھ کے بعد مہاراجہ جگت سنگھ کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے -

وزیر - بجا، درست - مہاراجہ جگت سنگھ کا کیا کہنا - چندرمان ہیں -

[مہاراجہ جودھپور کا خط لے کر قاصد آتا ہے]

وزیر - اَن داتا - بڑا غضب ہوا

مہاراناؤ - ——— کیا ——— ؟

وزیر - مہاراجہ مان سنگھ کا یہ پتر آیا (دکھا کر پڑھتے ہوئے) ہے اس میں تو ایک عجیب بات لکھی ہے

مہاراناؤ - پڑھو کیا بات ہے میں بھی تو سنوں ——— کیا لکھا ہے -

وزیر - (پڑھ کر) "اجکماری کرشن کنور کی نسبت جودھپور کے سنگھاسن سے ..... ہوئی تھی بھیم سنگھ سے نہیں ہوئی تھی - اب میں سنگھاسن پر ہوں، اس لیے میرا سنبندھ کرشن کنور سے ہوگا"

مہاراجہ - بتلاؤ - میں کیا کروں - یہ معاملہ عجیب مشکل ہو گیا ہے

وزیر - کچھ اور بھی میں نے سنا ہے، رام کرے جھوٹ ہو!

مہاراج - کیا ——— کہو ———

وزیر - میں نے سنا ہے کہ مان سنگھ نے مہاراجہ سندھیا سے سیاہنہ مانگی ہے ——— اور اَن داتا مہاراج جے پور نے نواب ٹونک امیر خاں سے مدد مانگی ہے اُنکی فوج تو جے پور سے چل چکی ہے

مہاراج - اس معاملہ میں کیا کروں ——— جودھپور کو کیا جواب دوں ——— مشکل یہ ہے کہ کرشن کنور بھی جودھپور جانے کے لیے اب تیار نہیں ہے ——— اچھا انکار لکھدو ——— دیکھا جائے گا جو کچھ ہو ———

وزیر ——— جواب لکھ دوں ——— سخت خونریزی ہوگی - ہزارہا راجپوت سورما قتل ہوں گے - ریاستیں برباد ہو جائیں گی - ہزارہا بچے یتیم ہونگے ——— ہزارہا پتی برت استریوں کے سہاگ ٹوٹیں گے ——— جواب لکھدوں - میرے ہاتھ میں قلم ہے جو حکم ہو لکھ دوں ———

[ایک ہرکارہ خبر لاتا ہے کہ جے پور اور جودھ پور کی فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی]

مہاراج ——— لکھ دو ——— انکار۔ [قاصد جاتا ہے]

منظر دوم مجلس دوم

امیر خاں ۔ جگت سنگھ ۔ مان سنگھ

قاصد رانا اودیپور کا جو لب لیجا تا ہے ۔ مان سنگھ کے غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی ۔ جے پور کے شبستان شہی کا ایک اس "پیکر ادا" کی خبر فضائے حسن سے اڑ کر پہونچی ۔ راجہ جگت سنگھ اس پیکر حسن کا دیوانہ عاشق ، اس عشق و عاشقی کا قصہ جے پور کے شبستان شہی سے باہر نکل کر اودیپور کی تنگ و تاریک گلیوں سے گونجتا ہوا مہاراجہ اودیپور کے کانوں تک پہونچا ——— کرشن کماری کو بھی علم ہوا جودھپور کے مقابلہ میں جے پور کو ترجیح دی گئی ——— تغیر رنگ لایا ——— رقابت کی خوفناک آگ ان سنگھ کے سینے میں بھڑکی ——— دونوں سلطنتیں حسن و عشق کی جنگ نے گھیر میں مصروف ہوگئیں ۔ نواب امیر خاں سرپنچ مقرر ہوئے ——— [امیر خاں نواب ٹونک کا دربار ہے جو بحیثیت حکم اپنا فیصلہ صادر کرنے والا ہے ۔ تمام والیان ریاست یا انکے نمائندے دربار میں موجود ہیں]

امیر خاں ۔ راجہ جگت سنگھ ۔ کیا میں نے آپ کی مدد کی تھی ؟

جگت سنگھ ۔ ضرور ۔

امیر خاں ۔ راجہ مان سنگھ ۔ کیا میں نے آپ کی مدد کی تھی ؟

مان سنگھ ۔ راجگدی آپ ہی کی کرپا سے ملی ۔

امیر خاں ۔ آپ دونوں میری بات مانیں گے ؟

جگت سنگھ ۔ میں تو آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں

مان سنگھ ۔ میں تو احسانمند ہوں

امیر خاں ۔ بس میری خوشی یہی ہے کہ آج سے لڑائی ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے ——— کیا آپ لوگ منظور کریں گے ؟

جگت سنگھ ۔ منظور

مان سنگھ کوئی شرط ؟

امیر خاں - راجہ مان سنگھ - آپ کی لڑکی کا کیا نام ہے ؟
مان سنگھ - (حیرت سے) چندر کنور
امیر خاں - راجہ جگت سنگھ، آپ کی بہن کا کیا نام ہے ؟
جگت سنگھ (متعجب ہوکر) لیلا وتی -
امیر خاں - ان لڑکیوں کے متعلق جو کچھ میں کہوں، آپ دونوں کو منظور ہوگا ؟ وہ یہ کہ جے پور کے راجہ کی شادی راجہ جودھپور کی لڑکی سے ہو ـــــ اور راجہ جودھپور کی شادی لیلا وتی سے ـــــ کیا آپ کو منظور ہے ؟
جگت سنگھ - مجھ کو جودھپور سنگھاسن کو اپنی بہن دینا منظور ہے
مان سنگھ - مجھ کو بھی منظور ہے -
امیر خان - میرا فیصلہ یہی ہے - اب آپ لوگ اسی پر قائم رہیے - یہ وہ رابطۂ اتحاد ہوگا کہ آیندہ نسلیں مجھ کو دعاؤں سے یاد کریں گی اور کبھی بھی ان دونوں سلطنتوں میں جنگ نہ ہوگی - میں دعا کرتا ہوں کہ آپ لوگ خوش و خرم رہیں .....
مان سنگھ - یہ تو سب ہوا، لیکن کرشن کنور کا کیا مشیر ہوگا ؟
امیر خاں - راجہ صاحب آپ کو اس معاملہ میں بولنے کا حق نہیں ہے - لیکن یہ خیال رکھیے کہ اس ناٹک کا آخری عبرتناک انجام وہی ہوگی -
[دربار برخاست ہوتا ہے مان سنگھ اور جگت سنگھ معانقہ کرتے ہیں اور باہر چلے جاتے ہیں]

منظر دوم - مجلس سوم

مہاراجہ اودے پور کا دربار ہے - ایک وفد سردار اجیت سنگھ کی سرکردگی میں امیر خاں کے بھڑکانے بھڑانے سے مہاراجہ سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کرشن کنور کو زہر دیدیا جائے، ورنہ ریاست میں بغاوت پھیل جائے گی ـــــ اودے پور پر سارا راجپوتانہ حملہ کریگا ـــــ مہاراجہ خوفزدہ ہوکر امیر خاں کے اس نسخے پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہوگیا

مہاراجہ اودے پور - سردار اجیت سنگھ - دیگر سردار - چاند کنور - کرشن کنور
[ایک ہرکارہ وفد کی آمد کی اطلاع دیتا ہے]
ہرکارہ - ان داتا - سردار اجیت سنگھ کچھ سرداروں کو لیکر آپ سے ملنے آئے ہیں ـــ

مہاراجہ ——— بلاؤ ——— [ہرکارہ جاتا ہے۔ اور وفد کو بلا کر لاتا ہے]

مہاراجہ۔ سردار اجیت سنگھ۔ آج کیسے آئے؟

اجیت سنگھ۔ بہت ضرورت تھی۔ حکم ہو تو عرض کروں؟

مہاراجہ۔ ضرور۔ شوق سے بیان کرو ———

اجیت سنگھ۔ مہاراجہ۔ راجپوتانہ تباہ ہو رہا ہے ——— جنگ کے شعلے اب بجھائے نہیں بجھتے ——— ریاستیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔ جنگ کسی طرح موقوف ہونا چاہیے ———

دیگر سردار۔ ہاں مہاراجا۔ جنگ ضرور موقوف ہونا چاہیے۔

مہاراجا۔ (تعجب سے یہ گفتگو سن کر) میں کیا کر سکتا ہوں؟

اجیت سنگھ۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ جنگ آپ کی راجکماری کرشن کنور کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ گلاب کا پھول مسل کر پھینکدیا جائے تو جنگ آج بند ہو سکتی ہے۔

مہاراجہ ——— کیا؟ کرشن کنور کا کیا قصور؟

سب سردار۔ مہاراجا۔ اُس کا حُسن ان جنگوں کا موجب ہے۔ اُس کا قتل ملک کے لیے مفید ہے

مہاراجہ۔ اپنی بیٹی کو میں کس طرح قتل کر دوں۔ کسی نے یہ کہا ہے؟

سب سردار۔ آپ کو کرنا ہوگا (غصے میں چیخ کر) ہزاروں گھر برباد ہو جائیں، ہزاروں کے سہاگ لٹیں، ہزارہا گھر بے چراغ ہوں، لاکھوں باپوں کو ترسیں ——— یہ ممکن ہے اور کرشن کنور کا قتل ناممکن ———

مہاراجہ (غصہ میں) یہ ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

سب سردار۔ نہیں ہو سکتا ——— آپ کو دھوکا ہے۔ ہم کرشن کو آپ سے زبردستی چھین کر نواب امیر خاں کے سپرد کر دیں گے، جنکا یہ فیصلہ ہے کہ بغیر کرشن کنور کی موت کے جے پور اور جودھ پور میں فیصلہ نہیں ہو سکتا ———

مہاراجہ ——— کیا کسی اور طرح فیصلہ ممکن نہیں ہے؟

سب سردار ——— نہیں۔ یا تو سلطنت سے ہاتھ دھوئیے یا لڑکی کی محبت سے! فیصلہ کیجئے

اجیت سنگھ ——— آپ کو نواب امیر خاں والی ٹونک کی طاقت کا حال معلوم ہے ———؟

مہاراجہ ——— کیا طاقت ہے! ایک لٹیرے کی طاقت ہی کیا ہو سکتی ہے ——— بگڑے ہوئے کمزوری سے ٹونک کا علاقہ بخش دیا ——— بڑے طرم خاں بنتے ———

ہیں اسے اٹھائی گیروں ——— کی گیدڑ بھبکیوں میں آکر اپنی آنکھ کی پتلی راج دُلاری کو موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکتا ——— کیا ——— میں اپنی جوان لڑکی کے معصوم خون سے اپنے ہاتھ رنگوں ——— کیا پرماتما ——— یہ پاپ ——— ان (اپنے) ہاتھوں پر ہاتھوں سے ——— کیا جس لڑکی کو ہزاروں آرزوؤں، ہزاروں منتوں سے پالا اُسکو اپنی آنکھوں سے تڑپتا دیکھوں ——— نہیں ——— نہیں، جاؤ ——— امیر خاں سے کہہ وہ وجودہ کرسکتا ہے کرلے ——— کیا تم بھی اپنے جگر کے ٹکڑے کو الگ کرسکتے ہو ——— کیا تم بھی اپنی آنکھوں کو خود پھوڑ سکتے ہو ——— کیا اپنے پیروں میں تم بھی خود کلہاڑی مار سکتے ہو ——— جاؤ ——— میں کنیا کے خون سے ——— اپنی تلوار کو شرمندہ نہیں کروں گا ——— ایک راجپوت سے یہ نامردی ——— ناممکن

اجیت سنگھ ——— کیا راجپوتانہ کی محبت آپ کو نہیں ہے؟

مہاراجہ — ضرور ——— نہ ہونے کی وجہ؟

سب سردار ——— کیا اودیپور کی راجدھانی سے آپ کو محبت نہیں ہے؟

مہاراجہ ——— ضرور ——— راجدھانی کی سیوا کرنا میرا دھرم ہے۔

اجیت سنگھ ——— کیا یہ منظور ہے کہ راجگڈھ کی اینٹ سے اینٹ بج جائے، اسکی گلیوں میں خون کی ندیاں بہ جائیں ——— ہزاروں پتی برت استریاں چتا کے بلند اُٹھتے ہوئے شعلوں میں بھسم ہو جائیں، کروڑہا بچے ایک دن میں بے ماں باپ کے ہو جائیں، ہزاروں گھرانے بے دیا ہو جائیں ——— تمام راجگڈھ (رام نکہے) تس نس ہو جائے ——— کیا آپ کو یہ منظور ہے کہ مہاراجہ کا راج راجگڈھ سے اُٹھ جائے؟ کیا کیسری جھنڈا اور کا راج اس بیکنٹھ میں رچتا ہوا دیکھ کر آپ کا دل نہ دُکھے گا کیا ان بے وارثوں کو روتا ہوا دیکھ کر آپ کانپ نہ اُٹھیں گے؟ کیا بھوکے اور فاقوں کے ماروں کی بدنصیبی پر آپ آرام سے سنگھاسن پر بیٹھ کر ——— راج کرینگے؟ کیا ان راج دولاریوں ——— کنوارنی کنیاؤں کا پاپ آپ پر نہ پڑیگا جنکا ——— اب سنسار میں کوئی وارث نہیں ہے ——— کیا ایک پھول کی خاطر سارا باغ ——— سارا بیکنٹھ ——— پامال ہوتا ہوا آپ دیکھنا پسند کریں گے ——— کیا ان بے باپوں کی آہوں کا دھواں ——— بیکار جائے گا ——— کیا آپ ملک کی خاطر ایسی معمولی قربانی بھی نہیں کرسکتے ——— کیا آپ

کرشن کنور کو بلدان نہیں دے سکتے ـــــ کیا دیوتاؤں کے غصہ سے آپ ڈرتے نہیں ہیں
ـــ اگر ایسا ہے تو کرشن کنور کی موت کے بغیر راجپوتانہ کی ان قدیم اور مشہور سلطنتوں یعنی
جے پور اور جودھ پور میں صلح و آشتی نہیں ہو سکتی۔ سارا راجپوتانہ آپ کا دشمن ہے۔
[اس تقریر سے دربار میں سناٹا چھا گیا]

مہارانا (بہت دیر خاموش رہنے کے بعد) لیکن کسی نے اپنی جوان لڑکی کو اپنے ہاتھوں ذبح کیا ہے؟
سب سرد ہے۔ لیکن آپ کو کرنا ہوگا ـــــ ایک کی خاطر ـــــ مہاراجگان جودھ پور و جے پور کی عزت
کی خاطر کرشن کنور کو موت کی بھینٹ چڑھنا ہوگا ـــــ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ آپ
نجیور ہوں گے ـــــ"

مہارانا (بہت دیر غور و خوض کے بعد) ـــــ اچھا ایسا ہی ہوگا ـــــ جاؤ۔ کل تم کو
کرشن کنور کی موت کی خبر ملے گی۔ (منظر بدلتا ہے) [وفد جاتا ہے]

چاند کنور، کرشن کنور

مہارانا اودیپور نے اپنی بہن چاند کنور کو بلا کر کل معاملہ بیان کیا۔ محل میں تہلکہ مچ گیا
لیکن مہاراناطے کر چکے تھے وہ ہو کر رہنا چاہیے تھا ـــــ کرشن کنور کو زہر دینے کے لیے مہارانا
نے چاند کنور کو تجویز کیا۔ چاند کنور ایک جام بلوریں میں زہر لیے ہوئے کرشن کنور کے سامنے
موجود ہے]

چاند کنور۔ کرشن کنور، یہ زہر ہلاہل کا جام بلوریں تم کو رانا کی عزت کی خاطر پینا ہوگا ـــــ اپنے پتا
کی لاج رکھ لو۔ اودیپور کی لاج رکھ لو۔ جلدی کرو میں تمہاری موت کی خبر سنانے کے لیے مقرر
کی گئی ہوں ـــــ"

کرشن کنور (زہر کا پیالہ ہاتھ میں لے کر)

[کس قدر حسرتناک منظر ہے کہ کشتہ غربت عثماں یہ کہکر]

یہی بیاہ میری تقدیر میں لکھا تھا

[جام زہر اپنے ہونٹوں سے لگا لیتی ہے]

(پردہ)

بجرم عشق توام سنگسار خواہی کرد ۔۔۔ تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا نیست

(مشیر احمد علوی، بی اے (علیگ)

نظرے خوش گزرے

لکھنؤ کے مشہور شاعر صفی صاحب کی ایک جدید الطبع مثنوی پر اس پرچہ میں ایک تنقید شائع کی جا رہی ہے۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی عزت ہمیں حاصل نہیں، مگر اس تنقید میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، اگر طباعت کی غلطی یا صاحبِ تنقید کی غلط فہمی کو اس میں دخل نہیں تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس مثنوی کی اشاعت سے صفی صاحب کی شہرت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔

لکھنؤ کے ایک دوسرے نامور شاعر سے جب اس مثنوی کا ذکر آیا تو اُنھوں نے بھی دلی افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ صفی صاحب کی مثنوی غلطیوں سے لبریز ہے۔

صفی صاحب بڑے مشاق شاعر ہیں۔ اس وجہ سے یہ باور کرنا دشوار ہے کہ وہ اس قسم کے اسقام کو رفع کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ پھر حیرت ہے کہ یہ مثنوی موجودہ شکل میں کیوں شائع ہونے دی گئی۔

اگر کوئی خاص سبب مجلت کا تھا، اور نظرِ ثانی کا موقع نہیں ملا، تو اُمید ہے کہ صفی صاحب جلد سے جلد توجہ فرما کر غلطیوں کی اصلاح کر دیں گے، اور اگر بعض دوسرے شعرا کی طرح درجۂ اجتہاد حاصل کرنے کی غرض سے دانستہ اس قسم کے اغلاط کو رواج دینے کی کوشش کی گئی ہے، تو ہم باادب اُنکے اس رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

صفی صاحب، ہندوستانی اکیڈمی کے بھی رکن ہیں، اور غالباً اُنکا انتخاب شعرائے لکھنؤ کی نمایندگی کی غرض سے کیا گیا ہے، اس لیے اُن پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اہالِ لکھنؤ کی اُن سے یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ وہ انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب سے متاثر و مرعوب ہو کر زبان و ادبِ اُردو کی تخریب گوارا نہ فرمائیں گے۔

گذشتہ ماہ صیام میں مولانا محمد علی صاحب نے "فسادِ فہم دل" کے عنوان سے ایک مضمون اپنے اخبار ہمدرد کے متعلق شائع فرمایا تھا، جس سے ظاہر ہوا کہ ہمدرد کی وجہ سے گذشتہ دو سال (۲۶ء و ۲۷ء) میں تیس ہزار سے زائد کا خسارہ اُنھیں برداشت کرنا پڑا۔ اور ہمدردانِ ہمدرد سے درخواست کی گئی تھی کہ اس خسارہ کی ادائی کے لیے امدادی رقوم بھیجنے کے علاوہ دو ہزار

جدید خریدار ہم پہونچائیں ورنہ اخبار کو بند کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد ایک دوسرے مضمون کے سلسلہ میں مولانا نے بعض جملے ایسے تحریر فرمائے تھے جنکی بنا پر اندیشہ ہوا کہ اب ہمدرد کے جاری رہنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔

مولانا محمد علی صاحب نے ملک و قوم کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اور جس سرگرمی و انہماک سے وہ نہایت ناموافق حالات میں اسکی کوشش فرماتے رہے ہیں کہ حصول آزادی کی راہ میں، خانہ جنگی اور باہمی منافرت کی بدولت جو سنگ گراں حائل ہے اُسکو دفع کرکے ہندوستان کو اُس شاہراہ پر لگادیں جس پر چل کر دنیا کی دوسری قومیں عزت و آزادی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ اُسکے لحاظ سے اُنکے لیے قطعاً محال تھا، کہ وہ اپنے اخباری کاروبار کے نظم و نسق پر پوری توجہ کر سکیں۔ اور ضرورت اسکی تھی کہ کوئی منتظم انھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش کردے۔ مگر ایسے کارکن کی غیر موجودگی کے باعث افسوس ہے کہ اُنکا اخبار جو اُنکی رہنمائی و ادارت میں قیمتی خدمات انجام دے رہا تھا، معرض خطر میں پڑگیا۔

دلی خواہش تھی کہ وقت نکال کر دفتر ہمدرد پر کچھ وقت صرف کیا جائے اور جو تھوڑا سا کاروباری تجربہ ہے اُسکی بنا پر ایسے مشورے دیے جائیں کہ ہمدرد کے نقصانات میں کمی ہو اور آمدنی کے نئے وسائل پیدا ہوں تاکہ اخبار بند نہ ہونے پائے۔

جنوری میں جب مولانا محمد علی صاحب سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے تو اُسوقت بھی یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا اور اُنھوں نے سے پسند فرمایا تھا، مگر ہر کام کے لیے ایک وقت معین ہے۔ چنانچہ ایسٹر کی تعطیل میں ایک کاروباری ضرورت سے "مشرق" کے دارالصدر میں حاضری دینے کا تہیہ تھا، سفر کی تیاری ہو چکی تھی کہ ہمدرد کا یہ آخری مضمون کسی دوسرے اخبار میں پڑھا اور طبیعت بیچین ہوگئی۔ راہ سفر فوراً تبدیل کرکے دہلی حاضر ہوا، اور دو تین روز تک ہمدرد کے حسابات آمد و صرف دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر مناسب انتظام ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمدرد کو بند کرنا پڑے۔

ہمدرد کی اشاعت بہت زیادہ نہیں، اور اس زمانہ میں تقریباً تمام اخبارات کی حالت یہی ہے۔ تحریک ترک موالات کے زمانہ میں اور اُس سے پہلے جو جوش اہل ملک میں پیدا ہوا تھا، اب اُسکے ردعمل کا دور دورہ ہے۔ فرقہ وارانہ منافرت بڑھانے والے اخبارات اور ایسے جرائد جو قومی ضرورتوں اور اخبار نویسی کے اصولوں سے زیادہ، اخبار کی آمدنی کو عزیز سمجھتے ہیں، ممکن ہے کہ اس

سرو مہری کے زمانہ میں بھی خاصی اشاعت رکھتے ہوں ورنہ مہاتما گاندھی کے اخبارات تک کی اشاعت زیادہ نہ رہی۔ پر ابھی ہمدرد کی اشاعت اسوقت بھی اتنی ہے کہ اگر اس میں کوئی خاص کمی بیشی نہ ہو تو مناسب انتظام کی صورت میں اسکے آمد و صرف کو برابر رکھنا ممکن ہے۔

مولانا محمد علی صاحب ہمدرد کے متعلق آخری فیصلہ کے لیے مولانا شوکت علی صاحب کی تشریف آوری کے انتظار میں تھے اس لیے قرار پایا کہ اُس موقع پر میں دوبارہ حاضر ہوں تاکہ تمام امور پر اُن کی موجودگی میں غور کیا جا سکے۔

اس اثنا میں دفعتہً مولانا محمد علی صاحب کے لیے علاج کی غرض سے ولایت جانے کا سامان غیب سے ہو گیا اور جب عبدالماجد صاحب کی معیت میں دوبارہ دہلی حاضر ہونے کا موقع آیا تو اس نئی صورتِ حال کی وجہ سے مجبوراً اُن تمام تجاویز کو عمل میں لانے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی جن پر مولانا محمد علی صاحب کے زیرِ نگرانی عملدرآمد ہونا چاہیے تھا۔ ادارت کی نگرانی مولوی عبدالماجد صاحب کے سپرد ہے اور دفتر و مطبع کے انتظامات مجھ سے متعلق ہیں۔ اپنی نااہلیت اور شاغل کی کثرت کے باوجود یہ خدمت محض خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ کر کے قبول کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ہندوستانی ایکاڈیمی

صوبہ متحدہ نے کچھ رقم اس غرض سے علیحدہ کر دی ہے کہ اس سے اُن اردو اور ہندی کتابوں کی طبع و اشاعت کرے جن کو ایکاڈیمی منظور کر لیگی۔ کتابیں خواہ کسی فن کی ہوں۔ جو لوگ اپنی کتابیں چھپوانا چاہتے ہوں، اُنکو اپنے مسودے ایکاڈیمی میں بھیجنا چاہیے۔ اور طے کرنا چاہیے کہ کن شرطوں پر وہ اشاعت کے لیے دینا چاہتے ہیں۔

مسودہ بالکل مکمل صورت میں اس طرح ہو کہ ایک صفحہ پر لکھا ہوا اور دوسرا سادہ رہے۔

مسودہ دفتر میں ۳۱۔ اگست تک پہونچ جائے

جنرل سکرٹری
ہندوستانی ایکاڈیمی۔ الہ آباد

روانہ کیا اور مجھے لکھا کہ اوس کی نیابت مین کام انجام کرو یہ شخص کپتان اوزلی بعد
معزولی کے ہندوستان مین مجنون بھی ہوگیا تھا اور مشہور ہے مَنْ جُنَّ مَاعَمَّ فَقَدْ جُنَّ اَیْدًا
حرکات اور سکنات اوس کے بالکل جنون کے تھے۔ لندن مین پہونچتے ہوئے
وزرائے سلطنت کے پاس جاکے اوس نے درخواست کی کہ راقم کو بادشاہ نے عہدۂ
سفارت سے معزول کیا ہے اور اوس کو سفیر مقرر کیا ہے چونکہ دو تین دن اوس تاریخ مین
باقی تھے جو ملکۂ معظمہ دام اقبالہا کے دربار خاص کے واسطے مقرر ہوئی تھی غرض اوس کی
یہ تھی کہ ملکۂ کشور اور شاہزادون کے ساتھ وہی مجاز حضوری کا ہو اور راقم ممنوع حضوری سے ہو
لیکن اوس کی درخواست پر کچھ اعتنا نہ ہوئی اور جو بندوبست دربار کا قرار پاچکا تھا کہ سوا
ملکۂ کشور کے اور دونون شاہزادون کے اور راقم کے کوئی پانچوان آدمی مجاز حضوری کا نہین
ہوگا وہ بدستور قائم رہا اسی عرصہ مین وہ ذات شریف یعنی کپتان اوزلی مجنون سرشار ہوگئے اور ہسپتال
مین مقید ہوے۔ الغرض جب بادشاہ کے مقید ہونے کی خبر وہان پہونچی اور معلوم ہوا
کہ ہندوستان مین نہایت زور اور شور سے غدر شروع ہوگیا ہے۔ جو تدبیرین مقدمہ
کی درستی کی ہم نے کی تھین وہ سب برہم ہوگئین اور پارلیمنٹ مین جو درخواستین گذری
تھین اپنے مشاورین کی صلاح سے اون کو ملتوی کروایا یعنی پیروی اوسکی موقوف
کی حقیقت مین مقدمہ بادشاہ کا بہت اوپر راہ تھا بہت فراین سے ہم کو نہایت امید ظفر کی تھی
مگر ہندوستان کے غدر نے اوس کو بگاڑ دیا پارلیمنٹ کے دونون ہوس کے بہت بڑے بڑے عمدہ
ممبر ہمارے معین اور مددگار تھے اگر کچھ نہ ہوتا تو اس مین شک نہ تھی کہ دو تین لاکھ روپیہ بادشاہ کا
درماہہ ہوجاتا اور شہر لکھنؤ اور حوالی اوس کے بادشاہ کے قبضہ مین رہتے چنانچہ ابتدا مین جب
ہم ولایت گئے تھے ایک صاحب بہت جلیل القدر جو بورڈ آف کنٹرول مین تھے کہ کمپنی کے
اوپر وہ محکمہ حاکم تھا اونھون نے بطریق پریوٹ یعنی خانگی طور پر مجھ سے کہا کہ تم نے ناحق اتنا
سفر دور و دراز اختیار کیا اب جو یہان آئے ہو تو کمپنی کے ساتھ بندوبست کرلو کمپنی بہت دولتمند ہے

بادشاہ اودھ کے کپتان اوزلی نام ایک شخص اپنا وکیل مقرر کرکے بھیجا اور اوزلی کا ولایت مین جاکر مجنون ہوجانا

ہندوستان کے غدر کے سبب سے اوزلی کا مجنون ہوجانا

دو تین لاکھ روپیہ بادشاہ کا درماہہ کردیگی تم کو بھی تیس چالیس ہزار روپیہ کی جاگیر دے سکتی ہے یہ خیال خام ہے کہ پارلیمنٹ سے ظفر حاصل ہو اور چونکہ اول سلطنت کی ضبطی کے وقت ایک عہدنامہ گورنر جنرل نے بھیجا تھا اوس مین لکھا تھا کہ بارہ لاکھ روپیہ نقد بادشاہ کو دین گے اور تین لاکھ روپیہ کچھ سوار اور پیادہ کی فوج جلوسی کے واسطے اور کئی لاکھ روپیہ اقربا اور ملازمین کی پنشن کے لیے مقرر ہوگا اور عزت اور وقعت بادشاہ کی بدستور رہیگی۔ اس کے ساتھ زبانی یہ بھی پیغام تھا کہ اگر بادشاہ اس پر راضی نہ ہون تو اضافہ ہوجاے۔ اور جب ہم لوگ لندن مین پہونچے تو کمپنی کی طرف سے یہ بھی تحریر گئی تھی کہ اگر بادشاہ چاہین تو چھ لاکھ روپیہ کا ملک واگذاشت کردیا اون کے قبضہ مین رہے۔ غرض یہ تھی کہ لکھنؤ اور حوالی اوس کے بادشاہ کے قبضہ مین رہین مگر پہلے تو ہندوستان کے غدر نے معاملہ خراب کیا۔ پھر بادشاہ کی بے صبری نے بالکل سب ابتر کردیا کہ وہ عہدنامہ جو پہلے آیا تھا اوس کو قبول نہ کیا اور بغیر کسی عہدنامہ کے بارہ لاکھ روپیہ قبول کرلیے جو غالبًا اونھین کی ذات تک باقی رہین گے۔ اب کیفیت دہان کے معاملات وقوعی کی مین نقل کرتا ہون۔ جن تدابیر سے کہ وہان مروج ہین ایسا سامان ہوا کہ سیکڑون عرایض تمام ممالک سلطنت برطانیہ اعظم سے پارلیمنٹ مین اور ملکہ معظمہ کے حضور مین گذرنا شروع ہوے جس مین بعضی عرضیون پر پانچ ہزار اور دس ہزار آدمی۔ کے دستخط تھے۔ کسی عرضی مین یہ درخواست تھی کہ بادشاہ اودھ پر نرا ظلم ہوا ہے اون کا ملک چھوڑ دینا چاہیے اکثر یہ درخواست تھی کہ بادشاہ اودھ کے مقدمہ کی تحقیقات عدالت اور انصاف سے کرنی لازم ہے۔ جب لکھنؤ مین غدر بہت طول ہوا اور سیکڑون بڑے بڑے افسر یہان مارے گئے۔ اب آراے علی العموم لوگون کے بدل گئے اور وہی بڑے بڑے ممبر دونون ہوس کے پارلیمنٹ مین جو ہمارے معین تھے یہ تقریر کرنے لگے کہ اگر لکھنؤ فتح نہ کیا جاے تو ہماری قوم کی ناک کٹ گئی اور جب علی العموم ہندوستان کی خبرین متضمن قتل اور خون بڑے بڑے افسرون کے خصوص جو یہان کے حمقا اور جہلا نے عورتون پر اور لڑکون پر ظلم اور ستم کیے تھے پہونچنی شروع ہوئین

سب نیات عدل اور انصاف کے جو لوگون کے تھے منقلب ہو گئے۔ اب تقدیر نے اس
حالت مین ہمارے اس مجمع سفارت مین فتور برپا کر دیا۔ وہ دربار ملکۂ کشور کا جو بڑی دھوم
دھام سے ہر جمعرات کو ہوتا تھا اوس مین کمی شروع ہوئی اور ملکۂ کشور کا جو عارضہ دایمی
استحاضہ کا تھا اوس مین کچھ زیادتی ہوئی وہ نہایت گھبرائین اور اونھون نے قصد مراجعت
کا کیا لندن سے روانہ ہوئین پارس فرانس کے دارالسلطنت مین پہونچی تھین کہ وہان
قضا کر گئین۔ تار کے ذریعہ سے جب لندن مین خبر آئی یہان سے راقم اور دونون شاہزادے وہان
پہونچے اور اون کو دفن کیا پارس مین وہان کے شہنشاہ نے ایک قطعہ زمین کا اون قطعات سے جو
مقابر کے واسطے وہان موضوع ہین محاط کر کے اور اوس کے وسط مین ایک کمرہ بنام نہاد مسجد
بنا دیا ہے اور وہ قطعہ محاط سلطان روم کے سفیر کے اختیار مین چھوڑا ہے کہ جو شخص اہل
اسلام مین سے اون کے ہمراہیون مین قضا کر جاے وہ وہان دفن ہو۔ گرد ستور کے
موافق قیمت زمین کی جو متعلق سینوسیل یعنی شہر کے متعلقین سے ہے داخل کرنا ضرور ہے
اور زمین کی قیمت کا یہ حال ہے کہ اگر برس دو برس کے واسطے.... مول لیوے تو قیمت
کم دینی پڑتی ہے بعد برس دو برس کے ہڈیان مردون کی نکال کے کسی غار مین ڈال دیتے
ہین اور زمین خالی کر لیتے ہین اور اگر ہمیشہ کے واسطے زمین مول لیوے اور قبر پر حظیرہ
وغیرہ بنا دے تو قیمت بہت دینی پڑتی ہے غرض پہلے تو اجازت روم کے سفیر سے
کی گئی بعد اون کی اجازت کے وہان لیجا کے دفن کیا اوس وقت تک اوس احاطہ
مین کوئی مسلمان مدفون نہین ہوا تھا۔ چار پانچ گز کا مربع ایک قطعہ زمین کا دس ہزار روپیہ کو خرید کیا
ارادہ تھا کہ اوسپر کوئی حظیرہ بنوایا جائیگا چنانچہ صرف ایک سنگ مرمر کا چبوترہ وہان
بنوایا گیا تھا اوس مین تین ہزار روپیہ خرچ ہوے۔ لاش ملکۂ کشور کی اس دھوم دھام
سے اوٹھائی گئی کہ اگر لکھنؤ مین ہوتین تو اس عظمت اور شوکت سے گمان نہین ہے
کہ اوٹھتی۔ سلطان روم کے سفیر اور بادشاہ ایران کے سفیر اور بعضے وزرا فرانسیس کی

کیفیت فتور کی مفارقت کی مہمات مین اور دربار ملکۂ کشور کا قضا کرنا

پارس مین شہنشاہ نے ایک قطعہ زمین کا اور کمرہ بنام مسجد کا سلطان روم کے سفیر کے اختیار مین چھوڑا ہے کہ جو شخص اہل اسلام مین سے اون کے ہمراہیون مین قضا کر جاے وہان دفن ہو۔ مول لیوے تو قیمت کم دینی پڑتی ہے

ملکۂ کشور کی لاش کی اس دھوم دھام سے اوٹھائی گئی کہ اگر لکھنؤ مین ہوتین تو اس عظمت سے گمان نہین ہے کہ اوٹھتی

سلطنت کے اور بہت سے امرا اور اجلۂ وہان کے ہمراہ تھے سیکڑون گاڑیان سواری کے ساتھ تھین اور اوس مہانسرا سے جہان اقامت تھی مقابر تک قریب چار یا پانچ میل کا فاصلہ تھا چنانچہ برابر اوس رستہ مین دورویہ تماشائیون کی ایک بھیڑ تھی مثل مشہور ہے کہ اگر تھالی پھینکتے تو سری پر جاتی بعد فراغت کے دفن سے جب اقامت گاہ پر پھر کے آئے اوس وقت شہنشاہ نے ایک کسی کو اپنے وزراؤن مین سے تعزیت کے واسطے بھیجا اور پیغام دیا کہ شہنشاہ چاہتے ہین کہ دونون شہزادون کو لیکے اون کے دربار مین راقم حاضر ہو چونکہ بدون توسط اپنی سلطنت کے سفیر کے اور بدون اون کی اجازت کے راقم کی راے مین حضوری اون کی دربار مین مناسب نہ تھی جواب اوس کا دوسرے روز پر ملتوی رکھا اور دوسرے دن راقم قصر سلطنت مین حاضر ہوا ایک بڑے وزراؤن مین شہنشاہ کے تھے جن کو ہماری ہندوستان کی اصطلاح مین عرض بیگی کہنا چاہیے اون کے پاس مین گیا جہان وہ بیٹھے تھے وہ بہت بڑا دالان تھا بیچ مین ایک پردہ پڑا ہوا تھا پردہ کے اوس طرف خود شہنشاہ بیٹھے تھے ظاہرا اس واسطے کہ جو کچھ گفتگو ہو وہ خود سنین۔ راقم نے عرض کیا کہ ہمارے شاہزادون کو شہنشاہ کے حضور مین حاضر ہونا نہایت اون کا موجب فخر اور اعزاز کا ہے اور گویا وہ تقریب نہایت مسرت کی ہے ایسی مسرت کی تقریب مین اپنی اس حالت ماتم داری مین جس مین اللہ تعالے نے اون کو مبتلا کیا ہے شہنشاہ کے دربار مین حاضر ہونے کو خلاف ادب سمجھتے ہین امید یہ ہے کہ اس عدم حضوری کو شہنشاہ معاف کرین۔ بعد اوس کے راقم نے عرض کیا کہ ملکہ کشور کا اس سفر دور دراز مین آکے شہنشاہ کے دارالسلطنت مین قضا کرنا یہ دلیل اسپر ہے کہ وہ مستغاثی اون مظالم کی جو اون پر واقع ہوے خدا کی درگاہ مین شہنشاہ کے ذریعہ سے ہوئی ہین اس واسطے ہم لوگ امیدوار ہین کہ شہنشاہ ہم لوگون کی حق رسی کی اعانت فرماوین۔ مگر اعانت دوستانہ سلطنت برطانیہ اعظم کے ساتھ ہمین مطلوب ہے معاندانہ اعانت کی درخواست

شہنشاہ فرنس کی طرف سے ایک وزیر حضرت کے واسطے آے اور راقم کو اور دونون شہزادون کو اپنے دربار مین طلب کیا

راقم کا قصر سلطنت مین فرنس کے شہنشاہ کے حضور مین حاضر ہونا اور اپنے تئین حالت ماتم داری کے سبب شہنشاہ کی حضوری کا غیر مناسب اور دونون شہزادون کی حضوری کا غیر مناسب اور دونون شہزادون کی حضوری کا مقدر ہونا

نہین ہے بعد اوس کے راقم نے اوسنین وزیر سے کہا کہ مین امیدوار ہون کہ اس کا جواب جو شہنشاہ دیوین اوس سے مجھکو اطلاع ہو دوسرے یا تیسرے دن ایک خط حسب الحکم شہنشاہ کے اونھون نے مجھے لکھا اوسکا مجمل گول مضمون تھا خلاصہ اوس کا یہ تھا کہ شہنشاہ کی دل سے خواہش ہے کہ سارے عالم کے اقوام اپنے حق کو پہونچین اور اگرچہ اعانت ہماری موقوف بہت بکھیڑون پر ہے مگر شہنشاہ کو یقین واثق ہے کہ سلطنت باشوکت برطانیہ اعظم کی خواہ مخواہ خود داد رسی کریگی - بعد اوس کے جب ہمارے مرزا ولی عہد بہادر مجھ سے مخالف ہو گئے اونھون نے پارس مین جاکے اقامت کی جس کی شرح مین آیندہ لکھونگا ظاہر اوہان اون کے ہمراہیون نے فکر کی کہ شہنشاہ کے دربار مین اون کو لیجاوین اور درخواست اون کی شہنشاہ کے پاس پہونچی - اون کی ملاقات تنہا شہنشاہ نے منظور نہ کی اور پھر اوسنین وزیر کا خط حسب الحکم شہنشاہ کے میرے پاس لندن مین آیا اس مضمون کا کہ آج کل شہنشاہ کو فرصت ہے - تم اپنے شاہزادہ کو لیکے دربار مین حاضر ہو - مگر اوس عرصہ مین راقم ایسا حوادث غیر متوقعہ مین مبتلا ہو گیا کہ نوبت وہان جانے کی نہ آئی الغرض وہان سے معاودت کرکے پھر لندن مین آئے یہان مرزا جواد علی سکندر حشمت بہادر نہایت مریض ہوے اور پورے ایک مہینے کے بعد ملکۂ کشور کے قضا کرنے سے وہ بھی قضا کر گئے اون کا عارضہ عجیب اور غریب ہوا - ایک دنبل اون کے مبز پر بہت پچھلے دنون مین نکلا تھا کہ وہ ناسور ہو گیا تھا کبھی اوس کا بہنا بند ہو جاتا تھا تو پھر دنبل ہو کے پکتا اور پھوٹتا تھا پھر جب بہنے لگا تو تسکین ہو جاتی تھی ایکی دفعہ اوسی ناسور نے بڑا زور کیا کہ اوس کے سبب سے تپ محرقہ ہوئی آخرش اوسی عارضہ مین قضا کر گئے - اس عارضہ کی اون کے کیفیت نہایت موجب عبرت ہے مرزا سکندر حشمت مزاج کے نہایت خلیق اور بامروت تھے اور بہت سے صفات مستحسن کے متصف تھے لیکن مذہب تشیع مین اون کو نہایت تعصب اور غلو تھا چنانچہ کمال جہالت سے اونھون نے ایک لمشت چاندی کا یا تانبے کا بنوایا تھا اوس پر خلفاے ثلثہ رضوان اللہ علیہم اور اور

بزرگان دین کے نام کندہ کروائے تھے اور وہ طشت ہمیشہ پاخانہ کی چوکی مین لگا رہتا تھا
قطع نظر اوس بے ادبی کے بزرگان عظام کے اسما سے حروف وہ جن سے قرآن شریف لکھا جاے
میرے زعم مین شیعہ کے مذہب مین بھی یہ بے ادبی اون حروف سے جایز نہ ہوگی۔ بہرصورت
میرے عقیدہ مین اللہ تعالے نے اوسی بے ادبی کے انتقام کے واسطے اون کے مسہ[illegible] پیدا
کیا اور اوسی عارضہ مین قضا کر گئے تاکہ اورون کو عبرت ہو واللہ علی کل شئی قدیر۔ الغرض اون کی
لاش کو راقم لندن سے پارس مین لے گیا اور اون کو بھی اوسی دھوم دھام سے جو ملکۂ کشور کی
لاش کے اوٹھانے مین ہوئی تھی اونھین کی مان کے پہلو مین دفن کیا اور جب ہم لوگ سب
لندن مین پھر کے آئے۔ اب راقم عجب تشویش اور تردد مین مبتلا ہوا مفسدون نے ابتدا ہی مین
مرزا ولی عہد بہادر کو اور ملکۂ کشور کو میری طرف سے برہم کر رکھا تھا مگر صرف مرزا سکندر حشمت
البتہ مجھ سے موافق رہے اور وہ دونون بہت منحرف تھے اور انواع طرح کے وہان مفاسد برپا کیے
کہ شرح اون جزئیات کی بہت طول ہے لیکن بادشاہ کے احکام تاکیدی پہونچنے کے سبب سے کچھ
کسی کی چل نہ سکی تھی۔ اب ملکۂ کشور کے اور جنرل سکندر حشمت کے قضا کرنے سے ولیعہد جو
شروع شباب مین تھے یعنی سترہ یا اٹھارہ برس کی اون کی عمر تھی مفسدون نے اون کا
مزاج میری طرف سے برہم کرنا شروع کیا۔ ملکۂ کشور کا جو کچھ مال جواہرات اور نقدی تھا
وہ تو سب اون کے ہمراہی چکھ گئے تھے۔ اب درپے ہوے کہ جنرل سکندر حشمت کا مال اور
کچھ نقد روپیہ بادشاہی جو مقدمہ کے مصارف کے واسطے جنرل صاحب کی تحویل مین تھا
اوس کو بھی اوڑا دین۔ چونکہ مین نے خود کلکتہ سے روانگی کے وقت تحویل کا اپنے اختیار
مین لینا قبول نہین کیا تھا اس واسطے بادشاہ نے جنرل صاحب کو سب روپیہ سپرد کیا
تھا۔ اب مین یہ سمجھا کہ اگر مین اوس کی حفاظت نہ کرون تو بادشاہ مواخذہ کرینگے اس واسطے جو روپیہ
جنرل صاحب کی تحویل مین باقی تھا اوس کو اور کل اونکے اسباب کی فہرست لکھوا کے اپنے
قبضہ مین کیا اور ملکۂ کشور کے یہان کے لوگون نے بھی چاہا تھا کہ اُن کے متروکات کی بھی مین فہرست

مفسدون نے مرزا ولیعہد کا مزاج میری طرف سے برہم کیا

لکھاؤن لیکن اوس مین مین نے مداخلت نہ کی اس واسطے کہ وہان تغلبات علانیہ تھے کہ سچے
جواہرات کے عوض مین جھوٹے رکھے گئے تھے اوراون کی سرکار کے نقدی کے حساب مین
جرنل صاحب کی زندگی مین ایک بزرگوار آٹھ ہزار روپیہ نقد داخل کرتے تھے اور ایک فرد حساب
کی ساٹھ ستر ہزار روپیہ کی دیتے تھے اس شرط پر کہ اون کو فارغ خطی لکھدی جاے چونکہ مدات اوس
حساب کے سب مہمل تھے میرے مشورے سے جرنیل صاحب نے فارغ خطی دینے سے انکار کیا
اونھون نے جو روپیہ داخل کرتے تھے نہ دیا اب جرنل صاحب کے قضا کرنے کے بعد پھر مجھ سے
اونھون نے درخواست کی کہ اگر فارغ خطی مین لکھدون تو وہ روپیہ داخل کرین۔ مین نے جواب دیا
کہ رسید البتہ اوس روپیہ کی مین دونگا اور حساب اونکا داخل کیا ہوا بادشاہ کے پاس بھیجدونگا اگر
وہان سے حکم فارغ خطی دینے کا آویگا اوس وقت مین فارغ خطی لکھدونگا۔ غرض اونھون نے
وہ روپیہ بھی نہ دیا۔ اور چونکہ مرزا سکندر حشمت کی سرکار مین چندان غبن اور تصرف نہ تھا اوس کو
مین اپنے اختیار مین لایا۔ اب معتمدون نے مرزا ولیعہد بہادر کو سمجھایا کہ سب مال واسباب مرزا
سکندر حشمت کا وہ مجھ سے طلب کرین مین نے اون سے عرض کیا کہ اس قدر توقف فرمائیے
کہ بادشاہ کے پاس سے جواب آوے سب مال واسباب تو آپ ہی کا ہے آپ گھبراتے کیون ہین
معتمد لوگ جانتے تھے اور اون کو خود بھی یقین تھا کہ بادشاہ اون کی بے اختیاری اور میرا اختیار
لکھینگے اور سب لوگون سے محاسبہ سمجھنے کا مجھے حکم آویگا تو وہ سب چاہتے تھے کہ قبل حکم بادشاہ
کے آنے کے جو کچھ ہے اوس کو اوڑا پوڑا دیجیے مجھ پر جبر کیا جب مین نے نہ قبول کیا تو جھٹ عدالت مین
میرے نام پر نالش کروادی مین نے جواب دہی مین یہی لکھا کہ مین منتظر بادشاہ کے حکم
کا ہون اور بدون بادشاہ کے حکم کے مجھے احتمال بادشاہ کی بازپرس کا ہے۔ اور نکہ
ظاہر مین راقم شخص اجنبی تھا ولیعہد کے موجود ہوتے ہوے مجھے جرنل صاحب کے ترکات
پر کچھ اختیار نہ تھا اور ہندوستانی رئیسون کے دستورات سے وہان کے لوگون کو کچھ
اطلاع نہ تھی صرف بقدر میرے دربار کے اور میرے ہمراہی عملہ کے بابت چھ مہینے آیندہ کے حاکم عدالت نے

میرے ہاتھ مین چھوڑ کے حکم کیا کہ سب نقد عدالت مین جمع کردو اور سب مال واسباب ولیعہد
کے سپرد کردینے کا حکم کیا چونکہ سب جانتے تھے کہ عنقریب بادشاہ کا حکم میرے
تفویض اور اختیار کا آویگا ولیعہد کو بھکا کے سارا مال واسباب لیکے لندن سے
روانہ ہوگئے اور پارس مین جاکے اقامت کی۔ بعد اون کی روانگی کے بادشاہ کا
حکم میرے نام پر سب مال واسباب ملکہ کشور کا اور جرنیل سکندر حشمت کا اپنے اختیار
مین لینے کا اور مواخذہ اور محاسبہ سب لوگون سے کرنے کا اور ولیعہد کی حفاظت کا اور
مفسدون کو اون کے پاس سے اخراج کرنے کا پہونچا اور گورنر جنرل کو بادشاہ نے
خط لکھا کہ ولایت کے حکام کو اطلاع کرین کہ وہ ہر طرح سے میری اعانت کرین مگر اب کیا
فایدہ ولیعہد مع سب مفسدون کے وہان سے چلے گئے تھے اگرچہ ممکن تھا کہ مین پارس
مین جاکے مفسدون کی دار وگیر کرتا مگر ایک تو آپس کے نزاع کو ایسی حالت نازک مین طول کرنا کہ
دوسرے سلطنت تک نوبت پہونچے اور ولیعہد کے تو جب بدنامی ہو مناسب نہ تھا دوسرا میرے
پاس ایک جبہ باقی نہ رہا جو کچھ تھا ولیعہد لے کے چل دیے مین خود وہان مبتلا عسرت
مصارف مین ہوا پارس مین جاکے مقدمے لڑانے کی کس کو طاقت تھی مقدمہ کا صرف تو جدا رہا مین
اپنے مصارف ذاتی مین تنگ ہوا اور نوبت قرض لینے کی پہونچی اور اسی مجبوری سے مین
جعلسازون کے ہاتھ مین پھنس گیا اور چونکہ اوس ملک کے جعلسازون اور فریبیون
مین ہمارے ملک کے جعل سازون سے زمین آسمان کا فرق ہے اور میرا گمان یہ ہے
کہ فریبی اور جعلسازونکون کو وہی پہچانے گا جو خود بھی اوس کوچہ سے عاری نہ ہو اور ہمارے
ملک کا کیا ہی کوئی تجربہ کار کیون نہو اون ممالک مین نئے تجربون کی حاجت ہے اس سبب سے
میرا پھنس جانا اون کے ہاتھ مین محل تعجب نہ تھا۔ الغرض جب مین ایسی تنگی اور عسرات مین مبتلا ہوا
جس شوکت اور عظمت سے وہان قریب دو برس کے گذرے تھے وفقہ مصارف اوس کے
موقوف کردینا عقل کے اور مصلحت کے خلاف معلوم ہوا اپنی جو کچھ جایداد ذاتی نقد کی جنس سے تھی

ولیعہد سب مال واسباب لیکے لندن سے پارس گئے اور اون کی جاکے اقامت کی اور بادشاہ کا حکم پہونچا کہ سب مال واسباب ملکہ کشور کا اور ولیعہد کی حفاظت کا اور مفسدون کے اخراج کا

جعلسازون کے ہاتھ مین پھنسنے کا

وہ سب خرچ ہوگئی ایسے وقت مین بعضے ایسے خیرطلب محبت سے اوراعانت سے پیش آئے کہ
مجھکو نہایت ممنون کیا ایک صاحب دن مین ایسے تھے کہ ہندوستان مین وڈبڑی نامروی کے عہدہ
پر تھے اور لاکھون روپیہ کما کے یہان سے لے گئے تھے اگرچہ ہندوستان مین مجھ سے اونسے ملاقات
نہین ہوئی تھی مگر اون کی ناموری کلکتہ مین راقم نے بہت سنی تھی اور لندن مین بہت بڑے بڑے
امیر لوگون کی آمدورفت اون کے یہان تھی وہ بھی لوگون کے یہان آتے جاتے اونکے یہان آجاتے تھے
بعضے بعضے پالیمنٹ کے سرداروں سے وہ ذریعہ میری ملاقات کے ہوے خواہ اپنے یہان دعوت کرکے
اون کو بلایا اور مجھے بھی شریک کیا یا وہ خود اون کے یہان مدعو ہوے اور مجھکو مدعو کروایا اور
بہت سی تدبیرین ہمارے مقدمہ کی درستی کی اونھون نے کین ایسے وجوہ سے کسی طرح کا شبہہ
جعل سازی کا اون کی طرف سے میرے دل مین نہ آیا۔ اور جب میرا ارادہ ہوا کہ کچھ اپنا اسباب
منقولہ رہن یا بیع کرکے کچھ روپیہ بہم پہونچاؤن۔ اونھون نے کہا استغفراللہ اسباب کے رہن اور بیع
کی کیا حاجت ہے جس قدر روپیہ مطلوب ہے ہم بے تکلف لے آوین گے چونکہ اوس وقت
مجھے پانچ ہزار روپیہ مطلوب تھا پانچ قطعہ کاغذ اسٹام کے اونھون نے پیش کیے جس کو
وہان کی اصطلاح مین بل آف اکسچینج کہتے ہین اس غرض سے کہ سو سو پونڈ کے واسطے کہ ہزار ہمارا
روپیہ ہے ایک ایک بل ہوگا اسکو دستخط کردیجیے ہم روپیہ ابھی لے آتے ہین۔ میرا گمان ہوا
کہ وہ روپیہ اپنے گھر سے دیتے ہین مطلق جعل سازی کے ارادہ کا وہم بھی نہ تھا چونکہ وہان
کے دستورات سے بالکل ناواقفیت تھی اور بل آف اکسچینج کا حال بھی یہی سنا تھا کہ سادے کاغذ
پر لوگ دستخط کردیا کرتے ہین اور قرض دینے والے اس نظر سے سادے کاغذ پر دستخط کرواتے ہین کہ
اگر قرضدار کچھ ادائے قرض مین بددیانتی کرے تو وہ بھی رقم قرض کی بڑھاوین خصوص جب اجنبی
آدمی قرض کا خواستگار ہو تو ظاہرا اکثر ایسا کیا کرتے ہین۔ اور اصل یہ ہے چونکہ اون لوگون پر نہایت اعتماد
ہوگیا تھا اور وہ دو آدمی سالے بہنوئی تھے اور اون کی بی بیان سب بہت بے تکلف راقم کے
ساتھ ہوگئین تھین وہ سب اور اون کے لڑکے بالے سب مجھ سے بہت محبت کرتے تھے کسی طرح کا کھٹکا

اور شبہ جعل اور فریب کا میرے دل مین نہ رہا اور اوس وقت یہ بھی مفصل مجھے معلوم نہ تھا کہ کس
مقدار کا اشٹام کتنے قرض کے واسطے وہان درکار ہوتا ہے کچھ اس کا بھی تجسس نہ کیا بالکل اونھین
لوگون کے اعتماد پر چھوڑ کے اون پانچون قطعہ اشٹام پر اپنے دستخط کر دیے اور اونھون نے فوراً پانچ ہزار
روپیہ لا دیے اوسکے بعد پھر مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ بتدریج چھ ہزار روپیہ اور اونھون نے
لا دیے اور ایکی دفعہ یہ بھی درخواست نہ کی کہ کسی کاغذ پر مین دستخط کرون اس عرصہ مین بادشاہ
نے قریب ساٹھ ہزار روپیہ کے گورنر جنرل کی معرفت مجھے بھیجے۔ جب یہ روپیہ آیا تو راقم نے ایک
چٹھی اون کے نام پر لکھی اور بہت شکریہ اون کی محبت اور اعانت کا لکھ کے لکھا کہ کل مع اون
کاغذات کے جو مین نے دستخط کر دیے ہین آپ تشریف لائیے مین قرض کا روپیہ ادا کرون اونھون
نے کہا کہ وہ کاغذات تو حسب الرسم ہم نے تم سے لکھوا لیے تھے کچھ فکر اس کی حفاظت کی نہین رہی
وہ گم ہو گئے ملتے نہین ہین تب فی الجملہ میرے دل مین کھٹکا پیدا ہوا مین نے اصرار اون کی
واپسی پر کیا۔ میرے بہت اصرار پر اونھون نے کہا کہ تم گھبراتے کیون ہو اگر کچھ تمھارے دل مین شبہ
پیدا ہوا ہے تو ہم اوسی طرح کے سادے کاغذ تم کو دستخط کر کے دیدیون اگر ہماری طرف سے کچھ بد دیانتی
ہو تم بھی جو چاہو اون کاغذات پر جو ہم دستخط کر کے دیون لکھ لیجیو راقم اس امر پر مطمئن ہو گیا۔ جب
اونھون نے اوسی طرح سے سادے کاغذ مجھکو دستخط کر کے دیے مین نے وہ گیارہ ہزار روپیہ ادا
کر دیا اور پھر بدستور وہی صحبت اور ملاقات باہم رہی۔ اب کچھ تھوڑی سی کیفیت بادشاہ کی طرف کی لکھنا اسلئے
انتظام سوانح نگاری کے ضرور ہے جب سلیگراف کے ذریعہ سے خبر بادشاہ کے مقید ہونے
کی پہونچی اور سب اخبارون مین چھپا کہ بادشاہ بلوائیون کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس
سبب سے مقید ہوے راقم فوراً انڈیا ہوس جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی کچہری کا نام تھا وہان
گیا۔ اوس عرصہ مین مسٹر منگل نام ایک صاحب چیرمین کورٹ آف ڈائرکٹرز کے تھے جو ہندوستان
مین گورنر جنرل کے سکریٹری بھی رہے تھے اون سے جا کے پوچھا کہ بادشاہ ہمارے کیون قید ہوے
آیا کچھ جرم اون سے واقع ہوا یا صرف احتیاطاً ایسا تو اونھون نے کہا اب تک کوئی خبر ہمارے پاس

نہین آئی بعد رد و کد کے کہا صرف احتیاطاً مقید کیا ہے۔ مین نے عرض کیا بہت مناسب ہوا لیکن مکاتبات ہمارے ساتھ اون کے جاری رہین اور بادشاہ پر تکلیف کسی نہج کی قلعہ مین نہ ہو دونون امر کو قبول کیا مگر مکاتبات کے بارہ مین یہ شرط کی کہ کھلے ہوے خطوط ادھر سے بھی اودھر سے بھی آوین جائین راقم نے ایک عرضی اوسی وقت بادشاہ کے حضور مین اس مضمون کی لکھی کہ حضور بے تکلف جو کچھ وہان واقع ہو لکھ کے اوسی طرح سے کھلا ہوا خط گورنر جنرل کے پاس بھیجدیا کیجیے اور کسی امر کے لکھنے مین خوف اور دریغ نہ کیجیے۔ اور قلعہ مین تشریف رکھنے سے کچھ گھبرائیے نہین جو کچھ ہوا اوس وقت مین بہتر ہوا۔ غرض بادشاہ نے حب تلک قلعہ مین تشریف رکھی برابر میرے عرایض اون کے پاس ہر میل مین یعنی جو ڈاک ہندوستان کی جاتی تھی پہونچا کیے۔ اور بادشاہ کے حکمنامہ میرے پاس آتے رہے اس عرصہ مین کمپنی کی حکومت ہندوستان سے موقوف ہوئی جس کی شرح چوتھے باب مین ہو چکی اور لارڈ اشانلے وزیر ہندوستان کے مقرر ہوے تھوڑے عرصہ کے بعد جب لکھنؤ کے فتح ہونے کی خبر بلوایون کے ہاتھ سے پہونچی تب راقم نے بادشاہ کی رہائی کی وزرا سے درخواست شروع کی امر در فردا کا جواب ہوا کیا۔ اتنے مین وزرا کنسرویٹو پارٹی کے معزول اور لبرل پارٹی کے وزرا مقرر ہوے اوس وقت لارڈ اشانلے جو وزیر ہندوستان کے تھے اونھون نے سر فٹزراے کیلے کے نام جنھون نے ہماری درخواست استغاثہ کی پارلیمنٹ مین پیش کی تھی اور وزراے معزول کے ساتھ اٹرنی جنرل تھے کہ وہ بھی ایک وزارت کا منصب ہے ایک چٹھی لکھی اس مضمون کی کہ آپ کی ڈاک جو ہندوستان سے آئی ہے اوس سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کی رہائی زیر تجویز تھی یقین ہے کہ اگلی ڈاک مین خبر اون کی رہائی کی آویگی اور جو وزیر میری جگہ پر مقرر ہوا ہے اوس کو بادشاہ کے واسطے معقول بندوبست کرنے کا مین نے سمجھا دیا ہے اونھون نے وہ چٹھی اپنی چٹھی مین ملفوف کر کے میرے پاس بھیجدی راقم نے فوراً نقل اوس کی اپنی عرضی مین بادشاہ کے پاس روانہ کی اور لکھا مجھے امید ہے کہ یہ میری عرضی قصر سلطانی مین حضور کے پاس پہونچیگی مین امیدوار ہون کہ بمجرد قلعہ سے باہر

وزیر ہندوستان کی چٹھی جس مین بادشاہ کی رہائی زیر تجویز تھی اور اوسکے معتمد کی رہائی کی اطلاع

تشریف لانے کے مجھے اطلاع ہو کہ مین مقدمہ کی پیروی پھر شروع کرون - پہلا حکمنامہ میرے پاس
پہونچا کہ مابدولت قلعہ سے باہر آئے اب تم مقدمہ کی پیروی شروع کرو - اوس کے دو ہفتہ کے
بعد ایک حکمنامہ پہونچا کہ کچھ ضرورت تمھارے حاضر ہونے کی بیان واعی ہوئی فورًا اپنے
تئین بیان پہونچاؤ معلوم ہوا بادشاہ نے پیش قبول کرنے کی گورنر جنرل کو درخواست
دیدی اور چونکہ اوس کا عطا وہان سے محل میری معزولی پر عہدۂ سفارت سے ہوا تیسرا
حکمنامہ میری معزولی کا جاری ہوا اور ظاہر اگورنر جنرل کی درخواست سے اخبارون مین
اشتہار دیا گیا کہ فلانا شخص عہدۂ سفارت سے معزول ہوا کوئی اوس کی درخواست اور
اُس کا دعوے بادشاہ کی طرف سے کسی محکمہ مین لایق پذیرائی کے نہین ہوگا اب راقم آمادہ مراجعت
کا ہوا تب معلوم ہوا کہ ہمارے احباب نے اون پانچون قطعۂ اسٹام مین جعل کیا ہے - ایک قطعہ
پر چھ ہزار پانسو پونڈ کا ایک بل آف اکسچنج کا بنا کے ایک شخص سے روپیہ لے لیا جسکا
پیشتر ہزار روپیہ ہوا اور اوس شخص نے فورًا عدالت مین استغاثہ اوس کا میرے
اوپر پیش کر دیا اور چار قطعہ پر ہزار ہزار پونڈ یعنی دس دس ہزار روپیہ کا بل آف اکسچنج
بنایا مفصل ساری کہانی اس استغاثہ کی لکھنا حق ایک درد سر ہے - خلاصہ یہ ہے
کہ سب استغاثون کی جوابدہی کے سبب سے پانچ چھ برس مین گویا وہان مقید ہو گیا پہلا استغاثہ
جو پیش ہوا اوس مین جعل بخوبی ثابت ہوا اور چیف جسٹس عدالت کامن پلی نے باتفاق ارباب
اپیشل جیوری کے تجویز کیا کہ اوس مقدمہ مین جعل بھی ہوا اور مدعی نے باوصف جعل سے
آگہی کے روپیہ دیا اس واسطے مقدمہ کو ڈسمس کیا مگر مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست
کی وہ اوسی عدالت کے اجلاس کامل مین پیش ہوئی - ایک اور عدالت کے حاکم
کی راے میرے مخالف تھی اس سبب تجویز ثانی منظور ہو گئی - اتنے مین ایک اور شخص
نے دس ہزار روپیہ کی نالش کی وہ بھی مقدمہ مدعی کی غیر حاضری عمدی سے نن سوٹ ہوا مگر
اوس کو اختیار پھر استغاثہ کا حاصل تھا اور اول مقدمہ مین جو حکم تجویز ثانی کا ہوا تو اوسی حاکم کے

سامنے جس کی رائے کچھ میرے مخالف تھی اور ایک دوسری اسپیشل جیوری کے سامنے ایک برس کے بعد پہلے فیصلہ سے پیش ہوا اور پھر نئے سر سے تحقیقات شروع ہوئی ایکی دفعہ بارہو آدمیون نے ارباب جیوری مین سے یہ تجویز کیا کہ اس مقدمہ مین جعل ہوا ہے مگر گیارہ آدمی متفق تھے کہ مدعی مقدمہ کا جعل ہونے سے آگاہ تھا صرف ایک شخص اس امر مین مختلف الرائے ہوا اور اوس کے ذہن مین یہ جما کہ مدعی کو جعل کی اطلاع نہ تھی اور غالب گمان ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص مدعی کا جانیدار ہوگیا۔ موافق دستور کے ارباب جیوری آدھی رات تک مقید رہے کہ ایک امر پر متفق الرائے ہوجائین وہ ایک شخص ہرگز اس امر پر متفق نہ ہوا اوس جیوری کی برخاست ہوگئی اور حکم ہوا کہ پھر نئے سرے سے مقدمہ کی تحقیقات ایک اور نئی جیوری کے سامنے ہو۔ اس عرصہ مین میری طرف سے بڑی عدالت چنسری مین درخواست ہوئی تھی کہ پانچون بل آف ایکسچینج کے جو ایک شخص نے جعلی بنائے ہین وہ عدالت مین طلب ہوکے باطل کیے جاوین۔ یہ دعوے ایک حاکم ماسٹر آف رال کہلاتے ہین اون کے محکمہ مین پیش تھا پہلے اونھون نے صدور حکم کا اوس درخواست پہلے اوس پہلے دعوے کے ختم ہونے پر ملتوی کیا۔ جب اوس دعوے کی وہ نوبت پہونچی جس کا ذکر ہم نے کیا ہے تب اونھون نے وہ چار بل جو دس دس ہزار روپیہ کے تھے اون کو تو عدالت مین طلب کرکے منسوخ کیا اور وہ پہلا بل جو پینسٹھ ہزار روپیہ کا تھا اوس کو منسوخ نہ کیا اوس کے واسطے حکم دیا کہ بدستور نئے سرے سے کامن پلی کی عدالت مین فیصلہ ہو۔ اب اس مقام پر ذکر اپنے تعلقات کا لندن مین ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اور بعد معزولی کمپنی کے ہندوستان کی حکومت سے وزرائے سلطنت کے ساتھ جو تھا ضرور ہوا اس واسطے کہ وہی تعلقات موجب میری بربادی اور تباہی کے ہوئے جب ابتدا مین راقم لندن مین پہونچا صاحب کورٹ ڈایرکٹرز کے محکمہ مین اس امر پر گفتگو ہوئی کہ راقم فارسی دفتر گورنر جنرل کے میر منشی کے عہدہ سے برخاست ہوا ہے اس نظر سے سفارت بادشاہ کی منظوری کے لایق ہے یا نہین۔ اس مباحثہ مین باتفاق یہ تجویز ہوا کہ چونکہ گورنر جنرل نے

بادشاہ کی منظوری کے لایق ہے یا نہین۔ اس مباحثہ مین باتفاق یہ تجویز ہوا کہ چونکہ گورنر جنرل نے

مقدمہ جعل کے باطل کرنے کا حکم اوس کے ختم ہونے پر ملتوی رہا

کارپردازی میرے تعلقات کی کمپنی اور وزرائے جو باعث میری بربادی اور تباہی کے ہوئے

اس امر پر کچھ اعتراض نہین کیا ہے بلکہ سفارش کی ہے کہ سفرا کی تعظیم اور توقیر مین کوئی امر
فروگذاشت نہو۔ اور منجملہ کورٹ ڈیرکٹرز کے ممبرون کے ایک سرفرزرک کری بھی تھے جنہون نے
گورنمنٹ کے سکریٹری ہونے کی حالت مین مجھے برخاست کیا تھا اونھون نے وہان ظاہر اظہار
کیا کہ میری برخاست اوس عہدہ سے قصور کے ثبوت سے نہین ہوئی چونکہ فارسی دفتر مین ایک
فتور واقع ہوا تھا اور مین اوس دفتر کا سردار تھا اس واسطے میری برخاست ہوئی تھی۔ اس
نظر سے میری سفارت منظور ہوئی اور ہر طرح کے مراسلات اور مطارحات کمپنی کے قیام تک
کورٹ آف ڈیرکٹرز کے ساتھ اور بعد برخاست کمپنی کے اوراون کے حالت قیام مین بھی سلطنت
کے وزرا کے ساتھ جاری رہے اور راقم کو جب بادشاہ نے سفارت کے عہدہ سے معزول کیا
تب بھی مین مورد مراحم اور شفقت رہا چنانچہ انھین جعل کے مقدمہ مین جو راقم کے اوپر پیش تھے ہر
طرح کی وزیر ہند کی طرف سے میری اعانت رہی پہلا مقدمہ جعل کا جب ڈسمس ہوگیا تو مین نے
ارادہ کیا کہ فورًا لندن سے مین ہندوستان کی طرف معاودت کرون اس واسطے
ہندوستان کے وزیر کے پاس مین نے ایک درخواست گذرانی کہ میرا ارادہ معاودت
کا ہے لیکن مین یہان قرضدار ہوگیا ہون اگر پندرہ ہزار روپیہ نقد مجھے عطا ہون اور
جہاز کی سواری کا اجازت نامہ ملے تو مین یہان سے روانہ ہوجاؤن۔ ہندوستان
مین پہونچ کے یہ رقم مع جہاز کے کرایہ کے بادشاہ سے مین دلوادون گا اگر بادشاہ
نہ دینگے تو جس طرح سے ممکن ہوگا مین اپنے پاس سے ادا کرونگا۔ اوس کے جواب مین ایک خط
حسب الحکم وزیر ہندوستان کے میرے نام پر آیا کہ پندرہ ہزار روپیہ تمھارے قرض کے ادا کے
واسطے بھی دیا جائیگا اور جہاز کی سواری کا بھی اجازت نامہ ملے گا اور ہندوستان مین تم سے مواخذہ
اوس کی ادا کا نہین ہوگا مگر اس شرط پر کہ جعل کے مقدمہ کی جو مدعی نے تجویز ثانی کی درخواست
کی ہے جب وہ مقدمہ بالکل ختم ہوجائے تب تم یہان سے روانہ ہو۔ اس کے جواب مین راقم
نے لکھا کہ مجھکو یہان توقف کرنے مین کچھ عذر نہین ہے لیکن بادشاہ نے میری اعانت سے

میرا ارادہ ہندوستان کی طرف معاودت کرنے کا اور وزیر ہند سے روپیہ کا مانگنا اور اوسکا منظور کرنا

ہاتھ کھینچا ہے میری بیان بسرکس طرح سے ہوگی۔ اوس کے جواب مین اس پوٹنی ہفتہ میرے خرچ
کے واسطے سین ہوے جسکے چار سو روپیہ مہینہ سے کچھ زیادہ ہوا اور سارے میرے قرضخواہون کو
ایک اطلاع عام کی گئی کہ جو کچھ قرض فلانے شخص کے اوپر ہے وہ وزیر ہندوستان کے دفتر سے ادا
کیا جائیگا۔ بلکہ ایک مفسد نمک حرام نے جس کو مین نے نوکر رکھا تھا اوس نے ایک دعوے بیہودہ
میرے اوپر کیا تھا مسٹر ولیم کی جو ہندوستان کے وزیر کے دفتر مین دفتر پولیٹکل کے مہتمم اور سربراہ کار
ہین راقم کے وہ دوست بھی تھے اونھون نے ایک مجمع عظیم مین مجھ سے کہا کہ تم کو اپنے پاس سے تو
روپیہ دینا نہین پڑتا ناحق اس مقدمہ کی جواب دہی کرتے ہو مجھے اجازت دو مین روپیہ اوسکو دیدون
اور سب حضار کی طرف متوجہ ہوکے اونھون نے کہا کہ اگر سیح الدین خان یہان لاکھون روپیہ کے
قرضدار ہونگے۔ سب روپیہ یہان سے ادا کیا جائیگا۔ اسی طرح سب میرے قرضخواہون سے اور جو میرا
وکیل عدالت مین تھا اوس سے بھی کہا بلکہ تحریری اطلاع اون کو دی کہ تمھارا قرض ادا کیا جائیگا
جس کی طرف ابھی اوپر اشارہ ہوا ہے اور جب تجویز ثانی اوس مقدمہ کی منظوری ہوگئی اوس وقت
وزیر ہندوستان کے وکیل اور بیرسٹر کو حکم ہوا کہ میرے وکیل اور بیرسٹر کے ساتھ مشورہ کرکے کیفیت
مفصل اوس مقدمہ کی لکھے اوس نے ساری مقدمہ کی حقیقت دریافت کرکے وزیر ہندوستان
کے پاس ایک کیفیت بھیجی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اوس نے ابتدا سے انتہا تک سارے مقدمہ
کو دیکھا کسی طرح کا قصور اور فتور اوس مین سیح الدین خان کی طرف ہرگز نہین ہے نزاع اون کے اوپر
جعلی اور فریب ہے لیکن جمیع مقدمات مین جو عدالت مین رجوع کرین جب تلک حکم اخیر
حاکم کی طرف سے نہ ہو کوئی شخص حقیقت فیصلہ کی کہہ نہین سکتا۔ اگر خلاف اون کے حکم ہوجاے
چونکہ سرکار نے کل سیح الدین خان کے قرض کے ادا کا ذمہ کیا ہے سرکار کا بہت نقصان ہوگا
اس واسطے اگر مدعی اوس مقدمہ کا دس ہزار روپیہ لیکے اپنے دعوے سے ہاتھ اوٹھاوے
تو سرکار پر لازم ہے کہ اوتنا روپیہ ادا کرکے اس مقدمہ سے اون کا پیچھا چھوڑوادے۔ اور اگر اوتنے
روپیہ پر مدعی راضی نہ ہو تب مقدمہ کی جوابدہی کیجائے اوس سے زیادہ دینا مصلحت نہین ہے

بموجب اس کیفیت کے پہونچنے کے وزیر ہندوستان نے میرے وکیل کو حکم دیا کہ مدعی سے موافق
اوس کے تصفیہ کرنے کا بندوبست کرے اگر وہ راضی ہو تو دس ہزار روپیہ یہان سے ادا کیا جائیگا
مگر چونکہ مدعی راضی نہ ہوا وہ بندوبست ملتوی رہا۔ دو مرتبہ توجیہ اوپر ذکر ہو چکا ہے مقدمہ پیش
ہوا اور اوس کا نتیجہ لکھا گیا اور ایک دفعہ اور تیسرے مرتبہ پیش ہوا اوس دفعہ ارباب جیوری جو
مطلوب تھے اوس مین سے صرف گیارہ آدمی حاضر ہوے ایک نہین حاضر ہوا ایسی صورت مین
ایک دستور بندھا ہوا ہے کہ کوئی سرشتہ دار عدالت کا ایک لفظ پکار کے کہتا ہے ٹیلس یعنی تخاصمین
سے اجازت طلب کرتا ہے جو کوئی اجازت دیوے تو ایک کسی شخص کو جو محکمۂ عدالت مین حاضر ہین اوس
بارھوین آدمی کی جگہ پر بٹھلا دیتے ہین اس امر کو تخاصمین کے بیرسٹرون نے منظور نہ کیا اس سبب سے
اوس اجلاس مین بھی مقدمہ ملتوی رہا اور یہ دستور ہے کہ جب ایک اجلاس سے مقدمہ دوسرے
اجلاس پر گیا تو ایک سال کا بیچ مین وقفہ ہو جاتا ہے اس واسطے کہ صرف چھ مہینے ایام اجلاس
عدالت کے ہوتے ہین اور چھ مہینے تعطیل رہتی ہے اور ابتدا ہی مین قرار پا جاتا ہے کہ فلانا مقدمہ
بترتیب نمبر فلانے حاکم کے پاس پیش ہوگا جو رہ گیا یا اوس کی تجویز ثانی ہوئی تو خواہ مخواہ جب
دوسری دفعہ کچہریان کھلین گی جس کو ٹرم کہتے ہین تب فیصلہ ہوگا۔ راقم کی طبیعت ہر دفعہ مقدمہ کے
ناتمام رہنے کے سبب سے سخت گھبرائی۔ ایک بہت بڑی عدالت ہے جہان دو دفعہ اجلاس کرتے
ہین اون کو لارڈس جسٹس کہتے ہین وہ عدالت چنسری کی ایک شاخ ہے اور وہی دونون حاکم
عدالت بریوی کونسل مین بڑے اجلاس کرتے ہین اور تیسرے باب مین مذکور ہو چکا ہے کہ
چنسری عدالت کا ٹرم یعنی ایام اجلاس ایک مہینا زیادہ ہوتا ہے اور اوس عدالت مین
اوس ٹرم مین مقدمہ کم تھے اس واسطے وہان کے حاکمون نے حکم دیا تھا کہ جس عدالت
کے فریقین تخاصمین چاہین اوس عدالت مین مقدمے اونکو الا مین راقم چونکہ تاخیر
اتصال سے بہت گھبرایا تھا اپنے وکیلون کو حکم دیا کہ مدعی کے ساتھ بندوبست کرکے
مقدمہ اوس عدالت مین اونکو الیا کمن اس خیال سے کہ اوسی ٹرم مین مقدمہ کو وہ حاکم فیصلہ کر ڈالین

مرے مقدمہ کا رجوع مولا لارڈس جسٹس کی عدالت مین

مرزا ادیب علی شہر مرحوم

فسانۂ عجائب ۴ جلد
انشائے سرور ۶
امیر مینائی مرحوم
امیر اللغات مکمل
صنم خانۂ عشق
مراۃ الغیب
محامد خاتم النبیینؐ
مناجات
مکاتیب امیر مینائی
جلال مرحوم
سرمۂ زبان اردو
مطبوعۂ دلکش
نغمۂ کاروان
ارسال مستمر کیرتانیٹ
اغلاط نامۂ تاریخ
قواعد المنتخب

مرزا احمد عباس موج مرحوم

فسانۂ نادر جہان
پیاری سہیلی
دختر سحر
لیمون
منشی افضل حسین ثابت
حیات دبیر
دربار حسین

پنڈت رتن ناتھ سرشار

فسانۂ آزاد ۴ جلد
سیر کہسار
خدائی فوجدار
جام سرشار
الف لیلیٰ کا ترجمہ
کاشی
بھٹیاری دامن
پھکڑ پن
فتح اندلس
مادھوناک
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور
الغانصو
مفتوح فاتح
ظلیانا
نرد ال بغداد
لعبت چین
کیلی کا پھل
جرائے حق
بانک خری
طاہرہ
شوقین ملکہ
یوسف زنجبہ
آنسو
تسبیح کا دانہ
نغمات آزاد

پریم چند

پریم بتیسی
تاریخی و جغرافی مضامین
پنچ پرمیشور

مولینا عبدالحلیم شرر

جنید بغدادی
خواجہ معین الدین چشتی
عبرت کامل
حسن سرور کامل
مخدرات
نقش و نگار
مقدس نازنین
ایام عرب
فتح اندلس
مادھوناک
حسن کا ڈاکو
قاسم و زہرہ
نیرنگ جمال
انجینہ
سیکفن اور لوسی
مفتوح فاتح
ظلیانا
نرد ال بغداد
لعبت چین
کیلی کا پھل
جرائے حق
بانک خری
طاہرہ
شوقین ملکہ
یوسف زنجبہ
آنسو
تسبیح کا دانہ
نغمات آزاد

حکیم محمد سلیمان مرحوم

رام پیاری کامل
عبرت کامل
حسن سرور کامل
مخدرات
نقش و نگار
مقدس نازنین
ایام عرب

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ
نیرنگ جمال
انجینہ
سیکفن اور لوسی

خواجہ عبدالرؤف عشرت

زبان دانی
اصلاح زبان اردو
قواعد میر
اصول اردو
جان اردو
شاعری کی پہلی کتاب
دو موتی
تیسری کتاب
نغمات آزاد

منشی محمد حسن وحشی

آغاز و فتح حال
سیر رجال
مجموعۂ نشاط
چاند ہیر

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

یادایام
تذکرۂ علماء
خلافت راشدہ
خلافت نبوانیہ
خلافت عباسیہ
عباسیہ بغداد
علوم عرب
دوم
سوم
چہارم
پنجم
ششم
ہفتم
ہشتم
نہم
دہم
یازدہم

مولوی خلیل الرحمن

اخبار الاندلس جلد ۶
تاریخ مولدین
مختصر تاریخ اسلامی
سلطان صلاح الدین
نور الدین محمود

مولوی محمد انشاء اللہ

سیرۃ الرسول
تاریخ آل عثمان
حالات حاتم و معن
حالات سلجوقیہ
تاریخ عرب

مولوی محمد یعقوب انصاری

الاسلام والنصرانیہ
فتح اندلس
ابو مسلم خراسانی
تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

سیرۃ الصدیق
حیات شعر
اعراب ہند

منشی سجاد حسین مرحوم

مخزن
مکاتیب امیر مینائی
اخبار الظرفا
مذکرۃ الشعراء حسرت

منشی سعید احمد رہبری

آئینۂ اکبری
علمائے سلف
تذکرۃ الشعراء حسرت

کوئی ملک ۔۔۔ کا قابل ۔۔۔ ہری اور ان کی ۔۔۔ نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے ۔ قیمت صرف ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

ملنے کا پتہ ۔ انشاء پریس لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا محمد

خیالات عزیز ۱۲
ذکر یار ۱۲

خواجہ جلال الدین اختر

صدیق اکبر ۱۲
حضرت زید ۶
مشاہیر اسلام ۱۲
بغداد ۱۲
دمشق ۱۲
دیوان اختر غزلیات ۱۲

مفتی انوار الحق بی اے

تاریخ ابوالبشر ۸
تذکرۃ الحبیب ۱۲
حقایق اسلام ۱۲

میر دلی اللہ دلی اے

بندگی ۱۲
کاس الکرام ۱۲
لسان الغیب جلد اول
" " دوم ۱۲
" " سوم ۱۲
" " چہارم ۱۲

سید رئیس سبزواری اے

انصاب اردو ۱۲
جاپان کا تعلیمی نظام ۱۲
انتخاب مذہبی ۱۲

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن ۱۲
سیرۃ عائشہ ۱۲
حیات امام مالک ۱۲
خلافت عثمانیہ اور اسلام ۱۲
خلافت اور ہندستان ۱۲
فلسفہ جذبات ۱۲
مکالمات برکلے ۱۲
پیام امن ۱۲
تصوف اسلام ۱۲
فلسفیانہ مضامین ۱۲
زود و پشیمان ۸

منشی محمد طیب بی اے

اکبر ۱۲
اورنگ زیب ۱۲
رنجیت سنگھ ۱۲
لارڈ کلائو ۱۲

پروفیسر فیروز الدین مراد

تحفہ عباسی ۱۲
بادل کے بچے ۱۲
خونابہ عشق ۱۲

حکیم احمد شجاع بی اے

باپ کا گناہ ۱۲
حسن کی حقیت ۱۲

پروفیسر یاسین بی اے

مقدمات نظرت جلد اول ۱۲

مفتی عبد المجید سالک بی اے

ارادہ دیوم سنرلہا ۱۲
پیادہ دیگر افسانے ۱۲
مناظر قدرت ۱۲
علم الصحت ۱۲

مولوی عبد السلام ندوی

اسوہ صحابہ جلد سوم ۱۲
سیرت عمر بن عبد العزیز ۱۲
انقلاب الامم ۱۲
تاریخ الحرمین الشریفین ۱۲
تعلیم اسلام ۱۲
تعلیم نسوانی ۱۲
شعر العجم جلد سوم ۱۲

مولوی عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی ۱۲
ریاضی کا فلسفہ ۱۲

مولوی سید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول ۱۲
سیر انصار جلد سوم ۱۲
سیر الصحابیات ۱۲

مولوی عبد السلام ندوی

اسوہ حسنہ ۱۲
کتاب الوسیلہ ۱۲
تذکرہ یاد رفتگان ۱۲

خواجہ حسن نظامی

قرآن آسان قاعدہ ۱۲
میلاد نامہ ۱۲
صبح زندگی ۱۲
شام زندگی ۱۲
شب زندگی ۱۲
نور زندگی ۱۲
عرش بریں ۱۲
دربار سلاطین ۱۲
شادی بیاہ ۱۲
سیاہ و دل ۱۲
سراب مغرب ۱۲
بنت الوقت ۱۲
قطرات اشک ۱۲
جوہر قدامت ۱۲
عروس کربلا ۱۲
یاسمین شام ۱۲
تیغ کمال ۱۲
ماہ بیم ۱۲
محبوبہ بغداد ۱۲
سودرہ ۱۲

نیاز فتح پوری

گلستان جلی ۱۲
جذبات بہاشا ۱۲
نگار ستان ۱۲
صحابیات ۱۲
تاریخ الاولیین ۱۲

مولوی عبد الاشد الجزری

الزہرا ۱۲
صبح زندگی ۱۲
شام زندگی ۱۲
شب زندگی ۱۲
نور زندگی ۱۲
دربار سلاطین ۱۲
شادی بیاہ ۱۲
سیاہ و دل ۱۲
سراب مغرب ۱۲
بنت الوقت ۱۲
قطرات اشک ۱۲
جوہر قدامت ۱۲
عروس کربلا ۱۲
یاسمین شام ۱۲
تیغ کمال ۱۲
ماہ بیم ۱۲
محبوبہ بغداد ۱۲
سودرہ ۱۲

مولانا حشر مہانی

شرح دیوان غالب ۱۲
کامل دیوان حسرت ۱۲

سید سجاد حیدر بی اے

فلسفہ تمدن ۱۲
شباب لکھنؤ ۱۲

مولوی عبد الماجد بی اے

فلسفہ اجتماع ۱۲
فلسفہ مذاہب ۱۲
فلسفہ اخلاق ۱۲
فلسفہ اجتماع ۱۲
فلسفہ مذاہب ۱۲
فلسفہ اخلاق ۱۲

منشی احمد علی بی اے

تاریخ تمدن ۱۲
شباب لکھنؤ ۱۲

مسٹر ظفر عزمی اے

چوروں کا کلب ۹
ننھی چھتری ۱۲
بہرام کی گرفتاری ۱۲
مستقبل اسلام ۱۲

مولوی عبد الباری ندوی

تفسیر قرآن مجید پارہ عم
تفسیر قرآن مجید پارہ تبارک
تفسیر قرآن مجید پارہ قد سمع
تفسیر قرآن مجید پارہ سبح
تفسیر قرآن مجید پارہ والشمس
تفسیر قرآن مجید پارہ والسماء ذات البروج
تفسیر قرآن مجید پارہ والسماء والطارق
تفسیر قرآن مجید پارہ لا اقسم بیوم القیامۃ
تفسیر قرآن مجید پارہ لم یکن
تفسیر قرآن مجید پارہ اذا زلزلت
تفسیر قرآن مجید پارہ والعادیات
تفسیر قرآن مجید پارہ القارعۃ
تفسیر قرآن مجید پارہ الہکم التکاثر
تفسیر قرآن مجید پارہ والعصر
تفسیر قرآن مجید پارہ ویل لکل ہمزۃ
تفسیر قرآن مجید پارہ الم ترکیف
تفسیر قرآن مجید پارہ لایلف قریش
تفسیر قرآن مجید پارہ ارایت الذی
تفسیر قرآن مجید پارہ انا اعطینک الکوثر
تفسیر قرآن مجید پارہ قل یا ایہا الکافرون
تفسیر قرآن مجید پارہ اذا جاء نصر اللہ
تفسیر قرآن مجید پارہ تبت یدا ابی لہب
تفسیر قرآن مجید پارہ قل ہو اللہ احد
تفسیر قرآن مجید پارہ قل اعوذ برب الفلق
تفسیر قرآن مجید پارہ قل اعوذ برب الناس

مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی

مقدمات نظرت جلد دوم ۱۲
معارف لغت ۱۲
مناظر قدرت ۱۲
علم الصحت ۱۲

مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی

ظرافت لکھنؤ ۱۲
ظرافت لکھنؤ ۱۲
ظرافت لکھنؤ ۱۲

رجسٹرڈ نمبر ۲۷۰۸ سے ۱۷ سے ۱۷

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ ۸ روپے

قیمت فی پرچہ ۱/۸

محصول معاف

۱۹۲۵ء کی روانگی پر آدھا

اور

۱۹۲۶ء کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

ہمہ تنبیہ بھیجیے

۱۹۲۶ء کی روانگی پر الناظر ایک سال

اور

تمام کی روانگی پر ۱۹۲۷ء کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم	**مولانا آزاد مرحوم**	**مولانا نذیر احمد مرحوم**	**مولانا حالی مرحوم**	**مولانا شبلی مرحوم**	**مولانا داغ مرحوم**
اردوے معلی ۲ جلد	آب حیات	۷	یادگار غالب	۷	تاریخ ہند ۲ جلد
عود ہندی ۸ دہ عدد	دربار اکبری	۷	حیات سعدی	۲	جلد دوم
دیوان غالب بھیجی	خندان فکر	۷	بنات النعش	۹	مقدمہ شعر و شاعری
مکمل دیوان غالب	نگارستان	۱۲	مراۃ العروس	۱۲	حیات جاوید ۲ جلد
سرسید مرحوم					
خطبات احمدیہ					
مکمل مجموعہ لکچر					
اسباب بغاوت ہند					
سیرت فریدیہ					
خطوط سرسید					
نواب محسن الملک مرحوم					
مضامین نذیر					
مکمل مجموعہ لکچر					
تقلید و عمل بالحدیث					
پروفیسر شہباز مرحوم					
سلطانوں کی تہذیب					
خلیفہ محمد حسین مرحوم					
اعجاز القرآن					
سفرنامہ یورپ ۲ جلد					

				سیرۃ النبی ۲ جلد	
				جلد دوم	
				مسدس حالی	
				الفاروق	
				سیرۃ النعمان	
				الغزالی	
				المامون	
				سوانح مولانا روم	
				سفرنامہ مصر و روم و شام	
				علم الکلام	
مولوی امیر الدین احمد				الکلام	
				رسائل شبلی	
				مقالات شبلی	
				شعر العجم جلد اول	
سید محمود مرحوم					
مولوی سید احمد					

نئے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ مئی ۱۹۲۸ء

نمبر ۵ — جلد ۴۴

مہاراجہ صاحب محمود آباد کی غلط فہمی ۱

دائرہ سیاسیہ ۱۴

سفرنامۂ اندلس (نمبر۴) (ریویو) — مولوی محمد خلیل الرحمٰن مترجم اخبار الاندلس ۱۷

غزل — قائم چاندپوری شاگرد سودا ۴۳

ابن خلدون — رائے بہادر پنڈت شیونرائن صاحب ایڈیٹ ۴۴

غزل — مولوی حبیب اللہ خاں صاحب رامپوری ۴۶

سرکار دربار (ریویو) — مولوی محمود علی خاں (علیگ) ۴۷

غالب (تذکرہ) — مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی ۵۱

نظرے خوش گزرے ۶۴

سفیر اودھ — خود نوشت مولوی مسیح الدین خاں بہادر مرحوم ۱۱۳/۱۲۸

خطی

ذکر میر

میر تقی میر کی یہ خود نوشت سوانحعمری اگرچہ فارسی زبان میں ہے مگر اردو کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے قیمتی تبرک ہے۔ میر صاحب نے اپنے عہد کے تاریخی حالات بھی بڑی خوبی سے بیان کیے ہیں۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ قیمت عہ

طبقات الامم

قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ کی قابل قدر کتاب کا ترجمہ از قاضی اطہر میاں اختر جوناگڑھی جس میں دنیا کے مختلف قوموں اور خصوصاً مسلمانوں کے علوم و فنون کی تاریخ بیان کی گئی ہے

شائع کردہ دارالمصنفین — قیمت عہ

المشتہر نیر الناظر پریس بجنبی لکھنؤ

نئی کتابیں

تاج سخن - نواب فصاحت جنگ جلیل کا یہ دیوان حیدرآباد میں چھپکر نایاب ہوگیا تھا اب دوبارہ بحسن وخوبی تمام لکھنؤ میں چھپا ہے - شائقین فوراً طلب فرمائیں - قیمت عہ

حجۃ الاسلام - یعنی کتاب تحقیق المذاہب کا پہلا حصہ جسکے مطالعہ سے دوسرے ادیان وملل کے مقابلہ میں مذہب اسلام کے خصائص و امتیازات معلوم ہونگے - اسلامی تعلیم پر غیر مذاہب والوں کی جانب سے جو بے سروپا اعتراضات کیے جاتے ہیں اُن کے سنجیدہ اور مدلل جوابات بھی دیے گئے ہیں - کتاب ایک بار چھپکر مقبول ہو چکی ہے اب دوبارہ شایع ہوئی ہے - جستجو و تلاش کامل اور حسن بیان کے لیے مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کا نام نامی کافی ہے - قیمت ۸ عہ

دنیاے افسانہ - حیدرآباد کے لائق ادیب مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی نے فن افسانہ نویسی پر یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے - جسکے مطالعہ سے لوگوں کو نہ صرف ناول لکھنے میں مدد ملیگی بلکہ ملک میں اچھے اور بُرے ہر قسم کے ناولوں کی اشاعت ہوتی رہتی ہے اُنکے حسن و قبح کو لحاظ فن کے جانچنے میں مدد ملیگی - اُردو میں اپنی قسم کی یہ پہلی کتاب ہے - قیمت ۴ عہ

دکن میں اُردو - مولوی نصیر الدین ہاشمی کی اس قابل قدر کتاب پر الناظر میں عرصہ ہوا مفصل تبصرہ شایع ہو چکا ہے - مگر پہلی بار اسکے بہت کم نسخے چھپے تھے اس لیے شائقین محروم رہ گئے اب دوسرے ایڈیشن کے کافی نسخے آگئے ہیں - جنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی کے متعلق اس کتاب میں قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہے - قیمت عہ

ارباب نثر اُردو - یعنی فورٹ ولیم کالج کے اُردو نثر نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ - از مولوی سید محمد قادری ایم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن - قیمت عہ

مبادی فلسفہ - مولوی میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد نے ایک انگریزی کتاب کا ملخص ترجمہ پیش کیا ہے - جسکے مطالعہ سے جدید فلسفہ کے بنیادی اصول ذہن نشین ہوں گے - قیمت ۱۲ عہ

اسوۂ حسنہ - مولوی احمد عبداللہ المسدوسی متعلم بی اے جامعہ عثمانیہ کا دلچسپ مضمون حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حالات میں - قیمت ۸ عہ

ملنے کا پتہ:- الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۵ جلد ۳۴ مئی سنہ ۱۹۲۸ء

مہاراجہ صاحب محمود آباد کی غلط فہمی

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

ایک عزیز شفیق نے بمبئی سے واپس آکر یہ خبر سنائی کہ مہاراجہ صاحب محمود آباد وہاں مولانا شوکت علی صاحب مدظلہٗ سے اس بات کی بڑی شکایت کی کہ آپ لوگوں نے اخبار ہمدرد کا انتظام ظفر الملک جیسے میرے سخت دشمن کے سپرد کر دیا۔

مہاراجہ صاحب سے مجھے جن امور میں اختلاف رہا ہے اُن کا ذکر بارہا الناظر میں آچکا ہے۔ لیکن اُن اختلافات کے باوجود میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ مہاراجہ صاحب کا یا جن دیگر حضرات کے طریقِ کار سے اختلاف ہوتا رہتا ہے اُن میں سے کسی کا بھی میں دشمن نہیں ہوں اور نہ مجھے کسی سے کوئی پرخاش ہے۔

آزاد و رہ ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مہاراجہ صاحب کو بخوبی علم ہے کہ میرا اُن سے اختلاف کسی ذاتی معاملہ کی بنا پر نہیں۔ وہ جس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اُس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اُن سے اور بعض دیگر تعلقداروں

اور رؤسا سے میرے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات ضرور ہیں، اور جہاں تک کہ حدودِ شریعت اور قوانین اخلاق اجازت دیتے ہیں میں اُن تعلقات و مراسم کو حتی الامکان نباہتا بھی ہوں، لیکن میری زندگی کا مطمحِ نظر اور میرا طرزِ ماندو بود دونوں، اُن سب سے اتنی مغائرت رکھتے ہیں کہ ایسے اختلافی مسائل میں جنکا تعلق خانگی معاملات سے ہو، میرے لیے کوئی موقع ہی اس کا نہیں کہ میں ایک جانب یا دوسری جانب کھڑا ہو سکوں۔

مہاراجہ صاحب پر غالباً یہ امر بھی اچھی طرح واضح ہوگا کہ زندگی کی کسی منزل میں میرے ذاتی نفع و نقصان کا اُنکی ذاتِ گرامی سے بعید سے بعید تعلق بھی نہیں رہا۔ ابتدا میں جب مجھے اُنکی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، تو اُسوقت ممکن ہے کہ میرے دل میں یہ اُمنگ موجود ہو کہ میں رسالۂ الناظر کے لیے اُن سے کوئی اعانت حاصل کروں، لیکن جلد ہی مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ مہاراجہ صاحب یا دوسرے رؤساء کا ایکرم جب کسی اخبار نویس یا قومی کارکن کے سر پر سایہ فگن ہوتا ہے تو اُسے اپنے ضمیر و ایمان کو سلامت رکھنا دشوار ہو جاتا ہے، اس سارے طبقہ کی طرف سے میری توقعات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے مسدود ہو گیا اور غالباً اُن تمام قومی کارکنوں میں جو مہاراجہ صاحب کے سیاسی عروج کے زمانے میں اُنکی بارگاہِ علی میں حاضری دیا کرتے تھے اس عاجز کے متعلق مہاراجہ صاحب کو خود بھی پورا اطمینان ہوگا کہ قومی اغراض کے سوا کبھی کسی خفیف سے خفیف ذاتی ضرورت کے لیے بھی مجھے آستانہ بوسی کا شرف حاصل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ میں نے یہاں تک احتیاط ملحوظ رکھی کہ ایک دفعہ اردو کانفرنس کے سلسلے میں دوسرے رفقاء کار کے ساتھ مجھے مہاراجہ صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہونا پڑا۔ کھانے کا وقت آگیا۔ دسترخوان بچھا اور میرے اکثر ساتھیوں نے اُس میں شرکت کی مگر میں عذر کر کے اُٹھ آیا۔

ذاتی طور پر، مہاراجہ صاحب سے اس قدر بیگانہ رہنے کے باوجود میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک زمانے میں مجھے جناب ممدوح سے بہت کچھ عقیدت و ارادت حاصل تھی۔ اور جب تک پے بہ پے ایسے واقعات نہیں پیش آئے کہ مہاراجہ صاحب کا اصلی رنگ رُخ ظاہر ہو، سالہا سال تک اُنکی جانب سے عظمت و احترام کے جذبات میرے نہاں خانۂ دل میں پرورش پاتے رہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مہاراجہ صاحب کے متعلق عقیدت و احترام کی بنیاد صرف اُنکی وہ خدمات گرامی تھیں جو بظاہر وہ قوم و ملک کی انجام دیتے رہے تھے یا محض راقم الحروف کی ناتجربہ کاری

وعدم واقفیت - لیکن اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ جب مہاراجہ صاحب نے ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے چندہ میں ایک لاکھ کی رقم خطیر شامل کرنے کے علاوہ صوبۂ اودھ کی چندہ فراہم کرنے والی کمیٹی کی معتمدی کا بار گراں اپنے ذمہ لیا اور ملک کے دیگر حصص میں فراہمی چندہ کے لیے دورہ کرنے میں غایت درجہ کا جوش وانہماک ظاہر فرمایا، ایران میں روسی مظالم اور انگریزی ریشہ دوانیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں پیش پیش رہے، طرابلس اور بلقان کے مصیبت زدگان کے لیے گراں قدر عطیے مرحمت فرمائے اور مسلمانان ہند کے ساتھ ترکوں سے اظہار ہمدردی میں نمایاں طور پر حصہ لیتے رہے، مسجد کانپور کے قضیہ میں مردانہ وار سرجیمس مسٹن کے مقابلہ میں مسلمانوں کے رہنما بنگئے، مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے اور بالآخر دونوں کے درمیان سمجھوتہ کرادینے میں مستعدی، فیاضی اور اولوالعزمی ظاہر فرمائی، اور ترکی خلیفہ کے باغی شریف حسین کی غداری کے خلاف، فرنگی محل کے تذبذب اور شریف کی ہاشمیت وسیادت کے باوجود لکھنؤ کے پُرزور مظاہرہ کی صدارت کرکے برطانوی وسیسہ کاری کو بے نقاب کرتے ہوئے احرار مسلمین کی ہم نوائی فرمائی، تو ہر موقع پر راقم الحروف اور مسلمان آزاد وشریفوں کی ساری جماعت نے مہاراجہ صاحب کے ان عظیم الشان کارناموں کی دل سے داد دی - اور ہم میں سے ہر شخص نے اپنی بساط کے بموجب مہاراجہ صاحب کی ان تمام مہموں میں شرکت کی اور مہاراجہ صاحب کی سالاری وسرداری میں ایک ادنیٰ رضاکار کی طرح مصروف خدمت رہنا اپنا فرض جانا -

عین دسمبر ۱۹۱۶ء میں جبکہ ہندوستانی سیاست کے نقطۂ نظر سے مہاراجہ صاحب کا نیر اقبال نصف النہار پر تھا ایک عزیز محترم نے، جو اب افسوس کہ زندہ نہیں ہیں، پہلی بار مجھے اس حقیقت سے آشنا کیا کہ مہاراجہ صاحب کی فیاضیاں اور اولوالعزمیاں کسی اعلیٰ جذبۂ خدمت قوم وملک کے باعث نہیں بلکہ انکی رائے گرامی میں مہاراجہ صاحب کی حیثیت ایک ہوشمند سیٹھ، ساہوکار یا سرمایہ دار کی تھی جو نفع ونقصان کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے اور پائی پائی سے فائدہ اٹھانے کا اندازہ لگا لینے کے بعد بالکل ایک کاروباری آدمی کی طرح قومیات کی تجارت میں اپنا روپیہ لگائے -

مہاراجہ صاحب کے متعلق جو حسن عقیدت اُس زمانہ تک میرے دل میں جاگزیں تھا اُسکی بدولت مجھے اس رائے کے قبول کرنے میں کچھ عرصے تک بہت تذبذب رہا، باوجودیکہ وہ رائے ایک ایسے بزرگ کی تھی جو میرے بہ نسبت مہاراجہ صاحب کو زیادہ عرصے سے جانتے اور زیادہ قریب سے جانچتے رہے تھے، اور جنکی عالی دماغی واصابت رائے کا میں دل سے قائل تھا مگر رفتہ رفتہ واقفیت کا

بادل چھٹتا گیا اور چند روز کے تجربہ کے بعد مہاراجہ صاحب کی حالت مجھ پر آئینہ ہوگئی۔
مہاراجہ صاحب کی زرفشانی، آزاد منشی اور حسن اخلاق نے تنہا اس عاجز ہی کو نہیں بلکہ مسلمان آزاد خیالوں کی اکثریت کو اور دوسرے کثیر التعداد مسلمانوں کو بھی عرصے تک مہاراجہ صاحب کا گرویدہ بنائے رکھا۔ لیکن جیسے جیسے آزمایش و استحان کے نازک مواقع آتے گئے، مہاراجہ صاحب کے جوہر نمایاں ہوتے رہے، اور اب مشکل ہی سے کوئی ایک متنفس ہماری قلندروں کی جماعت کا ایسا بتایا جا سکتا ہے جو مہاراجہ صاحب کی رہنمائی کو قبول کرتا یا اُنکے ساتھ سیاسیات ملکی و قومی میں اگلی سے ہم آہنگی رکھتا ہو۔
البتہ اپنے مصلحت پسند دوستوں کے مقابلہ میں، میری آنکھیں کسی قدر یا کہنا چاہیے کہ سب سے پہلے کھلیں۔ اور بسبب اسکے کہ ملکی و قومی امور کے متعلق اظہار رائے میں میرا قلم بیشہ بیباک رہا ہے، شاید مہاراجہ صاحب کے متعلق سب سے زیادہ مجھ ہی کو لکھنے کا موقع ملا۔ بر انیہم جو کچھ مہاراجہ صاحب کے متعلق میں نے لکھا ہے اُس میں سے سوا اُس حصہ کے جسکے بارے میں الناظر کے دورِ جدید کے ابتدائی پرچہ میں اظہار معذرت کیا جا چکا ہے ایک حرف کو بھی اُس لیے بغیر میں پورے وثوق و اطمینان کے ساتھ یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میرے دل میں مہاراجہ صاحب کی طرف سے کبھی دشمنی کا کوئی جذبہ نہ تھا، اور سوائے مفاد عامہ سے تعلق رکھنے والے معاملات کے جن پر تنقید و تبصرہ کرنا ہر ضمیر انسانی کا مسلمہ فریضہ اور جنکے متعلق موافق و مخالف جد وجہد کرنا ہر انسان کا غیر مشتبہ حق ہے، کبھی کسی ایسے معاملے سے میرا تعلق نہیں رہا جو مہاراجہ صاحب کے ذاتی و خانگی امور میں داخل ہو یا جسکو کسی ذاتی یا شخصی عناد پر محمول کیا جا سکتا ہو
مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں مہاراجہ صاحب نے اپنے سابقہ مواعید کو بھلا کر اور ہمارے ہی دوستوں میں سے بعض کو ملا کر حکومت کے مصالح و منشا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تو میری رائے ناقص میں مہاراجہ صاحب کی یہ کارروائی نہایت غلط اور مسلمانوں کے مفاد کے قطعی خلاف تھی۔
۱۹۱۷ء میں جب ہوم رول کی تحریک کو دبانے کے لیے مسز بسنٹ نظر بند کی گئیں تو ہندوستان کے کثیر التعداد باشندوں خصوصاً بنگال کے پُرجوش کارکنوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ کانگریس کی صدارت پر اُس خاتون محترم کو فائز کریں، مہاراجہ صاحب کے احباب و ہوا خواہ اصرار کر رہے تھے کہ دوسرے تمام لیڈروں کی طرح وہ بھی کانگریس کی صدارت سے مسز بسنٹ کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور بنگال میں سے سید رضا تھ بنرجی اور

سی آر داس کی جماعتوں میں جو نزاع برپا تھی اپنی دست برداری سے اُس کا خاتمہ کر دیں مگر مہاراجہ صاحب نے ایک نہ سنی، اور باعزت دست برداری پر ووٹوں سے شکست پانے کو ترجیح دی۔ میری ناچیز رائے میں مہاراجہ صاحب کا یہ طریق کار بھی کثیر غیر دانشمندانہ اور ہندوستان کے مفادِ عامہ کے لیے مضر تھا۔

۱۹۲۰ء میں سید وزیر حسن صاحب کی غفلت و بے توجہی سے مسلم لیگ کے حالات ابتر ہو رہے تھے اور اُنھوں نے بالآخر میرے مشورہ سے یا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میرے مطالبہ پر اخبارات میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ سکرٹری نہیں رہنا چاہتے۔ قوم کو اس کا پورا موقع تھا کہ جدید انتخاب کر کے مسلم لیگ کی خراب و خستہ حالت کو سدھارنے پر توجہ کرے اور مسلم لیگ کی کونسل کے بعض پُرجوش اراکین کی بھی یہی خواہش تھی مگر مہاراجہ صاحب کی اس ضد نے کہ اگر سید وزیر حسن صاحب سکرٹری منتخب نہ کیے جائیں گے تو میں بھی صدارت قبول نہ کروں گا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ کو مجبور بنا دیا اور انھیں اپنے بعض رفقاء کار کی رائے کے خلاف پہلی بار کے انتخاب کو مسترد کرا کے دوبارہ کوشش کر کے سید وزیر حسن صاحب کو منتخب کرانا پڑا۔ مہاراجہ صاحب کی اس ضد کو میں نے یقیناً مفاد اسلامی سے بے پروائی اور شخصی و ذاتی جذبات کی نگہداشت کا مرادف سمجھا۔

مسلم لیگ کے اسی دہلی والے اجلاس کے موقع پر ترکوں کے معاملات سے متعلق جو اہم ترین تجویز تھی، مہاراجہ صاحب نے کونسل کے جلسہ میں وعدہ فرمایا کہ کل وہ خود پیش کریں گے۔ جس روز یہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہونیوالی تھی، مہاراجہ صاحب کا غیر حاضر ہو جانا اور آگرہ کی سیر کیلئے تشریف لیجانا کسی ایسے شخص کو پسندیدہ نہیں معلوم ہوا جو اُس جلسہ میں شریک اور ان حالات سے واقف تھا۔

مسلم لیگ کی صدارت قبول کرنے کے تین مہینے کے اندر مہاراجہ صاحب کا استعفا دینا اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے اُنکی صدارت کی خاطر سید وزیر حسن صاحب کو سکرٹری بنوا کر خود اپنے بعض رفقا کی ملامت مول لی تھی جس قدر شاق ہوا ہوگا اُسکا اندازہ کچھ دشوار نہیں ہے۔

۱۹۱۹ء میں مسئلۂ خلافت سے متعلق لکھنؤ میں ایک جلسہ تمام صوبوں کے مسلمان اہل حل و عقد کا منعقد کیا جانے لگا تو مہاراجہ صاحب نے جلسہ کے اعلان پر دستخط چھپ جانے کے بعد اس جلسے سے بے تعلقی اختیار کی۔ اور یہی نہیں کہ اعلان سے دستخط واپس لے لیے بلکہ جلسہ کے معاونت اور انتظامات تک میں شرکت گوارا نہیں کی اور اپنے اشتعال انگیز اور تحقیر آمیز رویہ سے مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ وغیرہ کو سخت ناگواری و برہمی کا موقع دیا۔

تحریک خلافت میں مہاراجہ صاحب نے کوئی حصہ نہ لیا تا آنکہ ۱۹۲۰ء کے آخر میں مہاراجہ صاحب نے گورنمنٹ کی ملازمت ترک کرکے اپنے تئیں سیاسیات ملکی سے بالکل منقطع کرلیا۔ اُنکی اس کارروائی کے متعلق دو رائیں ہونا ممکن ہے۔ جو لوگ گورنمنٹ سے اتحادِ عمل کرنا پسند کرتے ہیں جیسے لبرل یا معتدلین، اُنکے نزدیک تو یہ طرزِ عمل غلط نہیں ہوسکتا، لیکن مہاراجہ صاحب نے ہمیشہ اپنے تئیں نیشنلسٹ کہا اور اس جماعت کے لوگ اس قسم کی سرکاری ملازمتوں کو قطعاً ناپسند کرتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں مہاں سرلے شاہی میں مقیم تھا۔ ڈیڑھ سال بعد جب دوبارہ قومی و ملکی تحریکات میں حصہ لینے کا وقت آیا تو ممکن تھا کہ مہاراجہ صاحب کے اس عہد کے بعض کارناموں پر تبصرہ کیا جاتا، لیکن ایک تارکِ موالات کو اول تو حکومت کے معاملات سے چنداں سروکار نہیں دوسرے یہ خیال کرکے کہ مہاراجہ صاحب دانستہ یا نادانستہ تحریکاتِ عامہ سے الگ ہوگئے ہیں، اُنکے اعمال و کردار کے کسی قسم کا تعرض مناسب نہیں سمجھا گیا۔

ہوم ممبری سے واپسی کے بعد مہاراجہ صاحب نے ابن سعود کی مخالفت پر کمر باندھی اور اگرچہ پُرانے رفقائے کار میں سے ایک بھی اُنکا ساتھ نہ دے سکا تاہم اُنھوں نے اپنی سی تو کر ہی ڈالی۔ حجاز کانفرنس کے انعقاد سے لیکر وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لیجانے اور ملکِ معظم کے نام اپنی جانب سے ایک تار دینے اور اُسے مسلمانانِ لکھنؤ کے جلسہ کا پیام قرار دینے تک کی کل کارروائی دنیا کے سامنے موجود ہے۔

بیشک اس تحریک میں بعض ایسے مسلمان بھی اُنکے شریک کار رہے ہیں جن سے زیادہ دانشمندانہ طرزِ عمل کی توقع کی جاسکتی تھی، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ بہت سے لوگوں نے اُنکی کارروائی کو سخت ناپسند کیا۔ اُنکے دوستوں علی برادران تک نے وائسرائے کے پاس ڈیپوٹیشن لے جانے یا ملکِ معظم کے پاس تار بھیجنے کو پسند نہیں کیا۔ اِس عاجز کی رائے مسئلہ حجاز میں واضح طور پر نہ صرف مہاراجہ صاحب اور خدام الحرمین کے خلاف تھی، بلکہ ابتدائی مراحل کے بعد سے محترم علی برادران اور اُنکے رفقاء سے بھی مختلف رہی، اور اسی سبب سے اس باب میں میری جد و جہد دونوں کی نگاہوں میں مردود قرار پائی۔

مہاراجہ صاحب نے نئے دورِ عمل میں قدم رکھتے ہی ایک روزانہ انگریزی اخبار نکالنے کی جد و جہد شروع کی۔ مہاراجہ صاحب کے پاس عرصہ تک I.D.T. (انڈین ڈیلی ٹیلیگراف) رہا ہے اور مجھے اس سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ اب بھی اگر مہاراجہ صاحب کا کوئی ذاتی

اخبار نکلتا تو کسی کو زیادہ تردد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ گو اخبار شایع ہونے کے بعد اُسکی پالیسی وغیرہ کا معرض بحث میں آنا ناگزیر ہے۔ مگر راجہ صاحب کی کوشش چونکہ یہ رہی کہ پبلک کے روپیہ سے اخبار نکلے۔ اس لیے ہر قومی کارکن کو اخبار کے متعلق رائے زنی کا پورا حق حاصل ہے۔

انگریزی اخباروں کی ضرورت تقریباً ہر پڑھا لکھا مسلمان محسوس کرتا ہے۔ لیکن جس طریقہ پر مہاراجہ صاحب اخبار نکالنا چاہتے ہیں اُس سے مجھے اور اکثر اصحاب کو اختلاف ہے، بر انیم میں نے بالقصد اپنے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ مگر اتفاق سے ایک واقعہ ایسا پیش آگیا کہ بعض اصحاب کے طرز عمل نے مجھے اپنے اختلاف کے اظہار پر مجبور کر دیا۔ اکتوبر ۲۶ء میں پراونشیل لیگ کا جلسہ میرٹھ میں تھا۔ میں بھی شریک ہوا۔ آخری اجلاس میں جبکہ پراونشیل لیگ کی کونسل کے اکثر ارکان اور صوبہ کے بیشتر معززین رخصت ہو چکے تھے اور جلسہ بالکل چراغ سحری ہو رہا تھا، دفعتہً مولوی محمد یعقوب صاحب وکیل مرادآباد و ڈپٹی پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک تجویز مہاراجہ صاحب کے اخبار کی تائید میں پیش کر دی۔ مجالس کے دستور کے مطابق، جلسۂ عام میں کوئی تجویز پیش نہیں ہو سکتی جب تک کہ مجلس مضامین نے اُسے منظور نہ کر لیا ہو یا کم سے کم اکہین مجلس مضامین کی اکثریت کی رائے کے خلاف بطور ترمیم کے اُسے جلسہ عام میں پیش کرنے کی پہلے سے اطلاع نہ دیدی گئی ہو۔

لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی پریسیڈنٹ صاحب اگر مجالس عامہ کے قوانین و دستور کے کسی مصلحت کی بنا پر تجاہل عارفانہ برت رہے تھے، تو صدر جلسہ کا فرض ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کھلی ہوئی بےقاعدگی کو روک دیتے۔ لیکن لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی پریسیڈنٹ کی مرعوب کن شخصیت کا اثر تھا یا جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر صدر صاحب نے مندرجہ ذیل ظاہر فرمایا، اُنکو اندیشہ تھا کہ مہاراجہ صاحب اسے ذاتی رنجش کا نتیجہ نہ قرار دیں۔ انھوں نے باوجود کئی بار مطالبہ کے اعتراضات کیے جانے کے معزز ممبر کو اپنی تجویز پیش کرنے کی اجازت دیدی۔ اور اس طرح مجھے مجبور ہونا پڑا کہ برسرعام تجویز سے اختلاف ظاہر کروں۔

اُس جلسہ میں تو میری مخالفت کا صرف یہی سبب تھا، لیکن میں اس موقع پر مختصراً وہ وجوہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں جن کی بنا پر مجھے اس اخبار سے اختلاف ہے۔

(۱) مسلمانوں میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد اگرچہ اب اتنی کافی ہو گئی ہے کہ انگریزی کے روزانہ اخبار ہر بڑے صوبہ سے نکلنا چاہیے مگر افسوس ہے کہ اس جماعت میں خود غرضی اور بےحسی

اس درجہ کی ہے کہ غیر معمولی جدوجہد کے بغیر کسی روزانہ اخبار کو چلانا آسان نہیں ہے۔

(۲) مہاراجہ صاحب کے پاس عرصہ تک ایک انگریزی روزنامہ رہا جسکے خریداروں کی تعداد بہت محدود رہی اور جسے مالی حیثیت سے کبھی کامیابی نہ ہوئی۔ نئے اخبار کے لیے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہونے سے رہا۔

(۳) اخبار کے لیے سب سے اہم سوال پالیسی اصول و رائے کا ہوتا ہے۔ مہاراجہ صاحب اپنے تئیں نیشنلسٹ کہتے ہیں۔ اگرچہ وہ نیشنلسٹ جو کبھی اُن کے دوش بدوش کام کرتے تھے اب اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ اُنکے سامنے مہاراجہ صاحب اور معتدلین ہم پلہ قرار دیے جاسکتے ہیں بلکہ شاید بعض امور میں معتدلین بھی مہاراجہ صاحب سے آگے نکل جائیں۔

مہاراجہ صاحب کے ساتھ جو حضرات اس اخبار کے انتظام میں شریک ہیں بعض اُن سے بھی کم درجہ کے نیشنلسٹ ہیں اور بقیہ وہ ہیں جو نیشنلزم کو یا تو سمجھتے نہیں یا سمجھتے ہیں تو اُس سے دُور بھاگتے اور موقع ملے تو اُس کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ ہمارے دوست چودھری خلیق الزماں صاحب سوراجسٹ بھی محض اس غرض سے اخبار کے بورڈ میں رکھ لیے گئے ہیں کہ آزاد خیال طبقہ کی بھی برائے نام نمایندگی بھی قائم رہے۔ اب ہر شخص خود سوچ اور سمجھ لے کہ جس اخبار کی انتظامی جماعت اس منوبہ سے تیار ہوئی ہو اُس کی پالیسی کیا ہو سکتی ہے۔

مسلمانوں کا موجودہ عام رجحان یہ ہے کہ ہندوؤں نے جو مخاصمانہ اور جنگجویانہ رویہ اختیار کیا ہے اس کا ترکی بترکی جواب دیا جائے۔ اور یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم مخالفت اور مخاصمت کے جذبات کو اشتعال ہی دیا جائے۔ اور آج وہی اخبار کامیابی سے چل رہے ہیں جو اس فرقہ وارانہ مخاصمت کے جذبہ کا اتباع کرتے ہیں۔ مہاراجہ صاحب کے اخبار سے اسکی توقع نہیں کیجا سکتی کہ انکا اخبار فرقہ وارانہ جذبات کی تائید کرے گا اور اسلیے یقینی ہے کہ اسکو مسلمانوں میں وہ ہر دلعزیزی حاصل نہ ہوگی جو ایک کامیاب اخبار کے لیے ضروری ہے۔

(۴) مہاراجہ صاحب خود رئیس ہیں اور اُنکے شرکا میں سے ایک کے سوا جو ایک کامیاب ملک التجار ہیں، کوئی صاحب انگریزی اخبار اور انگریزی پریس کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے۔

(۵) آئی ڈی ٹی تو انگریزی اخبار تھا، روزنامہ ہمدم کو بھی یہ لوگ کامیابی سے نہ چلا سکے۔ اور جو شبہ نقصان اُٹھاتے رہے۔ البتہ جب سے خان بہادر سید احمد حسین رضوی مالک کا غذ بنا کو جیسے کامیاب و تجربہ کار تاجر کے ہاتھ میں اُسکا انتظام دیا گیا ہے اخبار کی مالی حالت کچھ سدھری

ہے۔ اور اگرچہ یہی خان بہادر صاحب اس انگریزی اخبار کے منتظم بھی قرار دیے گئے مگر شبہ کے کافی وجوہ ہیں کہ وہ بھی اس کام کو بہ احسن وجوہ انجام نہیں دے سکتے۔ اور اب تو سنا جاتا ہے کہ وہ بھی اس دردسری سے دستکش ہو گئے ہیں۔

(۶) ہمارے صوبہ میں الہ آباد کے روزنامہ انڈیپنڈنٹ سے زیادہ شاید ہی کسی کو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہو۔ لیکن اُس کا حشر کیا ہوا؟ اسکی داستان پنڈت موتی لال نہرو صاحب سے سُنیے یا عدالت کی رپورٹ ملاحظہ فرمائیے۔ جہاں تک مجھے علم ہے تین لاکھ روپے کا سرمایہ اُس میں غرق ہو گیا۔

الہ آباد کا دوسرا روزنامہ لیڈر بھی سالہا سال تک نقصان سے چلایا گیا ہے۔ اور اگر پنڈت مدن موہن مالوی، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر چنتامنی کے سے قومی لیڈر اُسکے معاون و کارکن نہ ہوتے تو اس کا بقاء و قیام بھی مشتبہ رہتا۔

مسلمانان بنگال کا دیرینہ خادم مسلمان آج تک انھیں اندیشوں سے روزانہ نہیں کیا جا سکا اور پنجاب کا مسلم آؤٹ لک، احمدی جماعت کی اولوالعزمیوں کے باوجود اسوقت تک خسارہ سے نکل رہا ہے۔ ان حالات میں مجوزہ انگریزی روزنامہ کا نکالنا بعض اشخاص کے لیے ممکن ہے کہ مفید مطلب ہو، مگر قومی اغراض کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اندیشہ ہے کہ نقصان پہونچا دے گا۔

سطور بالا میں اجمال کے ساتھ اُن تمام واقعات کا ذکر کر دیا گیا ہے، جن کی بنا پر مجھے مہاراجہ صاحب کے طریق کار پر نکتہ چینی کرنے یا اُنکی کوششوں کا توڑ کرنے کے لیے مخالفانہ جد و جہد کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اور باوجودیکہ مہاراجہ صاحب کی طرف سے کسی بلند و رفیع کارنامہ کی اب کوئی توقع باقی نہیں رہی تاہم میں اتنا حسن ظن ضرور رکھتا تھا کہ مہاراجہ صاحب اپنی مالی تنگدستی کی وجہ سے اس قسم کے اختلافات کو ذاتی و شخصی مخالفت کی بنیاد نہ قرار دیں گے اور سائمن کمیشن وغیرہ کے معاملات میں یا اور ایسے معاملات میں جن میں وہ اپنی محدود آزادی کے حدود میں رہ کر کچھ کام کرنا چاہیں گے اہم قلندروں کے ساتھ اشتراک عمل کر سکیں گے۔ لیکن جو اطلاع مجھے پہونچی ہے اُس کی بنا پر مجھے افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مہاراجہ صاحب اپنی اعلیٰ منزلت سے اتنے نیچے اُتر آئے ہیں کہ میری نکتہ چیں نگاہ بھی اب تک وہاں نہ پہونچ سکی تھی۔ اور میں بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ میری توقعات کے خلاف اس بارے میں سید وزیر حسن صاحب کا کردار عمل

اُن سے بہت بہتر رہا۔ ۱۹۱۷ء میں رفاہ عام ہال کے ایک جلسہ میں جب عہدہ داران مسلم لیگ کے خلاف میں نے ملامت کا ووٹ پیش کیا تو اُس کا اثر براہِ راست اور سب سے زیادہ اُنھیں پر پڑا۔ چنانچہ اُنھوں نے اُسی وقت استعفا دیدیا اور اُسوقت تک استعفا واپس نہ لیا جب تک مسلم لیگ کے بہت سے معزز اراکین اور صدر جلسہ مرحوم سید آل نبی کی درخواست پر میں نے وہ تجویز ملامت واپس نہیں لی۔ ۱۹۱۸ء میں بمقام دہلی دوبارہ صرف اُنھیں کے خلاف تجویز ملامت پیش کی گئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لیگ کے حسابات کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیشن بٹھادیا گیا۔ اور جنوری ۱۹۱۹ء کے الناظر میں جو کچھ میں نے اُنکے متعلق لکھا اُس کی بدولت بالآخر اُنھیں مسلم لیگ سے مستعفی ہوجانا پڑا۔ لیکن میں اُنکی شرافتِ طبع کا معترف ہوں کہ اسکے بعد اُنھوں نے کبھی میرے ساتھ بیگانوں کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ آج تک جب کبھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس طرح ملتے ہیں جیسے میرے اُنکے درمیان کوئی اختلاف کبھی رونما ہی نہیں ہوا تھا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اُنکے مسلم لیگ سے علیحدہ ہوجانے کے بعد میرے اُنکے درمیان کوئی اختلاف باقی بھی نہیں رہا۔ مہاراجہ صاحب جیسے بلند مرتبہ اُنھیں میں یقیناً اس سے بہت زیادہ رفیع الخیالی ہونا چاہیے تھی۔ لیکن اگر وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تو انکو چاہیے کہ قومیات و سیاسیات کے اکھاڑے سے الگ رہیں۔ جب وہ ہوم ممبری سے واپس آئے تھے تو سُنا گیا تھا کہ اب وہ خاموشی کے ساتھ اپنی ریاست میں رہ کر زمینداری کے کاموں میں مصروف رہیں گے۔ اگر ایسا وہ کرسکتے تو شاید اُنکے لیے اور قوم وملک کے لیے بہتر ہوتا۔ سیاسیات قومی وملکی میں اب اُنکو وہ جگہ حاصل نہیں ہوسکتی جو ۱۹۱۸ء تک حاصل رہی۔ مہاتما گاندھی کے میدانِ عمل میں آنے کے بعد سے ہندوستان کی سیاسیات اب رئیسوں کا مشغلہ اور کرسی نشینوں کا کھلونا نہیں رہ گئی ہے۔ اور اگر کہیں اس کا سامان ہے تو شوق سے مہاراجہ صاحب وہیں اپنی لیڈری اور سرداری کا سکہ جمائیں۔

رہا ہمدرد کے انتظام کا معاملہ، تو یہ سب کو معلوم ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنا اخبار مجبور ہوکر بند کردینے کا ارادہ کیا تھا۔ حالانکہ اگر مہاراجہ صاحب کی فیاضانہ امداد اُنکو حاصل ہوتی رہتی، تو اسکی نوبت شاید نہ آتی۔ اور گو میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا محمد علی اب مہاراجہ صاحب کے کام کے نہیں رہے اور مہاراجہ صاحب جو روپیہ اُنکے اوپر یا اُنکے کاموں پر صرف کرینگے وہ تجارتی اصطلاح میں بٹے کھاتے میں جائے گا۔ لیکن پھر بھی اگر صرف اس لیے کہ مہاراجہ صاحب سے اختلاف رکھنے والا اور اُسکے اظہار کی جرأت کرنے والا یہ عاجز ہمدرد کا منتظم نہ رہے مہاراجہ صاحب

میرا ناچیز مشورہ قبول فرمالیں اور ایک ہزار روپیہ ماہوار ہمدرد کا مقرر کردیں تو ہمدرد بغیر کسی خسارہ کے چلایا جا سکے گا۔ اور ضرورت نہ رہے گی کہ میں لکھنؤ سے جاکر اُس کے انتظامات کی نگرانی کروں۔

مہاراجہ صاحب سے جو اختلافات رہے۔ کم و بیش اسی قسم کے اختلافات سر محمد شفیع اور بعض دوسرے حضرات سے بھی رہے ہیں۔ خصوصاً مسلم یونیورسٹی کے معاملات کی وجہ سے بزرگانِ علیگڈھ کی رایوں اور طریق کار سے بار بار مجھے اختلاف کرنا پڑا ہے۔ سر شفیع پنجاب میں رہتے ہیں اور اس سبب سے اُنکی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کے مواقع شاذ و نادر ہی نصیب ہوتے ہیں، لیکن دیگر حضرات سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ میری روش اور تحریروں سے سخت ناراض ہونے کے باوجود اُن میں سے کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو مجھے اپنا دشمن تصور کرتے ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی صاحب کے دل میں یہ خیال ہو تو میں باادب ہر اعتراض کرونگا کہ وہ بھی غلطی پر ہیں۔

ایمرسن کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ اختلاف رائے کے سوا انسان کا ہر گناہ معاف کیا جا سکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ مہاراجہ صاحب اور دوسرے حضرات جن سے میں اختلاف کرتا رہا ہوں حق بجانب ہونگے اگر میرے اس گناہ کو ناقابل عفو تصور فرمائیں۔ مہاراجہ صاحب کے مقابلہ میں میرا یہ گناہ اور بھی زیادہ سنگین ہونا چاہیے کہ لکھنؤ اُنکے اثر و اقتدار کا مرکز ہے۔ جہاں اُن کے ہر طبقہ کے اعوان و انصار موجود ہیں اور اس سبب سے شاید اُنکے لیے یہ امر بالکل خلافِ توقع وقوع پذیر ہوا کہ اُنکے کثیر التعداد دوستوں اور ہواخواہوں کے علی الرغم ایک نہایت حقیر و ناچیز ہستی نے جلسۂ عام منعقد کرکے اُنکے خلاف ملامت کی تجویز پیش کی اور وہ اُنکے بعض نادان دوستوں کی مخالفت کے باوجود منظور ہوگئی۔

لیکن بجائے اسکے کہ وہ اس ملامت کرنے والی جماعت یا اُنکو دعوتِ اجتماع دینے والے کو اپنا دشمن قرار دیں اُنھیں سوچنا چاہیے تھا کہ اس قسم کی تحریک کیوں پیدا ہوئی اور اُنکے وسیع ترین حلقۂ اثر کو نظرانداز کرکے کیسے کامیابی کی منزل سے گزر گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ صاحب کے طریق کار اور طرزِ عمل نے کثیر التعداد مسلمانوں کے قلوب اُنکی طرف سے پھیر دیے ہیں۔ لوگ اپنے ذاتی تعلقات، اپنے شخصی اغراض، یا اپنے فطری ضعف کی بدولت ممکن ہے کہ دلوں کی بات کو زبان پر لانے کی ہمت نہ رکھتے ہوں، یا نقصان کے خطرہ سے ایسی کسی تحریک میں علی شرکت گوارا نہ کریں جس کا مقصود یہ ہو کہ مہاراجہ صاحب کی روش کے خلاف مظاہرہ کیا جائے مگر وہ دل سے

یقین۔ کہتے ہیں اور خانگی صحبتوں میں بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے ہیں کہ مہاراجہ صاحب غلطی پر ہیں، اور اس سبب سے مہاراجہ صاحب کے خلاف جو مظاہرے کیے جائیں وہ اُن سے ہمدردی رکھتے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اُنکی مخالفت پسند نہیں کرتے۔

بے شبہہ فرنگی محل کے اصحاب اور بہت سے دوسرے لوگ جو سلطان ابن سعود کی مفروضہ وہابیت سے سخت بیزار ہیں، دل سے مہاراجہ صاحب کے ساتھ تھے۔ لیکن فرنگی محل والے بھی اسکے لیے تیار نہیں کہ اس باہمی نزاع میں انگریزوں کو دعوتِ مداخلت دیں۔ اور لکھنؤ کے کثیر التعداد مسلمانوں کو تو خود فرنگی محل والوں سے شدید اختلاف ہے کہ اُنھوں نے اس معاملہ میں شیعہ مجتہدین اور شیعہ رؤسا کے ساتھ شرکت کرکے اہل سنت کی تذلیل و دلآزاری کا سامان فراہم کیا۔ میرے مصلحت پسند احباب، ایسے مواقع پر دیدہ و دانستہ خاموش رہتے ہیں اور بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ

"گفتن آئینِ ہوشیاری نیست"
(گرچہ دانستن اختیاری نیست)

لیکن میں نے قومی و ملکی معاملات میں، خصوصاً جب کبھی امر حق کے اظہار کی ضرورت ہو، ہمیشہ "ہوشیاری" پر بے ہوشی کو ترجیح دی ہے۔ اور خدا سے دعا ہے کہ اسی مشرب پر زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

برا نہیں اُن امور میں اپنے احباب کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے میں کبھی مجھے عذر نہیں ہوتا جن میں اُنکی روش کو میں صحیح سمجھتا ہوں اور نہ وقتی و فروعی اختلافات کی بنا پر ایسے بزرگانِ قوم و ملک کی عظمت و عقیدت میں فرق آتا ہے جنکا اخلاص غیر مشتبہ اور جنکی خدمات مسلّم ہیں۔

مہاراجہ صاحب کو معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی مسلمان نہیں "وہابی" بھی نہیں، اس صوبہ کے رہنے والے بھی نہیں، زر و زمین کا زور بھی اُنکے پاس نہیں۔ اُن علوم کے عالم بھی نہیں جن کی وجہ سے ایک مسلمان یا "وہابی" اُنکی عظمت کر سکے، لیکن باوجود اسکے نہ صرف یہ حقیر بلکہ اُس جماعت کے کثیر افراد جو کبھی مہاراجہ صاحب کے لولے سرداری کے نیچے جمع رہتی تھی۔ اُنکی دل سے قدر کرتے اور اُنکی سرداری کو اپنے لیے باعثِ فخر جانتے ہیں۔ یہ کیوں؟ کیا صرف اسی لیے نہیں کہ اُنکی بے لوثی اور اخلاص مسلّم ہے۔ اور اُن کا ایثار اور جذبۂ خدمت پسندی غیر مشتبہ۔ مہاراجہ صاحب کو اگر قومی و ملکی کارکنوں کی جماعت میں وہی عزت و منزلت حاصل کرنا

مقصود ہے جو ۱۹۱۷ء تک انھیں حاصل رہی تو وہ شوق سے آزمایش گاہِ سیاست میں تشریف فرمائیں اور آنکھوں کے آنسوؤں یا زبان کے لبوں سے نہیں بلکہ اعمال و کردار سے لوگوں کے دلوں میں اپنی بے نفسی و اخلاصمندی، قوم پروری و وطن دوستی، آزادی و حریت پسندی کا یقین و اعتماد پیدا کریں تو دوسرے احباب کے ساتھ بلکہ انشاء اللہ اُن سے کچھ آگے وہ کریں بھی عزت و احترام کی نذر بارگاہِ معلّٰی میں پیش کرنے کے لیے کمربستہ نظر آویں گا۔

البتہ بے موقع نہ ہوگا اگر انھیں خواجہ حافظ کا وہ شعر اسوقت یاد دلا دیا جائے، جو ۱۹۱۶ء میں مسز سروجنی نائیڈو نے سر جیمس مسٹن کی موجودگی میں تقریر کرتے ہوئے قیصر باغ کی بارہ دری میں پڑھا اور پڑھ کر تمام سامعین کو مسحور کر لیا تھا، وہ ہذا

در رہِ منزلِ لیلےٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اور اگر مہاراجہ صاحب کو صرف میرے زبان و قلم پر بندشیں عائد کرنا منظور ہیں، تو میں اسکے لیے بھی بخوشی حاضر ہوں، لیکن یہ نذرانہ بھی غیر مشروط نہیں۔

(لین دین) کا اصول اس دنیا میں عام طور پر رائج ہے۔ میں بھی اپنی خاموشی کی قیمت چاہتا ہوں۔ اور قیمت بھی ایسی نہیں کہ اُن کے امکان سے باہر ہو۔

یعنی صرف اسقدر کہ وہ قومی و ملکی معاملات میں اپنی سرمایہ دارانہ روش کو ترک فرما دیں۔

اُن کا تعلقہ، اُن کی خان بہادری، اُن کا کے سی ایس آئی، اُن کی ہوم ممبری اور اُن کی مہاراجگی سب اُن کو مبارک رہے، بلکہ اگر اُن کو حکومت کا خطاب عطا کرے، یا کسی صوبہ کی گورنری دیدے، یا مہاراجہ بنارس کی طرح محمود آباد کا خود مختار والی ملک بنا دے جسکی تمنا سے دیوتے سُنا ہے کہ اُن کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تب بھی چشم ما روشن دل ما شاد۔ ہمیں تو صرف اپنی قوم و ملک کی فلاح و بہبود سے سروکار ہے۔ اور اُن کی روش نے چونکہ ثابت کر دیا ہے کہ اُن کے موجودہ مطامح نظر اور طریق کار سے قوم و ملک کو نقصان پہونچے گا، اس لیے اُن سے اختلاف کرنے کی جرأت کرنا پڑتی ہے۔ وہ ان چیزوں سے بے تعلق ہو جائیں، جو بظاہر ناممکن ہیں! پھر اپنی روش بدل دیں (حالانکہ انگریزی مثل کے بموجب چیتے کی کھال کے نقش و نگار نہیں بدلتے) تو ہم بڑی خوشی سے اسکے لیے تیار ہونگے کہ اُن کے خلاف زبان و قلم سے ایک حرف بھی

اگر یہ دونوں غیر ممکن یا ناقابل قبول ہیں تو ہمیں اختلاف کرنے پر بھی مجبور و معذور جانیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

لیکن خواہ موجودہ اختلافات قائم رہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وسعت حاصل کرلیں یا اُن کی روش میں تبدیلی پیدا ہونے کی وجہ سے بالکل رفع ہو جائیں۔ مہاراجہ صاحب کو اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اس فقیر کو خدانخواستہ اُن سے دشمنی و عداوت ہے

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آخر وہ بھی تو ابن سعود کے خلاف امکانی جد و جہد کرتے رہے ہیں۔ عقیدہ کا اختلاف اس کا باعث ہو یا حجاز کی سیادت۔ لیکن ابن سعود کا بڑے سے بڑا حامی یا کوئی کٹر سے کٹر "وہابی" بھی یہ تو نہیں کہتا کہ مہاراجہ صاحب کو ابن سعود سے عداوت و دشمنی ہے یا اُسکو تخت حجاز سے گرا کر وہ خود ارض حجاز کے والی و حکمراں بننا چاہتے ہیں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ چونکہ وہ پکا موحد ہے اور مقابر و آثار کی عظمت کرنے میں مہاراجہ صاحب اور اُنکے ہم خیالوں اور ہم مشربوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اس لیے وہ اُسے حکومت حجاز سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگرچہ مغربی سیاسیین کی طرح ابن سعود کے مخالفین عموماً حرب عقائد کا سارا الزام اُسی غریب کے سر تھوپتے ہیں لیکن جن لوگوں کی بصیرت پر حماقت یا تعصب نے پردے نہیں ڈال دیے ہیں وہ تو اس قسم کی ابلہ افریبیوں میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ ابن سعود کے مخالفین کے دلوں میں محض اہل حجاز کی محبت کے جذبات ہیں، عقائد کو کچھ دخل نہیں۔

پھر اگر مذہبی معتقدات یا سیاسی تخیلات کے اختلاف کی بنا پر مہاراجہ صاحب اور اُنکے شرکاء کار یا محترم علی برادران اور اُن کے متبعین حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ ابن سعود کے خلاف ہر قسم کی مخالفت راؤں کا اظہار کریں، مظاہروں کا سامان کریں، حتیٰ کہ التوا حج تک کا اعلان کردیں، وائسرائے سے جاکر عرض معروض کریں، جارج پنجم کی دُہائی دیں، اور سارے ہندوستان بلکہ سارے عالم اسلامی تک میں اپنی مخالفت کا ڈھنڈورا پیٹیں تو اس فقیر بینوا سے کیوں اسکی توقع کی جاتی ہے کہ وہ مہاراجہ صاحب کی غلطیوں اور کرشمہ سازیوں پر پردہ ڈالتا رہے اور اُنکی بے مہریوں اور بے عنوانیوں کو نظر انداز کرتا رہے۔

ظفر الملک

۲۳۔ اگست ۲۸ء

دائرۂ سیاسیہ

اُردو زبان میں یوں تو خدا کے فضل و کرم سے ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے، اور اس ذخیرے میں روز افزوں ترقی ہوتی جاتی ہے، لیکن ایسی کتابیں جن کے مطالعہ سے غیر انگریزی داں اصحاب کو سیاسی مسائل سے پوری آگاہی ہو، اُردو میں اتنی کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور اب تک اس اہم ضرورت کی طرف ہمارے اہل قلم اور قومی کارکن دونوں میں سے کسی کی توجہ نہیں۔

ہندوستان کو اگر آزاد کرانا ہے، یا سیاسی حیثیت سے ہندوستانیوں کو کسی قسم کی بھی ترقی کرانا ہے تو تھوڑے سے انگریزی داں اصحاب کی سیاسی واقفیت سے کام نہ چلے گا، بلکہ لازمی ہے کہ وہ کثیر التعداد طبقہ جو انگریزی نہیں جانتا اور جسکی اعانت و تائید کے بغیر اس ملک میں کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، سیاسی امور میں پوری دلچسپی لینے لگے۔ اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب وہ سیاسی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جائے۔

اب تک عام باشندگان ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ اخبارات اور مجالس عامہ رہی ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کافی نہیں۔ ضرورت اسکی ہے کہ عام طور پر لوگوں کو سیاست کے متعلق زیادہ ٹھوس واقفیت حاصل ہو اور مسائل سیاسی کی علمی و اصولی حیثیت اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ ملک میں جو تغیرات ہو رہے، یا ہونے والے ہیں، اُنکی حقیقت کو وہ پوری طرح سمجھ سکیں، اور اُنکی اہمیت کے لحاظ سے جہاں ضرورت ہو اپنی رائے کا استعمال کر سکیں۔

ان حالات کو پیش نظر رکھ کر تہیہ کیا گیا ہے کہ سیاسی مسائل پر کتابیں اور رسائل شایع کرنے کی غرض سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی جائے جسکا طریق کار فی الحال حسب ذیل تجویز کیا گیا ہے:

(۱) جو صاحب اس مقصد سے اتفاق رکھتے ہوں وہ بلا لحاظ مذہب و ملت یا سیاسی فرقہ بندیوں کے اس دائرہ کے رکن بن سکتے ہیں۔ مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

(الف) جو صاحب کم از کم ۴ سالانہ چندہ ادا کریں وہ دائرہ سیاسیہ کے رکن متصور ہونگے۔

ب۔ جو صاحب کوئی مفید کتاب لکھیں اور اُسکے حقوق بیع و اشاعت بغیر کسی معاوضہ کے

دائرہ کو ہبہ کردیں وہ دائرۂ سیاسیہ کے رفیق متصور ہونگے۔

(۲) دائرہ سیاسیہ کی تمام مطبوعات جملہ اراکین و رفقاء کو سال بسال بغیر کسی قیمت کے بھیجی جائینگی۔ البتہ جن اصحاب کے ذمہ چندہ باقی رہیگا انکو تا اوائے رقم بقایا کتابیں نہ بھیجی جائینگی۔

(۳) کتب و رسائل کی فروخت سے جو آمدنی دائرۂ سیاسیہ کو ہوگی وہ مسلسل مزید کتابوں کی اشاعت پر صرف کی جائیگی اور موقع ہوگا تو دائرہ کی جانب سے ایک ماہوار سیاسی جریدہ جاری کیا جائیگا۔

(۴) سردست ادارہ کی جملہ خدمات دفتر اخبار ہمدرد دہلی سے متعلق رہیں گی، اور جس وقت اراکین و رفقاء کی تعداد سو سے زائد ہو جائیگی اُسوقت سب کے باہمی مشورہ سے دائرۂ سیاسیہ کا ایک مستقل دستور العمل مرتب کیا جائیگا۔ اور اُسکا سارا انتظام خود اراکین دائرہ کے سپرد کر دیا جائے گا۔

جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہوں اور اس ضروری کام میں اتحاد عمل کرنا چاہتے ہوں، اُن سے استدعا ہے کہ دس روپیہ ارسال فرما کر اپنا نام نامی اراکین دائرہ کی فہرست میں درج کرائیں، اور جو صاحب قلمی اعانت فرمانا چاہتے ہوں وہ بھی دفتر کو اپنے عندیہ سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ پیش نظر کاموں میں اُنکی اعانت حاصل کی جائے۔

دائرۂ سیاسیہ کے متعلق جملہ مراسلات و ترسیل زر کا پتہ یہ ہوگا:—

مہتمم دائرہ سیاسیہ "دفتر روزنامہ ہمدرد۔ دہلی"

داعیان

(مولانا) حسین احمد غفرلہ (ڈاکٹر) مختار احمد انصاری (سر) عبدالقادر
(دیوبند) (دہلی) (لاہور)

(مولانا) ابوالکلام (مولانا) حسرت موہانی (ڈاکٹر) سیف الدین کچلو
(کلکتہ) (کانپور) (لاہور)

(ڈاکٹر) سید محمود (نواب) اسمٰعیل خاں (پنڈت) جواہرلال نہرو
(چھپرا بہار) (میرٹھ) (الہ آباد)

(پنڈت) کشن پرشاد کول (مولانا) عبدالماجد ظفر الملک
(لکھنؤ) (دریاباد۔ اودھ) (لکھنؤ)

سفرنامۂ اندلس

(۴)

عدالت، دادرسی و دادرسانی

وہ زمانہ تو اب اہالیِ اسپین کے خواب و خیال سے بھی بعید ہے کہ جب وہاں قاضی اجلاس کرتا تھا۔ مقدمات پیش ہوتے تھے۔ وکلاے فریقین شرع یا قانون کی ہندی کی چندی نکالتے تھے شہادتوں پر جرح و تعدیل ہوتی تھی۔ اور زیادہ سے زیادہ تین دن کے اندر مقدمہ کا فیصلہ اور فوراً ہی ڈگری یا حکم آخر کا نفاذ ہو جاتا تھا، اور ہر فریق اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے گھر جا بیٹھتا تھا۔ عدالتہاے مرافعہ کھلی ہوئی تھیں اور ہر شخص کو بادشاہ تک پہونچنے کا حق و موقعہ تھا۔

یہ صورت تو زمانۂ وحشت یا کفار (مسلمانوں) کی علامت سمجھ کر مٹا دی گئی اور اب صرف زیب (یا بدزیبی) قرطاس رہ گئی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ وقت بھی اسپین پر نہیں آیا، کہ مثلاً فوجداری میں، پولیس کو سخت جوابدہی کرنا پڑتی ہے کہ مجرم ایک عرصۂ معینہ سے زائد کیوں زیر حراست رہا۔ اور مجسٹریٹوں سے بازپرس ہوتی ہے کہ اتنا عرصہ مقدمات کیوں زیر تجویز اور ملزم کیوں زیر حوالات رہا ہے اس وقت یہ حالت ہے کہ عدالتوں کا نظم و نسق و طریق کار زمانۂ حال سے اگر صدیوں نہیں تو بیسیوں برس پیچھے ہے۔ انصاف یا دادرسی صحیح معنوں میں وہاں مفقود ہے۔ اگر کوئی انصاف پسند اور رحمدل مجسٹریٹ صحیح و واجب فیصلہ بھی سنا دے تب بھی یہ حالت ہے کہ غریب ملزم اپنے جرم کی انتہائی سزا سے زیادہ حوالات میں سزا بھگت چکا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جرم کی انتہائی سزا ایک سال قید سخت ہے، تو ملزم دو سال زیر حوالات رہ چکا ہوتا ہے۔ یہ نہ کہیے کہ یہ صورت شاذ واقع ہوتی ہوگی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہزار ملزموں میں سے شاید ایک ہی ایسا خوش قسمت ہوتا ہو کہ جو جلدی چھٹکارا پا جاتا ہو۔

فوجداری مقدمات کے دیر میں فیصلہ پانے کے خلاف برسوں لوگوں نے شکایتیں کی ہیں، مگر بے نتیجہ۔ ۱۸۸۸ء میں کچھ اصلاحیں ہوئیں، مگر حسب معمول وہ عمل میں نہیں آئیں۔ باوجودیکہ وہ اب تک اوراقِ قواعد کی زیبائش ہیں۔ ان کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس پر زور کے ساتھ بار بار توجہ بھی دلائی جاتی ہے، مگر بے اثر۔

گزرا نہ وہ چیز ہے کہ وہ سب کو اپنی راہ پر ڈال لیتا ہے۔ قریباً دس سال ہوئے کہ لوگوں نے عملی طور سے اس طریق کار کے خلاف بغاوت شروع کی ہے۔ اخبارات میں اس کے خلاف مضامین چھپتے ہیں۔ لیکن اگر مجسٹریٹ خود کسی طاقتور فریق متعلقہ وزارت کا فرد یا پٹھو ہوتا ہے تو وہ اخبار سنسر کیا جاتا ہے۔ بڑا اثر ٹریڈ یونین کا پڑ رہا ہے جو ایسے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ گو وہ اپنی برادری ہی کی حمایت کرتے ہیں، مگر ضمناً اس کا فائدہ اوروں کو بھی پہونچ جاتا ہے۔ شاید یہ صورت کسی وقت کارآمد ہو جائے۔ علامتیں تو یہی ہیں۔ گو دس برس کا تجربہ تو بہت اچھا نہیں۔ ہائیکورٹ بھی اس طرف متوجہ ہے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۲ء میں ہائی کورٹ نے ایک گشتی حکم سخت تہدید آمیز الفاظ میں جاری کیا تھا، اسکا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) بشرطیکہ محکمہ سیاسیات کی طرف سے مداخلت نہ ہو عام طور پر مقدمات (دیوانی یا فوجداری) اتنی مرتبہ ملتوی کیے جاتے ہیں کہ جو سخت شرمناک ہیں۔

(۲) اضلاع میں یہ حالت اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔

(۳) وہ لوگ جن کا تعلق سلطنت سے محض سیاسی ہے اپنے اثر و نفوذ سے اس طرح مقدمات فیصل کرا لیتے ہیں کہ کسی فریق کو حق اپیل باقی نہیں رہتا۔

(۴) عام عدالتیں بالکل عدالتِ کلیسائی بنی ہوئی ہیں کہ جن پر اب بھی بجا طور سے مذاق اڑایا جاتا ہے اور شعراء اپنے قصائد ہجویہ میں اپنا زور کلام دکھلاتے ہیں۔

(۵) جن مقدمات میں جیوری سے رد لی جاتی ہے یا سشن میں پیش ہوتے ہیں اُن میں بار بار التواء کیا جانا سخت شرم کی بات ہے۔ فریق مقدمہ کو تکالیف ہوتی ہیں۔ جیوری کو تکلیف ہوتی ہے بعض وقت اہالی جیوری مر جاتے ہیں یا کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے حاضر نہیں ہوتے۔ اس سے یا تو مقدمہ از سر نو شروع کرنا پڑتا ہے یا انصاف نہیں ہوتا۔ سشن روز روز اپنا اجلاس نہیں کرتا، اور مقدمات برسوں فیصل نہیں ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی گشتی حکم میں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا گیا ہے جو سرقہ کا تھا، اور جس میں تین آدمیوں کی جانیں ضایع ہوئی تھیں۔ یہ مقدمہ پانچ برس کے بعد فیصل ہوا! کہا گیا ہے کہ "یہ مقدمہ اپنی آپ ہی مثال نہیں ہے بلکہ ہزاروں ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں"۔

کیتینٹ کونسل کے ممبر تو بڑی بلا ہیں، معمولی ممبران لیجسلیٹو کونسل یا انکے دست پروردہ دھمکی دے کر [illegible] میں انصاف پانا ناممکن ہے۔ ان لوگوں کی سفارشیں الگ رہیں، ان کا اثر و نفوذ

ہی کافی ہے۔ انکے علاوہ زمیندار اپنے اقتدار کی رو سے عدالتوں کو اپنا فٹ بال بنائے رہتے ہیں۔ ممبران کے احکام سے عدالتیں سرتابی کر سکتی ہیں مگر زمینداروں کی تعمیل اشارہ اگر نہ کی جائے تو مجسٹریٹ یا منصف کا برجا قائم رہنا ناممکن۔ بعض وقت تو ان کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گیا ہے۔

برسوں کی چیخ پکار اور محنتِ شاقہ کے بعد رعایا کو حق جیوری عطا کیا گیا۔ قطع نظر اسکے کہ عدالتوں نے اسکو پسند نہیں کیا، صوبۂ برشلونہ و دیگر مقامات میں تو پہلے ہی سال یہ ثابت ہو گیا کہ اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔ ۱۹۱۹-۲۰ء میں جیوری کے ممبروں کو اتنی تخویف کی گئی کہ وہ غریب کسی کو ملزم قرار دیتے ہوئے اپنی جان سے ڈرتے تھے۔ اس کے ثبوت میں سارا گوسا کا ایک مقدمہ اس قابل ہے کہ اسکو کسیقدر تفصیل سے بیان کیا جائے:۔

سارا گوسا میں اسٹرائک ہوا۔ مزدوروں نے پولیس کے کئی سپاہیوں اور افسروں اور ایک مجسٹریٹ کو قتل کر دیا۔ مقدمہ قائم ہوا جس میں ایک فریق سرکار اور زمیندار تھے اور دوسرا فریق یہ مزدور۔ جیوری مقرر ہوئی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اُن میں سے ہر ایک کے پاس کئی کئی خطوط اس دھمکی کے پہونچے کہ اگر اُنھوں نے ملزموں کے خلاف رائے دی تو وہ قتل کر دیے جائینگے۔ گورنمنٹ کی طرف سے اُنکی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ مقررہ پر اٹھارہ آدمیوں (جیورس) نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھیجدیے۔ وکیل سرکار بھی عین وقت پر بیمار ہو گیا۔ مجبوراً مقدمہ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسری پیشی پر (جو پانچ روز بعد مقرر ہوئی) بیالیس گواہوں میں سے صرف اکیس حاضر ہوئے اور جیوری کے پھر ڈاکٹری سرٹیفکیٹ آ گئے۔ اس واقعہ پر ایک اخبار نے جو نوٹ لکھا تھا وہ یہ ہے کہ "سارا گوسا میں جو وبا یکایک پھوٹ پڑی ہے نہ اسکی تحقیقات کی ضرورت ہے نہ محکمۂ صفائی کے لیے فکر کی بات ہے۔ مگر اس واقعہ سے عوام الناس کو تشخیص مرض میں بڑی مدد ملی ہے"۔

بڑی مصیبت رشوت ہے۔ جو بنام نہاد "قیمت" اسپین بھر میں بلائے بے درماں بنی ہوئی ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمام حکام بددیانت ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ دوسری آفت یہ ہے کہ اکثر حکام کسی نہ کسی سیاسی آدمی کے آوردہ ہیں۔ اُن سے یہ اُمید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ بے رو و رعایت کام کریں گے۔ محکمۂ دیوانی کی حالت اور بھی بدتر ہے؛ مگر محکمۂ جیل بدترین ہے۔ نہ صرف اُن مجرمین کے لیے جو زیر تجویز ہیں، بلکہ اُن ملزمین کے لیے بھی جو اپنی سزائے اعمال پا رہے ہیں۔ ان سب پر ستزاد یہ غضب ہے کہ پولیس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ اُنکی داد و فریاد کہیں نہیں۔ ۱۹۲۲ء میں جیلخانوں کا خرچ بہ مقابلہ ۱۹۱۷ء کے قریباً ۱۳۰ فی صدی بڑھ گیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اسکی وجہ یہ ہے

کہ افسران محکمہ پولیس کے حکم سے ہزاروں ایسے آدمی جیل میں بھیجدیے گئے جو عدالت میں محض اس لیے نہیں پیش کیے گئے تھے کہ اُن کے خلاف اثبات جرم کے ایسے کافی دلائل موجود نہیں ہیں کہ عدالتیں انکو سزائیں دے سکیں، مگر حکام پولیس کو اُنکے ملزم ہونے کا یقین کامل ہے! ایک سوشلسٹ ممبر کونسل نے اس واقعہ کی طرف سیڈرڈ کے میئر کو توجہ دلاتے ہوئے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک تھیٹر میں تماشا دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اُن سے ٹکٹ مانگا گیا۔ یہ سخت توہین تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ پولیس سے دریافت کرو کہ میں کون ہوں۔ وہ غریب دریافت کرنے گیا تو گرفتار کرلیا گیا اور پولیس کے افسر اعلیٰ نے اُس شخص پر تین سو روپیہ جرمانہ کردیا۔ چونکہ جرمانہ فوراً ادا نہ ہوسکا، اسلیے وہ جیل بھیجدیا گیا! میئر نے اس پر توجہ فرمانے کا وعدہ کیا، مگر نہ معلوم کیا انجام ہوا۔

کسی کنسٹبل پولیس سے بگاڑ لینا تو درکنار کو مول لینا ہے۔ ایک حلال خور سے بھی چشمک ہوجانے کے یہ معنی ہیں کہ تمام میونسپلٹی کو اپنا دشمن بنا لیا گیا۔ جو فریق کہ برسر اقتدار ہو اُسکے خلاف ووٹ دینے یا اسکی تیاری کرنا بھی جرم ہے۔ اسکی سزا کسی نہ کسی جانے سے پانا پڑتی ہے۔

مضمون بالا بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اُس ملک میں زندگی وبال جان ہوگی اور ہر شخص کو ہر وقت جیل جانے کا اندیشہ رہتا ہوگا۔ حقیقت میں یہ بات نہیں ہے۔ نیک چلنی اور احتیاط اپنا پھل لاتی ہے۔ البتہ بعض موقعے ہوتے ہیں کہ ہر شخص کو خائف رہنا چاہیے۔ مثلاً ۱۹۲۱ء میں جب سینور ایڈوارڈو ڈاٹو وزیر اعظم مارا گیا تھا تو کوئی شخص بھی محفوظ نہیں رہ گیا تھا۔ ہزاروں بے گناہ گرفتار ہوئے اور پولیس کی معمولی و مشہور تعزیریں اور عدالتوں کی سستی و کاہلی کی سزائیں پائیں۔ اس موقعہ پر جس شخص پر ذرا سا بھی شبہہ پولیس کو ہوا، نہ صرف وہی بلکہ اُسکا اور اُسکی سسرال تک کا تمام خاندان گرفتار و پامال ہوا۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ اس پولیٹیکل قتل میں تصور خود پولیس کا تھا۔ کیونکہ اُسے پیشتر ہی سے مزین نے اطلاع دے دی تھی۔ پولیس کا یہ عذر ہے کہ وزیر اعظم بوقت قتل موٹر پر سوار تھے، اور پولیس کو کوئی ایسی سواری گورنمنٹ کی طرف سے مہیا نہیں کی گئی تھی۔ (مقابلہ کیجیے اس واقعہ کا دہلی کے اُس واقعہ سے جب لارڈ ہارڈنگ پر بم کا گولہ پھینکا گیا)

لہ کان فصاحت لکھنؤ کے ایک اخبار نے Mayor کا ترجمہ "ابو البلد" کیا ہے۔ میں بھی یہی لکھنا چاہتا تھا مگر شاید سمجھا جاتا۔ اس لیے معافی مانگتا ہوں۔ ایک اور موقعہ پر اسی جان فصاحت لکھنؤ کے اخبار کی اتباع میں نے کابل کی ملکہ "سوریہ" کو "ملکۂ ثوریہ" لکھا ہے۔ اس اصلاح کی میں اُس معزز و مؤقر اخبار سے معافی چاہتا ہوں۔ میری رائے ناقص میں لفظ "ثوریہ" زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ ثور کے معنی ہیں بیل۔ اسکا مؤنث ثوریہ یعنی گائے یقیناً صحیح ہوگا۔

یوں تو اپنے ملکوں کی رعایا کی ہر سفیر حفاظت کرتا ہے، مگر رعایائے گورنمنٹ برطانیہ (خواہ وہ ذلیل ملک ہندوستان کی ہو یا کناڈا اور آسٹریلیا کی) بہت کچھ مصئون و محفوظ ہے۔ ہماری گورنمنٹ کو یہ بجا شکایت ہے کہ سفیر برطانیہ کا زیادہ وقت اسی میں خراب ہوتا ہے۔

جن دنوں کہ اسپین میں بوجہ خانہ مقابلہ کے کشاکش ہوتی ہے وہ زمانہ بھی خطرناک ہوتا ہے۔ اُسوقت ہر شخص کو سخت احتیاط رکھنا چاہیے۔ بہت سے بے گناہ تکلیف پا چکے ہیں اور بعض بیقصور دو دو برس جیل میں پڑے سڑتے رہے ہیں، اور اسکے بعد بھی دور دراز مقامات کی جیلوں میں اتنی ہی سزا بھگتنے کے لیے بھیجدیے گئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اُن غریبوں پر ان چار برسوں میں کسی عدالت نے جرم قائم نہیں کیا!

جو حضرات ہندوستان کے جیلوں کے انتظامات پر نکتہ چینی کر رہے ہیں، مجھے اُن سے دلی ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اسپین کے جیلوں کے حالات بھی مختصر طور پر سُن لیں

سینور لوسی اوگل جیل کمیٹی کے ممبر نے ایک جیل کا ملاحظہ کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

عورتوں کے جیل میں بہت سی عورتیں تو وہ ہیں کہ جو حسن فروش کہلاتی ہیں، اور اپنے فرقہ کی معمولی بیماریوں سے خوب اچھی طرح سرفراز ہیں۔ انکے سوا بہت سی بیکاری عورتیں ہیں، اور وہ گھرستنیں ہیں جو کسی قانونِ میونسپلیٹی کی خلاف ورزی میں قید ہیں۔ ان سے زیادہ تعداد اُن عورتوں کی ہے جن پر ابھی کسی عدالت نے جرم بھی قائم نہیں کیا۔ ان سب کے لیے صرف ایک کوٹھری مہیا کی گئی ہے۔ اُن کو اپنا بستر لانے کی اجازت نہیں۔ ٹاٹ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے انکو دیے گئے ہیں، وہ اُنھیں کو بچھاتی ہیں۔ چونکہ جگہ کم ہے اس لیے ایکدوسری سے گویا ہم بغل ہوکر سوتی ہیں۔ محکمۂ صفائی کے انسپکٹر سے لے کر گورنر تک کو یہ حال معلوم ہے۔ اُن سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا ابھی تپ محرقہ اور حسن فروشوں کی مشہور بیماریوں کی ملک میں کمی ہے کہ وہ اُن کا اور زیادہ شیوع چاہتے ہیں؟

مردانہ جیل میں ۱۵-۱۶ برس کے لڑکوں سے لیکر بوڑھے اور اندھے تک اپنے دن گن رہے ہیں۔ زیادہ تعداد اُن لڑکوں کی ہے جو قمار بازی یا بھیک مانگنے کے جُرم میں گرفتار ہیں۔ اور باقی قیدی چھوٹے جرموں سے قتل و غارت کے جرموں کے مجرم ہیں۔ یہ سب ایسی کوٹھریوں میں بند کیے جاتے ہیں جن میں صرف ایک روشن دان گز بھر کا ہے۔ کوٹھری نہ صرف تاریک ہے بلکہ نم دار بھی ہے۔ فرش کچا ہے۔ سب کے لیے ایک ٹاٹ ہے۔ رہا شدہ قیدیوں کے کپڑے انھیں

پہننے کو ملتے ہیں۔ اُنکے دھونے یا ڈس انفکٹ کرنے کا کوئی سامان نہیں، کوٹھریوں کے ڈس انفکٹ کا کیا ذکر ہے۔ ان میں سے جو بدبو نکلتی ہے وہ دُور دُور تک گوارا نہیں ہوتی۔ ہر قسم کے موذی کیڑوں کی بھرمار ہے۔ بدکاری کا سامان مہیا ہے۔ اب بھی اگر شہروں میں وبا نہیں پھیلتی تو حکام جیل کا تصور نہیں ہے۔ میں مجسٹریٹوں کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ان بدقسمتوں میں سے شاید ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس پر کوئی عدالت اثبات جرم کر چکی ہو یا سزا دے چکی ہو۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ تین تین برس سے یہاں پڑے سڑ رہے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ بیگناہ ہیں۔ اگر اسکو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ مجرم ہیں، تو کیا ابھی اُن کے جرموں کا کفارہ نہیں ہو چکا ہے؟ .....

کیا کوئی ایسا ہے جو میرے اس بیان کی تردید و تکذیب کرے؟ کیا کوئی ایسا ہے جو اصلاحِ حال میں میرا ہم نوا ہو؟

لبرل اسپین میں سے شاید کوئی بھی ایسا آدمی نہ نکلے جو اس بات کو تسلیم نہ کرے کہ اسپین کے جیل بالکل وہی ہیں جو قرونِ وسطےٰ میں تھے۔ ڈکے ٹرکا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز میں اسلوب پیدا کر دینگے۔ کوئی اور محکمہ تو شاید اُن کا شکر گزار ہو، مگر محکمہ جیل تو بد سے بدتر ہوتے چلا جاتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ بہت سے زیرِ تجویز قیدی رہا کر دیے گئے ہیں۔ مگر کیوں؟ محض اس لیے کہ پولیٹیکل قیدیوں کے لیے جگہ خالی ہو۔

مزدور

تمام دنیا میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نفرت و عداوت اس شدت کے ساتھ شروع ہوئی ہے کہ (العلم عند اللہ) انجام یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دار اُس سے زیادہ حقیر و ذلیل ہو جائیں گے جتنے کسی زمانہ میں مزدور تھے۔ مزدوروں کی طاقت روز افزوں ہے اور سرمایہ داروں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ حیران و پریشاں مُنہ تک رہے ہیں۔ وہ وقت بہت قریب ہے کہ اس کشمکش نانہوں بندہ۔ دُور کیوں جائیے اس تاریک و غلام مُلک ہندوستان میں ہوشمندوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ باورچی، خدمتگار، سائیس کہاں سے اور کس مشاہرہ پر ملیں گے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ماہ فروری گزشتہ کے اخیر میں بمقام الہ آباد ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ ایک ملال خور (حقہ) بڑے بڑے بازاروں میں اپنی صوتِ جہیر کے ساتھ پکارتا پھرتا تھا کہ "صدیاں ہوئیں کہ ہندو اور مسلمان ہم سے غلیظ سے غلیظ کام لیتے رہے ہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اُن سے یہی

کام لیں" وغیرہ وغیرہ۔ کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ اُس سے کچھ سوال کرسکے، روکنا تو امر آخر ہے۔ یہ تو ہندوستان کا حال ہے، یورپ میں تو بڑے بڑے اہم اور اصولی سوال پیدا ہیں اور سرمایہ دار پریشان ہیں۔ لیکن اگر اسکا اثر نہیں ہے تو اسپین میں۔ وہاں اب بھی یہ کیفیت ہے کہ کارخانہ داروں کے وہی خیالات ہیں، جو صدیوں سے چلے آتے ہیں کہ ہمارے مزدور ہمارے زیردست ہیں۔ زمیندار اور امرا اُسی پُرانی ہوا میں اُڑ رہے ہیں اور وہ اپنے زیردستوں پر پُرانے ظلم روا رکھتے ہیں اور ویسے ہی غرور سے پیش آتے ہیں۔ یہ کیفیت نہ صرف اُن ہی مزدوروں کی ہے جو اپنے گاڑھے پسینے کی روٹی کھاتے ہیں، بلکہ اُن کی بھی جو سوداگروں کے نوکر ہیں یا کسی حرفتی کارخانہ میں کام کرتے ہیں۔ اسکو ذرا تعمیم کے ساتھ یوں کہنا چاہیے کہ اسپین کا ہر مرد و عورت اُس شخص کو حقیر سمجھتے ہیں جس سے وہ تنخواہ یا مزدوری دے کر کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے کردار و گفتار سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک مزدور یا تنخواہ دار کا کوئی حق، سوائے ہاتھ کی اُٹھائی چیز کے، اُن پر نہیں ہے۔ وہ اس امر کو کبھی خیال میں بھی نہیں لاتے کہ اُنکی آرام و آسایش، عزت و آبرو ان ہی مزدوروں یا نوکروں کے صدقہ میں ہے۔ اپنے فرائض کی ادائگی کا کوئی خاص صلہ یا اُنکی خدمت کا پورا معاوضہ ہرگز نہیں ملتا۔ ہر سرمایہ دار اپنا حق سمجھتا ہے کہ مزدور سے سب سے زیادہ کام لے اور سب سے کم مزدوری دے۔ وہ مزدور پر ظلم کرے اور وہ اُسے سہے اور اُف نہ کرے۔ ہر سرمایہ دار کی بیوی اپنی مامایا نوکر کو یہ سمجھتی اور وہی سلوک کرتی ہے جو کوڑے کرکٹ سے ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسپین کے نوکر یا مزدور اپنے آقا کو پورا کام کرکے نہیں دیتے۔ اور مگرے، سُست، بے پروا اور ناقابل ہوتے ہیں۔ ایک معمولی مزدور دس آنے مزدوری پاتا ہے۔ جوان، مضبوط، تندرست کاریگر کو دو شلنگ پانچ پنس سے لیکر ایک شلنگ ۸ پنس تک مزدوری ملتی ہے۔ ایک کلرک کو ۴ پونڈ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے، خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت قلیل مزدوری ہے۔ اور مزدور اس سے بھی کم کام کرکے دیتا ہے۔ جنگ کے بعد سے نہایت قدرے قلیل مزدوریاں اور تنخواہیں بڑھ گئی ہیں، وہ بھی اُسوقت کہ جب اسٹرائیک ہوئیں اور یہ لوگ خم ٹھونک کر مرنے مارنے پر تیار ہوگئے۔

ملک اسپین کی ایک بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ وہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے پہلے ہی کم ہے اور بیواؤں اور یتیموں کی تعداد نہیں بڑھی کہ اُنکو مردوں کے مقابلہ کا موقعہ نہیں ہوا۔ نہ وہاں فیشن کی انگلستان و فرانس جیسی بہتات ہے۔ عورتیں اب بھی وہاں مردوں کی وہ مستعد ہیں اور گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔ ورنہ خدا جانے کیا آفت آتی۔

مزدوروں کی بڑی دشمن پولیس ہے (شاید اس میں وہ پولیس شامل نہیں ہے جن کو خود بہت ہی کم تنخواہ ملتی ہے۔ وہ تو اعدادان بھی واجبی ہی ہے اور سخت بدتہذیب۔ انکی وردیاں بھی ایسی پھٹی ہوئی ہیں کہ وہ خود مزدور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ پولیس ہی ہے جو مزدوروں کو آزاد نہیں ہونے دیتی۔ اور اُن سے ہر جگہ اس طرح سلوک کرتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ روز روز فساد کیوں نہیں ہوتے۔ اہالی پولیس اَن پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ انکی زبان ایسی سخت ہے کہ وہ مزدوروں سے بغیر گالی کے بات نہیں کرتے۔ ایک ذرا سے خیالی جرم پر عورتوں، مردوں اور بچوں کو ہتکڑی لگاکر بازار میں لیے پھرتے ہیں، جس سے مزدوروں کی آبرو میں فرق آتا ہے اور وہ اور بھی بے حیا ہو جاتے ہیں۔

اسپین کے حکام کو اپنے اختیارات کی جا و بیجا نمایش کرنے کا بہت شوق ہے۔ مزدور اپنی تکالیف رفع کرنے کے لیے کوئی جلسہ کرتے ہیں تو مجسٹریٹ پولیس کی ایک فوج کی فوج لیکر پہنچ جاتے ہیں، انکی حرف گیری کرتے ہیں، انکو غصہ آتا ہے اور پولیس کی ہتکڑیاں فوراً کام میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کا انجام بعض وقت فریقین کے قتل پر ہوتا ہے۔ اور انتقام کا سلسلہ اسی طرح شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ ہمارے یہاں کے سرحدی پٹھانوں میں۔ یہ دیکھ کر جو ہوشدار ہیں وہ اس فکر میں لگ جاتے ہیں کہ ایسا ملک کبھی ترقی کر بھی سکتا ہے یا نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ متوسط الحال لوگ اپنی ہستی کا کوئی اثر گورنمنٹ پر پیدا نہیں کر سکتے۔ ٹریڈ یونین اور اسی قبیل کی اور انجمنیں اب بھی وہاں عملی طور پر خلافِ قانون ہی سمجھی جاتی ہیں۔

پادری صدیوں سے اپنی تمام بلاغت اسپر صرف کرتے رہے ہیں کہ انسان کو خدا پر توکل کرنا اور اپنے حال میں خوش رہنا چاہیے۔ اسپین کے غریبانے اس پر بہت کچھ عمل اور اپنی حالت پر صبر کیا، مگر یکایک روس کی طرف سے کچھ اُمید کی کرنیں اُنکو نظر آئیں۔ اس وقت کی حالت یہ ہے کہ بیشتر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو لینن کو اپنا مسیحا مانے ہوئے ہیں۔ انکی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ باوجود اسکے سخت مشکل یہ ہے کہ ان مزدوروں میں بھی برادریاں قائم ہو گئی ہیں۔ ایک برادری کا آدمی دوسری برادری والے کو اپنے ساتھ شامل نہیں کرتا۔ ایک دوسرے کو ذلیل جانتا اور اپنا نسب سمجھتا ہے۔ اتفاق و اتحاد نہیں تو نتیجہ معلوم۔

گورنمنٹ کے ہاتھ میں ایک بڑا کاری ہتھیار چلانا ملتا ہے۔ جہاں کہیں سرمایہ دار اور مزدوروں میں مناقشہ ہوا اور اس ہتھیار سے کام لیا گیا۔ اضلاع کے حاکمان ضلع کو یہ اختیارات حاصل

ہیں کہ سرسری تحقیقات کے بعد دونوں فریق میں سے جو مجرم معلوم ہوا اُسکو جلا وطن کردیں۔ سرمایہ دار دولتمند ہیں وہ کیوں جلا وطن ہونے لگے تھے، خمیازہ غریب مزدوروں ہی کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ جلا وطنی میں نہ مردوں کو دیکھا جاتا ہے نہ عورتوں کو نہ بچوں کو حتی کہ بعض وقت دس برس کی عمر کے بچوں کو بھی جلا وطن کردیا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ تحقیقات سرسری ہوتی ہے اور اس میں بھی اثبات جرم کا شائبہ بھی نہیں ہوتا اور لوگ جلا وطن کردیے جاتے ہیں۔ انکی تعداد بھی کم نہیں ہوتی۔ بعض وقت تو ایک ایک ضلع سے سیکڑوں کی تعداد میں جلا وطن ہوتے ہیں۔ اور وطن سے سیکڑوں میل پہونچا دیے جاتے ہیں۔ اعزا و اقارب کو خبر تک نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں۔ راستہ کے مصائب اُن پر ایسے ایسے پڑتے ہیں کہ اگر تفصیل بیان کی جائے تو دل دہل جائیں۔ میرا دل پتھر کا ہے کہ اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ کے قانون انتقام کا یہ ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ یاد کرو اُن مصائب کو جن میں تم ہی نے مولدین کو مبتلا کیا تھا۔ تمہارے اخبار تمہاری زبان بن کر آج گلا پھاڑ پھاڑ کر تمہارا مرثیہ پڑھتے اور تم پر روتے ہیں اور کوئی شنوا نہیں۔ کبھی تم نے اُن بے زبان مولدین کی فریاد بھی سُنی تھی جو آج تک فضائے آسمانی میں گونج رہی ہے۔ اللہ ہی سب سے بڑا بدلینا ہے اور وہی منتقم حقیقی ہے۔ تم نے مولدین کی ماؤں کی گودوں سے بچے چھینے ہیں، آج تمہاری ماؤں کی گودوں سے بچے چھینے جاتے ہیں۔ تمہاری حالت توریت کی اس آیت کی مصداق ہے کہ "میں تجھ سے، تیری اولاد سے اور اولاد کی اولاد سے بدلہ لوں گا"

مزارعین

ہمارے ہندوستان کی طرح اسپین کا بڑا حصہ زراعتی ہے۔ اگر برسلونہ اور لیباؤ کو مستثنیٰ کردیا جائے، جہاں کچھ کارخانے کھل گئے ہیں تو تمام ملک میں زراعت ہوتی ہے اور لوگ اسی پیشہ کی بدولت اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

ہر زراعتی ملک میں مزارعین کو محاصل زمین بہت زیادہ عزیز ہوتے ہیں، اور اسی اُمید پر وہ محنتہائے شاقہ برداشت کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا اسپین میں جو زراعتی ملک ہے، مزارعین اپنی محنت سے برومند ہوتے ہیں یا زمیندار؟ اسکا مختصر جواب یہ ہے کہ غریب محنت کش مزارعین گھاٹے میں رہتے ہیں اور سب سے بڑا حصہ زمیندار لے جاتے ہیں۔

ہر زراعتی ملک میں زمینداروں کے حقوق کو گورنمنٹ تسلیم کرتی ہے۔ منجملہ اور وجوہ کے اسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ یا تو ملکیت زمین بطور انعام جاں نثاری حاصل کرتے ہیں یا

یا مدت العمر کی کمائی سے زمین حاصل کرتے ہیں۔ زمیندار خواہ پہلے فرقہ کے ہوں یا دوسرے کے بہرحال گورنمنٹ کے دست و بازو ہوتے ہیں اور آڑے وقت میں کام آتے ہیں۔ یہ لوگ بقدر رتبے ملک کے وقعت و عزت پیدا کر لیتے اور اُس سے فائدہ اُٹھاتے اور پہونچاتے ہیں۔ گرشدہ شدہ انکی جیرہ دستیاں بڑھ جاتی ہیں اور انکی طرف سے فکر لاحق ہو جاتی ہے اسلئے علاوہ ایک سوال یہ بھی ہے کہ جب اسکو تسلیم کر لیا جائے کہ تمام ارضی ملک کی مالک سرکار ہے (ان الارض للہ یورثہا من یشاء) تو یہ درمیانی کڑی زمیندار کی کہاں سے آگئی؟ اور کیوں قائم رکھی جائے؟ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوبست نے جلدی کی اور اسی بنا پر زمینداروں کے خارزار کو اکھاڑ کر پھینک دینے کا ارادہ کیا۔ منجملہ اسباب غدر کے ایک سبب یہ بھی تھا۔ غنیمت ہے کہ اب اس میں یہاں بہت کچھ کامیابی ہوگئی ہے۔ اسپین میں اس قسم کے سوال نہ پیدا ہوسکے نہ ہونگے۔ وہاں زمینداروں کے حقوق اس وجہ تسلیم کیے جاتے ہیں کہ غریب مزارعین کی موت ہے۔ زمیندار مالکان زمین ہی نہیں ہیں بلکہ صحیح طور پر اپنی ملکیت کے حدود میں بے سامان بادشاہ ہیں، اور چھوٹے چھوٹے زمیندار بوجہ حاشیہ بردارانِ وزارت، بادشاہی کر رہے ہیں۔ قوانین مال انکی سجدہ مراعات کرتے ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ مزارعین، جنگلی تعداد بہت زیادہ ہے، گورنمنٹ کے شاکی ہیں۔

میں ذیل میں جنوبی حصۂ اسپین پر نظر ڈالتا ہوں، جہاں تعلقات مابین مزارع و زمیندار زیادہ خراب ہیں۔ اور ایک مدت سے خراب چلے آتے ہیں۔

اسپین میں ہر چیز کا دارومدار روایات و مراسم قدیمہ پر ہے۔ وہاں کے باشندے اب بھی عملی طور پر اُسی ہوا میں اڑ رہے ہیں جس میں اُنکے بزرگ صدیوں پیشتر اُڑتے تھے۔

ارضی کے متعلق جتنے جھگڑے ہیں، میں خوش ہوں کہ وہ نتیجہ ہیں اُن بے انصافیوں اور بے ایمانیوں کا جو عیسائیوں نے اُسوقت کی تھیں کہ جب اس ملک کو اُنھوں نے مسلمانوں سے فتح کیا تھا۔ انکے نقش قدم اب تک اندلس سے نہیں مٹے اور مزارعین کی رگوں میں تو اُن ہی کا خون دوڑ رہا ہے۔ پھر اسپینی بتاتا اور چیز ہے۔ جب مسلمان یہاں سے نکالے گئے تو ارضی ملک تعلقہ داروں[1] کو بطور انعام خدماتِ جنگ بے سوچے سمجھے ایک ہی جگہ عطا کر دی گئیں۔ اس سے ایک ایک آدمی بڑی بڑی جاگیرات کا مالک و زمیندار ہو گیا۔ اسکے علاوہ اُنکے بہت سے حقوق

---

[1] میں نے Feudal barons کا ترجمہ تعلقہ دار کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان دونوں کی حیثیت میں بڑا فرق ہے، مگر اختصار کے لیے لفظ تعلقہ دار اختیار کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

تسلیم کیے گئے۔ یہی حقوق مزارعین کا خون چوسے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی یہی کیا تھا (اور ہر فاتح یہی کرتا ہے) مگر انھوں نے ایک ہی جگہ ایک ہی آدمی کو بڑی جاگیر نہیں دی اور مزارعین کے حقوق کو تسلیم کرایا۔ اس کے علاوہ ہر جگہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کو آباد رکھا کہ جاگیردار زور نہ پکڑیں اور مزارعین کے حقوق کی حفاظت رہے۔ عام اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان۔ مسلمانوں کے زمانہ میں نہ جاگیرداروں کو شکایت ہوئی نہ مزارعین کو۔ ہر ایک اپنے اپنے حال میں خوش تھا۔ یوں ایک قوم کی قوم پروری اور دوسری کی دوراندیشی اپنا اپنا پھل لائی۔

ان حقوق کے علاوہ جاگیرداروں نے اور اراضی خرید کر بھی پیر پھیلائے؛ سیاسی مظالم الگ رہے۔ ان ہی مظالم کی بدولت عام طور پر جاگیرداروں کو "قزاق" کہا جاتا ہے۔ میں بھی آئندہ یہی لفظ استعمال کروں گا۔

ایک اخبار نے قزاقوں اور کسانوں کی متقابل تصویر یوں کھینچی ہے:۔

اگر سیکڑوں نہیں تو بیسیوں قزاقوں نے اپنے علاقوں کو جا کر دیکھا بھی نہیں۔ اُن کے مختار عام، یا وکیل، یا سالسٹر گھر بیٹھے اُنکے لگان بھیج دیتے ہیں، اور یہ شہروں میں بیٹھے گلچھرے اُڑاتے ہیں۔ اگر کوئی قزاق اپنے علاقہ میں جاتا ہے تو اپنے بیسیوں جانور کو لیے ہوئے سیر و شکار کے لیے۔ ان کا جانا غریب مزارعین کے لیے اور بھی مصیبت کا باعث ہوتا ہے، کہ کمبخت روندے جاتے ہیں اور نذر و نذور کے علاوہ رسد بہم پہونچانا پڑتی ہے۔ اس کی کہیں داد و فریاد نہیں۔ قانون مزارعین کے لیے نہیں۔ مزارعین کی یہ حالت ہے کہ وہ گویا روز پیدائش سے اُسی زمین پر رہتا ہے جس پر محنت کرتے کرتے وہ وہیں پیوند خاک ہو جاتا ہے۔ قوانین مال اور شرائط پٹہ سے اُسکے ہاتھ پیر بندھے رہتے ہیں۔ ہر چیز کا بار ذمہ داری اُس پر ہے۔ لگان کے ادا کرنے میں وہ دیر نہیں لگا سکتا، اگر بارش نہ ہو، یا کوئی اور آفت ارضی و سماوی آئے، یا قزاقوں کے گھوڑوں کے ٹاپ اُسکی کھیتی برباد کر دیں، تو وہ تخفیف لگان کی اُمید نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اراضی میں کوئی ترقی کرتا ہے تو وہ قزاق کی ملکیت ہوتی ہے اُس کا کوئی نفع مزارع کو نہیں ملتا۔

یہ سب کچھ بیان کر کے وہ اخبار یہ رائے دیتا ہے کہ "مزارعین کے حقوق [illegible]

توجہ کرنا چاہیے، کیونکہ ہمارے ملک کی فلاح و دولت ان ہی پر منحصر ہے۔ انکی خدمات اور احسانات ایسے ہیں کہ فوراً ایسا قانون بنایا جائے کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ اس میں سستی نہ کرنا چاہیے۔ جو بات آج ہم بخوشی خاطر کر سکتے ہیں اس کو بغاوت اور انقلاب ہونے تک کیوں چھوڑیں آج گورنمنٹ سستی کر سکتی ہے، مگر بغاوت کے بعد وہی کچھ جلدی میں کرنا پڑیگا۔ اس میں گورنمنٹ ہی کا نقصان ہوگا" یہ محض دھمکی ہی نہیں ہے بلکہ شدنی ہے۔

لگان اور شرائط پٹہ ہی وہ چیزیں ہیں ... جو مزارعین کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے ہیں انکی عزت و آبرو بھی تو کچھ نہیں سمجھی جاتی۔ تاجار وہ ایک جاگیردار کی زمین چھوڑتے ہیں اور دوسری جگہ اس امید پر جاتے ہیں کہ شاید وہاں امن و عافیت ملے، مگر آسمان سب جگہ ایک ہی ہے۔

مزارعین نے اپنی ایک ایسوسی ایشن قائم کرنا چاہی۔ ضلع پالنسیا میں یہ تحریک شروع ہوئی وہاں کے حاکم ضلع وہ شخص تھے کہ جن کی جاگیر اور زمینداری اس ضلع میں تھی۔ انھوں نے ایک نہ چلنے دی۔ مزارعین نے بیرونی مدد لی۔ ایک صاحب پیڈرو سینول نے صاحب ضلع کو اسکے متعلق لکھا۔ چھ مہینے تک جواب ہی نہیں ملا۔ بمشکل یہ جواب آیا کہ پارلیمنٹ کے ممبروں کے انتخاب کے بعد اس پر غور کیا جائیگا۔ وہ وقت بھی آگیا، اور جو قواعد بنائے گئے تھے وہ انھوں (صاحب ضلع) نے منظور کر لیے، مگر خفیہ طور پر ہدایات جاری کر دیں کہ اس پر کوئی توجہ نہ کی جائے بلکہ رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ اس پر اخبارات میں بڑے بڑے مضامین چھپے۔ مگر مارچ ۱۹۲۱ء سے غالباً اب یہ معاملہ وہیں کا وہیں ہے جہاں سے شروع ہوا تھا۔

غریب مزارعین کو بڑی مصیبت اُسوقت ہوتی ہے کہ جب کوئی فریق کونسل کے انتخاب کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور اس سے زیادہ آفت کا سامنا اُسوقت ہوتا ہے کہ وہ منتخب ہو جاتا ہے۔ اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہر شخص خود قیاس کر سکتا ہے۔

بعض ایسوسی ایشن کے ممبروں کے زور دینے پر ایک قانون کونسل میں پیش کیا گیا کہ بڑی بڑی جاگیروں کو کسی طرح حصص میں تقسیم کر دیا جائے اور فریقوں کی چیرہ دستیوں کی روک تھام کی جائے۔ یہ قانون بالکل نیک نیتی پر مبنی تھا، مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس قانون کا مسودہ ایسی بے احتیاطی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا کہ اس سے مزارعین کو بجائے فائدہ کے نقصان ہی پہونچا۔ فریقوں کے گروہ نے اس سے مخالفت نہیں کی اور دوسرے ممبروں نے اس پر غور نہیں کیا اور بعد چند تقریروں کے ۱۹۱۹ء میں پاس ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء میں اور مسودہ بنایا گیا معلوم نہیں

کہ اُسکا کیا حشر ہوا۔ بہرحال اُمید پڑتی ہے کہ اگر اس معاملہ کی طرف اسی طرح توجہ رہی تو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔

مزارعین کی شکایات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ڈکٹے ٹر کو اس طرف توجہ کرنا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ڈکٹے ٹر صاحب فوجی افسر ہیں، اور اُنکے بڑے بڑے جنرل قزاقوں کے فرقہ میں سے ہیں۔ اگر وہ مزارعین کی تکالیف رفع کرتے ہیں تو یہ قزاق کیا کھا کر جیئیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بغاوت کا اندیشہ ہے اور ملک اسکے لیے شاید اب تیار ہو گیا ہو، کیونکہ امیر عبد الکریم کا خطرہ گیا، گو مزارعین کے دل کی جلن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور یہ خود مخدوش ہے۔

مسلمانوں کے انتظامات اراضی و محکمۂ مال کی خوبی کا یہ ثبوت ہے، کہ علاقہ اندلوشیہ (جنوبی اسپین) میں اب مزارعین اور اُنکے مددگار ایسوسی ایشنوں کا ... یہ مطالبہ شروع ہوا ہے کہ موجودہ انتظامات میں تبدیلی کرکے بعینہ وہی صورت پیدا کردی جائے جو مسلمانوں کے زمانہ میں تھی۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

صوبۂ قشتالونیہ میں ہوم رول وغیرہ کی تحریکات

یہ بہت نازک سوال ہے اور اسپین کو سخت پریشان کیے ہوئے ہے۔ اس میں اور ہندوستان کی موجودہ تحریکاتِ آزادی میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ اگر ہندوستانی وہاں کی تحریکات پر غور کریں تو شاید بیجا اور خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ مگر اسپین کچھ اتنا پست ملک ہے کہ ہم ہندوستانی باوجود اپنی انتہائی ذلت و غلامی کے اُس طرف نگاہ نہ کریں گے۔ غرور و غلامی ایک عجیب طرح کا مرکب ہے! میں اس مضمون کو انتہائے اختصار سے لکھوں گا۔ گو میں اسکو تسلیم کرتا ہوں کہ یہ محتاج تفصیل ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو قشتالونیہ ایسا علاقہ ہے کہ جسکو اسپین سے بہت کم تعلق ہے۔ خیالات، راہ و رسم، زبان، تاریخ وغیرہ وغیرہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ اگر کسی وقت صرف اکھڑ سپاہی ہیں، تو یہ بلند نظر ہیں۔ مسلمانوں کی گرفت ان پر اتنی سخت رہی کہ یوں کان نہیں ہلا سکے۔ اسکے ساتھ حقیقۃً مسلمانوں کے عدل و انصاف کی وجہ سے وہ خاموش رہے، ورنہ اُنکے جوہر اب کھلے ہیں وہ چلے سے اُن میں موجود تھے۔

جب اُنھوں نے مسلمانوں سے علاقہ چھینا ہے تو خیال یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت الگ قائم کرلیں گے۔ چند روز تک رہی بھی، مگر بگنیا ہوں کا خون نہ تھا لایا اور یہ غلام بنے۔ اسپین نے

ان پر یہاں تک ظلم کیا کہ انکی زبان تک کو مٹا دیا - اُنیسویں صدی کے ثلث اول (۱۸۳۳ء) میں ان لوگوں کو کچھ زیادہ ہوش آیا - وہ دن اور آج کا دن کہ انکے مطالبات بڑھتے جاتے ہیں - گورنمنٹ کی طرف سے اس میں اغماض ہوا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیٹیکل قتل شروع ہوے - وزراء پر بم پھینکے گئے اور سخت جان بادشاہ اسپین تو ہر وقت معرض ہلاکت میں رہتا ہے - جیسا کہ آئے دن معلوم ہوتا رہتا ہے - کمیونسٹوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - روس کی سوویٹ گورنمنٹ اپنا لالچ پھیلائے ہوے ہر وقت موجود رہتے ہیں - مطالبات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - وہ ہوم رول چاہتے ہیں مگر اس خوبصورتی کے ساتھ کہ گویا آزادیِ کامل اُن کا نصب العین ہے - اسوقت اُن کے مطالبات یہ ہیں کہ :-

(۱) قتلونیہ کو سلف گورنمنٹ دیکر ایک الگ ریاست تسلیم کرلیا جائے اور اُسکو اپنے معاملات میں کامل اختیارات دیدیے جائیں -

(۲) قتلونیہ میں پارلیمنٹ یا لیجسلیٹو اسمبلی قائم کرلینے کا اختیار دیا جائے جس کو اسپین سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ صرف اپنے ہموطنوں کو جواب دہ ہو -

(۳) قتلونیہ کو اکزیکٹو کونسل قائم کرنے کا اختیار دیا جائے جو اپنی ہی پارلیمنٹ یا اسمبلی کو جواب دہ ہو -

(۴) قتلونیہ کے قدیم قوانین اور کانسٹی ٹیوشن کو اسمبلی کی معرفت پھر نافذ کردیا جائے -

(۵) قتلونیہ اپنی ہائیکورٹ خود قائم کرے - اُس کا حکم ایسا مطلق ہو کہ بادشاہ تک کو اُسکے مرافعہ سننے کا اختیار نہ ہو -

(۶) قتلونیہ کی زبان ہی زبان عدالت ہو - اُسی زبان میں سچ کی خط وکتابت ہو اور قتلونیہ کے متعلق تمام سرکاری مراسلات لکھے جائیں - (حامیان اُردو کے لیے شاید یہ مطالبہ کچھ سبق رکھتا ہو)

(۷) قتلونیہ صرف معاملات خارجہ بحری وبری فوج، سکہ، اوزان، پیمانہ، تجارت، خاص بحری، ذرایع آمدورفت وغیرہ امور میں اسپین کے ساتھ سردست متحد ومتفق رہیگا، مگر دست نگر نہ ہوگا -

یوں کہنا چاہیے کہ اُنکی جد وجہد اب شروع ہوئی ہے - ڈکٹیٹر صاحب نے ۱۹۲۳ء تک اُدھر توجہ نہیں فرمائی تھی - قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس معاملہ کو اُنھوں نے اہم نہیں سمجھا - دلوں کی جلن بڑھتی جاتی ہے اور معاملات بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں - اُمید نہیں پڑتی کہ ڈکٹیٹر قتلونیہ [illegible] بالخصوص [illegible] لیے کہ امیر عبدالکریم کی مہمات کو تمام خریف قتلونیہ

سے وصول کیا گیا تھا اور انھوں نے اسپر سختی سے احتجاج کیا تھا - پریوڈی ریویرا کا بڑا یہ فخر و ناز ہی مہم تھی - اور اس میں ذرا بھی چون و چرا کرنے والوں کے پریو سخت ترین دشمن ہو جاتے ہیں اُدھر قسطنطنیہ والوں کے پاس اتنی فوج نہیں کہ وہ اپنی ہستی کا ثبوت دے سکیں - ورنہ اب اب تک اُنھوں نے فیصلہ کرا لیا ہوتا - بہرحال کچھ ایسے مواد موجود ہیں کہ بھک سے اُڑنے کو تیار رہیں -

یہ ظاہر ہے کہ اگر قسطنطنیہ نے ہوم رول لیلیا تو اسپین کا بازو ٹوٹ جائے گا - دونوں طرف کشیدگی موجود ہے - انجام اللہ کے ہاتھ ہے - خدا شر سے برانگیزد -

اخبارات

بانشتا دا سپین، قریباً تمام یورپ کے اخبارات پرلے زمانہ کی عربی شاعری کا درجہ رکھتے ہیں کہ دل و دماغ کو بدل دیتے ہیں - اسپین اس معاملہ میں بھی یورپ سے ہزاروں میل پیچھے ہے کہتے ہیں کہ کسی ملک کے اخبار اُس ملک کا آئینہ ہوتے ہیں - یہ اصول (اگر اسکو اصول کہا جائے) اسپین پر بہت زیادہ منطبق ہوتا ہے - یہاں کے اخباروں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ جنوبی و وسطی امریکہ کے اسپینی اخباروں سے بھی زیادہ ادنیٰ درجہ کے ہیں - اسپین کے عوام شوق سے نہیں دیکھتے اور حکام اُن پر چنداں توجہ نہیں کرتے - اسکی یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں نہیں - باوجودیکہ قابل و ہوشمند و سیاست داں آدمی اُنکے ایڈیٹر اور مالک ہیں مگر ملک زیادہ توجہ نہیں کرتا - اول تو اسپین میں اخبار نویسی (میرا مطلب ایڈیٹری سے ہے) کوئی موقر پیشہ نہیں کہ کوئی بھلا مانس اور ذریعہ معاش چھوڑ کر اُسکو اختیار کرے - دوسرے اسپین کے عوام الناس اسکو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ کوئی شخص اتنا بے وقوف یا اس دل و دماغ کا آدمی ہوگا کہ وہ زندگی کی پیاری چیز اور اپنی تمام طاقتیں ایسی چیز پر خرچ کرے جو سب کے لیے نفع رساں ہو، یا وہ کسی خاص اصول پر ہمیشہ اڑا رہے - اور اپنی زندگی اُس پر فدا کرے ہر شخص کا یہ خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ جو شخص یہ پیشہ اختیار کرتا ہے وہ اپنی ذاتی غرض سے - یہ خیال اُن لوگوں سے نفرت پیدا کرنے کے لیے بالکل کافی ہے - جو کوئی اخبار پڑھے گا وہ اُس میں اسی کو ڈھونڈھے گا اور پالیگا - اور اخبار کو نفرت سے اُٹھا کر پھینکدے گا - اب اس کی وجہ خواہ واقعی صحیح ہو یا عام رجحان عوام ہو، یا کمی تعلیم ہو - ہر کیف کیفیت یہ ہے کہ کوئی اخبار (خاص کر روزانہ) اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتا - اسکو کسی متمول

شخص سے روپیہ لینا پڑتی ہے اور وہ اخبار اُسی کا مداح یا اُسکی رائے کو سر بفلک اور بڑھانیوالا ہوتا ہے اور وہ خیال کہ اسکی سطروں میں کوئی خود مطلبی پنہاں ہے صحیح ہو جاتا ہے - اسکول یا کالج کے لڑکے نکلتے ہیں اُنھیں فوراً کسی شغل اور آمدنی کی فکر ہوتی ہے - وہ اخبار نویسی شروع کر دیتے ہیں یا کسی اخبار میں (جیسا کہ کسی زمانہ میں پیسہ اخبار تھا) ملازمت کر لیتے ہیں - آمدنی کم ہوتی ہے اور تنخواہ کم ملتی ہے - یہ لوگ ہری چگ ہوتے ہیں چند ہی روز میں اچھی جگہ مل جاتی ہے اور وہ چڑیوں کی طرح اُڑ جاتے ہیں - ظاہر ہے کہ ایسا آدمی کیوں دل لگائے اور اسکی رائے کی کیوں وقعت ہو - رہ گئے پرانے اخبار نویس انکو تجربہ اتنا مزور سکھا دیتا ہے کہ اسپین کے پولیٹکل معاملات ایسے نہیں ہیں کہ کوئی اصول رکھتے ہوں - اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی اخبار جو آج عوام الناس کا ہمدرد اور گورنمنٹ کا شاکی ہے، کل اسکے برعکس مضامین لکھتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ اُس کا قلم اُس شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو اُنکو زیادہ دے -

مملکت اسپین کچھ بہت چھوٹی سی نہیں - اور پھر وہ یورپ میں واقع ہے - اس پر اُسکے اخبارات کی تعداد و اشاعت ملاحظہ فرمائیے :-

سہ ماہی چھپنے والے		۶۱
ماہوار	"	۷۱۷
مہینہ میں دوبار	"	۳۲۰
مہینہ میں ۳ بار	"	۱۰۱
ہفتہ میں دوبار	"	۵۶۳
ہفتہ میں تین بار	"	۳۶
روزانہ	"	۲۹۰
دیگر موقت الشیوع		۳۴
وقت اشاعت نامعلوم		۱۲۷
میزان		۲۲۴۹

میزان

روزانہ اخبارات زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں نکلتے ہیں - اُنکی کمی اشاعت پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کئی کئی روزانہ اخبار کیوں خریدے - مگر اشاعت کی کمی کی وجہ اور بھی ہو سکتی ہے - ایک تو ابھی بیان ہو چکی ہے - دوسرے جہالت، جسکی مزدوروں اور متوسط الحال لوگوں

میں کمی نہیں۔ تیسرے اہالی اسپین کی اخباروں کی طرف سے عام بے پروائی، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں ہوں یا نہ ہوں۔ جنگ نے کچھ شوق پیدا کیا تھا، مگر اس پودے کی آبیاری ختم ہو رہی ہے، وہ مرجھا رہا ہے اور چند روز میں مرجائے گا۔ اسپین کے اخبارات اب اپنے اخباروں کو زیادہ دلچسپ بنا رہے ہیں۔ اُنھوں نے ممالک غیر میں اپنے نامہ نگار بھیج رکھے ہیں، جو لوگ یہاں آتے ہیں اُن سے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں، مگر ابھی تک نتیجہ صفر ہے۔ اگر جہالت اور غفلت پر اخباروں کے اکید دوسرے کے ساتھ مقابلہ کو ایزاد کیا جائے تو یہ اُمید نہیں پڑتی کہ اشاعت میں کچھ ترقی ہوگی۔ تعجب یہ ہے کہ میڈرڈ کے دو روزانہ اخبار اس کا دعوے کرتے ہیں کہ اُنکی تعداد اشاعت دو لاکھ روزانہ ہے۔ اور کوئی اخبار تو ایک لاکھ چھپنے کا بھی دعوے نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں اُنکی آمدنیاں ہرگز خرچ کو کفایت نہیں ہوسکتیں۔ خاص کر اس لیے کہ اشتہارات کا رواج یہاں اب تک ابتدائی حالت میں ہے، اور اخبارات میں کم ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جتنے اچھے اخبار یہاں نکلتے تھے اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنا خرچ خود برداشت کرلیتا۔ گورنمنٹ اُنکو امداد دیتی تھی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ آدھے آنے سے زیادہ قیمت نہیں بڑھا سکتے۔ (شاید اس لیے کہ اس سے زیادہ میں کوئی شخص نہیں خریدتا) حالانکہ اُن دنوں کاغذ اتنا گراں تھا کہ آدھ آنہ سے زیادہ کا غذ میں خرچ ہوجاتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کی امداد بھی رُک گئی، مگر اخباروں کی قیمت کم سے کم ایک آنہ کردی گئی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ اشاعت کم ہوگئی۔ اسپین کا بنا ہوا کاغذ خراب اور گراں پڑتا ہے اور دیگر ممالک سے آیا ہوا گراں تر۔ حالانکہ گورنمنٹ نے محصول معاف کردیا ہے۔ باوجود اس کے اخبار ارزاں ہی فروخت کیا جاسکتا ہے۔

اسپین کے اخبارات کی غیر ہر دلعزیزی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ اوّل تو کاغذ خراب، دوسرے چھپائی اتنی خراب کہ اوّل تو پڑھنے والے کے ہاتھ اور کپڑے سیاہ ہوجائیں، پھر آنکھوں پر زور دے کر بھی نہ پڑھا جائے۔

اسکے علاوہ ذرائع آمد و رفت اتنے کم اور متعسر ہیں کہ ایک اخبار ہفتہ ہفتہ بھر کے بعد بعض مقامات میں پہونچتا ہے۔ اور بیکار ہوجاتا ہے۔ ریل ملک میں ہے مگر اس سے مسافر ہی نالاں ہیں، چہ جائیکہ ڈاک۔

اخبارات کی بے قدری ایسی نہیں ہے کہ اہالی اسپین بالکل مایوس ہوجائیں۔ زمانہ اپنا اثر کر رہا ہے اور انکی حالت روز بروز درست ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر آفت ارضی و سماوی کا ذکر نہیں ہے

مشکل یہ کہ ذرا سی ملکی خلش میں تمام اخبارات پر سنسر بیٹھ جاتے ہیں۔

حکومتِ فوجی

یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا وہ اسپین کا اگرچہ بالکل صحیح نقشہ ہے مگر ایسا کہ اس میں سوا پستی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ خیر خواہان اسپین خود سخت پریشان ہیں اور مآل کار سے بدگمان۔ ملک پر گھٹا گھور گھٹا چھائی ہوئی، اور ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ اولے اب پڑے کہ پڑے۔ یہ بھی برکاتِ دمِ عیسوی ہیں کہ بیرونی خطرہ نہیں، اگر کوئی خدشہ ہے تو یہ کہ اندرونی زخم نہ پھوٹ جائے۔ اس تاریکی میں اگر امید کی کوئی کرن نظر آتی ہے تو وہ حکومت فوجی ہے۔ اسکو میں کسی قدر تفصیل سے بیان کروں گا کیونکہ اسکا حال ہندوستان میں کم معلوم ہے۔ نیز اس سے اور امور پر بھی بہت کچھ روشنی پڑیگی۔ اگر ناظرین طبائع پر بار ہو، تو میں معافی خواہ ہوں۔

تمام ممالک نے بعد از تجربہ یہ قرار دیا ہے کہ حکومت میں لامرکزیت پیدا کرنا چاہیے کہ ہر قسم کی سہولت بھی ہو اور استحکام بھی۔ مگر اسپین کا بادآدم نرالا ہے۔ یہاں مرکزِ حکومت میڈرڈ ہے اور ہر قسم کے اختیارات صرف ناظمان میڈرڈ کو حاصل ہیں۔ صوبجات و دیہات وغیرہ کے لیے یہ ناممکن ہے کہ رعایا کی شکایات کو سن کر ان کا سدباب کریں۔ حکامِ صوبہ و اضلاع کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اپنے ذاتی منافع و پالٹکس میں اتنے گرفتار ہیں کہ کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تمام خرابیاں جو ایک بدنظم گورنمنٹ میں ہونا چاہییں مجسم ہو کر اسپین میں موجود ہیں۔ دوسری طرف شمالی و مشرقی اسپین میں جو نہایت خفیف سی ترقی تعلیم ہوئی اُس کے تمدن نے بھی اُسی حصہ رسدی سے ترقی کی حرفت کی چھوٹی سی ترقی نے مزدوروں کے دلوں میں ہیجان پیدا کیا۔ محاصل کی تخفیف نے ملک کو کسی قدر امداد پہونچائی۔ جنگ میں ملک نے غیر طرفدار رہ کر کچھ تمول میں ترقی کی۔ ہوشمند لوگوں نے غیر ممالک میں جا کر وہاں کی حالت کو اپنے ملک سے مقابلہ کیا۔ ان تمام باتوں کا متفقہ نتیجہ یہ ہوا کہ سونے والوں نے ذرا کروٹ لی، اب بجلا مزدوروں سے یہ کب اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ نیم فلاکتانہ زندگی بسر کرنے پر قناعت کرینگے۔

ملک میں جو بےچینی پھیلی ہوئی تھی وہ اُن مساعدات سے ظاہر ہوئی جو قتلونیہ اور دیگر رفتی اضلاع میں ہوئے۔ قتلونیہ میں اپنی بھولی ہوئی قومیت یاد آگئی اور اپنے ہی علاقہ کو ترقی دینے کا خیال پیدا ہوگیا یہ وہ مقامات ہیں کہ جو بھر کشمکش میں ختم کر دیے گئے ہیں۔ خود کشمالیں قدیم ہی کی حالت منزلزل تھی۔

اندلوشیہ، لیون، اور ایسٹر میڈورا میں مزارعین کی حالت نے کچھ ایسا رُخ بدلا تھا کہ تباہی اور بغاوت کے تمام اسباب مہیا تھے۔ ہر طرف سے یہ صدا آ رہی تھی کہ مرکزی حکومت بالکل جمود کی حالت میں ہے۔ ارباب بست و کشاد اس طرح کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے کہ اُن تک رعایا کی شکایات نہ پہونچتی تھیں اور وہ تحفظ حقوقِ شہریت کے متعلق ادنیٰ سا کام بھی نہ کرتے تھے۔ لبرل اور کنسرویٹو گروہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس طرح ہو گئے تھے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی ڈفلی الگ لیے ہوئے اپنا ہی راگ الاپ رہا تھا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا، مصیبت تو یہ تھی کہ ہر شخص کو اپنے اپنے پیٹ کی فکر تھی۔ ملک کی خوش قسمتی تھی کہ یہ لوگ ابھی تک ری پبلکن، ریفارمسٹ، فیڈرلسٹ، سوشلسٹ اور کامیونسٹ، فرقوں سے نہیں جا ملے تھے اور ان فرقوں میں خود ایسے اختلافات تھے کہ ملک اُنکے خیالات سے بچا رہا۔ ملک نے اُنکو بھی ویسا ہی سگِ زرد سمجھا جیسا کہ وہ اپنے پرانے مربّیوں کو شمار جانتے تھے۔

غرض ملک کی حالت کچھ ایسی نازک ہو گئی تھی کہ چاروں کا دفعتہً فتنہ و فساد معلوم ہوتا تھا۔ اور اسپین بھر میں یہ اندیشہ تھا کہ اس حالت کے دفعیہ کے لیے تلوار میان سے نکلا ہی چاہتی ہے، جسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ کیتھولکوں کے لیے دروازہ کھل جاتا اور بغاوت کی آگ سراسر اُٹھتی۔ ملک کے مصلحین (یا صحیح معنوں میں انقلاب پیدا کرنے والوں) کو یہ تو اُمید تھی کہ کلیسا ہمارے ساتھ ہو جائے گا، مگر یہ توقع نہیں تھی کہ فوج ہمارا ساتھ دیگی، کیونکہ بہت سے جنرل فرسودہ خیال تھے اور موجودہ حالت کو برقرار رکھنے میں اپنا ذاتی مفاد سمجھتے تھے، گو اُنکو بھی اپنے ماتحت افسروں اور سپاہیوں پر اعتماد کلی نہ تھا کہ وہ اُن (جنرلوں) کا ساتھ دیں گے، کیونکہ یہ لوگ بھیڑ بھرتی کیے جاتے تھے۔ فوج کی عام حالت یہ تھی کہ وہ خود مرض سے ترتیبی اور بدنظمی میں گرفتار تھی۔ ریف میں اسپینی فوج کی تباہی سے پہلے، یعنی ۱۹۲۱ء میں ایسی علامات نظر آ رہی تھیں کہ جنرلوں کے سوا تمام فوج میں سرکشی و بغاوت کے خیالات پیدا ہو چکے ہیں؛ ریف کی مصیبت کے بعد تو یہ بالکل عیاں ظاہر ہو گئے تھے۔ چنانچہ امیر عبدالکریم کے مقابلہ میں نہ صرف فوج نے، بلکہ وزارتِ فوج نے اپنی نالائقی اور اپنا تذبذب ظاہر کر دیا تھا۔ اس محکمہ کا یہ حال تھا کہ وہ امیر سے ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ انکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر مقابلہ کیا جائے۔ اب یہ بھی افواہیں اُڑنے لگیں کہ فوج اس لیے اپنے بادشاہ سے ناخوش ہے کہ اُس نے تمام کاروبارِ سلطنت اُن لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے جو اس تمام بدنظمی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بالکل صحیح تھا، کیونکہ کانسٹی ٹیوشن ہی ایسا ہے کہ اسکے سوا بادشاہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال فوج یہ چاہتی تھی کہ وہ زور ڈال کر بادشاہ کو تخت سے اُتار دے اور ولیعہد (پرنس آف اسٹریاس) کو تخت پر بٹھا دے۔ یوں ناتجربہ کار نوجوان بادشاہ

کو اپنی کٹ پتلی بنا کر اُس سے اپنی پالیسی پر عمل کرالیں۔

اس تمام پیچیدگی کا مرکز قتلونہ کا صدر مقام بارسلونہ تھا۔ کیونکہ یہاں اس وجہ سے فوج زیادہ رکھنا پڑتی تھی کہ وہاں سنڈی کلسٹ، کمیونسٹ، انارکسٹ وغیرہ کا زور تھا۔ ڈیوک میگوئیل پریمو ڈی ریویرا، مارکوئیس ڈی ایسٹیلا ۱۲ ستمبر ۱۹۲۳ء سے پہلے یہاں حاکم فوج تھے۔ اُنھوں نے اپنے اور جنرلوں کو ساتھ ملا کر یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ ۱۵ ستمبر کو انقلاب کے لیے بغاوت کر دی جائے۔ یہ خبر اُڑ گئی، اس لیے اُنھوں نے ارادہ کیا کہ بجائے ۱۵ کے ۱۲ ستمبر ہی کو یہ کارروائی کی جائے۔ ۱۹۲۱ء میں امیر عبدالکریم نے جو فاش اور شرمناک شکستیں اسپین کی فوج کو دی تھیں اُنکے متعلق یہ قرار نہیں دیا جا سکا تھا کہ انکی ذمہ داری محکمہ فوج پر پڑتی ہے یا محکمہ ملکی پر۔ ۱۹۲۳ء میں اُس نے بُری صورت اختیار کر لی۔ گورنمنٹ نے جو اسکے متعلق فیصلہ دیا تھا وہ اس قدر غیر تشفی بخش تھا کہ پیشہ ور رہبران ملک کے خلاف جو کچھ بھی کیا جاتا عوام الناس اُس سے بہت خوش ہوتے۔ یہ بات انقلاب کرنے والے لوگوں کی اور بھی تقویت کا باعث ہوا۔ ۱۲ ستمبر کو پریمو ڈی ریویرا نے ایک بیان شایع کیا جس میں لکھا تھا کہ "گورنمنٹ کی بدنظمیوں سے ملک کو بچانے کے لیے" اسپین کی فوج نے بادشاہ سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اپنی کیبنیٹ سے استعفا لے لے۔

شاہ الفانسو سیزدہم نے اسوقت بڑی عقل سے کام لیا۔ جس وقت پریمو ڈی ریویرا نے یہ مطالبہ پیش کیا بادشاہ سان سباسٹین میں تھا۔ اُس نے وہیں تحقیقات کر کے یہ معلوم کر لیا کہ فوج واقعی بغاوت پر آمادہ ہے اور تمام رعایا اُسکے ساتھ ہے۔ اسکے بعد وہ میڈرڈ گیا اور وہاں جا کر وزراء اور کمانڈر فوج متعینہ میڈرڈ (جنرل کاراکنٹی) سے اس معاملہ میں مشورہ کیا۔ وزیر اعظم (البوسماس) نے ایک حکم تحریری اس مضمون کا شاہی دستخطوں کے لیے پیش کیا کہ "بواہ بدبغاوت فوجی پریمو ڈی ریویرا کو معزول کر کے گرفتار کیا جاتا ہے"۔ یہ حکم کانسٹی ٹیوشن کے موافق تھا۔ مگر بادشاہ نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وزیر اعظم نے استعفا دیدیا اور فوراً منظور کر لیا گیا۔ پریمو ڈی ریویرا کو بھی استعفا دینے کا حکم دیا گیا، مگر جب اُس نے انکار کیا اور صاف صاف باغی ہو گیا تو اُسکو بذریعہ تار طلب کر کے وزارت کا کام سپرد کر دیا گیا۔ اُنھوں نے آکر بحیثیت پریزیڈنٹ فوراً چند جنرلوں کی ایک کونسل عارضی بنا لی۔ اور اُنکے تمام ماتحت افسران پریمو سے متفق الرائے تھے۔ ملک نے کوئی مخالفت نہیں دکھائی؛ صرف اتنا ہوا کہ بلبائو میں ایک پُرزور اسٹرائک ہو کر رہ گئی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر اس عارضی کونسل کو موقوف کر کے دوسری مستقل کونسل بنائی گئی اور بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ

جسکی رو سے تمام نظم بشق پریمو کے ہاتھ میں دیدیا گیا، سوا وزرائے مینہ فوج و خارجہ کے تمام وزراء موقوف کردیے گئے، پارلیمنٹ توڑدی گئی، کانسٹی ٹیوشنل ضمانتیں موقوف کرکے تمام اسپین میں مارشل لاء جاری کردیا گیا، وغیرہ وغیرہ

اس نئی فوجی حکومت نے بروے اختیار مارشل لا[1] سب سے پہلا یہ کام کیا کہ تمام دفاتر کا وقت ۹ بجے صبح سے ۲ بجے شام تک مقرر کیا اور حکم دیا کہ جو کوئی سوا نو بجے تک اپنے دفتر میں نہ پہونچ جائیگا وہ سزا پائیگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیکڑوں ایسے کلرک دفتر میں آموجود ہوئے جنکی کبھی صورت بھی نہ دکھلائی دیتی تھی۔ یہ کلرک اکثر وزراء کے آوردہ یا پروردہ تھے۔ انکے نام قبض الوصولی پر ضرور تھے، مگر وہ دفتروں میں صرف تنخواہیں لینے کے لیے آتے تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے کہ اتنی بھی تکلیف گوارا نہیں فرماتے تھے اور اپنے ملازموں کو بھیجکر تنخواہ منگوا لیتے تھے[2]۔ ان میں سے اکثروں کو فوراً موقوف یا معطل کردیا گیا۔ اس سے عوام الناس میں خوشی ہوئی، مگر ان غریبوں کے گھروں میں کہرام مچ گیا۔

تمام مقامی کونسلوں کو توڑدیا گیا اور میئروں کو موقوف کردیا گیا۔ لوگوں کو جتنی خوشی اس حکم سے ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ رنج اس حکم نے پہونچایا جسکی رو سے جوری کا قاعدہ توڑدیا گیا۔ رعایات برسوں کی مشقت کے بعد اسکو پایا تھا۔ جو بیک گردش قلم ختم کردیا گیا۔ ایک ہائیکورٹ بنایا گیا جسکا پریزیڈنٹ ایک امیرالبحر ہے اور تین جنرل جج ہیں، اور وہ مقامی آدمی ہیں۔ اس نے عدل و انصاف کی رہی سہی کمر توڑدی۔

انکے علاوہ اور بہت سی اصلاحیں ہوئیں، انکی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ بہت سے وعدے کیے گئے۔ مثلاً سول گورنمنٹ پھر بحال کی جائیگی اور قزاقوں کا زور توڑا جائیگا، وغیرہ۔ مگر دیکھیے یہ وعدے کبھی ایفاء بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ کئی احکام تو ایسے ہیں جن پر اسپین کے عموں کے موافق عمل نہیں ہوا اور بھول بسر گئے۔

کمیونسٹ، سوشلسٹ، انارکسٹ فرقے اس فوجی حکومت کے دشمن ہیں۔ مزدور چند روز

---

[1] خوش قسمت ہیں وہ اصحاب کہ جو مارشل لا کے معنی اور اسکی سنگینی کو نہیں سمجھتے۔ راقم بدقسمتی سے مارشل لا کے ایام میں لاہور میں تھا اور اسکی سختیاں دیکھے ہوئے ہے۔

[2] کوئی بوڑھے بزرگ شاید بتلا سکیں کہ شاہان اودھ کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا تھا یا نہیں۔ کیونکہ انھیں کا زمانہ بدنظمی میں مشہور ہے۔

خوش رہے، لیکن چونکہ وہ وعدے جو اُن سے کیے گئے تھے وہ ایفا نہیں ہوئے اس لیے اُن کی ناراضی بڑھتی جاتی ہے۔

اس حکومتِ فوجی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ یہ تمام تحریک قتلونیہ سے شروع ہوئی اور اُسی صوبہ نے اس میں بڑی مدد کی، مگر یہ حکومت اُسی صوبہ کی بلند نظری کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے۔ یہ مسلّم کہ مارشل لا ہمیشہ اُس دہشت کو رفع کرتا ہے جو عوام کے دلوں میں کسی خاص فرقہ یا گروہ کی طرف سے پیدا ہو جاتی ہے، لیکن دہشت کا علاج دہشت انگیز کارروائیوں سے نہیں ہوتا بلکہ استمالت کرنے اور حتی الوسع شکایات کو رفع کرنے سے ہوتا ہے۔ اس میں یقیناً پریموڈی ریویرا نے کچھ زیادتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا، اور باوجود اُن کی دہشت کے وہاں خفیہ کارروائیاں شروع ہو گئیں (جو سلطنت کے لیے بہت خطرناک ہوا کرتی ہیں۔ کمیونسٹ اور انارکسٹ فرقہ کے قدم جمنے اور انکی گرفت اور عظمت بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات کچھ پوشیدہ نہیں رہی کہ عوام الناس کی ناراضی بڑھ رہی ہے۔ انجام اللہ کے ہاتھ ہے۔

امیر عبدالکریم اسپین کے پہلو میں آہنی کانٹا تھے۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ (۱) اُنھیں کو تباہ کرنے کے لیے یہ اصلاحیں کی گئی ہیں (۲) رعایا کو اس میں مدد دینا چاہیے، اور (۳) بادشاہ کا وفادار رہنا چاہیے۔ اس خاص معاملہ میں کلیسا سے مدد لی گئی۔ مسلمانوں کے خلاف یہ وہ پرانا ہتھیار ہے کہ صدیوں اس سے بکامیابی کام لیا گیا ہے۔ اسی کو پرانے اسلحہ خانے سے نکالا گیا اور صیقل کرکے اسپین کے سامنے پیش کیا گیا۔ جیسا کہ یقین کیا گیا تھا، اس حربہ نے پورا کام دیا۔

امیر عبدالکریم کی مہمات اور اُنکے حالات ایسے نہیں جو بھولے جا چکے ہوں یہ کل کی بات ہے کہ اُنھوں نے اسپین کی فوج کو مولی گاجر کی طرح کاٹ پھینکا۔ ایک دفعہ نہیں، بارہا۔ سپاہی اُنکے مقابل جانے سے ڈرتے تھے۔ اُنکے نام کی وہ دہشت تھی کہ فوج کی فوج کو اپنے کشتوں کا پشتہ چھوڑ کر بھاگنا پڑتا تھا۔ قریب تھا کہ افریقیہ سے اسپین کی عظمت و اقتدار کا جنازہ اُٹھ جائے، کہ یہاں پریموڈی ریویرا برسرِ کار آ گئے۔ سازشیں ایسی چیز نہیں ہیں کہ جنکی کوئی شکایت کرے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مرتاب کچھ کرتا ہے۔ پریمو نے ادھر اپنی فوج کا دل بڑھایا اُدھر سازشوں کا جال بچھایا۔ امیر کو ایسے قبیلہ پر حملہ کرنے پر مجبور کیا جو بہت کچھ لے کر اسپین کا ہو چکا تھا، مگر فرانس کی رعیت تھا۔ بس یہ قیامت ہو گیا۔ پریمو نے فرانس سے ساز باز کیا، اُس سے فریاد کی، اور اُسکو امیر کے سامنے لا کھڑا کیا۔ امیر نے جو کچھ اُس وقت تک کیا وہ معجزہ سے کم نہ تھا۔ اسپین کی تو

مجال نہ تھی کہ اُن سے آنکھ ملا لیتا، مگر فرانس کا شامل ہو جانا امیر کے لیے غضب ہو گیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسپین تو کچھ مال نہیں، مگر فرانس کا مقابلہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اُنکے کارناموں کا آخری اعلان یہ تین فقرے تھے (۱) میں اُسوقت تک ہتھیار نہیں ڈالوں گا کہ جب تک میرے خاندان کا بچہ بچہ نہ کٹ جائے (۲) فرانس کی مالی حالت ایسی خراب کر دوں گا کہ دُنیا سے اُسکی ساکھ اُٹھ جائیگی (۳) اسپین کی ملکی و سیاسی اقتدار کو مٹا دوں گا۔

افسوس کہ پہلا دعوے اس لیے پورا نہ ہوا کہ امیر نے باوجود اپنی ہوشیاری کے غدار قبیلہ پر اعتبار کیا اور انھوں نے اُنکو گرفتار کرا دیا۔ چوں قضا آید طبیب ابلہ شود اسی کا نام ہے۔ افریقہ و اندلس کی تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ بارہ سو برس کا یہ تجربہ ہے کہ اس قبیلہ (مصمودہ) پر اعتماد کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ اس فرعون کے لیے موسیٰ کی ضرورت ہے۔ موسیٰ بن عمران (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) کی نہیں، بلکہ موسیٰ ابن نصیر (رحمۃ اللہ علیہ) کی۔

دوسرے دعوے کے پورا ہونے کو حضرات ناظرین نہ بھولے ہونگے کہ فرانس کی حالت اس درجہ متزلزل ہو گئی تھی کہ ایک مہینہ میں تین تین وزارتیں بدلی ہیں اور علاج نہ ہو سکا۔ سلطنت کا دیوالہ نکلنا معمولی بات نہیں۔ عوام نے سلطنت کی ہیت مدد کی تب جا کر یہ خطرہ ٹلا۔ مگر اس واقعہ کو آج پانچ برس گزر گئے اب تک دنیا کے بازار میں فرانس کی ساکھ برقرار نہیں ہوئی۔

تیسرے دعوے کی یہ کیفیت ہے کہ اسپین کی جڑیں بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اقتدار بالکل ختم ہو چکا ہے، اور یہ عمارت، جو پریمو ڈی ریویرا کے سر پر کھڑی ہوئی ہے، ممکن ہے کہ چند ہی روز میں زمین پر آ رہے۔ یقین جانیے کہ اگر برکاتِ دمِ عیسوی اُس کے شامل حال نہ ہوتیں تو وہ اسکا ساتھ دیدیتی۔ سیعلمون الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

اب کلیسا نے جو کچھ چاہا تھا اُسکو ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمالیجیے۔ پہلا اور دوسرا مطالبہ پورا ہو گیا تیسرا مطالبہ، جو سب سے زیادہ اہم تھا، اُسکا یہ انجام ہوا کہ پریمو ڈی ریویرا کی چیرہ دستیاں اتنی بڑھیں کہ آخر انھوں نے شاہ الفانسو سیزدہم سے اُس تاریخی دستاویز پر (یوں کہنا چاہیے کہ) بزورِ شمشیر دستخط کرا لیے کہ جسکے رو سے وہ ڈکٹیٹر بن گئے۔ اب سیاہ و سفید کے وہ مالک ہیں اور جناب الفانسو سیزدہم فرانس کے ہوٹلوں میں شراب پیتے پھرتے اور وہاں کے قمارخانوں میں جُوا کھیلتے پھرتے ہیں۔ بہر حال، پریمو ڈی ریویرا سے ٹکر آئی ہے۔ امید یہ ہے کہ انکی عظمت ختم ہو کر رہیگی۔ دیکھیے وہ اپنے ساتھ کس کس کو لیکر ڈوبتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ میری ہی زندگی میں ہو جائے، حالانکہ میں گھڑی

میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوں - یہ بات الگ ہے کہ خدائے تعالیٰ میں یہ بھی قدرت ہے کہ وہ مُردے میں جان ڈال دے - اور وہ اپنے نبی حضرت عیسٰے (علیہ السلام) کے ذریعہ سے یہ کرتا رہا ہے - یہ ہے موجودہ اسپین کی مختصر کہانی -

"ہندوستاں ہمارا"

ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں ہر مذہب (میرا مطلب دین سے ہے) اپنے پورے زوروں پر ہے اللھم زد فزد - اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ مجھ سے یہ سوال کیا جائے گا کہ "جس مُلک سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو آٹھ سو برس کے بعد نکالا ہے، وہاں اسلام اور مسیحیت کا کیا حال ہے؟" اس سوال کے پہلے جزو کا جواب تو میں تیقن کے ساتھ دے سکتا ہوں کہ "اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان بھی نہیں۔ حتیٰ کہ قبریں تک نہیں رکھی گئیں۔ مگر مسلمانوں کی اور صلحائے طلبیات ہر زندہ مسلمان سے یہ مطالبہ کرتی ہیں کہ اُنکے لیے دعائے مغفرت کریں اور اُن کا انتقام لیں"۔ میں اپنے علم ویقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کہ اُنکے حق میں دعائے مغفرت کرنے والا شاید دنیا بھر میں کوئی نہیں - الا ماشاء اللہ - انتقام کا ممکن ہے کہ کسی کسی کو خیال ہوتا ہو -

رہ گئی عیسائیت - میں اتنا جانتا ہوں کہ ملک بھر کیتھولک مذہب کا پیرو ہے، جو بُت پرستی کا دوسرا نام ہے؛ مگر اصل مذہب عیسوی جو سینٹ جان نے سکھایا یہی ہے -

۱۹۳۱ء میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ حضرت مخدومی فاضلی ولی محمد صاحب بالقابہ اسپین تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں - انھیں دنوں میں نے جناب ممدوح سے عرض کیا تھا کہ وہاں کی مذہبی حالت کو بغور ملاحظہ فرمائیں - بالخصوص یہ دیکھیں کہ آیا مسلمانوں سے اب بھی ویسے ہی تعصبات برتے جاتے ہیں، جیسے کہ آج سے تین چار سو برس پہلے تھے - جناب موصوف نے مجھے اسکے متعلق اطلاع دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا - میں ایک مرتبہ پھر جناب معزی الیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میری التماس پر توجہ فرما کر میری دو تین درخواستیں پوری کیں - جنکا سفرنامہ میں ذکر فرمایا ہے - مگر بدقسمتی سے اسی اہم سوال کا جواب نہیں ملا - میرا منصب شکایت کرنے کا نہیں ہے؛ بالخصوص اس لیے کہ ممدوح الشان کے عہدۂ جلیلہ کے کارہا متعلقہ اتنے ہیں کہ معلوم یہ سفرنامہ بھی کیونکر مرتب ہو گیا - نیز میں قیاس کر سکتا ہوں کہ ممدوح کے پاس وقت کی اتنی کمی تھی کہ دورانِ سیاحت میں وہ اسکو تحقیق نہ فرما سکے - مجھے جتنا بھی علم ہے وہ یہ ہے کہ اُنکی مذہبی حالت وہی ہے جو جہلاء کی بالعموم ہوا کرتی ہے -

کہ اپنے خیالات میں غلاظ و شداد ہیں، لیکن فی الحقیقت مذہب کی انھیں کوئی واقفیت نہیں، اور ایک ادنیٰ سے بیرونی حملہ کی تاب نہیں لاسکتے۔ لیکن تعصب مذہبی کا یہ عالم ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وہ اپنے سوا، تمام دنیا کے کیتھولکوں کو نہ صرف کافر بلکہ ناپاک سمجھتے ہیں۔ ایک یہ واقعہ میرے علم میں ہے کہ ایک شخص کا لڑکا ایک قصبہ کے پرائیوٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ بدقسمتی کو اس اسکول میں پراٹسٹنٹ مذہب کے مصنف کی ایک ریڈر پڑھائی جانے لگی۔ اس میں بعض خیالات بھی اسی مذہب کے تھے۔ اتفاق سے باپ کو معلوم ہوا تو اس نے بیٹے کو بہت سخت سست کہا؛ وہ ریڈر پھاڑ ڈالی اور دوسری صبح کو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جو استاد وہ ریڈر پڑھاتا تھا اسکو قتل کر آیا[1]! یہی واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس حلیم پیغمبر (علیہ السلام) کی بھیڑوں پر اسکے علم و انکسار کا کوئی گہرا اثر نہیں۔ جہالت انکی معبود ہے اور انتہائی عصبیت مذہبی انکی راہبر۔

بلاشبہ انھوں نے بجبر مسلمانوں کو سور کھلایا۔ جیسا کھانا اب اہالی اسپین کی عادت ثانیہ ہوگئی ہے۔ مگر وہ مسلمانوں کو بھول بسر چکے ہیں۔ موخرالذکر کے جو آثار انکے ملک میں رہ گئے ہیں وہ گویا تنہا قابل فخر ہیں کہ جن پر فخر کیا جاتا ہے۔ انکو یہ بھی خیال نہیں آتا کہ ہم میں سے اکثر کے نام عربی (بگڑی ہوئی سہی) کیوں ہیں[2]

مجھے دو ایک واقعات ایسے معلوم ہیں کہ جن کو اس کا خیال دلایا گیا، وہ اگر مسلمان نہیں ہوئے تو کم از کم انکو مسلمانوں کی طرف رجحان بلکہ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ یہ ہمارے ہندوستان کے سیاحوں

---

[1] اس واقعہ پر مجھے سرحد کا ایک واقعہ یاد آیا، جو جہالت کی بہترین مثال ہے۔ سرحد کا ایک نوجوان باشندہ حضرت خاتم المحدثین مولانا سید نذیر حسین صاحب دام اللہ مرقدہٗ کی شاگردی سے اپنے وطن میں تازہ وارد ہوا۔ کچھ طالبعلمانہ جوش کچھ عادت کہ اسنے تشدد میں انگلی اٹھادی۔ ایک بوڑھا اجہل پٹھان اسکے برابر ہی نماز پڑھ رہا تھا۔ اسنے اس طالب علم سے دریافت کیا کہ یہ بدعت کیسی؟ طالب علم نے جواب دیا کہ حدیث میں یوں ہی آیا ہے۔ بوڑھا پٹھان اٹھا، اپنے گھر سے تلوار لایا اور اس بیگناہ طالب علم کو قتل کر ڈالا۔ وہ تلوار کا وار کرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ دیکھ حدیث شریف میں یوں آیا ہے۔

[2] چنانچہ ایک کاؤنٹ الناز تھے کہ اپنے خاندانی تحقیقات کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان خاندان کے آدمی ہیں۔ وہ مسلمان ہوگئے۔ اسلامی ممالک کی انھوں نے سیاحت کی۔ ہندوستان بھی آئے تھے اور یہاں (اگر میں غلطی نہیں کرتا تو) حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت سے مشرف ہوئے۔ لکھنؤ کے ایک صاحب کو انکی ذات سے بہت دنیوی فائدہ ہوا۔ پیرس میں رہتے تھے۔ سنا ہے کہ اب انتقال فرما گئے۔ فداہ تعالیٰ

کی بدولت ہوا

ایں شعلہ ہند گرم خیز است اینجاست کہ آفتاب تیز است

یہی ہندوستانی اس فرض کفایہ کو ادا کرکے دوسروں کو سبکدوش کر دیتے ہیں، ورنہ دوسروں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ قرطبہ کی مسجد کو دیکھ کر بھی ہنستے کھیلتے نکل جاتے ہیں۔

یہ نہ سمجھیے کہ امیر عبدالکریم اور اُنکے شرکاء کارزار کی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ اُنھوں نے وہ نقش ملک پر چھوڑا ہے کہ جلد مٹنے والا نہیں۔ جس طرح یورپ کی ترقی کا ایک راز جنگ صلیبی کو بتلایا جاتا ہے، بعینہٖ اسی طرح امیر عبدالکریم کی پہلی جنگ اسپین پر، بذریعہ قیدیان جنگ اثر ڈالے بغیر نہیں رہی۔ آج وہاں کے بہترین دل و دماغ اس طرف لگے ہوئے ہیں کہ اسپین کو مسلمانوں کے زمانہ کے رنگ پر ڈھالا جائے۔ نجی کی صحبتوں میں اس پر بحث ہوتی ہے، اخباروں میں اس پر مضامین لکھے جا رہے ہیں، کانشکارا اس کا مطالبہ کر رہے ہیں، ارباب سیاست اس پر غور کر رہے ہیں۔ گیانگوس اور زائیڈین انتقال کر چکے ہیں۔ اُن سے اُمید تھی کہ وہ اپنے علم و فضل سے کام لیکر صحیح حالات کی طرف رہنمائی کرتے۔ ایک دو کالجوں میں عربی کی تعلیم کا انتظام ہے، مگر طالب علموں کو ابھی برسوں چاہییں کہ وہ کارآمد ہو سکیں۔ قیدی سلطان حفید سے، یا ملک الشعراء معرے (جو میڈرڈ میں مقیم ہیں) یہ اُمید رکھنی بیکار سی ہے کہ وہ کچھ مددگار ہو سکیں۔ سلاطین ترک نے مسلمانان اندلس کو تباہ ہوتے دیکھا اور ایک اُنگلی نہیں اُٹھائی (حالانکہ وہ بہت کچھ کر سکتے تھے) شاہان مصر وہ رہے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے اور اُف تک نہیں کی۔ مراکش خود مرا ہوا ہے، اُس سے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ جنبش بھی کرے۔ کچھ اُمید ہو سکتی ہے تو مسلمانان ہندوستان سے، جو غلام ہیں مگر ایک باہیبت و باصولہ گورنمنٹ کی رعایا ہونے کی حیثیت سے غیر ممالک میں بہت کچھ ذی عزت اور محفوظ و معصوم ہیں

ونیے نے ایک بہت بڑے (ہندوستانی) فلسفی کی رائے دی ہے کہ "یہ ممکن نہیں کہ اسلام کو اسپین میں کامیابی ہو، بشرطیکہ وہاں باقاعدہ اُس ملک کے حالات و ضروریات کو دیکھکر تبلیغ کیجائے"۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا، نہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں تبلیغی کوششیں نہ کی جائیں، یا مسلمانوں کو مسلمان نہ بنایا جائے۔ خدا تعالیٰ اُن عیسائیوں اور سید غلام بھیک اور اُنکے شرکاء کو ضرور اسکی جزاء خیر دے گا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر مسلمانوں کی پگڑیوں کو بچا رہے ہیں۔ لیکن آج یورپ کو کریم کارساز نے وہ چیز بنا رکھا ہے کہ وہاں جس چیز کو کامیابی ہو وہ دنیا بھر میں کامیاب ہوتی ہے۔ اسپین میں تبلیغ بہترین نتائج پیدا کر سکتی ہے، وہ جس خوش قسمت کے نصیب میں لکھی ہو۔ بظاہر تو یہ فرض کفایہ اگر

کوئی ادا کر سکتا ہے تو ہندوستان

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ارواحِ طیباتِ مسلمانانِ اندلس و مقلیہ ہر زمانہ مسلمان سے اسی کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اسی کو وہ انتقام سمجھتی ہیں۔ اور حقیقۃً اگر کوئی صحیح انتقام ہو سکتا ہے تو یہی۔

میں سالہا سال سے بڑے بڑے آدمیوں سے یہی درخواست کرتا پھرتا ہوں، مگر ابھی تک کوئی گوش شنوا نہیں ملا۔ مولانا محمد علی صاحب (امیر جماعت احمدیہ لاہور) سے التماس کیا، مگر ممدوح نے کمی خرچ کا عذر فرمایا۔ کئی برس متواتر حضرت خلیفۃ المسیح سے تحریری و زبانی عرض معروض کیا، مگر مطلق توجہ نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ اسکی وجہ یہ ہو کہ میں غیر احمدی ہوں۔ غرض

من ہر جمعیتے نالاں شدم
جفتِ خوشحالان و بدحالاں شدم

ابھی تک راہِ کامیابی بالکل مفقود ہے۔ اول تو یہی کسے اُمید ہے کہ کوئی یہ سطور پڑھے گا، لیکن الناظر کے ذریعہ سے میں ایک مرتبہ تمام مسلمانانِ ہندوستان کو اس طرف متوجہ کرتا ہوں۔ شاید کوئی اہلِ دل نکل آئے۔ اگر کوئی تیار ہو تو تدبیر و ترکیب بتلانے اور انکے ہمراہ رکاب ہونے کو میں تیار ہوں۔ اگر میں بوڑھا اور ناتواں نہ ہوتا، تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا اور چل دیتا۔ مگر اب ضرورت ہے عصائے پیری کی۔ کاش وہ بہم پہنچ جائے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مردافگنِ عشق
ہے کر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

محمد خلیل الرحمٰن
مترجم اخبار الاندلس وغیرہ وغیرہ

غزل قائم چاندپوری شاگرد سودا

پڑھ کے قاصد خط مرا اُس بدزباں نے کیا کہا
کیا کہا پھر کہہ بتِ نامہرباں نے کیا کہا

غیر سے ملنا تو نا راضی کے گو ہم چپ رہے
پر سُنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

آہ اے مرغِ چمن کچھ تو بھی واقف ہے کہ صبح
گل نے کیا پوچھا تھا ہنس کر باغباں نے کیا کہا

سب خواصِ مصر دیکھا تھا زلیخا کو پہ سوچ
مول یوسف سے بشر کا کاروان نے کیا کہا

قائم اُس کو چھے شب غم میں نہ آتا تھا یقیں
کیا کہوں تجھ سے کہ اسکو ہا سماں نے کیا کہا

ابن خلدون

ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں بمقام شہر ٹیونس (Tunis) پیدا ہوا اور بمقام قاہرہ ۷۴ سال کی عمر میں ۱۴۰۶ء میں راہی ملکِ بقا ہوا۔ عرب کے تاریخ نویسوں میں اس کا رتبہ بہت بلند ہے بلکہ ایشیا میں اُس کا ثانی شاید کوئی شاذ و نادر ہوگا۔ تاریخ نویسی پر جو مقدمہ اُس نے لکھا ہے تاریخ نویسوں کے لیے سبق آموز اور رہنما ہے۔ اس قابل عالم کی زندگی مصیبت اور عزت کا مجموعہ ہے۔ اسکے سوانح عمری پڑھ کر اس میں شک نہیں رہتا کہ یہ عالمِ استقلال طبع کا مالک تھا۔ اس کا دماغ روشن اور معلومات کا معدن تھا۔ تاریخ نویسی کے وہ اسلوب جو زمانۂ حال میں صحیح سمجھے جاتے ہیں شروع میں اسی نے وضع کیے تھے۔ اخبار سٹیٹس مین (Statesman) مورخہ ۲۲۔ جون ۱۹۲۶ء میں اس مورخ کی زندگی کے بعض حالات شایع ہوے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے ہم مختصر اُن حالات اُردو میں حوالۂ قلم کرتے ہیں۔

سویل (Seville) کے ایک معزز اور بارسوخ خاندان کے ساتھ ابن خلدون کی رشتہ داری تھی۔ بیس سال کی عمر میں وہ سلطان عبدالاسحاق ثانی کا پرائیوٹ سکرٹری تھا۔ یہ سلطان جو حافض خاندان سے تھا کم از کم نام کے لیے ٹیونس پر حکمراں تھا۔ یہ عہدہ ابن خلدون ترک کرکے فیض کو چلا گیا جو اُسوقت مرین خاندان کے سلاطین کا دارالخلافت تھا۔ سلطان ابوعنین کے دفتر میں اُس نے ملازمت اختیار کرلی لیکن یہاں ناچاقی ہوگئی اور وہ مقید کرلیا گیا۔ سلطان کی وفات پر چند واقعات ایسے ظہور میں آئے کہ نہ صرف اُسکو قید سے رہائی مل گئی بلکہ وہ سلطان متوفی کے جانشین کا سکرٹری مقرر ہوگیا۔ لیکن رہا کی بغاوت کی وجہ سے اسکی حالت مخدوش ہوگئی۔ اس کا آقا برطرف کردیا گیا۔ لاچار اُسکو ہسپانیہ واپس جانا پڑا (۱۳۶۲ء) سلطان ابوالحمر نے جسکی وہ خدمات کرچکا تھا اُس کی آؤ بھگت کی اور بعزت سفیر کے اُسکو اُسکے وطن سیویل کو بھیجا۔ یہ شکایت پیٹر شاہ کیسٹیل (Castile) کے دربار میں تھی۔ شاہ مذکور نے اُس سے اُسکی اجدادی جائداد کے واپس دینے کا اقرار کیا اور اس کا بہت اچھا استقبال کیا۔ مگر وہ غرناطہ چلا گیا جہاں عدالت سے کچھ عرصہ رہا۔ ازاں بعد ایک ناخوشآیند واقعہ ظہور میں آیا۔ یعنی وزیر ابن خطیب نے اُسے فرقہ جانے پر بھیجدیا۔ (۱۳۶۵ء) یہاں اُس نے بجایہ میں مستقل سکونت اختیار کی جہاں اُسے خافصہ خاندان کے سلاطین کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔ یہاں بھی غریب کو

امن نہ ملا۔ ایک ہمسایہ شاہزادہ کنٹیل نے شہر پر دھاوا کرکے اُسے فتح کرلیا؛ ناچار ابن خلدون کو تلمسن جانا پڑا جہاں وہ کبھی شاہزادہ ابوحمون کا سکرٹری تھا، مگر جہاز سے اُترتے ہی مرین خاندان کے سلطان عبدالعزیز نے اُسے گرفتار کرلیا۔ پھر معمولی تحقیقات کے بعد وہ رہا کردیا گیا۔ سلطان کی خواہش تھی کہ اُس سے کام لے۔ کیونکہ خانہ بدوش عربی قوموں میں اس کا بہت رسوخ تھا چنانچہ سلطان کے فرزند ابوبکر سعید کے عہد تک وہ وہیں ملازم رہا۔ اِن دنوں شہزادہ کی نابالغی میں وزیر مدارالمہام تھا۔ اس شہزادہ کی نابالغی کے زمانے میں شاہ غرناطہ نے ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کردیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے تئیں تخت کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نابالغ شہزادہ برطرف کردیا گیا، اور اسی خاندان کا ایک اور شہزادہ تخت پر بٹھادیا گیا۔ خلدون نے منت سماجت کی کہ اُسے ہسپانیہ جانے کی اجازت مل جائے۔ بجائے اجازت دینے کے اُسکے سابق مربی شاہ غرناطہ نے اُسے شہربدر کردیا۔ جب وہ افریقہ واپس آیا تو اسکی حالت اور مخدوش ہوگئی۔ ادھر تو وہ مرین خاندان کے علاقہ میں جا نہیں سکتا تھا اُدھر تلمسن کے سلطان سے بدمزگی ہوچکی تھی۔ تاہم جب سلطان مذکور نے بُلایا تو اُس نے انکار نہ کیا۔ اور اسکے پاس چلا گیا۔ درویشوں کے حجروں میں اُس نے سکونت اختیار کی۔ مگر جب موقعہ ملا یہاں سے وہ چلا گیا۔ اور عبدالواد کے ایک قصبہ میں جو ایک گوشہ میں تھا وہ معہ اپنے کنبہ کے رہنے لگا۔ اس قصبہ کا نام ملقاب الوسلایا تھا۔ ایک پُرانے قلعہ میں آرام سے بیٹھ کر اُس نے چار سال میں مسلم تہذیب کی تاریخ تصنیف کی۔

۷۷۵ھ میں وہ ٹیونس گیا تاکہ ایک بسیط تاریخ کے واسطے مسالہ جمع کرے یہاں سلطان ابوالعباس سے اُسے بہت مدد ملی۔ مسجدوں اور درسگاہوں میں بہت سی کتابیں تھیں۔ عوام کو بھی شوق کتب بینی کا تھا۔ چنانچہ یہاں اُس نے بربر اور زناتی اقوام کی تاریخ مکمل کی۔ ابھی چار سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اُسکے خلاف سازش شروع ہوگئی۔ حج کے لیے اجازت لیکر وہ سکندریہ پہنچگیا سکندریہ سے وہ قاہرہ گیا۔ یہاں وہ قاضی القضات مقرر ہوگیا (۷۸۴ھ) اور ایسا عمدہ انتظام کیا کہ درویش جو معاملات سرکاری میں دخل دیا کرتے تھے اوس سے کانپنے لگے۔ اُس نے احکام اس قسم کے جاری کیے کہ اُسکے دشمنوں کا شمار بڑھ گیا۔ ایک مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کا کنبہ ٹیونس جاتا ہوا بحری طوفان میں تباہ ہوگیا۔ عہدۂ قضا سے اُس نے استعفا دیدیا۔ ۷۸۷ھ میں وہ والیِ مصر کے ہمراہ ایک مہم میں تیمور لنگ کے خلاف تجویز ہوئی تھی شام پہونچا۔ بمشکل سے یہ سال پھر

مقید ہو گیا۔ کسی نہ کسی حیلے سے اُس نے یہاں سے مخلصی حاصل کی اور پھر قاہرہ چلا گیا جہاں ایک مرتبہ سے زیادہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور رہا۔ اس مورخ نے سلطنتوں کے بہت اُتار چڑھاؤ دیکھے، عوام کی حالتیں بدلتی دیکھیں، اپنے مصائب و آلام اتنے دیکھے کہ کبھی عرش پر کبھی تحت الثریٰ میں۔ اُسکی طبیعت نے جدید طرز تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی، مورخوں کو تعصبات اور غلط واقعات سے متنبہ کیا۔ اُسکی تاریخ میں نہ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے بلکہ سوسائٹی کی حالت بھی وہ شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔

ہم کو اُس کے مقابل کا ایک شخص صرف کلہن مصنف راج ترنگنی معلوم ہوا ہے۔ جسنے کشمیر کی تاریخ آزادانہ لکھی۔ حال کے تواریخ نویسوں کو ابن خلدون کا دیباچہ ضرور پڑھنا چاہیے۔

شمیم

غزل

جو ڈالے عکس اپنا وہ بت بے پیر پانی میں
نظر آنے لگے خورشید کی تصویر پانی میں

لبِ دریا کبھی پہونچا جو اُن زلفوں کا سودائی
تو اُسکے واسطے ہر موج تھی زنجیر پانی میں

کھڑے ہیں وہ لبِ جو اور بر پا اک تلاطم ہے
تڑپتے لوٹتے ہیں سیکڑوں نخچیر پانی میں

جبیں جب سوزِ غم سے اشک تر رخسار جلتے ہیں
نہ دیکھی آج تک یہ آگ کی تاثیر پانی میں

پڑا ہے عکس قاتل جو ہلالِ عید قرباں کا
نظر آتی ہے سربازوں کو اب شمشیر پانی میں

اُڑاتا ہے لبِ دریا جو تو خاک اپنے کشتہ کی
بہاتا ہے عبث لے سیتن اکسیر پانی میں

دمِ تحریر نامہ جو حبیب آنسو ٹپکتے ہیں
ہوئی جاتی ہے تا دامان سب تحریر پانی میں

حبیب اللہ خاں حبیب رامپوری

لہ علامہ ابن خلدون کی سوانحعمری چھپی ہوئی موجود ہے اور ہر ایک الناظر طلب کیجئے سے مل سکتی ہے۔ ایڈیٹر

سرکار کا دربار

مصنفۂ احمد الیاس مجیبی (فرخ آبادی)

(صفحات ۱۵۲ - قیمت عہ / ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی)

دنیا میں صرف دو ہستیاں ایسی ہیں جو کسی دوسرے کو اپنے سے زیادہ قابل، زیادہ مالدار، زیادہ خوش و خرم، غرضکہ ہر حیثیت سے زندگی میں زیادہ کامیاب دیکھنے کی خواہشمند رہتی ہیں۔ اور وہ ماں اور باپ ہیں۔ جن کی نہ صرف یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ہر شعبۂ زندگی میں زیادہ کامیاب دیکھیں بلکہ وہ اپنے اس نیک مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی امکانی کوشش اٹھا نہیں رکھتے ڈانٹ ڈپٹ سے، پند و نصیحت سے، لاڈ پیار سے، غرض ہر طرح سے وہ اسکی کوشش کرتے ہیں کہ انکے بچے برائیوں سے محفوظ رہیں اور اچھائیوں کو اختیار کریں۔ کیونکہ انکا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ اس کم سنی میں جبکہ بچوں کی حالت موم کے مانند ہوتی ہے کہ جس سانچے میں ڈھالو، ڈھل جاتے ہیں۔ انکے اخلاق کی درستی ہی کامیابی کی کلید ہے۔

بچوں کے اخلاق درست کرنے کے بہترین ذرائع کیا ہیں؟ یہ مسئلہ ہمیشہ سے ایک نہایت ہی سرکہ آرا مسئلہ چلا آتا ہے۔ اور ماہرین علم النفس نے اس موضوع پر بڑے بڑے مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے قریب قریب سب متفق ہیں کہ سختی یا خشک وعظ و تلقین تو کجا بچے کو اسکا احساس بھی نہ ہونا چاہیے کہ اُسکو نصیحت کی جارہی ہے۔ ورنہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ بچوں کی فطرت ہمیشہ خشک نصائح سے بغاوت کرتی ہے۔ اسی لیے یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اچھائیاں اور برائیاں دونوں، بچوں کے سامنے اس پیرایہ میں پیش کی جائیں کہ وہ اُن میں خود بخود امتیاز کرنے لگیں جس سے اُنکے کیرکٹر کی تعمیر پر بہتر اثر پڑے، اور اصلاح و تربیت کا مقصد بغیر کسی براہِ راست کوشش کے بہ آسانی حاصل ہو جائے۔ ذاتی عمل سے بہتر اسکا اور کوئی طریقہ نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر انسان سراپا عمل نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ لازم ہوا کہ انبیاء کی مکمل ترین ہستیوں کے کارنامے اس انداز اور ایسی زبان میں انکے سامنے پیش کیے جائیں کہ مذکورہ بالا مقاصد ... طرح مدنظر رہیں اور کسی طرح انکی سمجھ سے بالاتر بھی نہ ہوں۔

مسلمانوں کے نزدیک حضور سرورِ کائنات، رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات

سے زیادہ تو کیا برابر بھی آج تک کوئی ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ آپ دنیا کے سامنے ایک کامل ترین نمونہ بن کر آئے تھے۔ آپ کا ہر فعل احسن اور ہر قول خدا کا قول تھا۔ آپ کی پاک زندگی کا ایک کھلا ہوا درس ہے، ایک مستقل شمع ہدایت ہے۔ اس لیے مسلمان بچوں کی اخلاقی اصلاح کے لیے آپ کے حالات سے بہتر اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ مجیبی صاحب نے ان ہی مقاصد کو ملحوظ رکھ کر "سرکار کا دربار" تصنیف کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں "دربار کا سلام" کے عنوان سے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی جیسے ناقد کا مقدمہ شامل ہے۔ جس میں موصوف نے چند معمولی لغزشیں نمایاں کرنے کے علاوہ ایک عجیب والہانہ انداز میں کتاب کی تقریب کی ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی ضرورت اور اہمیت کو کھلانے کے بعد آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اب تک جنھوں نے قلم اٹھایا، یا تو انکے دلوں میں درد محبت کی کسک جو دنہ تھی اور یا دماغ کو تاریخی حقیقتوں کی قید گوارا نہ ہوئی۔ پھر اگر دونوں باتیں جمع ہو بھی گئیں، تو پڑھا آدمی بچوں کی زبان میں باتیں کرنے کے لیے خود کہاں سے بچہ بن جائے"

یہ چند جملے کسی مزید تشریح کے محتاج نہیں۔ اور انکی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب سے پہلے اب تک اردو زبان میں اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں تاریخی حقیقت بھی نظر انداز نہ کی گئی ہو اور جو درد محبت سے بھی لبریز ہو۔ ساتھ ہی ساتھ زبان اتنی سادی اور پیاری ہو کہ بچوں کے لیے صرف گرانبار ہی نہ ہو، بلکہ ایک مرتبہ اگر وہ شروع کریں تو ختم کیے بغیر نہ اٹھیں، اور اٹھیں تو اپنے ہادیِ اعظم کی محبت کی ہلکی ہلکی موجیں اپنے سینوں میں اٹھتی ہوئی محسوس کریں۔

کتاب میں رسول اکرمؐ کی ابتدائی زندگی کے حالات، خاص خاص لڑائیوں کے تذکرے، اور سخت سے سخت مصیبتوں اور آزمایشوں کے مقابلہ میں نہایت استقلال کے ساتھ اعلاے کلمۃ الحق کرتے رہنا، اور اشاعتِ اسلام کو جاری رکھنا زیادہ نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اسکے ساتھ ہی عقائدِ اسلام کی تشریح اور انکی اہمیت پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے اور آخر میں آپ کے اخلاق حسنہ کو ایک ایک کرکے نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے۔ خاص طور پر تمام کتاب میں اس چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ان چیزوں کو منتخب کیا جائے جنکا تعلق براہ راست بچوں کے کیرکٹر سے ہو۔ احد شاید مصنف کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اسکی وجہ سے حضورؐ کے معجزات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہرحال مثلاً آپ اس موقع کو ملاحظہ فرمائیں جہاں "حیوانوں پر رحم کے سلسلہ میں حضورؐ کے چند ارشادات بیان کیے گئے ہیں۔ بچوں کی طبیعت

ہوتی ہے کہ چڑیوں کے انڈے بچے اُنکے گھونسلوں سے نکال لیتے ہیں اور اُن سے کھیلتے ہیں۔ اس کے متعلق چند واقعات کچھ اس پیرایہ میں بیان کیے ہیں کہ ایک مسلمان بچہ انھیں پڑھ لینے کے بعد اگر کبھی ایسی حرکت کرے گا تو فوراً اُسے حضورؐ کی تعلیم یاد آجائے گی اور وہ اس سے ضرور احتراز کریگا۔ وغیرہ وغیرہ

مجیبی صاحب نے زورِ تحریر میں ادب کے پہلو کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ہر جگہ انھوں نے اس قدر سنبھال کر لکھا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں کامل توجہ کی ضرورت باقی رہ گئی ہے۔ مثلاً

"عرب اور خاص کر مکہ میں تو (گھر کی مرغی دال برابر تھی) کی مثل تھی" ص۱۸

واقعیت سے یہ دُور نہ سہی لیکن طرزِ بیان ضرور کھٹکتا ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس قسم کی فروگذاشتوں کی اصلاح کر دی جائے گی۔

زبان کے لحاظ سے بھی بعض خامیاں نظر آتی ہیں۔ جن میں سے چند کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر مصنف صاحب مناسب سمجھیں تو آئندہ ایڈیشن میں انکی جانب ضرور توجہ فرمائیں۔ بعض غلط یا غیر فصیح الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً

(۱) ص۳۴ تیجتی چھر لی زمین بجائے تیتی
(۲) ص۴۷ کبھی نہیں بیٹ سکتا بجائے مٹا سکتا
(۳) ص۴۸ دھیرے دھیرے بجائے آہستہ آہستہ
(۴) ص۹۰ ساری رکاوٹیں دھری رہیں بجائے رکھی رہ گئیں۔
(۵) ص۹۰ خدا نے جو کام انکے ذمہ دھرا تھا بجائے کیا تھا
(۶) ص۳۹ اسکا ذکر کھول کر کیا جائیگا بجائے پوری طرح
(۷) ص۹۹ وارثی شاہ بھی بجائے شاہ صاحب (اسمیں تذلیل کا پہلو نکلتا ہے۔)
(۸) ص۱۰۶ آپ گھڑ جیسے نہ تھے (اگرچہ انکار ہے لیکن پھر بھی ادب مانع ہے۔)

اسکے علاوہ زبان کو سہل کرنے کے خیال سے بعض جگہ ہندی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ جن میں سے اکثر یا تو غیر فصیح معلوم ہوتے ہیں یا اُن لفظوں سے زیادہ مشکل ہو گئے ہیں جن کو مشکل سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً

(۱) ص۴۶ ہارا تھا راسب کا پالن ہار
(۲) ص۵۲ ابو طالب نے اپنے حضرت کو بُلا کر باتیں کیں اور کہا کہ اے میرے پوت!
(۳) ص۱۰۸ جنتی ماتی

(۴) ص۵۴ دین کے پرچار بجائے پھیلانے کے

کتاب میں اکثر جگہ اقبال کے اشعار بھی مناسب موقعوں پر دیے گئے ہیں۔ لیکن ایک موقع کی موزونیت بالکل ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ صفحہ ۹۶ پر سرکارؐ کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اگر توحید کا معاملہ نہ ہوتا تو رسول پاکؐ ہمارے سرکار کے دیوانے حضرت صدیقؓ کے ان لفظوں کا سننا بھی گوارا نہ کرتے۔ ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال نے "شکوہ" نامی اپنی ایک نظم میں ایک جگہ لکھا ہے، اللہ میاں سے کہتے ہیں ؎

تھی تو جو واحد ہی سے تیری ذاتِ قدیم — پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم — بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

مصنف نے شاید "دیوانی" پر زور دیا ہے، لیکن میں ان کی توجہ "ورنہ" کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں

کتاب کے بالکل آخر میں حدیثوں سے اقتباس کر کے حضورؐ کے کچھ اقوال دیے ہیں اور اس کے بعد خواجہ حالی کے مسدس کے چند بند بھی دیے ہیں، جو اپنی جگہ پر موزوں اور مناسب ہیں۔ ہم پُرزور تائید کرتے ہیں کہ ہر مسلمان بچے کو "سرکار کا دربار" کا مطالعہ ضرور کرانا چاہیے۔ اس لیے ہماری قطعی یہ رائے ہے کہ تمام اسلامی مدارس کو اپنے نصاب میں یہ کتاب داخل کر لینا چاہیے۔

محمود علی خاں (از دہلی)

رسید کتب

عربوں کا تمدن	مترجمہ سید نذیر نیازی بی اے (جامعہ)	عمدہ
ذکرِ میر (فارسی)	میر تقی میر کی خود نوشت۔ انجمن ترقی اردو	عمدہ
اسلامی تعلیم	مؤلفہ مولانا سید محمود زیدی الوری	۷ے
سیرۃ باقی	مصنفہ حافظ سید عزیز حسن۔ دہلی	۱۲

غالب

تنہا صاحب نے اُردو نثر نویسوں کا تذکرہ سیر المصنفین کے نام سے مرتب کیا ہے۔ جلد اول ۱۹۲۴ء میں شایع ہوئی تھی۔ دوسری جلد چھپ رہی ہے اور یقین ہے کہ سالِ رواں میں مکمل ہو جائے گی۔ اب آپ کی توجہ شعرائے اُردو کی طرف ہوئی ہے۔ شعرا کے متعدد تذکرے موجود ہیں، اور لالہ سری رام صاحب کا خُم خانۂ جاوید تو واقعی تذکرۂ ہزارہ استان ہے، جو مکمل کے بعد ایک حد تک اُردو شاعری کی انسائیکلو پیڈیا کہے جانے کا مستحق ہوگا۔ مگر تنہا صاحب اپنے مذاق کے مطابق شعراء کے حالات، اُنکی شاعری پر تبصرہ، اور اُنکے کلام کا انتخاب مرتب کرنا چاہتے ہیں اور وعدہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے کے سب مضامین ابتداءً الناظر ہی میں شایع ہوں گے، بعد کو کتابی صورت میں چھاپے جاسکیں گے۔ اسی قسم کے مضامین کا ایک سلسلہ ا۔ ز لکھنوی کے نام سے رسالہ زمانہ اور الناظر میں کبھی شایع ہوا کرتا تھا، مگر افسوس ہے کہ ناتمام رہا۔ تنہا صاحب کا اس سلسلہ کا پہلا مضمون حاضر ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے مرزا غالب کو اولیت کا فخر حاصل نہیں ہونا چاہیے تھا، اور تنہا صاحب کو اس طرف توجہ بھی دلائی گئی تھی۔ مگر وہ اس وقت کسی ترتیب کے پابند ہونا نہیں چاہتے، البتہ تدوینِ کتاب کے وقت ترتیب صحیح ملحوظ رکھی جائے گی۔ "ایڈیٹر"

آپ کا نام میرزا اسد اللہ خاں تھا اور غالب و اسدؔ تخلص تھے۔ آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب تورانی فریدوں تک پہونچتا ہے اور آپکے آبا و اجداد ایک قوم کے ترک تھے۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے۔ ترسم خاں نامی ایک امیرزادے کی اولاد میں تھے۔ مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولھا کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی، جو عمائد شہر آگرہ میں سے تھے۔ مرزا کے آگرہ ہی میں پرورش پائی اور سن شعور تک آگرہ ہی میں رہے۔ مرزا نے شیخ معظم جو اُس زمانے میں آگرہ کے نامی معلموں میں سے تھے تعلیم پائی اور اسکے بعد ایک شخص عبدالصمد سے جسکا نام مسلمان ہونے کے بعد عبدالصمد رکھا گیا تھا دو برس تک فارسی زبان میں کسب کمال اور بصیرت پیدا کی۔

اس کے سوا مرزا نے اور کسی کے سامنے زانوے ادب تہ نہیں کیا۔ اور اس لیے مرزا کا یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے

آنچہ در مبدأ فیاض بود آن من است گل جدا نا شدہ از شاخ بداماں من است

مرزا کی شادی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی۔ تیرہ برس کی عمر میں ۱۲۲۵ھ رجب ہجری کو اُن کا عقد ہو گیا، اور اس تقریب سے دلی میں اُن کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی۔ اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر تک دلی ہی میں رہے۔

مرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے اچھے تملقوں میں بسر ہوا تھا اور وہ شہر کے نہایت حسین اور خوش رُو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

دلی میں وہ قریب پچاس برس کے رہے لیکن نہ اپنے لیے کوئی مکان خریدا اور نہ بنایا۔ جب ایک مکان سے جی اُکتایا، اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ اسی طرح مطالعہ کے لیے بھی، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ آپ کتاب فروشوں کی دکان سے کرایہ پر کتابیں منگاتے تھے اور مطالعہ کے بعد کتاب واپس کر دیتے تھے۔

مرزا نے کبھی کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا۔ وہاں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کیے تو اُنھوں نے ایک مثنوی بادِ مخالف لکھی، جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور اُنکے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور دردانگیز طریقے سے بیان کیے ہیں۔

۱۸۴۲ء میں دلی کالج کے لیے ایک فارسی کے مدرس کی ضرورت تھی۔ مرزا صاحب کو مسٹر طامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند سے طلب کیا۔ مرزا گئے۔ لیکن اس خدمت سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اُن کا اعزاز و احترام جیسا کہ کیا جاتا تھا ملازمت کی صورت میں نہیں کیا جائے گا۔

۱۲۶۶ھ ہجری میں مرحوم ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر دربار عام میں مرحمت فرمایا۔ اور خاندان تیموری کی تاریخ نویسی کی خدمت پر مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ مرزا نے ابتدائے آفرینش سے ملوک جغتائی تیموری گورکانی تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیر الدین ہمایوں تک اخیر زمانے تک لکھے تھے کہ غدر ہو گیا اور یہ کتاب ناتمام رہی۔ البتہ مرزا نے حالاتِ غدر تحریر کیے۔

شیخ ابراہیم ذوق کے بعد بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی اور وہ

اس کام کو بادلِ ناخواستہ سرانجام کرتے تھے۔
مرزا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ مرزا بدیہہ گو بھی تھے اور جو قطعہ اُنکے دیوان میں مکھنی ڈلی کے متعلق چھپا ہوا ہے وہ فی البدیہہ کہا گیا تھا۔
مرزا کو عربی میں خاصی استعداد تھی اور فارسی دانی اور عروض میں وہ کامل تھے۔ علمِ نجوم سے کسی قدر اور اُسکی اصطلاحات سے اُنکو پوری واقفیت تھی۔ علم تصوف سے اُنکو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے اُنکے مطالعہ سے گزرے تھے۔ مرزا کا خطِ نستعلیق شفیتہ آمیز نہایت پاکیزہ اور دلاویز تھا۔ اور باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی خاص کر شاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا۔
مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور اُنکی خوشی سے خوش اور اُنکے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھتے تھے۔ بیماری اور تکلیف میں بھی وہ اپنی اس عادت سے باز نہیں آتے تھے۔ مروت اور لحاظ بیحد تھا۔ اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل اُنکے دروازہ سے کبھی خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردشِ روزگار سے بگڑ گئے تھے نہایت شریفانہ سلوک کرتے تھے۔ مرزا لطیفہ گو اور بذلہ سنج تھے۔ حافظہ بھی بلا کا پایا تھا اور شعر فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔ حق پسند اور راست گفتار تھے۔ آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔ تاریخ وفات "آہ غالب مرد" ہے۔ مرزا فارسی کے بڑے شاعر تھے، اور نثر اُردو میں جو طریقہ مکتوب نویسی کا اُنھوں نے ایجاد کیا اُس کا تتبع بھی آج تک کسی سے نہیں ہو سکا۔ چونکہ یہاں ہم کو اُنکی صرف اُردو شاعری اور خصوصاً غزل گوئی سے بحث ہے لہذا ہم اُنکے متعلق جو کچھ رائے رکھتے ہیں ذیل میں درج کرتے ہیں

غالب کے اُردو کلام پر تبصرہ

اگرچہ مرزا غالب کی اُردو شاعری اور اُنکے کلام پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن باوجود اس کے اب بھی دنیائے ہندوستان میں ایسے قدامت پرست اصحاب موجود ہیں جو کلیر کے نقیر بنے ہوئے ہیں اور اُنھوں نے اپنے بزرگوں یا اُستادوں سے جو اتفاق سے ذوق مرحوم کے کلام کے دلدادہ تھے یہ سن لیا

ہے کہ اُردو شاعری کا خاتمہ ذوق پر ہوگیا اور اس لیے اُن کا بھی یہ راسخ عقیدہ ہوگیا ہے کہ یہ رائے بلاشبہ درست اور بجا ہے۔ لیکن اگر وہ امعان نظر سے ذوق اور غالب کا موازنہ کریں تو انکو معلوم ہو جائے کہ آجکل کے تعلیم یافتہ اصحاب ہی نہیں بلکہ ہر صاحب ذوق یہی کہے گا کہ غالب سے ذوق کو غزل گوئی میں کوئی نسبت نہیں۔ بے شک ذوق مرحوم غزل گوئی کی استعداد رکھتے تھے لیکن فطرت کی فرمایشوں نے انکا حلقہ بند کر دیا تھا۔ اور وہ مجبور تھے کہ ایسی غزل لکھیں جو بادشاہ اور ارکین دربار کو پسند آئے۔ اور وہ لوگ صرف زبان کے چٹخارے پسند کرتے تھے انکو تخیل سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چنانچہ تمام دیوان ذوق اسکی بیّن مثال پیش کرتا ہے۔ گنتی کے کچھ اشعار ایسے ضرور ہیں جو بلند خیالی کا ثبوت دیتے ہیں اور اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ ذوق میں ملکۂ شاعری ضرور موجود تھا لیکن درباری شاعر ہونے کی وجہ سے وہ جذبہ روز بروز کم ہوتا گیا اور آخر کار معدوم ہوگیا۔

ایک درباری شاعر کو اہل انگلستان نے کبھی شاعر نہ مانا۔ یہاں تک کہ ورڈس ورتھ ملک الشعرائی کی کرسی پر جلوہ افروز ہوا اور اسکے بعد ٹینی سن کو یہ جگہ دی گئی۔ جنھوں نے فرمایشوں سے قطع نظر کرکے اپنے جذبات کی ترجمانی کو مقدم سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرمایش پر کسی غزل یا نظم لکھنے اور اپنے جذبۂ دل سے بے اختیار لکھنے میں آورد اور آمد کا فرق ہے۔ اور اسی بنا پر ایک درباری شاعر کا کلام تصنع اور آورد سے لبریز نظر آتا ہے۔ اور قدرتی شاعر کے یہاں حسیات و جذبات کا دریا بہتا معلوم ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مرزا غالب کا کلام اول سے آخر تک یکساں نہیں ہے۔ بعض بعض اشعار ضرور مبتذل ہیں اور انکی شان سے بعید ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اشعار کسی فرمایش کی بنا پر یا وقتی ضرورت کے لحاظ سے محض تفریح و تفنن طبع کے لیے کہدیئے گئے ہیں اور مرزا غالب کے قدردانوں نے انھیں بھی دیوان میں شامل کر دیا ہے، مثلاً

پنس میں گزرتے ہیں جو وہ کوچے سے میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

یا کافی ہے نشانی ترے چھلّے کا نہ دینا — خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

مرزا غالب نے جن اصحاب کو اپنا دیوان منتخب کرنے کے لیے دیا تھا وہ ضرور سخن فہم ہونگے لیکن انھوں نے اپنے انتخاب سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بہت سا حصۂ کلام جسکو وہ مشکل سمجھتے تھے اور نظر انداز کر دیا تھا اپنے اندر آسان اور عمدہ اشعار بھی رکھتا تھا اور بعض آسان اشعار محض زود فہمی کی بنا پر انتخاب کیے گئے نظری کرنے کے قابل تھے۔ تاہم ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور اکثر و بیشتر عمدہ ہی اشعار ہیں جو غالب کے تمام کلام کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر دیوان غالب کے مطالعہ کا شوق اُس وقت ہوا جبکہ میں آٹھویں کلاس میں تعلیم پاتا تھا اور کثرتِ مطالعہ سے تمام دیوان غالب ازبر یاد ہوگیا تھا۔ میں اُس وقت دیوانِ غالب کے بہت کم اشعار سمجھتا تھا لیکن بعض اوقات جب کوئی مشکل شعر خود بخود سمجھ میں آجاتا تھا تو میں اُچھل پڑتا تھا اور یہ خیال ہوتا تھا کہ غالب کے دیوان میں یہ شعر پہلی ہی مرتبہ میں نے دیکھا ہے۔ اِدھر مجھ کو دیوان غالب پڑھنے کا یہ شوق تھا اور اُدھر اپنے ہمجولیوں کو دیوانِ داغ کی تعریف میں رطب اللسان پاتا تھا۔ مجھکو اُسوقت اشعار کی خوبیاں بیان کرنے پر قدرت نہ تھی اور میرے ساتھی داغ کی صرف زبان کی تعریف کیا کرتے تھے اور دیگر شعراء سے صرف اسی بات کا موازنہ کیا کرتے تھے۔ داغ مرحوم زندہ تھے اور اُسوقت ہر مبتدی فن کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ مرزا داغ کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہو جائے جسکو دیکھو داغ ہی داغ پکارتا تھا۔ میں اگرچہ مرزا غالب کی شاعری کا مداح تھا لیکن اپنے دعوے کو ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ ناظرین کرام میری اُس خوشی کا اندازہ فرما سکتے ہیں جبکہ ایک یا دو سال بعد میری نظر سے یادگار غالب گزری اور میں نے خواجہ حالی جیسے سخن شناس و سخنور کو بہ زعمِ خود اپنا ہمخیال پایا۔

سچ یہ ہے کہ خواص نے مرزا غالب کے اُردو کلام کی ہمیشہ تعریف کی ہے اور اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ عوام میں نہ اُنھیں مقبولیت حاصل ہوئی اور نہ آئندہ اُمید ہے کہ وہ عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کریں گے۔ لیکن یادگار غالب نے تعلیم یافتہ طبقہ کو دعوت دی کہ وہ کلام غالب کا مطالعہ کریں اور اُس سے لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال سے لیکر ایک اسکول کے طالب علم تک ہر شخص اُسی عجیب و غریب ہستی کے مطالعہ کلام میں مصروف ہے اور بس نہیں کرتا۔ شرح پر شرح لکھی جا رہی ہیں اور زمانۂ حال کے شعراء اپنے کلام کو بھی غالب ہی کے انداز پر ڈھال رہے ہیں۔ طرح طرح کے نسخہ ہائے دیوانِ غالب نکل رہے ہیں اور پبلک کی قدر دانی روز افزوں ہے۔

اُردو کے غزل گو شعراء میں میر اور غالب کو پسند کیا جاتا ہے۔ میر نے عشق کو اور غالب نے فلسفۂ عشق کو بیان کیا ہے۔ میر کا انداز عام فہم اور آسان ہے۔ فلسفۂ عشق نے اظہار کے لیے زبان خواہ مخواہ دشوار اور ثقیل ہو جاتی ہے۔ اِس لیے غالب کا اندازِ بیان اگر ادق ہے تو اسکی کوئی شکایت نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ غالب کے تخیل کے لیے یہی طرز ضروری اور لازمی تھا۔

بعض اصحاب اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ "مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے" تو اسکے یہ معنی ہیں کہ جو علوم مشکل ہیں اُنکو ترک کر دینا چاہیے اور اسی طرح جو فن مشکل ہے اُسکو بھی چھوڑ دینا چاہئے

اگر زندگی کی یہی شکل اختیار کرلی جائے تو دنیا کبھی ترقی نہ کرے اور ادبی دنیا بھی جہاں ہے وہیں رہ جائے ایجاد اور نو آئینی ایکدم موقوف ہو جائے، ندرت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

ذوق کا مجھے ایک شعر یاد آگیا جو لحاظ تخیل نہایت اچھا شعر ہے، لیکن اُس کا طرز بیان ذوق کا سا نہیں رہا، بلکہ غالب کا رنگ آگیا ہے۔

اُسید ہو گئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لیے

لہذا اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر لکیر کا فقیر ہونا منظور نہیں ہے تو ندرتِ بیان کے لیے طرز اداء ضرور مشکل اور اوق اختیار کرنا ہوگا۔ اور غالب کی تقلید لازمی کی جائے گی۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم ایسے اشعار سے خوش ہوں:۔

پانی طبیب دیگا ہمیں کیا بجھا ہوا ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

ہم بُتوں کو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے پر بڑے پتھر ہیں مشکل سے کھنچے جائینگے

ہمارے لیے بلند خیالی کی ضرورت ہے۔ پیش پا افتادہ مضامین ہم پر کچھ اثر نہیں ڈالتے۔

اُردو شاعری میں غالب نے فارسی تراکیب کثرت سے استعمال کی ہیں اور بہت سی ترکیبیں اُنکی خود ساختہ ہیں، لیکن تقریباً سب کی سب مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً شوخیِ تحریر، دامِ شنیدن، خمارِ رسوم، آتشِ خاموش، خانہ زادِ زلف، شبستان، دریائے، جمع و خرچ دریا، آئینۂ انتظار، تکلف برطرف، دریا آشنا، محشرِ خیال، سلکِ قافیت، وادیِ خیال، دریائے بیتابی، گرمِ تماشا، دامِ تمنا، چشمِ صحرا، غبارِ وحشت، شیرازہ بستہ وغیرہ وغیرہ۔ ان تراکیب سے زبان میں بیحد وسعت پیدا ہو گئی ہے اور دوسروں کو بھی موقع ہے کہ وہ اسی انداز پر اپنے اظہارِ خیال کے لیے ترکیبیں ایجاد کریں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ غالب کی فارسیت نے اُردو کے محاورہ کو بھی بدل دیا ہے، لیکن ہم اُسکو قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں۔ مثلاً

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

عذر لانا، عذر آوردن کا ترجمہ ہے لیکن یہ اُردو کا محاورہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ عذر لانے کا استعمال بالکل غلط ہے۔ نہیں معلوم غالب کے طرزِ بیان میں کیا دلکشی ہے کہ مجھے ذاتی طور پر اُس سے عشق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میر نے بہتر شعر (اگر یہ تعداد دوگنی کر دی جائے) ایسے ضرور کہے ہیں کہ جنکا جواب نہیں، لیکن یہ اشعار میر صاحب کی تمام عمر کی کمائی ہیں اور اُنکے سات دیوانوں میں سے ہیں۔ غالب نے اپنے زورِ طبیعت کو فارسی کلام میں صرف کیا ہے۔ کبھی کبھی تفریحِ طبع کے لیے اُردو میں کچھ کہ لیا ہے

اس پر یہ حال ہے کہ اُردو شاعری میں کوئی اُن کا ہمسر نظر نہیں آتا، اور الف سے ی تک تمام دیوان میں سے اگر بہتر شعر نکال دیے جائیں تو باقی تمام اشعار لاجواب نظر آئیں گے۔ (نسخہ حمیدیہ کا ذکر ہے دیوان سے وہ دیوان مراد ہے جو مرزا کی زندگی میں مرتب کیا گیا تھا)

میر صاحب فرماتے ہیں

نقطے کو اُٹھا چہرہ سے وہ بت اگر آئے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

کیا خوب شعر ہے۔ لیکن مرزا غالب کے حسب ذیل شعر میں کچھ اور ہی لطف ہے:

کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

میر صاحب کا ارشاد ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

فی الواقع یہ شعر دل پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے لیکن غالب اپنے مصائب کا حال اس طرح بیان کرتا ہے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

یعنی مجھ پر وہ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے کہ ایک دل کا کام نہیں جو اُسے برداشت کر سکے۔

کوئی اور شاعر کیا یہ شعر کہہ سکتا تھا؟

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اور اگر کہتا تو ہرگز اس طرح نہ کہتا۔ غالب کی خصوصیت یہی ہے کہ بات میں سے بات پیدا کرتا ہے اور طرز ادا جس وہ جدت ہوتی ہے کہ معمولی بات بھی دلکش ہو جاتی ہے اور نئی معلوم ہوتی ہے۔ کیا کسی شاعر کے یہاں ایسا شعر مل سکتا ہے

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگنِ عشق؟ — ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

ہمارے آسان فہم تعزلات تو اس شعر کو بھی مہمل قرار دیتے اگر مولانا حالی خود مرزا غالب سے اس کا مطلب نہ دریافت فرماتے۔

میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اُردو شاعروں میں غالب جیسا کہ اُن کا تخلص ہے سب پر غالب ہیں اُنکے آسان اور دشوار دونوں طرح کے کلام کا انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین اُس سے شاد کام ہوں:

کلامِ اوق

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

۱- ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
۳- عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی - درد بے دوا پایا
۴- دھر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
۵- اسدؔ یہ عجز و بے سامانیِ فرعون تو اام ہے — جسے تو بندگی کہتا ہے دعوے ہے خدائی کا
۶- ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
۷- حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل — جہاں ساقی ہے تو باطل ہے دعوٰی ہوشیاری کا
۸- لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
۹- غافل بوہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طرۂ گیاہ کا
۱۰- رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی ہے عذر نہ کرنا گناہ کا
۱۱- کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
۱۲ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
۱۳- چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
۱۴- دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
۱۵- گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
۱۶- جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟ — دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
۱۷ نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا غالبؔ — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا
۱۸- محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
۱۹- رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
۲۰- ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا
۲۱- بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
۲۲- درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
۲۳- نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
۲۴- عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
۲۵- ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
۲۶- لے دل نا عاقبت اندیش ضبطِ شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

۲۸۔ شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
۲۹۔ کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق؟ — ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
۳۰۔ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفیِ قدح خوار دیکھ کر
۳۱۔ نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
۳۲۔ عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
۳۳۔ یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک
۳۴۔ گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیرِ یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
۳۵۔ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
۳۶۔ میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی" — سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ "یوں"
۳۷۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — اک چھیڑ ہے وگرنہ مرادِ امتحاں نہیں
۳۸۔ ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا سجود — قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
۳۹۔ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
۴۰۔ آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
۴۱۔ کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم! — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
۴۲۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
۴۳۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
۴۴۔ حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
۴۵۔ ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
۴۶۔ ٹپکے ہے نوبتِ غرّۂ ہستی کا غم کوئی — عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو
۴۷۔ وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
۴۸۔ ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا — ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی
۴۹۔ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
۵۰۔ وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا — دریا زمیں کو عرقِ انفعال ہے
۵۱۔ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
۵۲۔ ڈھونڈھے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی — جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

۵۲- کشاکشِ ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی ہوئی زنجیر، موجِ آب کو، فرصت روانی کی
۵۳- رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں مسجد و جام و سبو، میخانہ خالی ہے
۵۴- سراپا رہنِ عشرت وعدۂ صبر آزما تیرا فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
۵۵- کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے
۵۶- دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
۵۷- تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
۵۸- ساقی گری کی شرم کر آج، ورنہ ہم ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
۵۹- جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
۶۰- خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے
۶۱- پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
۶۲- کرنے گئے تھے اُن سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ، کہ بس خاک ہو گئے
۶۳- مذکور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی قسمت کھلی ترے قدِ رخ سے ظہور کی
۶۴- اک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
۶۵- کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
۶۶- خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
۶۷- ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
۶۸- ہیں بس کہ دشتاقِ جفا، عجبِ جفا اور ہی تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور ہی
۶۹- نویدِ امن ہے بیدادِ دوستِ جاں کے لیے رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
۷۰- بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے
۷۱- وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
۷۲- فنا کو سعیِ مری کوشش کی ہے، کہ مرغِ اسیر کرے قفس میں فراہم خسِ آشیاں کے لیے

سہلِ ممتنع

۱- ہوئے کل، نالہ دل، دود چراغِ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
۲- میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا
۳- دوستدارِ دشمن ہیں میری سعی فرمائینگے کیا زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا؟

۴- یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
۵- کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیمکش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی؟ جو جگر کے پار ہوتا
۶- کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
۷- میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا
۸- دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا
۹- لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا
۱۰- یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زباں اور
۱۱- آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
۱۲- ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم — قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
۱۳- آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟ — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
۱۴- آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
۱۵- زخم سلوانے سے مجھ پارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
۱۶- مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
۱۷- لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
۱۸- ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
۱۹- نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں
۲۰- کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے، ولے اسقدر آباد نہیں
۲۱- وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُنکو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
۲۲- نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
۲۳- جنبشِ اُسکی ہے دامانِ اُسکا ہے، رہیں اُسکی ہیں — تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہوئیں
۲۴- اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
۲۵- دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
۲۶- طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
۲۷- ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
۲۸- جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

۲۹- جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

۳۰- سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

۳۱- کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

۳۲- مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

۳۳- ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

۳۴- آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

۳۵- اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

۳۶- مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

۳۷- قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

۳۸- آگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۳۹- ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

۴۰- ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۴۱- کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

۴۲- آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

۴۳- جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

۴۴- ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

۴۵- جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

۴۶- ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

۴۷- بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

۴۸- نہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

۴۹- تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

۵۰- نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

۵۱- رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

۵۲- میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

۵۳- انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

۵۴- عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
۵۵- منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید نا امیدی اسکی دیکھا چاہیے
۵۶- عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے
۵۷- فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے
۵۸- ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے" نہیں ہے
۵۹- سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
۶۰- کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
۶۱- بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
۶۲- نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
۶۳- واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے، تمہاری شرابِ طہور کی
۶۴- گو، واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
۶۵- تم جو بت بھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے تم خدا تو نہ ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
۶۶- کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
۶۷- مت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
۶۸- کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
۶۹- پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
۷۰- جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
۷۱- زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
۷۲- ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

محمد یحییٰ تنہا بی اے، ایل ایل بی

رسید کتب

عربوں کا تمدن - (مترجمہ سید نذیر نیازی بی اے (جامعہ) اُردو اکاڈمی دہلی
ذکر میر فارسی - (میر تقی میر) انجمن ترقی اُردو

نظرے خوش گزرے

دو سال ہوے کہ ہندوستانی اکیڈمی کی تاسیس حکومت صوبجات متحدہ کے زیر غور تھی۔ ایک کرمفرما نے جن کو اکیڈمی کی تنظیم میں خاص دخل تھا، راقم الحروف کو بھی دعوت شرکت دی۔ اور خدمت گزاریِ اُردو کے غایۂ شوق سے متاثر ہوکر اکیڈمی کا نظام اساسی دیکھنے سے قبل ہی ان کرمفرما کی دعوت قبول کرلی گئی۔ مگر جب اُس کا مسودہ وصول ہوا تو مناسب خیال کیا گیا کہ اس بارے میں مہاتما گاندھی سے بھی مشورہ کرلیا جائے کہ مبادا اس میں شرکت ترک موالات کے اصولوں کے منافی ہو۔ مہاتما جی نے اُس مسودہ کو ملاحظہ فرمانے اور کافی بحث وغور کرنے کے بعد بالآخر یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اکیڈمی میں شرکت تارکین موالات کے لیے جائز نہیں اور اس بنا پر میں نے اپنے کرمفرما سے اپنی معذوری کا اظہار کردیا۔

یہ فیصلہ دو سال ہوے کیا گیا تھا۔ اسکے بعد اکیڈمی قائم ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ سال سے اُسکا کاروبار جاری ہے۔ اس اثنا میں جو حالات بعض احباب کے ذریعہ سے معلوم ہوئے اُنکی بنا پر ماننا پڑتا ہے کہ مہاتما جی کی رائے نہایت صائب تھی۔ اور دلی مسرت ہے کہ اُنکے دانشمندانہ مشورہ کو قبول کرکے میں اس سرکاری ادارہ سے علٰحدہ رہا۔ جن بعض احباب نے کسی مصلحت سے اکیڈمی میں شرکت گوارا کرلی تھی امید ہے کہ وہ بھی اب زیادہ دنوں اُس سے وابستہ نہ رہ سکیں گے بشرطیکہ ترک موالات کی تحریک کے ساتھ اُنکو اب بھی وہی شیفتگی و دلچسپی باقی ہو جسکا اس سے قبل مظاہرہ ہوچکا ہے۔

سرکاری سرپرستی سے بے نیاز ہوکر بھی ادب کی خدمت کے کافی مواقع حاصل ہیں۔ انجمن ترقی اُردو، دارالمصنفین، انجمن اُردو، اور اردو اکیڈمی کے علاوہ اب ایک خالص سیاسی ادارہ بھی قائم ہوگیا ہے اور ان سب مجالس کو مخلص و سرگرم خدمتگذاروں کی ضرورت ہے۔ کاش حکومت کے خزانہ کا سہارا ڈھونڈھنے کے بجاے ہمارے احباب خود اپنے اور اپنی قوم کے وسائل پر اعتماد کریں اور سرکاری اداروں کو اُن لوگوں کے لیے چھوڑدیں جنکا مطمح نظر باطریق کار آزادانہ جدوجہد سے موافقت نہیں رکھتا۔

بے شبہ حکومت کی دولت و اقتدار کے سایہ میں رہنے والوں کیلیے جو عافیت و منفعت ہے آزاد قومی اداروں میں اُسکا سامان فراہم ہونا محال اگر نہیں تو دشوار ضرور ہے لیکن منافع کے ساتھ ساتھ سرکاری اداروں میں مضرت کے جو پہلو ہیں اُن سے تو بہرحال نجات رہیگی۔

اور یہ بھی تیسرے باب مین معلوم ہو چکا ہے کہ اون عدالتون مین ارباب جیوری نہین بیٹھتے
ہین صرف حکام اپنی راے سے مقدمات فیصلہ کرتے ہین مگر بعد دہان اوٹھا بیجانے کے ۔ ۔ ۔
معلوم ہوا کہ اوس عدالت مین مقدمہ کا لیجانا نامناسب ہوا۔ انفصال اوس کا ارباب
جیوری ہی کے سامنے مناسب تھا اور جس جلدی کے واسطے مقدمہ اوٹھا لیگئے تھے وہ بھی ظہور
مین نہ آئی یعنی اوس طرح مین وہان بھی حکم اخیر اوس مقدمہ مین نہ ہوا۔ دوسرے طرح مین جب پیش
ہوا وہان کے حکام نے یہ تجویز کیا کہ مقدمہ مین جعل اور فریب خواہ مخواہ ہے مگر مدعی اوس مقدمہ کا
اوس جعل اور فریب سے آگاہ نہ تھا اور چونکہ اوس نے محض میرے اعتماد پر روپیہ دیا اس واسطے
مجھ پر لازم ہے کہ مدعی کا روپیہ ادا کرون اور میرا مواخذہ جعل سازون سے چاہیے اور
اوس حاکم کو جس نے اور چار تمسک باطل کر دیے تھے اون کو دہان کے حاکمون
نے حکم دیا کہ جعلسازون کی نسبت میرے واسطے جو مناسب جانین حکم دیوین یا اوس
حاکم کی راے مین جیسا اون کی تجویز سے معلوم ہوا وہ حکم انصاف کے خلاف ہوا مگر چونکہ
اوس حاکم پر وہان کے حکام بالا تھے اصل تجویز مقدمہ مین کچھ دخل نہ کر سکا مگر حکم دیا کہ جس قدر
اوس عدالت سے میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے وہ کل میرے حق مین جعلسازون پر ڈگری ہو
لیکن کیا فائدہ اول تو جعل ساز مفرور تھے اور وہ مفلس بحت تھے اور وہ سارا اونکا طمطراق
اوسی جعل اور فریب کے روپیہ سے میرے اوپر اور لوگون کے شکار کرنے کے واسطے تھا اور
اس مقدمہ کے فیصلہ کے بعد وزیر ہندوستان نے دفعۃً میری اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا
ہر چند مین نے شور اور شغب کیا کہ صرف تمھارے روکنے سے مین یہان ٹھہرا اگر
پہلے مقدمہ کے فیصلہ ہونے کے بعد مین یہان سے چلا جاتا تو کوئی میرا دامنگیر نہ تھا
اس واسطے کہ اوس مقدمہ کی تجویز ثانی بھی تین چار مہینے کے بعد منظور ہوئی تھی مگر
کسی نے کچھ نہ سنا۔ دوسری مصیبت میرے اوپر یہ ہوئی کہ تیس چالیس ہزار روپیہ کا
میرا اسباب چوری ہو گیا چاندی اور سونا اور عمدہ عمدہ لباس کشمیری اور ریشمی فرنگی اور

عدالت سے حکم ہوا کہ آقا مرحوم کا روپیہ ادا کرون اور میرا مواخذہ جعل سازون سے چاہیے

جعلسازون پر ڈگری ہوئی مگر وہ مفرور اور مفلس تھے

وزیر ہندوستان کی اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا

مالی نقصان کا چوری ہونا

بہت کچھ زیورات جو مین نے تحائف کے واسطے جمع کیا تھا سب لٹ گیا چور پکڑے گئے ایک
مدت تک اوس کے بکھیڑے مین راقم رہا اونکو سات سات برس کی قید ہوئی مگر دو چار چیزون
کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ تیسری مصیبت یہ ہوئی کہ کچھ حصے ہندوستان کی ریلوے کے قریب ساٹھ
ستر ہزار روپیہ کے مدت سے میرے قبضے مین تھے اوس کے منافع پانچ روپیہ سیکڑے
کے جو تھے وہ کلکتہ مین اپنے اہل وعیال کے مصارف کے واسطے ادا کر دیے تھے وکلا کو
اوس سے اطلاع ہو گئی اور وزیر ہندوستان نے خلاف وعدگی کر کے میری اعانت سے
دست برداری کی وکلا نے وہ سب حصے بکوا کے تصرف کر لیا۔ کچھ تھوڑا سا اسباب
رہا سہا تھا وہ بعضے دوستی اور محبت اور اپنایت کے فریب مین گیا کہ وہ دوسری اور تیسری ڈکیتی
وہان ہوئی ہندوستان مین غدر کے ایام مین جو غدارون نے چھوڑا وہ سرکاری فوج نے
لوٹ لیا کچھ مکانات میرے اکبر آباد مین تھے وہ یہان کے حکام نے نیلام کر ڈالے اوس کا قصہ
بہت طول ہے حالانکہ ایک دفعہ ہندوستان کے وزیر نے حکم دیا کہ وہ نیلام ناانصافی کا ہے مگر سیر
بھی یہان کسی نے نہ سنا اب مین ہندوستان اور انگلستان دونون جگہ مفلس بحت ہو گیا
نوبت بہ فاقہ کشی پہونچی اس حالت مین جب مین نے بہت شور و شغب
مچایا تب ایک بڑے جلیل القدر افسر نے وزیر ہندوستان کی کچہری کے مجھ سے
فرمایا کہ تم نے حتی المقدور سرکار بلند اقتدار کی بدنامی مین کچھ قصور نہین کیا بادشاہ
کے مقدر مین کتابین چھاپ چھاپ کے سارے عالم مین سرکار کو رسوا کیا اب سرکار
سے کس منھ سے امید اپنی رفاہ کی رکھتے ہو اس کے ساتھ اب یہ بھی مجھے یقین
ہو گیا کہ ارباب اقتدار یہ بھی نہین چاہتے کہ مین ہندوستان مین جاؤن اس گمان سے کہ شاید پھر
بادشاہ کو آمادہ پارلیمنٹ مین استغاثہ کا کرون جب وزیر ہندوستان سے درخواست
کی کہ اب میری نوبت یہان فاقہ کشی کی آئی میری رہائی کروائیے وہان سے یہ جواب
ہوا کہ وہ مدعی جس کی میرے اوپر ڈگری ہوئی ہے اوس کی تحریری اجازت داخل کرون

تب قرض بھی میرا ادا کیا جائیگا اور جہاز کی سواری کی بھی اجازت دی جائیگی۔ اور حالانکہ وہ
مدعی مجھ سے خواستگار اپنے دعوے کا نہ تھا اور اوس نے بھی مکرر عرایض وزیر ہندوستان کو
اس مضمون کے گذرانے تھے کہ حقیقت مین اوس کا دعوے اودھ کے بادشاہ پر ہے اس سبب
سے کہ اون کے مقدمہ کے خرچ کے واسطے روپیہ اوس نے دیا تھا سفیر کی ذات کے واسطے نہین
دیا اور وزیر ہندوستان پر ہے اس سبب سے کہ اونھون نے برابر اس مقدمہ مین اعانت روپیہ سے اور
تدابیر سے بادشاہ کے سفیر کی کی ہے اس واسطے اوس کو امید ہے کہ وہ روپیہ ادا کرین۔ مگر جب
وزیر ہندوستان نے مجھے اجازت تحریری مدعی کی پیش کرنے کا حکم دیا راقم نے مدعی سے درخواست
کی کہ تم اپنی ڈگری میرے اوپر جاری کراؤ تو مجھے کچھ چارہ نہین ہوگا بجز اسکے کہ مین انسالونسی کی
درخواست گذرانون جس کو ہندوستان کی اصطلاح مین دیوالہ نکالنا کہتے ہین اور اگر میرے اوپر
جاری کروانا ڈگری کا منظور نہین ہے تو اجازت تحریری مجھے دیدو کہ میری یہان سے نجات ہو۔
اوس نے کہا کہ نہ بالفعل مجھے تمھارے اوپر ڈگری جاری کرانا منظور ہے اور نہ مین تحریری اجازت
دونگا اور اگر تم چلے جاؤ گے تو مین تمھین نہین روکونگا۔ اب راقم نے اپنے وکلا سے کہا کہ ہزار
روپیہ تم میرا لے چکے ہو اب کچھ ایسا سامان کردو کہ مین یہان سے روانہ ہوجاؤن۔ بہزار دشواری قریب
ایک ہزار روپیہ کے اونھون نے تدبیر کی اوس روپیہ سے راقم نے ایک فرانسیس کی کمپنی ہے
جس کے جہازات ہر مہینے مین ایک دفعہ مسافرون کو ہندوستان مین اور چین مین پہونچاتے
ہین اوس کمپنی سے بندوبست کیا جس کے ذریعہ نومبر ۱۸۶۳ء مین راقم لندن سے روانہ ہوا
چار دن ریل کا خشکی مین سفر ہوا اور سات دن دریا مین پارس اور مارسلیس کے راستے سے
گیارھوین دن بلدۂ اسکندریہ مین راقم پہونچا تین چار صندوق کچھ ضروری پوشاک اور چند کتابون کے لیکے
وہین اسکندریہ تک کرایہ کیا تھا اور ارادہ تھا کہ مفلسانہ وہان سے مکہ معظمہ مین جاؤن اس واسطے کہ جن

راقم لندن سے روانہ ہوکر اسکندریہ مین ۱۸۶۳ء

مہ ہماری شریعت کی اصطلاح مین جب کسی شخص کے پاس کچھ باقی نہ رہے اور قرضخواہ اوس کے بہت ہون تب ایک
قاعدہ ہے کہ قاضی اوس کا افلاس مشہور کرتا ہے اس حکم سے کہ اگر کوئی شخص فلانے شخص کو قرض دیگا۔ اوسکا دعوے
یہان نہ سنا جائیگا اس کو تفلیس کہتے ہین انسالونسی جو انگریزی قانون مین ہے اوس کے قریب قریب ہے۔

نجاسات مین راقم مبتلا تھا بغیر زمزم سے دھونے کے طہارت ممکن نہ تھی۔ اگرچہ میرے عقیدہ مین
لندن مین کچھ نجاست نہ تھی میرے اپنے حرکات موجب نجاست تھے جس وقت مین اسکندریہ مین پہونچا
تیس چالیس روپیہ نقد میرے پاس باقی تھے اور گھڑی وغیرہ کئی سو روپیہ کا مال بھی تھا کہ مصر مین اگر
مین بیچتا تو گیارہ بارہ سو روپیہ کو وہ مال بکتا تھا۔ اب یہان کوئی چار سو روپیہ کو بھی نہین پوچھتا۔ ارادہ یہ تھا
کہ دس بارہ روپیہ مین اسکندریہ سے بندر سویس تک ریلوے کے ذریعہ سے پہونچون گا اور سویس سے
کوئی بغلہ دس پندرہ روپیہ مین جدہ تک پہونچا دیگا اور جس وقت جہاز اسکندریہ مین پہونچا اوس وقت

راقم کا بہ نیت خالص اپنے تئین مہمان خدا اور رسول کی مہمانی مین سپرد کرنا اور نظر کرنا

راقم نے بہ نیت صادق اور خالص بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی اور پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعہ گردانا اور عرض کیا کہ اب مین نے اپنے تئین خدا اور رسول کی
مہمانی مین سپرد کیا جس طرح سے ہو مجھکو بیت اللہ اور مدینۃ النبی مین پہونچائیے۔ کچھ شک
نہین ہے کہ اس روسیاہ کی دعا تیر بہدف ہوئی اور خدا اور رسول نے ایسی مہمانی کی کہ

خدا اور رسول کی مہمانی کی کیفیت

جس کا مطلق وہم اور گمان بھی نہ تھا یعنی باوصف اس افلاس کے مثل امرا اور دولتمندون
کے دو حج کروائے اور چھ مہینے اقامت مدینۃ النبی مین میسر ہوئی کیا اوس کا سامان باندھا جو وہی
عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ہوا۔ دستور ہے کہ جب جہاز پر چڑھتے ہین تو صندوقون پر
اور وہ تمہارے حق مین بہتر ہو
اسباب کے نام و نشان جہان تک اسباب جائیگا لکھ دیتے ہین۔ بعضے اتفاقیات سے مارسیلس

میرا اسباب غلطی سے چین کو روانہ ہوگیا

مین جہاز پر مین اوس وقت پہونچا جب اوس کا لنگر اوٹھتا تھا مستعمین نے جھٹ پٹ
صندوق اوٹھا کے مخزن مین پھینک دیا اوس پر نشان لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ یہ صندوق
اسکندریہ مین اوترین گے۔ اور اوس جہاز پر چین کے مسافر بہت تھے جب لنگر ہوا مین جہاز
پر منتظر کھڑا رہا کہ میرے صندوق خزانہ سے نکلین تو پہچان کے مین لے لون۔ لوگون نے کہا
گھاٹ پر چلو وہین اسباب آتا ہے وہان لے لیجیو۔ گھاٹ پر مین پہونچا تو شام ہوگئی وہان لوگون
نے کہا اب اندھیرے مین اسباب نہین مل سکتا۔ اس وقت جا کے کہین اقامت کرو صبح کو آکے
اسباب لے جانا۔ مین تو شہر مین چلا آیا اور وہان اسباب رات ہی کو چین کے مسافرون کے ساتھ

ریل پر لد گیا صبح کو پھر گھاٹ پر پہونچ کے اسباب ڈھونڈھا کہین نہ ملا جہاز کی کمپنی کے مہتمم جو اسکندریہ مین تھے اون کے پاس جاکے ظاہر کیا اونھون نے اوسی وقت قاہرہ مین اور سویس مین ٹیلیگراف کے ذریعہ سے خبر بھیجی کہ اس اس طرح کے صندوق فلانے مسافر کا اسباب ہے وہ آگے نہ بڑھے جہان پہونچے وہین روکو اور مجھ سے کہا تم قاہرہ مین جاؤ تمکو اسباب وہان ملیگا راقم قاہرہ مین آیا اور وہ اسباب سویس مین بھی نہ روکا جہاز لد کے چین کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب میرے پاس وہی کپڑے جو بدن پر تھے وہ رہ گئے اور ایک باگ یعنی چمڑہ کا ایک بٹوہ رہا جو میرے گلے مین تھا اور تیس چالیس روپیہ کی انگریزی اشرفیان اور ایک سونے کی گھڑی وغیرہ جس کا مین نے اوپر ذکر کیا مصر مین گیارہ بارہ سو روپیہ اوسکے ملتے تھے وہ بھی اوس بٹوہ مین تھی جب مین اسباب سے مایوس ہوا تب انگریزی کنسل یعنی بالیوز جو قاہرہ مین وکیل التجارت تھا اوسکے پاس گیا ان بالیوز کا یہی کام ہے کہ جس سلطنت کا بالیوز ہوتا ہے اوس سلطنت کی رعایا کے انفس اور اموال کا محافظ رہتا ہے اوس سے اپنی مصیبت کا حال بیان کیا پہلے اوس نے کہا کہ ہم کس طرح سے جانین کہ تم سلطنت برطانیہ کی رعایا مین ہو۔ اتفاقاً لندن سے روانہ ہوتے وقت راقم نے وزیر ہندوستان کو ایک چٹھی لکھی تھی کہ میری یہان سے نجات کروا دیجئے اونھون نے اوسکے جواب مین یہی لکھا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اپنے مدعی کے پاس سے تحریری اجازت داخل کرو تو تمھاری اعانت ہو وہ چٹھی اوسی کیسہ مین چمڑے کے تھی ... وہ چٹھی مین نے دکھائی اوس کو دیکھکے وہ مطمئن ہوا اور جہاز کی کمپنی کے لوگون سے مواخذہ شروع کیا کہ فلانے شخص کا اسباب منگواؤ اور جب تک اوس کا اسباب نہ آویگا دس روپیہ روز اوسکے خرچ کے واسطے اور جو کچھ نقصان توقف اور تاخیر سے بیان ہوگا وہ سب تم کو دینا پڑیگا۔ اب ایک اور اتفاق عجیب ہوا کہ شب کو راقم قاہرہ مین ایک فرنگی مہمان سرا مین جاکے رہا تین چار اشرفی انگریزی جو بٹوہ مین میرے پاس تھین وہ کسی نے چرا لین اب میرے پاس ایک حبہ نہ رہا جو روزمرہ کے خرچ کو کافی ہو مین نے بالیوز سے کہا کہ مین کس طرح سے بسر کرون اوس نے اپنے میر منشی کے ہمراہ

کچھ روپیہ بالیوز کے پاس تھا وہ راقم کو دیا اور راقم نے اوسکی رسید لکھ دی

مصطفےٰ پاشا قاہرہ کے گورنر کے پاس بھیجدیا ..... جو
اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کے اقربا ؤن مین تھے کہ سلطانی مسافرخانہ مین ان کو بھیجد و سلطان کی طرف سے
ہر شہر مین مسافرخانہ ہین بہت عمدہ مکانات نہایت تکلف سے فرش و فروش سے آراستہ
ہر قسم کے خدام خدمت کے واسطے اگر سواری کی حاجت ہو گھوڑے کی گاڑیان
سواری کی۔ کھانا پینا بہت عمدہ سرکاری مگر وہان صرف عمایداور امرا اور شاہزادے
جو مسافرانہ اوس شہر مین وارد ہون اقامت کرتے ہین۔ عام مسافرخانے نہین ہین مصطفےٰ
پاشا نے فوراً مجھکو وہان بھیجدیا۔ اب یہ پہلا اثر میری اجابت دعا کا تھا کہ کس خوبصورتی
سے خدا و رسول نے میری مہمانی کی مصر کے ممالک مین یہان سرائین نہین ہین قہوہ خانے
ہین کہ وہین لوگ اقامت کرتے ہین دو تین دن اسکندریہ مین اور قاہرہ مین اون قہوہ خانون مین
راقم رہا پسوؤں کی کثرت سے مطلق نیند نہ آئی اور فرنگی ہوٹل انگریزی اور فرانسیسی اور اطالیانی جو وہان
ہین وہ البتہ بہت پاک و صاف رہتے ہین لیکن اسکندریہ مین جب جہاز پہونچا اور مین نے دعا
جس کا مین نے ذکر کیا اوس وقت یہ بھی نیت کی تھی کہ اب فرنگی کھانے پینے سے مین احتراز کرونگا
جب قہوہ خانون میں وہ نکلیف ہوئی اور مین پھر فرنگی ہوٹلون مین جانے کے لیے مجبور ہوا تو مجھے
نہایت ملال ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی نہین ہے کہ مین اس بدنامی سے بچون اس واسطے کہ اون
سب ہوٹلون کا دستور ہے کہ کوئی اونکے یہان کھانا پینا کھائے یا نہ کھائے وہ کرایہ مع مصارف
کھانے پینے کے مجرا لیتے ہین اور میرے پاس گنجایش بھی مصارف کی نہ تھی اور ظاہر ہے اگرچہ شرعاً
وہان کے کھانے پینے مین کچھ قباحت نہ تھی اور مصر کے لوگ سب باہم مختلط تھے مگر راقم نے اپنے ہندستان
کے دستور کے موافق باقتضاے اِتَّقُوا مِنْ مَوَاضِعِ التُّهَمِ عزم احتراز کا کیا تھا اس سبب سے
دل مین بہت ملال پیدا ہوا کہ نقض عہد کرنا پڑا جناب اقدس الٰہی نے وہ سامان کردیا کہ برابر فرنگی
ہوٹلون سے زیادہ وہان آسایش ہوئی اور میرا اسباب چھ مہینے کے بعد سیلان یعنی ہراندیپ مین
پہونچ کے وہان سے پھر کے آیا اور مین اسکندریہ مین اواخر جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ مین پہونچا تھا اور

سلطان عبدالعزیز نے مجھے سلطانی مسافرخانہ مین بھیجدیا جو عمدہ مکانات فرش و فروش سے آراستہ ہر قسم کے خدام خدمت کے واسطے سواری کی گاڑیان ہین یہ پہلا اثر میری دعا کا تھا

ذیقعدہ اوسی سال تک قاہرہ مین اور وہان رہا ان مسافرخانون مین جو آسایش پائی اوس کے
ادا سے شکر کی زبان کہان ہے خصوص ماہ مبارک رمضان مین افطاری اور کھانا اور سحری کس
کثرت سے آتی تھی عمدہ عمدہ کھانے سیٹھے اور رسلونے ترکی آتے تھے جو رقم اکیلا تن تنہا کھا پکتا تھا
وہی خرچ تھا باقی سب مسافرخانہ کے خدام کو نصیب ہوتا تھا اوسی عرصہ مین قاہرہ کے بالیوز نے
میری درخواست پھر وزیر ہندوستان کے پاس بھیجی اور میری زحمت اور تکلیف سے اطلاع دی۔
ظاہر مین پہلے اونھون نے انکار مطلق میری اعانت سے کی مگر بالیوز کو خدا جانے کچھ مخفی کیا لکھا آیا
کہ وہ مجھ سے اصرار کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تم اب ہندوستان مین نہ جاؤ وہان تم جاکے خوش نہ ہوگے
قسطنطنیہ کا سفر کرآؤ یہین کچھ فکر اپنے معاش کے پیدا کرنے کی کرو مجھ سے جو اعانت
ممکن ہے وہ کرونگا مین نے جواب دیا کہ مین حج کرآؤن پھر جیسا مناسب ہوگا
وہ کرونگا اور اوسی بالیوز کی معرفت وہی گھڑی وغیرہ اپنا اسباب پالسنور روپیہ پیسہ
مین نے رہن کیا جسکے سبب سے چھ مہینے مصر کے ایام قیام مین سب اپنے مصارف
بالائی امیرانہ مین کرتا رہا اور وطن مین اپنے عزیزون کو اطلاع کی کہ جلد میری کچھ
اعانت کرو تاکہ مین وطن مین پہونچون اور جب اسباب سب سراندیپ سے پھرکے آیا تو کچھ تھوڑا
سا پشمینہ باقی رہ گیا تھا اور پالسنور روپیہ جو اسباب رہن کرکے ہاتھ آئے تھے وہ سب خرچ
ہوگئے اب ذیقعدہ کی پچیسوین یا چھبیسوین راقم نے ارادہ جدہ کی روانگی کیا اوسی انگریزی
بالیوز نے خدیو مصر کا حکمنامہ ایک جہاز بخاری پر جو مصری جہاز سویس سے جدہ تک
آتے جاتے ہین اور ایک ریلوے کے مہتمم پر جو قاہرہ سے سویس تک تھی لکھوا کے
منگوا دیا۔ الغرض راقم بہت آسایش سے پہلے درجہ کی ریل پر سویس تک پہونچا
وہان دو تین دن توقف ہوا پھر جہاز پر سوار ہوا چوتھی یا پانچوین ذی الحجہ کی جدہ
مین پہونچا اور وہان سے ایک دن یا دو دن پیشتر اوس دن کے جس امیر الحاج
عرفات کی طرف روانہ ہوگا مکہ معظمہ مین داخل ہوا وہ قلیل پشمینہ قاہرہ مین ذریعہ بالیوز کے خط ہمراہ بھیجنے کے جدہ مین
انگریزی بالیوز نے خط لکھ دیا تھا جدہ کے بالیوز کو اوسکے پہونچنے پر اوسنے روپیہ دیدیا

روپیہ کو بیچا تھا کہ جہاز کے اور ریل کے کرایہ کے سوا اور مصارف بالائی مین کام آئے تین چار روپیہ میرے پاس باقی تھے۔ اب نہایت تشویش ہوئی کہ وہ سفر حج کے واسطے کافی نہ ہون گے اگرچہ بہت سے لوگ وہان اہل تعارف سے موجود تھے جن سے درخواست قرض کی کیجاتی روپیہ مل جاتا مگر حمیت اور غیرت مجاز کسی سے طلب کے نہین کرتی تھی۔ مجبوری سے ایک بڑے تعلقہ دار علیگڈھ کے علاقہ کے وہان مہاجر ہو کے رہے ہین اون کے پاس مین گیا کہ اون سے کچھ قرض مانگونگا وہان پہونچ کے پھر حمیت مقتضی طلب کی نہ ہوئی اور ذہن مین یون گذرا کہ مفلسانہ پیادہ پا چل کے حج کرو کسی سے کچھ طلب نہ کرو یہ دل مین تصور کرکے اوٹھ کھڑا ہوا۔ اوسی وقت ایک شخص نے آکے خبر دی کہ جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مغفور کے پاس ایک ہزار روپیہ کی ہنڈوی میرے گھر سے میرے مصارف کے واسطے آئی ہے مولوی صاحب ممدوح حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے نواسہ مولوی اسحاق صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی وہان مہاجر ہو کے جا رہے تھے اور سارے اہل ہند کے بہت سے امور مین حاجت روا رہتے تھے اور راقم جا کے اونھین کے گھر مین فروکش ہوا تھا الغرض اس روپیہ کے پہونچنے سے جو وہ ایک اور اثر میری اجابت دعا کا تھا راقم نے نہایت آسایش سے جا کے حج کیا[1] اور حج سے فراغت کرکے اواخر محرم ۱۳۸۱ھ مین مدینہ منورہ کی عزیمت پر روانہ ہوا جو قافلہ حج کرکے وہان جاتا ہے دستور ہے کہ اکثر آٹھ روز وہان اقامت رہتی ہے تاکہ چالیس نماز جو حدیث شریف مین واقع ہوئی ہین وہان ادا کرین راقم نے جو روپیہ وطن سے آیا تھا نصف اوسمین سے جناب مولوی یعقوب صاحب ممدوح کے پاس امانت رکھا اور نصف لے لیا کہ حج کے سفر مین مدینہ منورہ کے سفر مین خرچ کرونگا اس نیت پر کہ وہ نصف بقیہ معاودت کے واسطے ہندوستان مین کافی ہو ہلال صفر کا شاید مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کے راستہ میں دیکھا گیا دوسرے یا تیسرے دن مکہ معظمہ سے روانگی کے مین قضاے حاجت کے واسطے اونٹ پر سے اترا ساربان جو ہندوی لوگ تھے اون کا عجب دستور ہے کیسی ہی ضرورت ہو قافلہ سے جدا کرکے ایک اونٹ کو نہین بیٹھنے دیتے مین راقم قضاے حاجت کے واسطے جو اترا اونٹ میری سواری کا تھا نہیں مین قافلہ سے الگ ہو گیا پھر قافلہ مجھے نہ ملا مین جنگل مین ادھر اودھر مارا مارا

[1] یہان سے یہ عبارت چھوٹ گئی ہے۔

آخرش کہی شیخ بدویون کے یہ خبر سن کے میری تلاش کے واسطے نکلے کہ وہ اونکا ایک شکار تھا اونمین سے ایک شیخ مجھے پکڑ لیگیا راقم کے پاس جیب مین چند ریال تھے۔ وہان مشہور ہے کہ بدوی لوگ جس قافلہ کم کردہ کو پکڑ لیجاتے ہین صرف کپڑے وغیرہ جو اوسکے پاس ہین چھین نہین لیتے بلکہ اوس کو قتل کر ڈالتے ہین یا کہین بیچ لیتے ہین رستہ مین اوس شیخ نے جب مجھے پکڑا مین نے کہا میرے پاس یہ چند ریال ہین اور میرے کپڑے ہین یہ لیلو اور مجھے قافلہ مین پہونچا دو۔ اوس نے کہا نہین تم ہمارے ساتھ چلو مین نے کہا کیا تم کو میرا خون ناحق کرنا منظور ہے اوس نے کہا استغفر اللہ ایسا ہم نہین کرینگے رستہ مین اور دو تین شیخ اونٹون پر سوار آکے اون کے شامل ہو گئے اون کو یہ شیخ جو میرے میزبان تھے شریف کہتے تھے یعنی وہ سید تھے۔ غرض وہ شیخ مجھے اپنے خیمہ صحرائی مین لیگیا اور وہان بھیجکے ایک شخص کو بھیجا کہ ہمارے قافلہ مین اطلاع کرے کہ قافلہ گم کردہ آدمی یہان موجود ہے۔ اس حکایت کو جس نے سنا بہت تعجب کیا دو الا سب ہمارے قافلہ کے لوگ میری طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ بدویون کا صحیح وسالم مجھکو چھوڑ دینا اور خود قافلہ مین اطلاع کر بھیجنا یہ بھی اثر دہی میری دعا کا تھا کہ جناب اقدس الٰہی تعالے شانہ نے اون کے ہاتھ سے میری حفاظت کی جب قافلہ چند میل اوس مقام سے جہان مین تھا پہونچا بدوی لوگ جو ہمارے قافلہ کے ساربان تھے وہان آئے اور جب شام کو قافلہ نے کوچ کیا تو وہ مجھے ہمراہ لیکے قافلہ کے شامل ہوئے اور اوس شیخ نے میری بہت مدارات کی اور بدوی جو وہان تھے وہ مجھ سے کہتے تھے کہ تم بڑے خوش نصیب ہو جو اس شیخ کے ہاتھ آئے والا اور لوگ تھین آخر کر ڈالتے وہ لوگ جن کو ہمارے شیخ شریف کہتے تھے وہ استہزاً مجھ سے کہتے تھے ہم تم کو قتل کر ڈالین مین کہتا تھا ہم تمھارے قابو مین ہین جو چاہو سو کرو بعد اوسکے وہی شیخ اوٹھے اپنے دوسرے خیمہ مین جاکے ایک بڑی سینی مین باجرے کا ملیدہ دودھ مین بنا کے لائے اور اوس مین ایک سیر بھر گھی چھوڑ دیا جتنے لوگ وہان جمع تھے سب کے آگے رکھدیا مجھکو بھی شریک کیا شام کے قریب جب مجھے رخصت کیا تین چار ریال جو میرے پاس تھے راقم نے اون کے نذر کیے اور وہان سے اپنے بدویون کے ساتھ قافلہ مین آکے شامل ہوا سب لوگ قافلہ کے

بہت خوش ہوے اور ہر ایک میری حفاظت سے نہایت متعجب تھا کہ بدویون کے قبضہ مین جاکے
زندہ رہنا یا کہین بک نہ جانا ایک امر عجائبات سے ہے - بعضے شیوخ ہندی جو قافلہ مین تھے اور
میرے گم ہونے سے دست افسوس ملتے تھے اور دعا کرتے تھے اونکے مریدین اور معتقدین میری حفاظت
کو اونکی کرامات پر محمول کرتے تھے غرض قافلہ جسکے ساتھ راقم تھا دسوین یا بارھوین دن مدینہ منورہ پہونچا
اور چونکہ دستور ہے جو قافلہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو جاتا ہے ساربانون کے اختیار مین رہتا ہے
اس واسطے کہ اونٹون کا کرایہ آمد و رفت دونون کا کیا کرتے ہین اور اکثر وہ روپیہ کرایہ کا پیشگی
لے لیا کرتے ہین پھر جب مدینہ منورہ مین پہونچے تو جو تاریخ وہان سے معاودت کی ساربان لوگ
معین کر دیتے ہین اوسی تاریخ سارا قافلہ جمع ہو جاتا ہے کبھی آٹھ دن کبھی کم یا زیادہ جو اون بدویون
کو مصلحت معلوم ہوتی ہے اوسکے بموجب زائرین مجبور اونکی اطاعت کے رہتے ہین راقم جب مدینہ
منورہ مین پہونچا اور شرف زیارت سے ہوا تو دل یہ چاہتا تھا کہ وہان زیادہ توقف کرے مگر زاد راہ
کی کمی کے سبب سے علے الخصوص مدینہ منورہ مین جو ساتھ لیگیا تھا اوسمین کچھ قلیل باقی رہگیا
تھا نصف اوس کا جو وطن سے روپیہ آیا تھا مکہ معظمہ مین چھوڑ گیا اور افکار اپنی معیشت کے اور اہل و عیال
کے ظاہر مین مانع بہت توقف کے تھے مگر جو تھے پانچوین دن اوس بلدہ متبرکہ مین پہونچنے کے موافق
دستور کے پانچون وقت کی نماز مسجد نبوی مین علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام ادا کر کے جب
مواجہہ شریف کے سامنے دعاے زیارت پڑھنے کو گیا تب راقم نے نہایت تضرع و زاری سے
روح مبارک کی طرف متوجہ ہو کے دعا کی کہ آج شب کو مین دعاے استخارہ پڑھون گا
اس نیت پر کہ ... جو میرے حق مین دین اور دنیا کے لیے بہتر ہے مجھکو صاف صاف بلا تعبیر
کے خواب مین حکم ہو جاے کہ یہان مین اقامت کرون یا قافلے کے ساتھ معاودت کرون
اور اوسی شب کو وہ عمل استخارے کا جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قول جمیل
مین لکھا ہے وہ پڑھا اور جناب مولانا عبد الرشید مدظلہ بیٹے اور خلیفہ سجادہ نشین مولانا
احمد سعید بیٹے اور خلیفہ سجادہ نشین حضرت شاہ ابو سعید خلیفہ و سجادہ نشین حضرت شاہ غلام علی

راقم نے استخارہ کیا کہ قافلے کے ساتھ معاودت کرون یہان اقامت کرون جواب مین حکم آنا کہ اقامت کرو

خلیفہ و سجادہ نشین حضرت شاہ مظہر جانجانان قدس اللہ اسرارہم کے جو وہان مہاجر ہو کے رہے ہین
اونھون نے تبلایا تھا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بقدر اوس کے اعداد جمل کے جو پڑھ کے سووے وہ
اپنے مطلوب پر خواب مین آگاہ کیا جاتا ہے وہ بھی اوس عمل کے ساتھ ضم کیا اوسی شب کو مین نے
خواب مین دیکھا کہ ایک گھوڑا سبز رنگ معہ ساز و یراق میری سواری کے لیے کھڑا ہے اور مین سوار
ہونے کا ارادہ رکھتا ہون کہ کسی شخص نے پکار کے کہا جسکی مین نے غالبًا صورت نہین دیکھی کہ رسول اللہ
جانے اور سوار ہونے کو منع فرماتے ہین مین اپنے عقیدہ مین یہ نعمت عظمی بہ تصدق رسول مقبول
صلے اللہ علیہ الف الف تحیۃ وسلام اپنے اوپر سمجھتا ہون خواجہ اخیار کے جواب مین مجھے ارشاد ہوا اور
جو دعا اور آرزو نہایت تضرع اور زاری سے حجاز سے فرنگستان کے سفر کے اوتر کے راقم نے کی تھی کہ
اپنے تئین دعوت اور مہمانی مین خدا اور رسول کے سپرد کیا تھا اس طرح کی میری دعوت اور مہمانی
اس دار دنیا مین ہوئی کہ اوس سفر حج مین ایسی راحت اور آسایش سے بسر ہوئی کہ بڑے دولتمندون
کی بھی بسر نہ ہوئی ہوگی اور اس روسیاہ نالایق اور ہیچکارہ کو حکم ہوا اور اجازت قیام کی مدینہ النبی
مین ملی اور بہت امیدواری فوز و فلاح آیندہ کی حاصل ہوئی اسی طرح سے مجھے امید اور آرزو ہے
کہ عقبے مین بھی مقبول ہو جاؤن اور عاقبت میری بخیر ہو اس طرح کا جواب صاف صاف پہلی شب
مین استخارہ کرنے کے جس نے سنا نہایت تعجب کیا اس واسطے کہ اون استخارون مین آٹھ آٹھ نو نو یا کم
اور زیادہ شبون مین ایسی خوابین نظر آتی ہین کہ بغیر اور تاویل سے لوگ اپنا مطلب سمجھتے ہین بالآلہ العالمین
برکات اوس کے اور جو جو عزت اور مکرمت مجھکو وہان حاصل ہوئی جب تک دنیا مین زندہ ہون
اور عقبے مین بعد مفارقت روح کے بدن سے میرے اوپر وایم اور قایم رہے وَاللّٰہُ ھُوَ الْمُوَفِّقُ وَالْمُسْتَعَانُ
لِکُلِّ رَاجٍ عَاصِ الغرض راقم چھ مہینے کامل مدینہ منورہ کے قیام سے مشرف رہا اور پنجگانہ نمازین
اول جماعت مین مسجد نبوی کے ادا کین اور موافق وہان کے دستور کے ہر نماز کے بعد مواجہ
شریف مین دعاے زیارت پڑھا گیا جو فیوض اور برکات وہان حاصل کیے شرح اوس کی
مصلحت نہین ہے چند مرتبہ خواب مین بھی مشرف زیارت کا ہوا۔ پہلے سعادت شرکت مجلس

دوازدہم ربیع الاول ہیں حاصل ہوئی اور رجبی کی مجلس ہین جو ستائیسوین رجب کی معراج کے ذکر کے واسطے ہوتی ہے شریک ہو کے مشرف ہوا اور سب خلفا اور ایہ کے عرسون مین جو مختلف مہینون مین ہوتے ہین شریک رہا۔ حضرت امیر حمزہ کے عرس کے بعد جو ستائیسوین رجب سے شروع ہو کے پانچ چھ دن تک اوس کا مجمع بطور میلہ کے ہوتا ہے وہان سے مکہ معظمہ کے عزم پر روانہ ہوا برشتگی طبیعت کی اوس بلدۂ طیبہ اور مناسک معظمہ کی مفارقت سے اور حرمان نصیبی سے جو حاصل ہوئی اور کیفیت بے اختیاری گریہ وزاری کی جو ہنگام رخصت ہین پیش آئی یاد اوس لذت سوز و گداز کی اب خواب و خیال ہو گئی آرزو یہ ہے کہ انفاس بقیہ چند پھر وہین بسر ہون افسوس ہے کہ تعلقات دنیاوی علایق اور عشایر کے سنگ راہ ہوے والا ایام قیام حرمین شریفین کے ایک برس اور دو مہینے کے قریب جس راحت اور آسایش اور بے فکری مین گذرے مدۃ العمر اس ترتیب مین کبھی نصیب نہیں ہوے تھے اس کا مقتضا یہ نہ تھا کہ یہ چند انفاس باقیہ کہین اور بسر ہون مگر وطن کے آب و دانہ نے نہ چھوڑا اور اون برکات سے محروم کیا۔ غرض ہلال شعبان ۱۲۸۱ھ کا دوسری یا تیسری منزل مین اوس بلدۂ طیبہ سے روانہ ہو کے دیکھا غالبًا چوتھے دن وہان سے روانگی کے سفر خشکی ترک کیا اور ایک بغلہ کرایہ کر کے لنگر بحر عرب مین اوٹھایا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ اس تین چار دن کے سفر خشکی مین ایک مصیبت عظیم پیش آئی۔ ایک منزل مین جس کا نام سہو ہو گیا ہے ایک قلعہ تھا وہان کچھ فوج ترکی مامور تھی بدوی ساربان جو ہمارے قافلہ کے ساتھ تھے کنوین سے پانی بھرنے مین اون سے اور ترکی لشکریون سے کچھ تکرار ہوئی منازعت زبانی منجر جنگ و جدل کی طرف ہوئی دونون طرف سے بندوقین چلنا شروع ہو گئین بیچ مین قافلہ ایک طرف ترکی فوج مہذب دوسری طرف جنگلی بدوی قریب دو گھنٹہ کے مار دھاڑ ہی کتنے قافلہ کے مرد اور عورت کا خون ناحق ہو گیا بعضے مجروح ہوے ایک حافظ بیچارے یادش بخیر مولوی عبد القیوم صاحب کے بیٹے کو قرآن شریف حفظ کرواتے تھے اور اکثر تماشا شہادت کی کیا کرتے تھے ہم چند آدمی ایک ہی جگہ پر بیٹھے تھے وہ حافظ بھی ہمارے ساتھ

بیٹھے تھے .... ایک گولی اونکے آکے لگی وہ بیچارے شہید ہو گئے آخرش ترکون نے رحم کھاکے
ہاتھ کو روک لیا والا بدویون نے تو سارے قافلہ کو تمام کر دیا تھا غرض دو گھنٹہ کے بعد امن ہو گیا
جناب اقدس الٰہی تعالے شانہ نے مثل اور حفاظت اور عنایت اور شفقت کے اس مصیبت مین
بھی اس روسیاہ کو محفوظ رکھا والا بہت سی گولیان سر پر سے اور داہنے اور بائین دونون طرف
گئی نکل گئین ساری رات اور وہ دن الامان اور توبہ اور انابت مین گذرا صبح کو دوسرے دن پھر
کوچ ہوا قافلہ کے بہت سے لوگون نے اس خوف سے کہ پھر رستہ مین مبادا ترکی فوج سے جو جابجا
قلعون مین مامور تھی اور بدویون سے بکھڑا ہو جائے خشکی کا سفر ترک کیا۔ جس بغلہ پر راقم سوار ہوا اسی
پر چند اپنے احباب بجنس مثل مولوی عبدالقیوم صاحب سلمہ اللہ تعالے مولانا عبدالحی مغفور کے بیٹے اور مولانا
اسحاق حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسہ کے داماد مع اپنے اہل وعیال کے بھی سوار ہوے لیکن
جس دن سے بغلے نے لنگر اوٹھایا برابر ہوا مخالف رہی دسوین یا بارھوین دن بہت صعوبت سے
بندر جدہ مین لنگر ہوا دو ایک دن اونٹون کی تلاش مین وہان اقامت رہی آخرش اوسط
شعبان مین مکہ معظمہ مین بخیریت داخل ہوے مشفقی حاجی سعید بخت سلمہ اللہ تعالے سلامت
کے ایک بڑے زمینداروں مین مہاجر ہو کے امیرانہ وہان رہتے تھے پہلے سال
مین بھی بعد فراغت حج سے جو پندرہ بیس دن وہان اقامت ہوئی تو وہ مبالغہ ہو کے
اپنے مکان مین راقم کو اوٹھا لیگئے تھے اب کے دفعہ بعد معاودت کے مدینہ طیبہ
سے پھر وہ مبالغ ہوے اور راقم اونھین کے ہمخانہ ہوا اور پیشتر سے اونھون نے اب زیادہ محبت
یہ کی کہ راقم کو الگ کھانے پینے کا بندوبست نہ کرنے دیا۔ لیکن حساب دوستان در دل برابر تھا زاید
اونکے مصارف سے ایک لبادہ قاقم کا جو لندن مین چھ سات سو روپیہ مین راقم نے تیار کروایا
تھا اور وہ بھی لندن کے مال مسروقہ مین تھا جو اسباب میرا چوری ہو گیا تھا مگر بعضی اور چیزون
کے ساتھ وہ مل گیا تھا وہ ہدیتہً راقم نے اون کو نذر کیا۔ رمضان شریف ۱۲۸۱ھ کا مکہ معظمہ مین بہت
برکات سے گذرا آٹھ سات عمر سے اوس ماہ مبارک مین نہ ملا کیے اور اوس سال کا حج جو میری قسمت سے

نسبت دون مصیبت کے جس کی طرف اشارہ کیا ہے اوس کا قصہ یہ ہے کہ جب بارھوین دن بندرگاہ جدہ مین لنگر ہوا اور اسط شعبان مین مکہ معظمہ مین داخل ہوے

حج اکبر واقع ہوا یعنی روز حج روز جمعہ تھا بخیر و خوبی ادا ہوا۔ عجیب اتفاق ہوا کہ جب امیر الحاج نے حج کے واسطے کوچ کیا مجھکو سواری نہ میسر ہوئی اور باوصف پیر کے حج مسنون یعنی پیادہ پا کرنا پڑا مکہ معظمہ سے منا تک پیادہ پا گیا چونکہ اوس مین بہت بڑا ثواب ہے تصور ہوا کہ یہ بھی مثل اور عبادتون کے ہے جو اوس سفر مین میرے اوپر جناب اقدس الٰہی کی مبذول ہوئی ہین۔ لیکن بسبب ضعف پیری کے نصف حج پیادہ پا ادا ہوا۔ حج کے وقت سواری نہ ملنے کی وجہ سے

سن کے متحمل اوس کا نہ ہو سکا۔ منا مین کچھ زیادہ خرچ کرنے سے ایک اونٹ کرایہ کا عرفات تک دونون آمد و رفت کے واسطے مل گیا۔ شکر الٰہی جس کی طاقت ادا کی ہرگز نہین ہے بجا لایا اور نصف حج پیادہ پا ہوا۔ جب حج سے فراغت ہوئی منا مین پھر کے آئے وبا ہیضہ کی شروع ہوئی اوس کے زور و شور کا کچھ بیان نہین ہو سکتا پندرہ بیس دن تک بازار ملک الموت کا ایسا گرم رہا کہ العیاذ باللہ ہزارون آدمی آخر ہو گئے۔ بہت سے ہمخانہ اور ہمصحبت لوگ کوچ کر گئے ہزارون آدمی بہت سے مناسک مسنون حج کے چھوڑ کے معاودت کر گئے اوسی حالت مین ایک مرتبہ راقم بھی اسہال مین مبتلا ہوا کہ نوبت وصیت نامہ بھی لکھنے کی پہونچی لیکن اس مصیبت سے بھی جناب اقدس الٰہی نے نجات دی ایک شب کو ایک بزرگ کے دفن کرنے کے واسطے جنت المعلے مین اتفاق جانے کا ہوا جہان کہ ہزارون لاشون کو بہت ہی اوتھلا غار کھود کے دبا دیتے ہین ہزارون لاشین گویا زمین پر رکھی ہوئین تھین شدت تعفن سے میری عجیب کیفیت ہو گئی کہ معاودت دشوار ہوئی غش کی صورت پر مکان مین پہونچ کے مین گر پڑا عشا کی نماز کے واسطے حرم مین جانے کی نوبت نہ آئی۔ شاید آدھی رات کو اقامت گاہ مین اوٹھ کے نماز پڑھی۔ بالجملہ اواخر محرم ۱۲۸۳ھ مین معاودت کے ارادے سے مکہ معظمہ سے روانہ ہو کے جدہ مین آیا۔ یہان قریب ایک مہینے کے اوس اسباب کے بندوبست کے واسطے جو قاہرہ مین راقم رہن کر کے آیا تھا توقف ہوا پہلے ارادہ تھا کہ خود مصر مین جا کے اور اسباب رہن سے نکال کے وہین سے جو جہازات بخاری ہندوستان کو آتے ہین اون پر سوار ہو کے روانہ ہون مگر کچھ روپیہ کا بندوبست نہ ہو سکا

آخر ایک تاجر حاجی قاسم نام ممبئی تھے اون کے ساتھ بندوبست کیا کہ وہ اسباب منگوا کے بمبئی مین بھیجدین گے اور اس نظر سے کہ ارباب اقتدار سلطنت کے مبادا یہ شبہہ کرین کہ مین کلکتہ مین پہونچ کے پھر بادشاہ کو پارلیمنٹ مین مرافعہ کے واسطے بھکاؤنگا کلکتہ جانے کا عزم موقوف کیا منتظر تھا کہ کوئی بخاری جہاز بمبئی کا جانے والا ملے تو اوسپر سوار ہون۔ اتنے مین جناب مولوی عبدالقیوم صاحب مع اپنے اہل وعیال کے بھی معاودت کے ارادہ پر جدہ مین آئے اور ایک بادبانی جہاز پر اونھون نے بندوبست روانگی کا کیا اون کی رفاقت اور مصاحبت کی نظر سے راقم نے بھی اوسی جہاز پر ایک کمرہ لیا۔ ربیع الاول کے شروع مین جہاز نے جدہ سے لنگر اوٹھایا اور بچیس روز مین بمبئی مین داخل ہوا۔ چونکہ عین ایام بارش کے تھے اور اوس سال برسات بہت زور شور کی ہوئی۔ اور جب تک ریلوے کی سڑک صرف بمبئی سے برہان پور تک جاری ہوئی تھی برہان پور سے آگے رستہ بہت خراب تھا لاچاری سے قریب تین مہینے کے بمبئی مین توقف ہوا اور آخر جمادی الثانی ۱۲۸۲ھ مین بمبئی سے ریلوے کے ذریعہ سے برہان پور تک پہونچا یہان سے بمعیت مولوی عبدالقیوم صاحب کے خشکی کا سفر اختیار کیا بھوپال مین آیا دہان دو تین ہفتہ تک توقف ہوا بعد اوس کے کرانچی کی ڈاک پر آگرہ مین پہونچا دہان سے ریلوے کے ذریعہ سے کانپور مین آیا۔ کانپور سے لکھنؤ تک جب تک ریل نہین تیار ہوئی تھی گھوڑے کی گاڑی کی ڈاک پر چوتھی شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۳- دسمبر ۱۸۶۵ء وطن مین داخل ہوا چونکہ بعد سلطنت اودھ کی ضبطی کے حکم تھا کہ سب بادشاہی نوکرون کو پنشن دیا جاے اس سبب سے راقم نے اپنی طرف سے اور اپنے بڑے بیٹے مولوی فریدالدین خان سلمہ اللہ تعالے کی طرف سے پنشن کی درخواست کی مدت تک اوس کا مجھلہ پڑا رہا آخر مین یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ لارڈ لارنس گورنر جنرل تھے اور عجب طرح کا اتفاق ہوا کہ جب راقم لندن مین تھا لارڈ موصوف وزیر ہندوستان کے ایک مشاورین مین تھے اور راقم وزیر ہندوستان کے محکمہ مین اکثر جاتا تھا چونکہ لارڈ ممدوح سے ہندوستان مین کبھی شناسائی اور تعارف نہ تھا مین اونکے پاس

۲۵- ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ کو بادبانی جہاز پر اونھون نے بندوبست روانگی کا کیا

۲۷- ربیع الاول ۱۲۸۲ھ کو جہاز نے جدہ سے لنگر اوٹھایا

۲۹- ربیع الاول ۱۲۸۲ھ کو بمبئی مین داخل ہوا

۴- جمادی الثانی ۱۲۸۲ھ کو بمبئی سے ریلوے کے ذریعہ سے برہان پور تک پہونچا

۲۲- جمادی الثانی ۱۲۸۲ھ کو برہان پور سے بمعیت مولوی عبدالقیوم صاحب کے خشکی کا سفر اختیار کیا

۲۴- شعبان ۱۲۸۲ھ کو کرانچی کی ڈاک پر آگرہ مین پہونچا

کبھی ملاقات کے واسطے نہین گیا اور ظاہرا مزاج اون کا بہت خوشامد طلب ہے۔ یہ امر اون کو ناگوار ہوا۔ جب اون کے پاس میری درخواست پنشن کی۔ اور ایک دوسری درخواست اس مضمون کی گذری کہ میرا دعوے بادشاہ اودھ پر چار لاکھ روپیہ کا ہے اور ایکٹ ۱۳ سنہ ۱۸۶۸ء کا نفاذ پایا ہے کہ کسی طرح کا کوئی دعوے بادشاہ پر بدون اجازت خاص گورنمنٹ کے کسی عدالت مین مسموع نہ ہوگا اس واسطے مین امیدوار ہون یا خود گورنمنٹ میرے دعوے کو اونکے اوپر فیصلہ کرے یا مجھے اجازت دیوے کہ مین عدالت مین نالش کرون۔ مجھے یقین ہے کہ لارڈ مہ وح نے اوسی ناراضامندی کے سبب سے جو میری طرف سے اون کے دل مین تھی میری دونون درخواستون کو نامنظور کردیا۔ اگرچہ راقم نے اوس کا مرافعہ وزیر ہندوستان کے پاس بھی کیا مگر کچھ وہان بھی اب تک شنوائی نہ ہوئی۔ شرح اور تفصیل اپنی تباہیون کی جو اس سلطنت کے ارباب قدر کی عدم توجہ سے میرے حال پر ہوئی بسبب یاس کلی کے کسی نتیجہ خیر سے بعث و فضول ہے اور اصل وہی ہے جو اوپر ایک جلیل القدر کا قول راقم نے نقل کیا ہے کہ بادشاہ اودھ کے مقدمہ مین لندن مین بعضے تصانیف جو راقم نے چھاپ کے مشتہر کئے تھے وہ باعث میرے حال پر شفقت اور رحم نہ کرنے کے ہوئے اور بادشاہ والاجاہ اودھ جنھون نے راقم کو ان مصایب مین گرفتار کیا اون کی عقل اور فطانت اپنی سلطنت سے کنارہ کرنے سے ظاہر ہے اون سے کچھ امید بہبود کی رکھنا طول امل سے بھی کچھ بڑھکے ہے ایسی حالت مین بجز قہر درویش برجان درویش اور کچھ نہین ہے اور کسی سے محل شکایت نہین ہے بجز اپنی تقدیر کے کبھی ایسا تصور ہوتا ہے کہ اگر مین لندن نہ جاتا تو بہتر ہوتا کہ اتنی تباہی نہ آتی پھر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ تھا غدر کا عہد چونکہ بصالح سلطنت اذھا احمد تھا کچھ تعجب نہین ہے کہ لوگ پھانسی پر چڑھا دیتے اس حفاظت کے واسطے آب و دانہ نے وہان کھینچا تھا۔ غرض اس عالم اسباب مین لاکھون تدبیرین معاش پیدا کرنے کی ہین مثل مشہور ہے پائے مرا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست جب تک ہاتھ پاؤن چلتے ہین محض عنایت اور شفقت الٰہی سے مین مایوس نہین ہون اگر

مرزا حبیب علی بیگ مرحوم

فسانۂ عجائب عہ
انشائے سرور ۶
امیر مینائی مرحوم
امیر اللغات فاضل عہ
صنوفانہ عشق عاشقانہ
مراۃ الغیب عہ
محامد خاتم النبیین ۸
مناجات سخن عہ
مکاتیب امیر مینائی عہ
جلال مرحوم
سرمایۂ زبان اردو عہ
مضمونہائے دلکش عہ
نظم نگارین عہ
رسالہ تذکیر و تانیث ۸
اوقاف قدیم ۸
قواعد النقب ۴
امراجد عباس معاشق مرحوم
فسانۂ ارجمند عہ
پیاری سہیلی ۱۲
دفتر سحر ۸
لیمن ۱۲
منشی افضل حسین بانبت
حیات دبیر عہ
دربار حسین ۷

پنڈت دتاتریہ تھہ رشار

فسانۂ آزاد جلد عہ
سیر کہسار ۱۲
خدائی فوجدار ۱۶
جام شہار ۱۶
الف لیلیٰ کا طرز نادل ۱۲
قیس و لبنیٰ ۱۲
مقدس نازنین ۱۲
ایام عرب ۱۲
فتح اندلس ۱۶
اہ ملک ۱۶
حسن کا ڈاکو ۱۲
قاسم و زہرہ ۱۲
نیرنگ جمال ۱۲
گنجینہ ۱۲
سکیفن اور لوسی ۱۲
زبان دانی ۶
اصلاح زبان اردو ۶
قواعد سیر ۶
اصول اردو ۶
جان اردو ۶
الاسلام والنصرانیہ ۱۲
شاعری کی پہلی کتاب ۱۲
دوسری کتاب ۱۲
تیسری کتاب ۱۲
لغات اردو ۱۲
آغاز و ختم سال ۱۲
سیر رجال ۱۲
تاریخی و عجائبی مضامین ۱۲
جام جہر ۱۲

مولینا عبدالعلیم شرر

جنید بغدادی ۱۲
خواجہ معین الدین چشتی ۱۲
تذکرہ مشاہیر عالم ۱۶
فخر دات ۱۲
قیس و لبنیٰ ۱۲
جغرافیہ ۱۲
ایام عرب ۱۲
فتح اندلس ۱۶
اہ ملک ۱۶
حسن کا ڈاکو ۱۲
قاسم و زہرہ ۱۲
نیرنگ جمال ۱۲
گنجینہ ۱۲
سکیفن اور لوسی ۱۲
مفتوح فاتح ۱۲
فلپائنا ۱۲
زوال بغداد ۱۲
بنت جین ۱۲
کل کا پھل ۱۲
جواب حق ۱۲
بابک خرمی ۱۲
ملاپہ ۱۲
شوقین ملکہ ۱۲
یوسف و زلیخا ۱۲
گزشتہ لکھنؤ ۱۲
شاعرانہ دماغشناسی مضامین ۱۲

حکیم محمد علیخان مرحوم

رام پیاری کامل ۱۲
عبرت کامل ۱۲
حسن سرور کامل ۱۲
اختر حسینیہ ۱۲
ڈیول ویری ۱۲
جعفر و عباسہ ۱۲

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق ۱۲
قاسم و زہرہ ۱۲
نیرنگ جمال ۱۲
گنجینہ ۱۲
سکیفن اور لوسی ۱۲

خواجہ عبدالرؤف عشرت

زبان دانی ۶
اصلاح زبان اردو ۶
قواعد سیر ۶
اصول اردو ۶
جان اردو ۶
الاسلام والنصرانیہ ۱۲
شاعری کی پہلی کتاب ۱۲
دوسری کتاب ۱۲
تیسری کتاب ۱۲
لغات اردو ۱۲

منشی محمد حسن فحشی

مجبوس گشت ۱۲
جام جہر ۱۲

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

یادایام ۱۲
تذکرۂ علمائے عہ
حیات حافظ رشید ۱۲
خلافت نواتیہ ۱۲
خلافت عباس ۱۲
عباسیہ بغداد ۱۲
علوم عرب ۱۲
سوم ۱۲
چہارم ۱۲
پنجم ۱۲
ششم ۱۲
ہفتم ۱۲
ہشتم ۱۲
نہم ۱۲
دہم ۱۲
یازدہم ۱۲
سلطان صلاح الدین عہ
نورالدین محمود ۱۲

مولوی محمد علیم انصاری

اصول اردو ۶
جان اردو ۶
الاسلام والنصرانیہ ۱۲
فتح اندلس ۱۲
ابوسلم خراسانی ۱۲
تاریخ عرب ۱۲

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

سیرۃ الصدیق ۱۲
علمائے سلف ۱۲
تذکرۃ الشعراء حصہ اول

حافظ الم جیراجپوری

سیرۃ الرسول ۱۲
خلافت راشدہ ۱۲
خلافت نواتیہ ۱۲
خلافت عباس ۱۲
عباسیہ بغداد ۱۲
علوم عرب ۱۲

قاضی محمد سلیمان منصورپوری

رحمۃ للعالمین ۱۲
سفرنامہ حجاز ۱۲

مولوی خلیل الرحمن

اخبار الاذکیا جلد عہ
تاریخ مولدین ۱۲
مختصر تاریخ اسلامی ۱۲
غدار ۱۲

مولوی محمد انشاء اللہ

سیرۃ الرسول ۱۲
تاریخ آل عثمان ۱۲
حالات طرابلس مرحوم و لبنان ۱۲
حالات قسطنطنیہ عہ
تاریخ ملوک مغرب الاقصیٰ ۱۲

منشی سمیع اللہ حیدرآبادی

آشنا لکبری ۱۲
حیات سعد ۱۲
امراے نظام ۱۲

کوتوالی ۔ ماہنامہ مذہبی تعلیم نہایت دلکش نذارین لکھی گئی ہے ۔ قیمت صرف .. .. .. ۴ ر

ملنے کا پتہ ۔ انا ظر بک ایجنسی لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا ایم اے	مولانا حسرت موہانی	منشی احمد علی بی اے	مولوی سید سلیمان ندوی	خواجہ حسن نظامی	مولوی عبدالرشید الزہری
خیالات عزیز ۶	شرح دیوان غالب ۴	تاریخ تمدن ۳	ارض القرآن ۱۲	قرآن آسان قاعدہ ۱	
ذکر یار دی ۴	کلیات دیوان حسرت ۴	شباب لکھنؤ ۲	سیرۃ عائشہ ۲	میلاد نامہ ۱	صبح زندگی ۱
			حیات امام مالک ۱	محرم نامہ ۱	شام زندگی ۱
خواجہ عماد الدین اختر	سید سجاد حیدر بی اے	مولوی عبدالماجد بی اے	خلافت عثمانیہ اور اسلام ۲	فاتحہ عزت اسلام ۲	شب زندگی ۱
			خلافت اور وہابی تحریک ۲	ذکر خوش پاک ۱۲	نور زندگی ۱
صدیق اکبر ۴	خیالستان ۴	فلسفہ جذبات ۴			
حضرت زید ۶	حکایات و واقعات ۴	مکالمات برکلے ۴	مولوی عبدالسلام ندوی	رشن جیون ۴	درثمہاد
مشاہیر اسلام ۴	پیام امن ۳			شادی جہاد ۴	مناظرہ السارہ ۱
بغداد ۶	زہرا ۱۳	تصوف اسلام ۲	سوانح صحابہ اجلد سے	سیارہ دل ۶	
دمشق ۶	جلال الدین خوارزم شاہ ۳		سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ۲	سرسبز مغرب ۱	
دیوان خاقانی خاور		فلسفیانہ مضامین ۴		گم شدہ موت ۴	بنت العنب ۴
	مسٹر ظفر عزیز بی اے	زود پشیمان ۰	انقلاب الامم ۶	پنکھڑیاں گلدستہ جاں ۱۲	قطرات اشک ۱
مفتی انوار الحق ایم اے			تاریخ حرمین الشریفین ۶	آئین خطوط نویسی ۴	جوہر قدامت ۱
	حرون کا کلب ۹	منشی محمد لطیف بی اے	مفرق اسلام ۴	روزنامچہ ۶	عروس کربلا ۱
تاریخ ابوالبشر ۴	ایلی چھتری ۴			بیوی کی تعلیم ۴	یاسمین شام ۴
تذکرۃ الحبیب ۶	بہرام کی گرفتاری ۴	اکبر ۴	سوانح سنوانی ۴		
حقایق اسلام ۶	مستقبل اسلام ۴	اورنگ زیب ۴	شعر الہند ۲ جلد سے	بیوی کی تربیت ۶	تیغ کمال ۱
		رنجیت سنگھ ۴		اولاد کی شادی ۶	ماہ عجم ۴
	پروفیسر فیروز الدین ایم اے	اودھ کا ابو ۴	مولوی عبدالباری ندوی	جگ بیتی کہانیاں ۱۰	محبوبہ خدا ۱۳
میر دلی اللہ بی اے					
	بادل کے بچے ۲	مختصر تاریخ ۶	مبادی علم انسانی ۱۲		
بندگی ۶					
کاس الکلام ۶	خونناب عشق ۶	پروفیسر یوسف علی ایم اے			
لسان الغیب جلد اول ۶					
" " دوم ۶		معالج الدین ۱۲			نیاز فتح پوری ۱۲
" " سوم ۶		تذکرۃ المصطفےٰ ۴	مولوی سعید انصاری		
" " چہارم ۶	حکیم محمد اجتماع علی بی اے	صحت سماوی ۶			گلستان علی ۶
		تیغ سخن ۱۰	سیر الصحابہ جلد اول ۶		
	باپ کا گناہ ۴				جذبات بھائی ۱۰
پروفیسر السن نی ایم اے	حسن کی تربیت ۶		سیر انصار و جلد سے		بجلد ستان ۶
					زید نامہ ۴
			سیر الصحابیات ۶		صحابیات ۶
					تاریخ الاسلام ۸
			مولوی عبدالحق ندوی		
					تسکین احساس ۸
			اسوۂ حسنہ ۶		یاس عظیم آبادی
					روزنامچہ ۱۲
					چراغ حسن ۴
					نشتر یاس ۸

رجسٹرڈ نمبر ہو استعان لے ۴۷۰

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۸/

محصول معاف
روپیہ کی روانگی پر آدھا
اور
روپیہ کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

ہدیتہً بھیجیے
روپیہ کی روانگی پر ناظر ایک سال
اور
تمام کی روانگی پر غدر کی کتابیں،

مرزا غالب مرحوم

اُردوے معلی ۲ جلد
عود ہندی ۸ر۰ حصہ
اردو ۸ر۰ حصہ
کلیات نظم طبا طبائی ۲ جلد
کلیات نظم حزیں ۱ جلد
کلیات نظم نسیم ۱ جلد
دیوان غالب بجی ۱ جلد
دیوان غالب صد
نیرنگ خیال ۱ حصہ
سیر ایران ۱ حصہ
درامہ اکبر ۱ حصہ
رویائے صادقہ ۱ حصہ
انشائی ۱ حصہ
کاشانہ بتنا ۱ حصہ
ابن الوقت ۱ حصہ
مصائب غدر ۲ حصہ
جانورستان ۱۰ حصہ
بیاض آزاد ۱ حصہ
تذکرۂ علماء ۱ر۸ حصہ
لغت آزاد ۱ حصہ
چند پند ۱ حصہ
مبادی الحکمۃ ۱ حصہ

مولانا نذیر احمد مرحوم

مآثر الامراء ترجمہ ۱۲ حصہ
الحقوق والفروض ۱۲ حصہ
بنات النعش ۹ حصہ
مراۃ العروس ۱۲ حصہ
گوہر تاج ۱۰ حصہ
موعظہ حسنہ ۱ حصہ
مسدس حالی ۱ر۰ حصہ
مجموعہ نظم حالی ۱ حصہ
بچوں کی مناجات ۲ حصہ
شکوۂ ہند ۲ حصہ

مولوی شبلی الرحمن صاحب

واقعات دارالحکومت دہلی ۱ حصہ
تاریخ بیجاپور ۱ حصہ
عروز طفلان ۱ حصہ
نشاط عمر ۱ حصہ
مصباح پیری ۱ حصہ
لخت جگر ۱ حصہ
حسن حاشرت ۱ حصہ
اصلاح معیشت ۱ حصہ
اقبال دولت ۱ حصہ
شمع ہدایت ۱ حصہ
دیوان بشیر ۱ حصہ

مولانا شبلی مرحوم

سیرۃ النعمان ۱ حصہ
الفاروق ۲ جلد ۱۰ حصہ
الغزالی ۱ حصہ
المامون ۱ حصہ
سوانح مولانا روم ۱ حصہ
سفرنامہ مصر و روم و شام ۱ حصہ
علم الکلام ۱ حصہ
الکلام ۱ حصہ
رسائل شبلی ۱ حصہ
مقالات شبلی ۱ حصہ
شعر العجم جلد اول ۱ حصہ
" " دوم ۱ حصہ
" " سوم ۱ حصہ
" " چہارم ۱ حصہ
" " پنجم ۱ حصہ
موازنہ انیس و دبیر ۱ حصہ
مضامین عالمگیر ۱ حصہ
آغا شاعر ۱ حصہ
مجموعہ کلام شبلی اردو ۱ حصہ
کلیات شبلی فارسی ۱ حصہ

مولانا آزاد مرحوم

آب حیات ۱ حصہ
دربار اکبری ۱ حصہ
نگارستان فارس ۲ حصہ
بہارستان فارس ۲ حصہ
انشائے آزاد ۱ حصہ
نیرنگ عالم ۱ حصہ
سخندان فارس ۲ حصہ
سخن دان فارس ۲ حصہ
سخندان ایران ۲ حصہ
سخن دان ایران ۲ حصہ
سبک شناسی ۲ حصہ
سبک شناسی ۲ حصہ
سبک شناسی

بسم اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ جون ۱۹۲۸ء

جلد ۳۴ — نمبر ۶

خان جہاں لودی	مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	۱
تینسگے	مسٹر جلیل احمد جلیل قدوائی بی اے	۳۵
افکار وحشت	مولانا رضا علی وحشت	۴۰
روح رواں (ریویو)	مولوی ضیاء احمد ضیاء بدایونی ایم اے	۴۱
غلط رہ نمائی		۵۱
نظرے خوش گزرے		۵۸
سفیر اودھ	خود نوشت مولوی سید الدین خاں بہادر مرحوم	۱۲۹ / ۱۴۴

ظر

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی تصانیف

راج دُلاری - اس قابل قدر ڈرامہ میں ہندوستانی معاشرت دکھائی گئی ہے - قیمت ۴ر

توزک قیصری - ایک تاریخی نظم جس میں تاریخ ہند کے اہم اور نتیجہ خیز واقعات درج ہیں قیمت ۸ر

پریم ترنگنی - تمثیل اور استعارہ کے پیرایہ میں حسن اخلاق، حسن سلوک اور روحانی ترقی اور انسانی مقصد زندگی کے عالمگیر اصول - قیمت ۶ر

مراری دادا - اس ڈرامہ میں بچوں خاص کر لڑکوں کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے قیمت ۶ر

خمخانۂ کیفی - حضرت کیفی کی چند دلآویز نظموں کا مجموعہ - قیمت ۶ر

ملنے کا پتہ

الناظر بک ایجنسی - لکھنو

نئی کتابیں

نہرو رپورٹ کا اُردو ترجمہ تیار ہے قیمت ۸ر

سیر المصنفین (جلد دوم) مصنفہ مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی - جسکا دیباچہ الناظر میں شایع ہو چکا ہے اب تیار ہو گئی ہے - اس ۶۵۰ صفحے کی کتاب میں تیسرے دور کے نثر نویسوں کے حالات، اُنکی تصانیف کا تذکرہ، اُنکی تحریروں کے نمونے ہیں - اور اُنکی انشا پردازی پر تبصرہ کیا گیا ہے سرسید، چراغ علی، آزاد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، نذیر احمد، حالی، شبلی، سرشار و شرر کے علاوہ حاجی اسمٰعیل خاں، محسن الملک، وحید الدین سلیم، ماسٹر پیارے لال، سید احمد، عزیز مرزا، ظفر علی خاں، بشیر احمد - منشی سجاد حسین سید سلیمان ندوی، مولوی عبد الرزاق کانپوری وغیرہ کے حالات اس جلد میں آگئے ہیں - قیمت ۴ر

آئینۂ حقیقت نما (جلد دوم) مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی قابل قدر تاریخ ہند کا پہلا حصہ شایع ہو کر حسن قبول حاصل کر چکا ہے - اب دوسرا حصہ تیار ہوا ہے جس میں تغلق اور لودی خاندانوں کی حکومت کے حالات ہیں - حجم ۱۵ جزو - قیمت ۴ر

خاکِ پروانہ - اُردو کے مشہور ادیب و فسانہ نویس پریم چند کے ۱۴ بہترین افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شایع ہوا ہے - شایقین فوراً طلب کریں - قیمت صرف ۴ر

مرآۃ محمدی - یعنی مسلمان سلاطین گجرات کے مستند حالات - مصنفہ شیخ غلام محمد مرحوم مصنف مرآۃ عالمگیری وغیرہ - جو مصنف کے انتقال کے بعد اُنکے جانشین نے طبع کرائی ہے - قیمت ۴ر

تحفۂ احباب - مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب رحمانی نے چند قرآنی آیات کی تفسیر لکھ کر ثابت کیا ہے کہ کتاب اللہ کی آیات میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر آیت دوسری آیت کی موید و مفسر ہے - نیز انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق غلط روایتوں کی تردید کر کے قرین عقل مطالب بیان کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ قصص قرآن میں ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے کار آمد نصائح ہیں - قیمت ۴ر

روضۃ الہدیٰ میں مصنف تحفۂ احباب نے بعض دوسری آیات قرآنی کی تفسیر بیان کی ہے - اسمیں ذات، منکر نبوت، حکم مرتد، بعث قبلہ، میراث، حج بدل، گوشت خوری، تخلیق و تصویر، بعثت انبیاء غیرت مسلم، لوح محفوظ وغیرہ مضامین اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں - قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ :- **الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۴ جون سنہ ۱۹۲۸ء

خان جہاں لودی

تمہید محمد بن قاسم علیہ الرحمہ کی فتوحاتِ ہند سے لیکر سلطان شہاب الدین غوریؒ کی وفات تک ہندوستان کے شمالی و مغربی صوبے اکثر مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہے لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک الگ مستقل سلطنت قطب الدین ایبک کے زمانے سے شمار کی جاتی ہے۔ قطب الدین ایبک۔ شمس الدین التمش۔ غیاث الدین بلبن اور اُنکی اولاد کا دورِ حکومت ختم ہو کر خاندان خلجی ہندوستان کی فرماں روائی پر فائز ہوا۔ خلجیوں کے بعد تغلقوں کی شہنشاہی کا نمبر آیا۔ ان تینوں فرمانروا خاندانوں کے عہد سلطنت میں وزیر اعظم کو الغ خاں کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ الغ خاں ترکی زبان کا لفظ ہے جسکا ترجمہ سردار اعظم، خان جہاں، خان خاناں، خانِ اعظم، سند عالی، حضرتِ اعلیٰ وغیرہ الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔ حملۂ تیمور سے جب خاندان تغلق کا خاتمہ کر کے ایک نئے مجہول النسب خاندان کو فرمانروائی کا موقع دیا تو اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ خضر خاں نے اپنے آپ کو تیمور کا والیسرائے قرار دیکر اپنا لقب سند عالی تجویز کیا۔ سند عالی خضر خاں کے بعد اُسکے بیٹے نے ایک خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ لیکن الغ خاں کا ترکی خطاب پھر ہندوستان میں نہیں سُنا گیا۔ اس خاندان کے بعد لودیوں کی حکومت شروع ہوئی تو ایک ہی وقت میں کئی کئی شخصوں کو سند عالی، خان خاناں اور خان جہاں کے خطابات ملے۔ سکندر لودی اور ابراہیم لودی کے عہد حکومت میں کئی خان خاناں، کئی سند عالی، اور کئی خان جہاں تھے۔ خان جہاں کا خطاب

تو ایک جمعیت فراہم کر کے اپنے وطن سے چلا اور ۷۵۸ھ میں جبکہ فیروز تغلق بنگالہ کے سفر سے ناکام واپس آچکا تھا دہلی پہونچ کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنے سابقہ حقوق اور حاجی الیاس کی شکایات زبان پر لا کر ہر قسم کی جانفشانی و جانفروشی پر آمادگی ظاہر کی سلطان نے بھی ظفر خاں کو اپنی مہربانی و عنایت کا یقین دلایا۔ شمس سراج عفیف سلطان فیروز کے الفاظ کو اس طرح روایت کرتا ہے کہ

"آں شہریار ریز احم شاہی و عواطف پادشاہی ظفر خاں را بسیار پرسیدہ و بنایت نوا ختہ فرماں فرمود کہ ظفر خاں خاطر جمع دارد و اندیشہ را بسوے خود گمار اگرچہ شداید بسیار و مکاید بیشمار رو دیدی و راہ ہاے مخالف و بیداہاے مخوف ہیود ی المنۃ للہ بمقصود رسیدی ہرچہ درسنار گانوں و شتی اصناف آں تو مفوض خواہد شد"

چنانچہ ظفر خاں کو سلطان نے زمرۂ امرا میں شامل کیا۔ وہ اول نائب وزیر پھر ۷۶۹ھ میں صوبہ گجرات کا حاکم مقرر ہوا۔ ظفر خاں لودی جب ۷۷۵ھ میں فوت ہوا تو اُسکے بیٹے دریا خاں لودی کو سلطان فیروز تغلق نے ظفر خاں کا خطاب دیکر اپ کی جگہ گجرات کی حکومت پر مامور کیا۔ تین سال کے بعد ۷۷۸ھ میں دریا خاں لودی المخاطب بہ ظفر خاں ثانی حاکم گجرات کو تہوبہ کی حکومت پر اس لیے تبدیل کیا گیا کہ یہاں کے سرکشوں اور باغیوں کو کوئی دوسرا سردار قابو میں نہیں لا سکا تھا۔ خان جہاں ثانی ایک ہندوزادہ فیروز تغلق کا وزیر اعظم تھا اُس نے خاندان شاہی کے خلاف ایک سازش میں شریک ہو کر ظفر خاں ثانی کو جو خاندان شاہی اور سلطان کے بیٹے ناصرالدین محمد شاہ تغلق کا طرفدار تھا دھوکے سے ۷۸۹ھ میں قتل کرا دیا۔ یہی قتل خاندان تغلق کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ظفر خاں ثانی نے چار بیٹے چھوڑے تھے جنکے نام لھو خاں، سارنگ خاں، عادل خاں، محمود خاں تھے۔ جب تیمور نے ۸۰۰ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا تو سارنگ خاں نے تیمور کے پوتے پیر محمد کا ملتان میں مقابلہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد بڑی بہادری سے لڑ کر مارا گیا۔ لاہور میں عادل خاں نے اپنی مٹھی بھر جمعیت سے تیمور کی ۹۲ ہزار جرار فوج کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ کامیاب نہ ہو سکا مگر دوست و دشمن دونوں سے اپنی شجاعت و بہادری کا اقرار کرالیا۔ تیمور جب دہلی پہونچا تو بڑے بھائی لھو خاں لودی المخاطب بہ اقبال خاں نے چالیس ہزار کی بھیڑ بھاڑ لیکر جسمیں تجربہ کار جنگجو کم اور دہلی کے نا تجربہ کار شہری لوگ زیادہ تھے تیمور کی ایک لاکھ بائیس ہزار فوج کا

مقابلہ کیا (چونکہ پیر محمد کی فوج بھی جنگ لاہور کے بعد شامل ہوگئی تھی اس لیے اب تیموری لشکر کی تعداد ایک لاکھ بائیس ہزار تھی) غرض ہندوستان میں تیمور کو ظفر خاں کو دی ہی کی اولاد سے بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ تیمور کے بعد ملھو خاں لودی المخاطب بہ اقبال خاں نے دہلی میں آکر پھر سلطنت اسلامیہ قائم کی اور خضر خاں سندعالی کو جو سارنگ خاں کا رگید اہوا میوات کے جنگلوں میں چھپا چھپا پھر رہا تھا اور تیمور کے آنے پر اسکی خدمت میں پہونچ کر ہندوستان کی سند حکومت تیمور سے حاصل کر چکا تھا دہلی پر قابض نہ ہونے دیا۔ آخر سات آٹھ سال کی فرماں روائی اور خود مختارانہ حکومت کے بعد ۱۹ جمادی الاول ۸۱۰ھ کو خضر خاں اور گجرات کی متحدہ فوجوں سے ملتان کے قریب لڑتا ہوا اپنے ایک ہمقوم ملک شاہ لودی ابن بہرام خاں لودی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ خضر خاں نے ملک شاہ لودی کو اس برادر کشی کے صلہ میں اسلام خاں کا خطاب دیا۔ ملتان میں خضر خاں کی حکومت مستقل ہوگئی لیکن دہلی پر پھر بھی قابض نہ ہوسکا۔ دہلی میں اقبال خاں لودی کے بھتیجے دولت خاں ابن محمود خاں لودی نے سلطنت کو سنبھالا اور آٹھ نو سال تک ایک طرف خضر خاں حاکم ملتان دوسری طرف ابراہیم شاہ شرقی بادشاہ جونپور کا کامیاب مقابلہ کرتا اور دہلی کو دونوں کی بار بار کی یورشوں سے بچاتا اور دشمنوں کو شکست دے دے کر بھگاتا رہا۔ ۸۱۵ھ میں سلطان ناصر الدین محمود جو شاہ شطرنج سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا فوت ہوا تو دہلی کے تمام امراء و شرفاء و علماء نے متفقہ طور پر دولت خاں لودی کو تخت سلطنت پر جلوس کرنے اور بادشاہ بننے پر مجبور کیا۔ اس طرح ۸۱۷ھ تک دولتخاں لودی سلطان دہلی رہا۔ اسکو مورخین دولت خاں اول کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آخر خضر خاں دہلی پر قابض ہونے اور دولت خاں اول کو قتل کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ خضر خاں اور اسکی اولاد کے عہد حکومت میں ملک شاہ لودی المخاطب بہ اسلام خاں نے خوب ترقی کی۔ اسی اسلام خاں لودی کا بھتیجا جلول خاں لودی ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ جسکے پوتے ابراہیم خاں لودی کے عہد حکومت میں دولت خاں اول کا پوتا یا پڑپوتا دولت خاں دوم پنجاب کا صوبہ دار تھا جس نے بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ یہ دولت خاں دوم سلطان سکندر لودی کے زمانے میں پنجاب کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ اُسکے یکمجدی رشتہ دار ملک احمد لودی کے چاروں بیٹے دولت خاں، نصرت خاں، پہاڑ خاں، موسیٰ خاں، لاہور آئے اور دولتخاں دوم نے انکو مناسب جاگیریں عطا کرکے نصرت خاں ابن ملک احمد لودی کے ساتھ اپنی بیٹی

کی شادی کر دی۔

خان جہاں لودی کا خاندان

نصرت خاں کے بھائی دولت خاں کو ایک دن دولت خاں دوم صوبہ دار پنجاب کی مجلس میں کسی شخص نے دولت خاں کہکر پکارا تو دولت خاں صوبہ دار اور دولت خاں ابن ملک احمد دونوں اس طرف متوجہ ہوے اس پر دولت خاں صوبہ دار نے کہا کہ برادرم دولت خاں یا تو میں اپنا نام تبدیل کروں یا تم اپنا نام تبدیل کرو اس نے جواباً عرض کیا کہ آپ کو اپنا نام مبارک ہو میرا دوسرا نام تجویز فرما دیجیے۔ چنانچہ دولت خاں دوم صوبہ دار پنجاب نے دولت خاں کا نام شیر خاں تجویز کیا۔ اور پھر وہ شیر خاں ہی کے نام سے موسوم رہا۔ جب دولت خاں لودی حاکم پنجاب اور ابراہیم لودی سلطان ہندوستان دونوں کی عمر دولت ختم ہوگئی تو شیر خاں، نصرت خاں اور بہاڑ خاں تینوں بھائی پنجاب سے سفر کر کے صوبہ بہار میں پہنچے جہاں پٹھانوں کی سلطنت و حکومت ابھی باقی تھی۔ پٹنہ میں محمود خاں ابن سلطان سکندر لودی برادر سلطان ابراہیم لودی کو امرائے افاغنہ نے بادشاہ بنایا تو دولت خاں المعروف بہ شیر خاں بھی اس جدید سلطان کی فوج میں بھرتی ہوا۔ فرید خاں الملقب بہ شیر خاں بھی جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ ہوا سلطان محمود خاں لودی کے ساتھ جونپور کی طرف گیا تھا۔ اسی سفر میں ہر دو شیر خاں ایک دوسرے سے واقف اور ہمنامی کے سبب ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ جون پور کی جنگ میں سلطان محمود خاں لودی کو شکست ہوئی دولت خاں المعروف بہ شیر خاں زخمی ہو کر پٹنہ واپس آیا اور سپہ گری سے دستکش ہو کر تجارت میں مشغول ہوا۔ جب شیر شاہ نے ہمایوں کو پہلی مرتبہ بکسر کے قریب شکست دیکر بھگا دیا اور شیر خاں سے شیر شاہ بن گیا تو شیر خاں (دولت خاں) اپنے تجارت کے کاروبار کو چھوڑ کر شیر شاہ کی خدمت میں آیا۔ شیر شاہ نے پرانی دوستی و شناسائی کو مدنظر رکھ کر مروت و عزت کا سلوک اور زمرۂ امرا میں شامل کیا۔ اسکے بعد مالوہ کے زمینداروں اور رئیسوں نے شیر شاہ کے پاس درخواستیں بھیجیں کہ ہم آپ کے فرماں بردار و مطیع ہیں کسی سردار کو اس طرف بھیج دیجیے کہ ہم سب اُسکے ساتھ ہو کر ہمایوں کے کارندوں کو اس ملک سے خارج کر دیں۔ شیر شاہ نے اپنے بڑے بیٹے قطب خاں کو مالوہ کی طرف روانہ کیا، اور شیر خاں کو بطور اتالیق قطب خاں کے ہمراہ بھیجا۔ چونکہ امرائے مالوہ نے خود درخواست بھیجی تھی اور ہر قسم کی جانفشانی کا اقرار کیا تھا لہذا قطب خاں کے ساتھ کوئی بڑی فوج نہیں بھیجی گئی۔ خیال تھا کہ مالوہ کی تمام فوجیں قطب خاں

کے زیر علم فراہم ہو جائیں گی۔ قطب خاں اور شیر خاں جب مالوہ میں پہونچے تو ہمایوں نے آگرہ سے اپنے بھائی مرزا عسکری و مرزا ہندال کو اُس طرف روانہ کیا۔ امرائے مالوہ از راہ بد عہدی قطب خاں کو تنہا چھوڑ کر مرزاؤں کے شریک ہو گئے۔ قطب خاں سے جب اُسکے ہمراہیوں نے کہا کہ یہاں سے بھاگ چلو تو اُس نے جواب دیا کہ میرے سوا شیر شاہ کے اور بھی بیٹے موجود ہیں میرے مارے جانے سے کوئی ہرج و نقصان واقع نہ ہوگا لیکن مرزاؤں کے مقابلے سے سیر افزار ہو جانا ہمارے خاندان کی عزت کو نقصان پہونچائیگا۔ یہ کہکر وہ اپنے مٹھی بھر ہمراہیوں کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گیا۔ اور بڑی بہادری کے ساتھ مارا گیا۔ قطب خاں کے مارے جانے پر شیر خاں سے ہمراہیوں نے کہا کہ اب کیا باقی رہا ہے اپنی جان میدان سے سلامت نکال لیجاؤ۔ شیر خاں نے کہا میں اپنی سفید داڑھی شیر شاہ کو کیسے دکھا سکتا ہوں۔ یہ کہکر حملہ آور ہوا اور بہت سے دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر خود بھی قطب خاں کے پاس پہونچ گیا۔ شیر شاہ نے قطب خاں اور شیر خاں کے مارے جانے کا حال سنکر پٹنہ سے شیر خاں کے چاروں بیٹوں کو بلایا جنکے نام محمود خاں، عمر خاں، قاسم خاں اور کمال خاں تھے۔ ان چاروں کو بڑی بڑی جاگیریں اور طوغ و علم و نقارہ عطا کر کے معزز و سرلبند کیا۔ عمر خاں کو اپنے پاس رکھکر باقی تینوں کو اُن کی جاگیروں کی طرف رخصت کر دیا۔ برہان پور کے فاروقی فرمانروا کا سپہ سالار عالم خاں لودی جب شیر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو شیر شاہ نے عالم خاں کی بیٹی سے عمر خاں ابن شیر خاں کی شادی کر دی۔ پھر چند روز کے بعد عمر خاں کو بھی جاگیر کی طرف رخصت کیا۔ ان چاروں بھائیوں کی نسبت کئی مرتبہ لوگوں نے شیر شاہ کی خدمت میں شکایتیں پہونچائیں۔ شیر شاہ نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ ابھی تک شیر خاں کا خون مالوہ کی زمین پر خشک نہیں ہوا ہے میں اُسکے بیٹوں کو ہرگز آزردہ نہ کروں گا۔ شیر شاہ کے بعد سلیم شاہ نے عمر خاں اور محمود خاں کو اٹاوہ اور قنوج و گوالیار و بیانہ و سنبھل وغیرہ کی طرف حکومت و انتظام ملکی پر مامور رکھا۔ ۹۵۶ھ میں عالم خاں لودی کی بیٹی کے پیٹ سے عمر خاں کا بیٹا دولت خاں قلعہ گوالیار میں پیدا ہوا۔ سلیم شاہ کی وفات کے بعد جب عدلی تخت نشین ہوا تو وہ عمر خاں اور اُسکے بھائیوں سے ناخوش رہا۔ آخر اُس نے محمود خاں، قاسم خاں اور کمال خاں تینوں بھائیوں کو اُنکی جاگیروں سے بیدخل کر کے چنار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ یہ سنتے ہی عمر خاں فرار ہو کر مالوہ کے کسی غیر معروف مقام میں چلا گیا۔ عدلی جب چنار سے ہیمو بقال کو فوج دیکر آگرہ و دہلی کی جانب روانہ کیا، تو محمود خاں، قاسم خاں،

کمال خاں، تینوں بھائیوں کو قید خانہ سے نکال کر خلعتِ فاخرہ عطا کیے اور ہر قسم کے انعام و اکرام کا متوقع کر کے ہیمو کے ساتھ روانہ کیا۔ پانی پت کے معرکہ میں محمود خاں و قاسم خاں دونوں بھائی مغلیہ فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔ عمر خاں بھائیوں کے مارے جانے اور پٹھانوں کے قبضے سے سلطنت کے نکل جانے کی خبر سنکر مع اہل و عیال گجرات کی طرف روانہ ہوا اور ۹۶۳ھ میں احمد آباد پہونچکر گجرات کے مشہور سردار شیر خاں فولادی کا نوکر ہو گیا۔ عمر خاں کا بیٹا دولتخاں جب جوان ہوا تو وہ گجرات کے ایک دوسرے امیر حاجی خاں کا نوکر ہوا اور موضع اٹاوہ متصل احمد آباد دولت خاں کی تنخواہ میں بطور جاگیر مقرر ہوا۔ ۹۸۲ھ میں جب اکبر کی فوجوں نے گجرات پر حملہ کیا تو میدان جنگ میں شیر خاں فولادی کے بیٹے محمد خاں کے ہمراہ عمر خاں بھی مارا گیا اُسوقت دولت خاں کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔

مسند عالی دولت خاں سوم

جب گجرات پر مغلوں کا قبضہ ہوا تو دولت خاں احمد آباد سے سورت چلا گیا۔ سورت کے راجہ نے دولت خاں کے ساتھ عزت و تکریم کا برتاؤ کیا اور اُسکو اپنے زمرۂ مصاحبین میں داخل کر لیا۔ شاہ ابوتراب محاسب گجرات نے ۹۸۳ھ میں دولت خاں کو سورت سے بُلوا کر خان اعظم مرزا عزیز کوکہ صوبہ دار گجرات کی خدمت میں پیش کیا۔ مرزا عزیز کوکہ نے دولت خاں کو اپنی مصاحبت میں داخل کر کے پرگنہ جھالاوار جاگیر میں عطا کیا۔ جب گجرات سے مرزا عزیز کو آگرہ طلب کیا گیا تو مرزا کے ساتھ دولت خاں بھی ہمسفر ہوا۔ راستہ میں بمقام سروہی کے قریب راجپوتوں کی ایک زبردست جماعت نے مرزا عزیز کے قافلہ پر اچانک حملہ کیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور بظاہر بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ دولت خاں نے اُسوقت بڑا کام کیا اور تنہا راجپوتوں کے سپہ سالار سے جا بھڑا۔ اگرچہ خود بھی زخمی ہوا مگر راجپوتوں کے اس سردار کو قتل کر دیا۔ سردار کے قتل ہوتے ہی راجپوت بھاگ گئے۔ اور مرزا عزیز نے خدا یتعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اُسی وقت دولت خاں کو دو ہزار روپیہ اور ایک گھوڑا انعام دیا۔ دار السلطنت پہونچکر دولت خاں کے اس کارنامہ کا حال پادشاہ کو سنایا۔ اکبر نے دولت خاں کو اپنے سامنے بُلوایا تو اُسوقت تک اُسکے چہرہ کا زخم پورے طور پر مندمل نہ ہوا تھا۔ پادشاہ نے خوش ہو کر اپنے کاندھے سے طوسی دوشالہ اُتار کر دولت خان کو دیا۔ چند روز کے بعد مرزا عزیز کوکہ سے پادشاہ سے ناراض ہو کر امارت ترک کی اور گوشہ نشیں ہو گیا۔ دولت خاں نے اس حالت میں بھی مرزا عزیز کی رفاقت ترک نہیں کی۔ مرزا عزیز نے عبدالرحیم

ابن بیرم خاں المخاطب بہ مرزا خاں کو جو ابھی تک خان خاناں نہیں ہوا تھا اپنے پاس بلوایا۔ دوستخاں کا ہاتھ پکڑ کر مرزا خاں کے سپرد کیا اور کہا کہ "یہ ایک امانت ہے جو تم کو سپرد کرتا ہوں اسکے حال سے کبھی غافل نہ ہونا اور ہمیشہ اسکے ساتھ بھائیوں کی طرح سلوک کرنا" مرزا خاں نے بیحد خوشی کا اظہار کیا اور دولت خاں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ بھائیوں سے بڑھ کر عزیز رکھا اور کبھی اُسکو ناراض ہونے کا موقع نہ دیا۔ ۹۸۴ھ میں دولت خاں کا تعلق مرزا عبدالرحیم کے ساتھ قائم ہوا۔ ۹۸۵ھ میں اکبر نے شہباز خاں کمبوہ اور مرزا خاں کو اودیپور میواڑ پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا۔ رانا پرتاب بانسواڑہ کے پہاڑوں میں بھاگ گیا اور کونبلمیر و اودیپور پر شاہی فوج کا قبضہ ہوا۔ اس معرکہ میں سب سے زیادہ دولت خاں نے خدمات شایستہ انجام دیں۔ پھر ۹۸۹ھ میں اکبر نے مرزا عبدالرحیم کو مظفر گجراتی کے خلاف گجرات پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس معرکہ میں دولت خاں ہی نے مرزا عبدالرحیم کو سنبھالا اور وہ رستمانہ حملے کیے کہ تمام دشواریاں آسانی سے تبدیل ہوگئیں۔ اسی فتح گجرات کے صلے میں مرزا عبدالرحیم کو خان خاناں کا خطاب اور پنجہزاری منصب ملا۔ اسکے بعد سندھ کی تسخیر میں دولت خاں سے وہ بہادری وصف تمکنی ظہور میں آئی کہ بادشاہ نے خوش ہوکر دوہزاری منصب عطا کیا اور سندھ کے فتحنامے دولت خاں کے نام پر لکھے گئے۔ شہزادہ مراد دکن کی فتح پر مامور ہوا تو خان خاناں کو شہزادہ کا اتالیق بنا کر بھیجا گیا۔ دولت خاں خانخاناں کے ہمراہ تھا اور خانخاناں کوئی کام دولت خاں کے مشورہ بغیر نہیں کرتا تھا۔ مراد کے مرنے پر اُسکے بھائی شہزادہ دانیال کو بادشاہ نے دکن کا ناظم مقرر کیا۔ اور خانخاناں و دولت خاں اس شہزادے کی اتالیقی پر بھی مامور ہوے۔ شہزادہ دانیال خانخاں کا داماد بھی تھا۔ شہزادہ نے یہ دیکھکر کہ دولتخاں سے بڑھکر بہادر اور صائب الرائے دوسرا تلاش نہیں کیا جا سکتا خانخاناں سے فرمایش کی کہ دولتخاں کو میری سرکار سے متعلق کر دو۔ خانخاناں نے اول عذر کیا لیکن جب شہزادہ نے اپنی بیوی یعنے خانخاناں کی بیٹی سے بہت زور ڈلوایا اور خود بھی مسلسل اصرار کرتا رہا تو خانخاناں نے مجبور ہوکر کہا کہ یہ معاملہ دولت خاں کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں۔ دولت خاں سے کہا گیا تو اُس نے کہا کہ خانخاناں کو اختیار رہے کہ وہ مجھ کو اپنے پاس سے جدا کردے لیکن میں خود اُس سے جدا ہونے کی خواہش کبھی نہ کروں گا۔ آخر بڑی ردوکد کے بعد ۱۰۰۹ھ صفر میں دولت خاں شہزادہ کے متوسلین میں شامل ہوا۔ شہزادہ دانیال نے دولت خاں کو حاصل کرکے ایسی خوشی کا اظہار کیا جیسے کسی بڑی عظیم الشان سلطنت پر قبضہ پایا۔ شہزادہ نے دولت خاں کو سند عالی

کا خطاب دیکر اپنے تمام کاموں کا مدار المہام اور مختار کل بنا دیا۔ اس کے بعد اکبر خود برہان پور گیا اور شہزادہ دانیال کو احمد نگر سے برہان پور طلب کیا تو وہ دولت خاں کو احمد نگر چھوڑ کر خود باپ کی خدمت میں برہان پور حاضر ہوا۔ ۲۸ شعبان ۱۰۱۱ھ کو مسند عالی دولت خاں کا احمد نگر میں انتقال ہوا۔ باون سال کی عمر پائی۔ جنازہ برہان پور میں لاکر دفن کیا گیا۔ یہی مسند عالی دولتخاں ابن عمر خاں ہے جسکو مورخین "دولت خاں سوم" کہتے ہیں۔ اگر دولت خاں سوم کے دادا کا نام دولت خاں کی بجائے شیر خاں مشہور نہ ہوا ہوتا تو اسکو دولت خاں سوم اور اسکو دولت خاں چہارم کہا جاتا۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کہا کرتا تھا کہ "ہر شخص میں خواہ کتنی ہی خوبیاں ہوں مگر کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے لیکن دولت خاں ایسا شخص ہے کہ مجھ کو سوائے خوبیوں کے کوئی عیب اس میں نظر نہ آیا۔ ہاں اگر کوئی عیب دولت خاں سے منسوب ہی کرنا پڑے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہمت رکھتا ہے سو یہ ایسا عیب ہے کہ اسپر ہزار خوبیاں قربان کی جا سکتی ہیں"۔ مسند عالی دولت خاں نے دو جوان بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ ایک کا نام محمد خاں اور دوسرے کا نام پیر خاں تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے بھی محاربات دکن میں باپ کے ساتھ بڑی بڑی جانبازیاں دکھائی تھیں اور فنون سپہگری کے علاوہ علم و فضل سے بھی بے بہرہ نہ تھے شہزادہ دانیال نے ان دونوں کو اپنی مصاحبت میں داخل کرکے ہر قسم کی رعایت و تربیت انکے حال پر مبذول رکھی۔ محمد خاں ابن دولت خاں ۱۰۱۱ھ میں ایک بیٹا خضر خاں نامی چھوڑ کر فوت ہوگیا۔ اب مسند عالی دولت خاں کا صرف ایک بیٹا پیر خاں باقی رہا۔ یہی پیر خاں ابن دولت خاں ہے جو بعد میں خانجہاں کے خطاب سے مخاطب ہو کر آج تک خان جہاں لودی کے نام سے مشہور اور اس نگارش کا موجب ہے۔

خان جہان لودی ۱۰۱۱ھ میں پیر خاں ابن دولت خاں لودی شہزادہ دانیال کی مصاحبت میں داخل ہوا پیر خاں کی قابلیت و لیاقت نے بہت جلد شہزادہ کو اپنا گرویدہ کرلیا۔ اور اس نے بیٹے کو باپ کا نعم البدل پاکر اس کے اختیار و اقتدار میں اضافہ کرکے دولت خاں کی ذمہ داریاں اسکے سپرد کردیں۔ یکم دیسمبر ۱۰۱۳ھ کو شہزادہ دانیال کا دکن میں انتقال ہوا۔ اسکے ساڑھے چھ مہینے بعد ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ کو اکبر بھی فوت ہوگیا۔ شہزادہ سلیم نے جو اکبر کے بعد جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا ۱۰۱۳ھ میں جبکہ شہزادہ دانیال زندہ تھا دو مرتبہ پیر خاں کے پاس پیغام بھیجے کہ تم ہمارے پاس چلے آؤ۔

غالباً جہانگیر پیر خاں کو اس لیے اپنے پاس بلانا اور شہزادۂ دانیال سے جدا کرنا چاہتا ہوگا کہ شہزادۂ دانیال ہی تخت سلطنت کے لیے جہانگیر کا رقیب اور مقابل بن سکتا تھا۔ پیر خاں کی بہادری اور قابلیت کی شہرت جہانگیر تک پہونچ چکی تھی۔ اُس نے ہر قسم کے لالچ دیئے مگر پیر خاں نے شہزادۂ دانیال سے جدا ہونا پسند نہ کیا۔ جب اکبر کا انتقال ہوا تو خانخاناں اور پیر خاں دونوں برہان پور میں موجود اور معاملات دکن کے سلجھانے میں مصروف تھے۔ مرزا عزیز اور مان سنگھ دونوں جہانگیر کی تخت نشینی کے مخالف اور جہانگیر کے بیٹے خسرو کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ خسرو مان سنگھ کا بھانجا اور مرزا عزیز کا داماد تھا۔ اگر شہزادہ دانیال زندہ ہوتا تو خانخاناں دانیال کی تخت نشینی کے لیے جہانگیر کے خلاف ضرور کوشش کرتا اور پیر خاں کو بھی اس کوشش میں حصہ لینا پڑتا۔ لیکن خانخاناں اور پیر خاں کو دانیال کی وفات نے اس مصیبت سے پہلے ہی نجات دیدی تھی۔ جہانگیر کو بھی اب خانخاناں یا پیر خاں سے کوئی اندیشہ نہ رہا تھا لہذا اُس نے تخت نشیں ہوتے ہی خانخاناں کے پاس مہمات دکن کے اہتمام کی سند اور خلعت بھیجکر پیر خاں کو اپنی خدمت میں طلب کیا۔ خانخاناں نے شاہی ایلچیوں کے ہمراہ عرضداشت بھیجی کہ پیر خاں کا اسوقت یہاں سے جدا ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ جہانگیر چونکہ عرصہ سے پیر خاں کو اپنے پاس بلا رہا تھا اس لیے خانخاناں کی درخواست پڑھکر آتش شوق اور بھی تیز ہوئی۔ دوبارہ تاکیدی حکم بھیجا گیا کہ بلا توقف پیر خاں کو ہمارے پاس بھیجدو۔ اس حکم کے پہونچنے پر پیر خاں برہان پور سے روانہ ہوا۔ اور لاہور میں جبکہ جہانگیر خسرو کو گرفتار کرکے مسمات بیگ وغیرہ کو سزا دے چکا تھا، جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہانگیر پیر خاں کے آنے سے بہت خوش ہوا۔ صلابت خاں کا خطاب اور دو ہزاری منصب عطا کیا۔ اسکے بعد جہانگیر کابل کی طرف روانہ ہوا اور پیر خاں لودی المخاطب بہ صلابت خاں کو ہمراہ لے گیا۔ اس سفر میں ہر روز جہانگیر کا التفات صلابت خاں کی نسبت بڑھتا گیا۔ کابل سے لاہور واپس آکر جہانگیر نے صلابت خاں کو پنجہزاری منصب اور خانجہاں کا خطاب عطا کرکے اپنی فرزندی سے بھی مشرف کیا۔ چنانچہ بادشاہ نے خود تصنیف فرماکر اپنے قلم سے ایک کاغذ پر یہ سجع لکھا ؎

"فرزند خاص شاہ شد از قبل [illegible]

خانِ جہان مرید جہانگیر بادشاہ"

پھر ملا احمد مہرکن کو طلب فرماکر حکم دیا کہ اس سجع کو انگوٹھی پر کھدوا کے لاؤ۔ ملا احمد انگوٹھی

تیار کر کے لایا تو پادشاہ نے اپنے ہاتھ سے وہ انگوٹھی جس پر سجع مذکور کندہ تھا خان جہاں کو عطا کی خان جہاں کے حال پر اس قدر شفقت و عنایت مبذول دیکھ کے بعض حاسدوں نے پادشاہ سے تنہائی میں موقع پا کر عرض کیا کہ ایک افغان کو ایسا بلند مرتبہ عطا کرنا اور فرزندی کے مقام رفیع تک پہونچانا احتیاط و عقل کے خلاف ہے۔ جہانگیر پر اسکا اثر اُلٹا ہوا۔ اُس نے اگلے روز دربار میں خان جہاں کو خلعتِ خاص، اسپ خاص، تسبیح جواہر، کمر و خنجر مرصع، شمشیر مرصع عطا کر کے تمام امیروں اور وزیروں سے اونچے مرتبے پر بٹھایا۔

دارالسلطنت آگرہ میں پہونچکر جہانگیر نے خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ تمام امرا نے پادشاہ کے اس ارادہ کی تائید و توثیق و تصویب کی۔ خانجہاں اس مجلس میں شریک نہ تھا اور شاید دانستہ شریک نہیں کیا گیا تھا۔ پادشاہ کے اس ارادے کا حال سُن کر خود پادشاہ کی خدمت میں پہونچا اور نہایت آزادی کے ساتھ عرض کیا کہ "خان اعظم کی ماں جیجی نے آپ کے باپ کو دودھ پلایا ہے۔ خان اعظم کے باپ شمس الدین محمد خاں اتکہ نے اُسوقت جبکہ سلطنت خطرے میں تھی بیرم خاں کو شکست فاش دے کر سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کیا۔ اسی کارنامے نے اُسکے حاسدوں کو اُسکی جان لینے پر آمادہ کیا اور وہ آپ کے باپ پر قربان ہوگیا۔ مرزا عزیز کوکہ کے کارنامے اور پادشاہ اکبر کا اُسکی ناز برداریاں کرنا کسی سے پوشیدہ نہیں۔ مرزا عزیز آپ کا چچا اور آپ کے لیے عزت و عظمت کا مقام ہے۔ اُسکی کسی اضطراری غلطی پر سخت گیری یا سنگدلی کا برتاؤ کرنا ہرگز آپ کے شایانِ شان نہیں"۔ پادشاہ پر خانجہاں کی گفتگو کا بڑا اثر ہوا اور اُسی وقت مرزا عزیز المخاطب بہ خانِ اعظم کی تمام لغزشوں کو معاف فرما کر ہفت ہزاری منصب اور خلعت و اسپ عطا کیا۔

عبدالرحیم خانخاناں اگرچہ جہانگیر کی تخت نشینی کے وقت جہانگیر کا مخالف و مزاحم نہ تھا، اور نہ وہ دارالسلطنت آگرہ میں اُسوقت موجود تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں پہلے تک وہ جہانگیر کی تخت نشینی کے خلاف تھا لہذا کچھ دنوں بعد بہانگیر کے انتقامی جذبہ میں تحریک پیدا ہوئی اور اُس نے خانخاناں کا پنجہزاری منصب اور تمام سامان امارت اور جاگیر وغیرہ ضبط کر کے اُسکو نظر بند کرنا چاہا۔ امرائے دربار بھی خانخاناں کے مخالف و بدخواہ تھے اور اگر کسی کو اُسکے ساتھ ہمدردی بھی تھی تو اس قدر جرأت نہ تھی کہ خانخاناں کی نسبت کلمۂ خیر زبان تک لا سکے۔ اس نازک موقع پر جبکہ زمین و آسمان سب خانخاناں کے مخالف نظر آرہے تھے، خانجہاں لودی نے

اپنی شرافت و انسانیت کا اظہار اس طرح کیا کہ نہایت بیباکانہ و آزادانہ لہجہ میں سربار بادشاہ سے عرض کیا کہ "خانخاناں خاندان سلطنت کا قدیمی پروردہ و تربیت کردہ ہے اُسکو ذلیل و رسوا کرنا اور اذیت پہونچانا ہرگز شان شاہانہ کے شایاں نہیں"۔ پھر یہ شعر پڑھا کہ ؎

"چوب را آب فرومی نبرد از پئے آنکہ
شرم دارد ز فرو بردن پروردۂ خویش"

خانجہاں کے کلام نے تازیانہ کا کام کیا اور جہانگیر کے دل میں عفو و درگزر کی صفت حسنہ نے فوراً واپس آکر خانخاناں کے منصب و جاگیر کو بدستور بحال رکھا اور دہ دکن کی نظامت پر مامور ہوا۔

اسکے بعد جہانگیر دوبارہ خانخاناں سے ناراض ہوا اس لیے کہ اُسنے عنبر حبشی کے ساتھ دوستی پیدا کرلی جالنہ وغیرہ چند پرگنے بخوشی عنبر کو دیدیے تھے۔ خانخاناں آگرے میں طلب ہوا۔ اور قریب تھا کہ اُسکو عبرتناک سزا دی جائے اس مرتبہ بھی خانجہاں نے ہی اپنی جان پر کھیل کر خانخاناں کی سفارش کی۔ اور ایسے لطیف و عاقلانہ انداز سے بادشاہ کو سمجھایا کہ اُسکا تمام غیظ و غضب فرو ہوگیا۔ اور خانجہاں سے خانخاناں کی ضمانت لیکر اُسے پھر دکن کی نظامت پر بھیجدیا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ خانجہاں لودی کے باپ دولت خاں سوم کا مرزا عزیز اور مرزا عبدالرحیم سے کس قسم کا تعلق تھا۔ خانجہاں نے اپنے باپ کے ان دونوں قدرداؤں اور محسنوں کے حقوق کو بخوبی ادا کیا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ جہانگیر نے جب راجہ مان سنگھ کے استیصال کا ارادہ کیا تو کسی کو بھی وہم و گمان نہ تھا کہ مان سنگھ کی سفارش کے لیے کوئی شخص اپنی زبان کھول سکے گا۔ مان سنگھ ہی وہ شخص تھا جس نے جہانگیر کو محروم رکھکر خسرو کو اکبر کے بعد تخت نشین کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی تھیں۔ اُسی نے خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو بہکا کر اپنا ہمخیال اور شریک کار بنایا تھا۔ جہانگیر کے دل میں مانسنگھ کی جانب سے سخت نفرت تھی اور وہ راجپوتوں سے بہت بدگمان ہوگیا تھا۔ دربار جہانگیری میں کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو مانسنگھ کی نسبت کلمۂ خیر کہہ سکے۔ لیکن اس موقع پر بھی خانجہاں لودی ہی آگے بڑھا۔ اور اُس نے مان سنگھ کے اُن تمام کارناموں اور جاں فروشیوں کی داستان سنائی جو اکبر کے عہد حکومت میں اُس سے ظہور میں آئی تھیں۔ ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی توجہ

دلائی کہ پادشاہ کے لیے اور سلطنت کے استحکام و رونق کے لیے بھی عفو کا نتیجہ انتقام سے بہتر ثابت ہوگا۔ چنانچہ جہانگیر نے مان سنگھ کے قتل کا ارادہ ترک کرکے اُسکو دکن کی جانب ایک مناسب جاگیر دے کر رخصت کر دیا اور وہ وہیں فوت ہوا۔ گویا خان جہاں لودی نے ہر شاہی معتوب کی سفارش کرنے اور ہر معزز شخص کی عزت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اگر خانجہاں لودی نہ ہوتا تو جہانگیر مذکورہ ہر سہ امیروں (خان اعظم مرزا عزیز کوکہ، عبدالرحیم خانخاناں، راجہ مانسنگھ) کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرکے ہندوستان کے نہایت بدنام پادشاہوں میں شامل ہو چکا ہوتا خان جہاں لودی کے ان کارناموں اور اُسکے اُس اثر و اقتدار کو جو دربار جہانگیری میں اُس کو حاصل تھا عہد شاہجہانی کا کوئی مورخ اس لیے مفصل بیان نہیں کر سکا کہ شاہجہاں کے زمانہ میں خانجہاں لودی کو دشمنِ سلطنت اور باغی و طاغی قرار دیا جا چکا تھا جیسا کہ آگے یہ دلخراش داستان بیان ہونے والی ہے۔ مذکورہ حالات زیادہ تر عہد جہانگیر کی تصنیف شدہ مخزن افغانی مصنفۂ حبیب اللہ ہروی سے ماخوذ ہیں۔ دکن کی سلطنت نظام شاہی اور سلطنت دہلی کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے تھے۔ جہانگیر نے شہزادۂ پرویز کو دکن کی جانب روانہ کیا لیکن شہزادہ کو رخصت کرنے کے بعد کسی زبردست سپہ سالار اور صاحب تدبیر شخص کا اُس طرف بھیجنا ضروری محسوس ہوا۔ امرائے دربار خان جہاں لودی کے اثر و اقتدار کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے اور اُسکو پادشاہ سے جدا رکھنا چاہتے تھے سب نے یکزباں ہو کر مشورہ دیا کہ خان جہاں سے بہتر کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دکن کی مہمات کو بحسن و خوبی انجام دے سکے۔ یہ مشورہ غلط اور حقیقت کے بھی خلاف نہ تھا اور خان جہاں کے مانند کوئی دوسرا شخص دار السلطنت میں موجود نہ تھا۔ جہانگیر نے بادلِ ناخواستہ خان جہاں کو اپنے پاس سے جدا کرنا گوارا کیا اور خانجہاں شروع ۱۰۱۹ھ میں شہزادۂ پرویز کے پاس برہان پور پہونچکر مہمات دکن میں شریک ہوا۔ ۴ رماہ صفر ۱۰۱۹ھ کو ملکاپور کے میدان جنگ میں خانجہاں اور اُس کے بھتیجے خضر خاں نے دکنی لشکر کے مقابلہ میں رستم و اسفندیار کے کارناموں کو تازہ کرکے دکھایا اور دکن میں سلطنت دہلی کی دھاک بٹھا دی۔ عبدالرحیم خانخاناں بطور اتالیق شہزادہ کے ہمراہ تھا لیکن ابھی تک کسی سے کچھ نہ ہو سکا تھا۔ خانجہاں کے پہونچتے ہی مہمات دکن کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ نظام الملکی لشکر کو جب خان جہاں کے مقابلے میں پے در پے چند شکستیں ہوئیں تو عنبر حبشی کی جانب سے صلح کی درخواست آئی۔ خان جہاں لودی اور شہزادہ پرویز اگرچہ صلح پر رضامند نہ تھے لیکن خانخاناں اور دوسرے امرائے لشکر صلح پر آمادہ ہو گئے اور عنبر حبشی نے

بالا گھاٹ اور جالنہ وغیرہ کئی پرگنے دیکر اور دیگر صلح کرلی۔ اس صلح کے بعد شہزادہ مع خانخاناں وخان جہاں برہان پور آگیا جو اس زمانے میں ناظم دکن کا مستقر حکومت تھا۔ ۷ ماہ رجب ۱۰۱۹ھ کو مہابت خاں بادشاہ کا فرستادہ پہونچا اور خان خاناں کو شاہی حکم پہونچایا کہ فوراً اپنی تمام ذمہ داریوں کا چارج خانجہاں کو سپرد کرکے آگرہ پہونچو۔ چنانچہ عبدالرحیم خان خاناں شہزادہ کی اتالیقی اور دکن کی تمام ذمہ داریاں خان جہاں کو سپرد کرکے مہابت خاں کے ہمراہ آگرہ کی جانب روانہ ہوا۔ خان جہاں پونے دو سال تک شہزادہ کا اتالیق اور صوبجات دکن وبرار کا ناظم وفرماں روا رہا۔

۲۔ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ کو ارادت خاں المخاطب بہ خان اعظم شاہزادہ کی اتالیقی پر مامور ہوکر برہانپور آیا اور خان جہاں بدستور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ پر قائم رہا۔ ۱۹ شعبان ۱۰۲۱ھ کو برہان پور سے خان اعظم شہزادہ پرویز کو ہمراہ لیکر دولت آباد کی جانب روانہ ہوا۔ جہانگیر نے حکم دیا تھا کہ برسات کے گزرنے اور سہیل کے طلوع ہونے کے بعد برہانپور کا لشکر شمال و مشرق کی جانب سے اور عبداللہ خاں فندی حاکم گجرات مع علی مرداں خاں وخان عالم شمال و مغرب کی جانب سے دولت آباد پر حملہ آور ہوں۔ اسی قرارداد کے موافق خان اعظم برہانپور سے روانہ ہوا۔ لیکن احمد نگر کی نظام شاہی فوجوں نے صوبہ خاندیس پر حملہ آوری شروع کردی تھی لہذا صوبۂ خاندیس کی حفاظت کے لیے خانجہاں مقرر ہوا۔ خان جہاں نے موضع روہکھیڑہ کے قریب نظام شاہی فوجوں کو شکست فاش دیکر دکنی لشکر کی کمر توڑدی اور صرف بیس روز کے عرصہ میں خاندیس اور سرحدات خاندیس سے حملہ آوروں کو بھگا کر اس طرف کے خطرہ کا قابل اطمینان سدباب کردیا۔ اور یہاں سے روانہ ہوکر شہزادہ سے جو آہستگی دولت آباد کی طرف بڑھ رہا تھا جا ملا۔ وہاں جاتے ہی یہ خبر سنی کہ حبشی عنبر حبشی نے یعقوب خاں حبشی اور آدم خاں کو بیس ہزار سواروں کے ساتھ بالا گھاٹ سے خاندیس پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا ہے۔ یہ سنتے ہی خان جہاں لودی بالا گھاٹ کی جانب اس ارادہ سے روانہ ہوا کہ مذکورہ نظام شاہی فوج کو شکست دیکر اس طرف سے دولت آباد کی جانب روانہ ہو جائے گا۔ اس یلغار میں راجہ مان سنگھ و سورت سنگھ بھی خانجہاں لودی کے ہمراہ تھے۔ بالا گھاٹ کے قریب پہونچکر دکنیوں کے لشکر کو شکست فاش دیکر خان جہاں دولت آباد کی جانب روانہ ہوا۔ دولت آباد پر حملہ کرنے کی تاریخ پہلے سے مقرر ہو چکی تھی کہ اسی روز عبداللہ خاں فندی اور خاں جہاں ہر دو جانب سے حملہ آور ہونگے۔ خان جہاں بالا گھاٹ سے تاخت ہوکر دولت آباد کی جانب ایسے وقت روانہ ہو چکا تھا کہ مقررہ تاریخ پر وہاں [illegible]

لیکن ایک قدرتی رکاوٹ یہ پیش آگئی کہ راستہ میں نہایت سخت بارش ہوئی اور دو تین دن لشکر کو مجبوراً مقام کرنا پڑا۔ بارش نے جب ذرا مہلت دی تو دولت آباد کی طرف کوچ ہوا۔ عبداللہ خاں فدوی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خان جہاں لودی ابھی دولت آباد کے قریب نہیں پہونچا اور دو تین روز کا تامل ضروری ہے۔ لیکن اس نے محض اس شوق میں کہ دولت آباد کی فتح تنہا میری کوشش سے حاصل ہو، خان جہاں کا انتظار نہ کیا اور بڑھا چلا آیا۔ دولت آباد سے بارہ کوس کے فاصلہ پر موضع بھنیا پور میں عنبر حبشی سے مقابلہ ہوا۔ عبداللہ خاں شکست کھا کر بھاگا۔ علی مرداں خاں اور مرزا برخوردار خاں المخاطب بہ خان عالم دونوں سردار زخمی ہو کر گرفتار ہو گئے۔ خانجہان لودی دولت آباد سے ۳۴ کوس کے فاصلہ پر پہونچا تھا کہ اسکو عبداللہ خاں کے شکست کھا کر فرار ہونے اور مذکورہ دونوں سرداروں کے زخمدار و گرفتار ہو جانے کا حال معلوم ہوا۔ اسی جگہ خان اعظم بھی مع فوج خانجہاں سے آملا۔ اور شہزادہ پیچھے لکھا پور میں مقیم رہا۔ لشکر گجرات یعنی عبداللہ خاں کی شکست اور علی مرداں خاں و خان عالم کی گرفتاری کا حال سنکر لشکر شاہی اور سرداران لشکر کے حوصلے پست ہو گئے۔ سب نے یہی مناسب سمجھا کہ برہان پور کی طرف واپس لوٹ چلیں کیونکہ دشمن کی فوج بہت زیادہ اور لشکر شاہی کے لیے سامان رسد کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ خان جہاں لودی نے واپسی سے قطعاً انکار کیا اور کہا کہ تم سب واپس چلے جاؤ میں تنہا اپنے ذاتی آدمیوں کے ساتھ دشمن پر حملہ کروں گا۔ اس اختلاف نے بہت طول کھینچا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ خان اعظم، مان سنگھ، نرسنگدیو بندیلہ، خواجہ ابوالحسن وغیرہ تمام سردار خانجہاں لودی کے خیمہ میں آئے اور سب نے مل کر منت سماجت کے ساتھ واپسی پر آمادہ کرنا چاہا مگر خانجہاں کسی طرح رضامند نہ ہوا۔ اسی اصرار و انکار میں تین دن گزر گئے۔ اور نظام شاہی فوج کے بعض دستے لشکر گاہ کے قریب پہونچکر شوخی دکھانے لگے جن کو شکست دے دے کر بھگا دیا تھا۔ اس قضیہ کو طے کرنے اور خان جہاں کو واپس لیجانے کے لیے مان سنگھ، خواجہ ابوالحسن اور دوسرے سرداروں نے یہ تدبیر سوچی کہ دستاویز تیار کی جائے اور چنانچہ اس مضمون کی دستاویز لکھی گئی کہ خانجہاں واپسی پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے ہم مفادِ سلطنت اور شاہی مقاصد کو مدنظر رکھ کر مصلحت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہاں سے واپس لوٹ چلیں اور دولت آباد کی طرف ہرگز قدم نہ بڑھائیں۔ ہم سب مجبور کرکے خانجہاں کو واپس لیے جاتے ہیں اگر ہماری اس واپسی کو پادشاہ نے ناپسند کیا تو ہم ہی شاہی عتاب کے مورد

ہوں گے خانجہاں پر اُسکا کوئی اثر نہ ہوگا - یہ تحریر بطور دستاویز خان جہاں کو سپرد کی جاتی ہے۔
جب سب کے دستخطوں سے مکمل ہوکر یہ تحریر خان جہاں کے روبرو پیش ہوئی تو وہ واپسی پر آمادہ
ہوا - لیکن ابھی کوچ نہ ہوا تھا کہ ملکاپور سے شاہزادہ کی تحریر پہونچی کہ احمدنگر کی نظام شاہی حکومت
نے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے ذریعہ سے صلح کی درخواست بھیجی ہے اور دربار بیجاپور سے
سفارت ہمارے پاس پہونچی ہے - عارضی طور پر جنگ ملتوی کرکے تمام سردار و امرا مع فوج
ملکاپور واپس آجائیں تاکہ صلح کے معاملے میں مشورہ کیا جاسکے - چنانچہ سب ملکاپور پہونچے اور
صلح نامہ مرتب ہوا - اسی قصبہ ملکاپور میں جبکہ صلحنامہ کی تحریر تکمیل ہو رہی تھی ۲۰ ماہ محرم ۱۰۲۰ھ
کو حبیب اللہ ہروی، خان جہاں لودی کے ملازم نے کتاب مخزن افغانی لکھنی شروع کی اور ۱۰ محرم
۱۰۲۱ھ کو برہان پور میں یہ کتاب ختم کی - صلحنامہ کی تحریر و تکمیل کے بعد شہزادہ پرویز ملکاپور سے روانہ
ہوکر آخر ماہ محرم ۱۰۲۱ھ کو مع امرا برہان پور پہونچ گیا - ماہ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ تک خان جہاں
لودی برہان پور میں شہزادہ پرویز کے ہمراہ رہا - ۲ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ کو شاہی حکم کے بموجب
خان جہاں لودی صوبۂ برار کا گورنر مقرر ہوکر برہان پور سے بیجاپور کی جانب روانہ ہوا - بادشاہ
جہانگیر نے صوبۂ برار کی گورنری کا فرمان اپنے قلم سے لکھ کر مع خلعت و شمشیر روانہ کیا تھا - اس زمانہ
میں صوبۂ برار سرحدی صوبہ تھا اور اس صوبہ کی حکومت پر سب سے زیادہ ذی ہوش و مستعد اور طاقتور
شخص کی ضرورت تھی - اسی سال بماہ شعبان شب جمعہ الیچپور میں خان جہاں کو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی - خان جہاں نے بیدار ہوکر اس خوشی میں اپنا تمام مال و
اسباب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کردیا - الیچپور میں خان جہاں ذیحجہ ۱۰۲۲ھ تک مقیم رہا -
اور اس سرحدی صوبے کا نہایت اچھا انتظام کیا - یہاں اُسکے پاس بہت سے علما و صلحا و صوفیا
جمع ہوگئے تھے - اس نے اپنے اوقات کا بڑا حصہ عالموں اور باخدا لوگوں کی صحبت میں گزارا -
الیچپور میں جہانگیر کا شفقہ جو بادشاہ نے اپنے قلم سے لکھا تھا خان جہاں کے پاس پہونچا جسکے الفاظ
یہ تھے :-

فرزند سعادت مند صاحب اقبال گوہر درج دولت و اجلال منظور انظار مربی با اقتدار
خان جہاں باستفاضہ انوار خاطر دانش آرائے منظور و ملحوظ بودہ خاطر اشرف اقدس
مارا نگران خود شناسد و چوں مہمات دکن عمدۃ الملک رکن السلطنت خانخاناں سپہ سالار
وابستہ بالفعل ہمے کہ باعث توقف آں فرزند با شد درمیان نیست باید کہ خود را متوجہ

درگاہ سازد و اگر دریں باب تعلل نماید بعد ازیں بطلب او چیزے نوشتہ نخواہد شد"
اس شاہی شقہ کے پہونچنے پر بھگو انداس وکیل سلطنت نے جو ایلچپور میں مقیم تھا خاں جہاں کو مشورہ دیا کہ شاہزادہ پرویز اور خانخاناں سے ضرور مشورہ لینا چاہیے - خاں جہاں نے برہان پور میں شاہزادہ کو اطلاع دی - شاہزادہ نے خان جہاں کو فوراً لکھا کہ تم ایلچپور کو ہرگز نہ چھوڑو میں بادشاہ کو تمہاری نسبت لکھتا ہوں کہ خان جہاں کا ایلچپور سے جدا ہونا فی الحال کسی طرح مناسب نہیں ہے - شاہزادہ کی تحریر کے دربار میں پہونچنے اور خاں جہاں کے نہ آنے پر خان جہاں کے حاسدوں کو باتیں بنانے اور جھوٹی شکایتیں کرنے کا خوب موقع ملا - اور بادشاہ کو یقین دلایا گیا کہ خانجہاں خود ہی دربار میں آنا نہیں چاہتا کیونکہ شاہان دکن سے اُس نے تعلقات دوستی قائم کر لیے ہیں - جہانگیر کے دل پر بدگویوں کی باتوں کا اس قدر اثر ضرور ہوا کہ اُس نے خان جہاں کو برار کی صوبہ داری سے گجرات کی حکومت پر تبدیل کر دیا اور تبدیلی کے فرمان میں لکھا کہ گجرات کا صوبہ برار کے صوبہ سے بہتر ہے اور وہاں کولی اور بھیل قوم کے متمردوں نے جو پہاڑوں میں مسکن گزیں ہیں سرکشی اور بے راہ روی اختیار کی ہے تم ہی وہاں پہونچ کر اُنکا علاج بخوبی کر سکو گے - چنانچہ خان جہاں ایلچپور سے روانہ ہو کر اول برہان پور شاہزادہ پرویز کی خدمت میں پہونچا - پھر وہاں سے گجرات کی طرف روانہ ہوا - شاہزادہ کو خان جہاں سے بہت محبت ہو گئی تھی اور وہ اُسکو اپنے پاس سے جدا کرنا نہ چاہتا تھا - خانجہاں نے گجرات پہونچ کر قلعہ تھالنیر میں قیام کیا اور چند روز میں وہ ملک ہر قسم کے فتنوں سے پاک ہو گیا - خان جہاں ڈیڑھ سال گجرات میں رہا اسکے بعد شہزادہ پرویز نے بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی کہ خاں جہاں کے اب گجرات میں رہنے کی ضرورت نہیں رہی میری خواہش ہے کہ خان جہاں کو میرے پاس برہانپور میں رہنے کی اجازت دیدیجائے - جہانگیر نے شہزادہ کی اس درخواست کو منظور کر لیا - اور خان جہاں ۲ شعبان ۱۰۲۳ھ کو تھالنیر سے روانہ ہو کر ۴ رمضان کو برہان پور میں شہزادہ کے پاس پہونچ گیا - خان جہاں کو شاہزادہ پرویز کے پاس برہان پور آئے ہوئے نو مہینے گزرے تھے کہ نورجہاں بیگم نے جہانگیر کو اس بات پر مجبور کیا کہ خان جہاں کو برہانپور سے دارالسلطنت میں بلوایا جائے - چنانچہ جہانگیر نے پھر خان جہاں کو خط لکھ کر شوق ملاقات کا اظہار کیا اور اپنے پاس بلایا - اس مرتبہ شہزادہ پرویز کی تمام تدبیریں اور کوششیں بیکار ثابت ہوئیں جہانگیر کی طرف سے طلبی کے فرامین پیہم پہونچے اور ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۲۴ھ کو خاں جہاں برہان پور سے اجمیر کی طرف جہاں جہانگیر مقیم تھا روانہ ہوا - شاہزادہ پرویز نے خاں جہاں کو

بادلِ ناخواستہ بچشمِ پُرآب رخصت کیا۔ خان جہاں جب اجمیر سے دو تین منزل پر پہونچا تو جہانگیر نے شاہزادۂ خورم (شاہجہاں) کو استقبال کے لیے روانہ کیا اور خلعت و اسپ خاصہ معتمد خاص کے ذریعہ بھیجوایا۔ جب اجمیر سے ایک منزل پر پہونچا تو بادشاہ نے اعتماد الدولہ پدر نورجہاں اور آصفخاں وزیر اعظم مہابت خاں کو جو سب سے بڑے امیر تھے استقبال کے لیے روانہ کیا۔ اجمیر میں خان جہاں کے لیے نہایت شاندار خیمہ سراپردہ استادہ کرایا گیا۔ نورجہاں نے مٹھائیاں اور فواکہات اور بادشاہ نے مطبخ خاص سے انواع و اقسام کے کھانے بھجوائے۔ لحظہ لحظہ بادشاہ کی طرف سے کوئی نہ کوئی تحفہ پہونچتا رہا۔ نماز عصر کے بعد خان جہاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے دُور سے دیکھتے ہی فرمایا کہ "بابا خان جہاں خوش آمدی پیش بیا" جب خان جہاں تخت شاہی کے قریب پہونچا تو بادشاہ نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر خان جہاں سے معانقہ کیا اور اُسکی پیشانی کو بوسہ دیا پھر نہایت محبت اور خصوصی التفات کے ساتھ حالات سفر اور غیبت دریافت کرتا رہا۔ خان جہاں نے نذرانے اور تحفے جو بہت قیمتی تھے پیش کیے۔ رات کو پھر بادشاہ نے صحبت خاص میں طلب کیا اور ہر قسم کی گفتگو دیر تک ہوتی رہی (یہاں تک خان جہاں لودی کے جو حالات لکھے گئے ہیں وہ زیادہ تر حبیب اللہ ہروی مصنف مخزن افغانی کی تحریر سے ماخوذ ہیں جو چشم دید راوی اور عینی شاہد ہے۔ حبیب اللہ ہروی کا بیان خانجہاں کو جہانگیر کے پاس بمقام اجمیر پہونچا کر ختم ہو جاتا ہے اور یہیں تک خان جہاں کے عروج و اقبال کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ آگے پھر زوال شروع ہونے والا ہے)

خانجہاں کی زندگی کا نصف آخر

خان جہاں لودی ایک بہادر، باوفا، اور بیگانگ و یک رُخ انسان تھا۔ دربار سلطنت اس زمانے میں سازشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آصف خاں وزیر اعظم چاہتا تھا کہ جہانگیر کے بعد اُسکا داماد شاہزادۂ خورم (شاہجہاں) تخت نشیں ہو۔ اُسکی بہن نورجہاں بیگم جو سلطنت کے کاموں میں دخیل اور جہانگیر کے دل پر قابض تھی، شہزادۂ شہریار کو جہانگیر کے بعد بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ شہزادۂ پرویز کو خود جہانگیر نے ولیعہد بنایا تھا اور خان جہاں لودی و خان خاناں وغیرہ امرا اُسکے طرفدار تھے۔ نورجہاں نے خان جہاں کو بہانپورے اسلیے بُلوایا تھا کہ اُس پر اثر ڈال کر شہریار کا ہوا خواہ و معاون بنائے۔ آصف خاں اس کوشش میں تھا کہ خانجہاں کو خورم کا طرفدار بنا دے۔ جہانگیر کے سامنے جب دکن کے معاملات پر خان جہاں کی موجودگی میں گفتگو چھڑی تو سارا دربار شہزادۂ پرویز کا مخالف نظر آیا۔ اُسکی بُرائیاں نورجہاں اور آصف خاں دونوں کے طرفدار اور [illegible] بیان کرنی شروع کیں اور

اور خان جہاں سے جو سب سے بہتر اور ثقہ گواہ ہو سکتا تھا تائید چاہی۔ اگر خان جہاں دوسرے امیروں کی طرح زمانہ ساز اور چالاک شخص ہوتا تو یہ رنگ دیکھ کر کم از کم خاموش ہی رہتا، لیکن وہ اس قسم کا آدمی نہ تھا۔ اُس نے نہایت جرأت کے ساتھ شہزادہ پرویز اور خانخاناں کی خوبیاں بیان کرکے نہ صرف اُسکی بیگناہی بلکہ مستحق ستایش ہونے کے زبردست دلائل اس خوبی سے بیان کیے کہ سب ہونٹ چاٹتے رہگئے۔ ایک روز شہزادہ خورم (شاہجہاں) نے دربار خاص کی بے تکلف صحبت میں موقع پاکر بادشاہ سے استدعا کی کہ مجھ کو دکن کا ناظم بنا کر شہزادہ پرویز کی جگہ برہان پور بھیجدیجیے میں ایک ہی سال میں سلطنت احمدنگر اور سلطنت بیجاپور کو فتح کرکے ممالک محروسہ میں شامل کر دونگا۔" آصف خاں وزیر اعظم نے اسکی تائید کی لیکن خان جہاں لودی نے بلا تامل شہزادہ خورم کو اس طرح مخاطب کیا کہ "یہ کلام آپ کی شان کے بالکل خلاف اور نہایت گستاخانہ ہے۔ آپ اپنے بڑے بھائی کی تحقیر کر رہے ہیں اور چھوٹے ہوکر بڑے پر فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو ہرگز کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔" خان جہاں کے یہ بیباکانہ الفاظ اگرچہ جہانگیر کو ناگوار نہیں گزرے لیکن شہزادہ خورم (شاہجہاں) کے لیے تیر و خنجر سے ہرگز کم نہ تھے۔ نہ صرف خورم بلکہ آصف خاں وزیر اعظم کے دل میں بھی خانجہاں کے ان الفاظ نے ناسور ڈال دیے۔ اور خان جہاں کے یہی الفاظ اُسکی تباہی کا باعث ہوے۔ نور جہاں بھی اس سپاہی پیشہ آزاد منش اور صاف گو سردار سے مایوس ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے کوشش کرکے خان جہاں کو گجرات کی حکومت پر اور شہزادہ پرویز کو برہان پور سے جدا کرا کر بنگالہ کی حکومت پر بھیجوا دیا۔ شہزادہ پرویز کا سب سے بڑا دوست اور مددگار خان جہاں لودی تھا۔ جب اُسکی دوستی کو دشمنی میں تبدیل نہ کیا جا سکا تو ایک کو مشرق اور دوسرے کو مغرب میں بھیجوا دیا گیا تاکہ ایک دوسرے کو کوئی امداد نہ پہونچا سکے۔ اس کام سے فارغ ہو کر بہن اور بھائی یعنے نور جہاں اور آصف خاں کی سازشی معرکہ آرائی خوب زور شور سے شروع ہوئی۔ نور جہاں نے مہابت خاں کو تقویت پہونچا کر اپنا آلۂ کار بنایا۔ آصف خاں نے بوڑھے سردار خانخاناں اور اُس کے بیٹوں کو اپنی طرف توڑ لیا۔ مگر دونوں کے لیے یہ دونوں سردار کچھ کارآمد ثابت نہ ہوے۔ آخر وہ وقت آگیا کہ شہزادہ خورم نے سرکشی اختیار کی۔ وہ جب بنگالہ کی طرف پہونچا تو شہزادہ پرویز کو مہابت خاں کے ذریعہ امداد پہونچائی گئی۔ پرویز کے مقابلہ میں خورم کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ وہاں سے وہ دکن کی جانب متوجہ ہوا تو شاہی حکم کے موافق پرویز بنگالہ کی حکومت مہابت خاں کو سپرد کرکے اُس کے تعاقب میں

ہیں روانہ ہوا۔ یہ سب نورجہاں کی تدبیریں تھیں کہ پرویز کو بنگالہ کی حکومت سے بھی جدا کر دیا گیا ورنہ خرم کے تعاقب میں مہابت خاں بھی جا سکتا تھا۔ شہزادہ خرم نے جب احمد نگر کی فوجوں کے ساتھ برہان پور کا محاصرہ کیا تو خان جہاں لودی کا سب سے بڑا دوست اور دست راست لودیخا نامی سردار جو برہان پور میں موجود تھا لڑائی میں مارا گیا۔ شہزادہ پرویز نے بنگالہ سے برہانپور پہنچکر شہزادہ خرم کو شکست دیکر بالکل بے ساز و سامان بنا دیا۔ برہان پور سے بحالت تباہ شہزادہ خرم ٹھٹھہ کی جانب اس ارادہ سے آیا کہ ملک ایران کی طرف چلا جائے۔ آصف خاں اپنے داماد شہزادہ خرم کی اس خطرناک حالت سے بیخبر نہ تھا۔ اسکے توڑ جوڑ عین وقت پر کام آئے۔ ادھر مہابت خاں جو بنگال پر حکومت کر رہا تھا آصف خاں سے مل گیا ادھر شاہزادہ پرویز برہانپور میں مرگ مفاجات کا شکار ہوا۔ شہزادہ پرویز کے یکایک فوت ہو جانے پر حیرت تو سب کو ہوئی مگر اسکی وفات کا اصلی سبب کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ مہابت خاں نے بنگال میں سرکشی کا اظہار کیا۔ ان واقعات نے بچھی ہوئی شطرنج کی چالوں میں تغیر عظیم پیدا کر دیا۔ خرم ایران کا ارادہ فسخ کرکے دکن کی جانب چلا گیا۔ پرویز کے مرتے ہی خان جہاں لودی کی جانب سے اب کسی کو کوئی اندیشہ نہ رہا تھا۔ خرم نے خان جہاں لودی صوبہ دار گجرات کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ سفارش کرکے بادشاہ سے میری خطائیں معاف کرا دیں۔ ادھر مہابت خاں نے بادشاہ کی خدمت میں عفو تقصیرات کی درخواست بھیجی۔ دونوں کی خطائیں معاف ہوئیں۔ خرم (شاہجہاں) تو دکن کی جانب رہا۔ مہابت خاں کو بنگالہ سے دربار شاہی میں طلب کیا گیا۔ خان جہاں لودی کو ناظم دکن بنا کر گجرات سے برہانپور تبدیل کیا گیا۔

مہابت خاں جو پہلے نورجہاں کے اشاروں پر کام کرتا تھا اب آصف خاں کے مقاصد کا مؤید تھا۔ وہ بنگالہ سے خوب مستعد ہو کر اور راجپوتوں کی تازہ فوج بھرتی کرکے اپنے ہمراہ لیکر حاضر ہوا اور غالباً آصف خاں کے مشورہ اور سازش سے جہانگیر کو قید کر لیا۔ مہابت خاں کی قید سے آزاد ہو کر جہانگیر کا جلدی ہی یعنی ماہ صفر ۱۰۳۷ھ میں انتقال ہو گیا۔ شہریار تخت نشین ہو کر مارا گیا اور ہندوستان کی حکومت شہزادہ خرم کے حصہ میں آئی جو شاہجہاں کے نام سے ہندوستان کا مشہور بادشاہ ہوا۔

شاہجہاں نے تخت نشین ہو کر تمام امرا کے مناصب و مراتب بلند کیے۔ آصف خاں بدستور وزیر اعظم اور مدار المہام سلطنت رہا۔ مہابت خاں کو خانخانا کا خطاب ملا۔ خان جہاں لودی

کی باتیں بادشاہ اور وزیر دونوں کو یاد تھیں۔ اُسکا استیصال فوراً مناسب نہ سمجھ کر اول صرف یہ انتظام کیا گیا کہ خانجہاں کو برہان پور سے مالوہ کی صوبہ داری پر تبدیل کرکے مہابت خاں خانخانا کو ناظم دکن بنایا گیا اور خانخاناں کو حکم دیا گیا کہ تم اپنی طرف سے اپنے بیٹے خان زماں کو برہانپور بھیجدو۔ خان جہاں برہان پور سے مالوہ آکر ابھی اطمینان سے بیٹھنے نہ پایا تھا کہ جھجار سنگھ ابن نرسنگدیو بندیلہ نے علامات سرکشی کا اظہار کیا۔ اُسکی سرکوبی کے لیے خانجہاں کے پاس حکم پہونچا اور بعض دوسرے امرائے شاہی بھی اس مہم پر مامور ہوے۔ خانجہاں نے اس مہم میں حسب توقع اپنی شجاعت و قابلیت کا اظہار کیا۔ بندیلہ مذکور کو عاجز کرکے حکم شاہی کے موافق اُسکے مقبوضہ علاقہ کا بڑا حصہ اُس سے جدا کرلیا گیا۔ اور بھاری نذرانہ وصول ہونے کے بعد اُسکی خطا معاف ہوی۔ خان جہاں لودی کا یہ کارنامہ سنہ جلوس اول شاہجہانی میں ظہور پذیر ہوا لیکن اُس گرہ کو جو اُسکی طرف سے شاہجہاں کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی نہیں کھول سکتا تھا۔ امرائے دربار بھی مع آصف خاں وزیر اعظم درپئے انتقام تھے۔ ایسے بے عذر، بہادر اور شمشیر برہنہ شخص کو کسی خطرناک مہم اور ہلاکت کے مقام میں بھیجکر اُس کا قصہ پاک کرادینا کوئی دشوار کام نہ تھا، اور بادشاہ ہر قسم کی بدنامی اور مردم ناشناسی کے الزام سے محفوظ رہ سکتا تھا لیکن اس طرح خانجہانلودی کی شہرت و عزت کو کوئی نقصان نہ پہونچتا اور وزیر و بادشاہ دونوں کے جذبہ انتقام کو پوری تسکین حاصل نہ ہوتی لہذا اب خانجہاں کو زیادہ مہلت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اُسے آگرہ طلب کیا گیا یا وہ خود جھجار سنگھ بندیلہ کی مہم سے فارغ ہوکر رسم تہنیت ادا کرنے آیا۔ بادشاہ بظاہر عزت کے ساتھ پیش آیا لیکن صوبہ مالوہ کی طرف واپس جانے کی اجازت اور رخصت نہیں دی گئی۔ وہ چند روز آگرہ میں مقیم اور روزانہ دربار شاہی میں حاضر ہوتا رہا۔ کسی صوبہ دار کو اُسکے صوبہ کی طرف جانے کے لیے رخصت نہ کرنا معمولی بات نہ تھی۔ خانجہاں اس طرز عمل سے پہلے ہی اندیشہ مند تھا کہ اسی اثنا میں اُسکو معلوم ہوا کہ وہ مع اہل و عیال گرفتار ہوکر کتے کی موت مارا جائے گا۔ یہ سُن کر خانجہاں بہت پریشان ہوا۔ اُس نے اپنے دروازہ کے سامنے چڈاولوں کی فوج کا جو اُسکے ہمراہ تھا پہرہ مقرر کرکے دربار میں جانا ترک کردیا۔ منتخب اللباب کا مصنف لکھتا ہے کہ مخلص خاں کے بیٹے نے جو خانجہاں کے بیٹے کا دوست تھا محض دلگی اور مذاق کے طور پر یہ کہا تھا کہ خانجہاں کو بہت جلد قرار واقعی سزا ملنے والی ہے۔ یہی باعث خانجہاں کے وہم کا ہوا۔ مگر یہ مورخ موصوف کی دلگی، بادشاہ جہاں کی غیر منصفانہ کاروائی ہے۔ خانجہاں لودی کوئی جنگلی، پہاڑی، وحشی یا گنوار

آدمی نہ تھا کہ اس طرح لڑکوں کی گفتگو اور دل لگی کی باتوں میں آکر ایسی غیر معمولی حرکت کا ارتکاب کرتا۔ وہ اول درجہ کا امیر، خانجہاں، فرزند شاہ کے خطاب سے مخاطب اور دکن کے چار صوبوں کا وائسرائے رہ چکا تھا۔ جہانگیر کے دربار میں اُس کی سب سے زیادہ عزت و توقیر تھی۔ وہ عبدالرحیم خانخاناں، مرزا عزیز کوکہ، مان سنگھ، شہزادہ پرویز کی سفارشیں کرکے شاہی عتاب سے اُنکو بچا چکا تھا۔ جہانگیر کے خاص الخاص مشوروں میں دوسرے تمام وزراء سے بڑھکر اپنے صائب الرائے ہونے کا ثبوت پیش کرتا رہا تھا۔ وہ صاحب السیف والقلم تھا۔ یعنی شجاعت و بہادری کی مخصوص صفت کے علاوہ علم و فضل سے بھی بے نصیب نہ تھا۔ اُس کی ساری عمر میدان جنگ میں سپہ سالاری اور دربار میں بادشاہ کی مصاحبت و ندیمی کرتے ہوئے گزری تھی۔ شہزادوں اور وزیروں کی صحبت اُسکو ہمیشہ رہی تھی۔ وہ خود دل کا صاف، زبان کا سچا، قول کا پکا اور وعدہ کا وفا کرنے والا تھا لیکن دنیا داروں کی چالاکیوں اور دھوکہ بازیوں کو ساری عمر دیکھتا رہا تھا۔ ایسے شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اُس نے ایک لڑکے سے دل لگی کی بات سنکر بلا وجہ دربار کا جانا ترک کر دیا اور اپنے دروازہ پر اپنے ہم قوم پٹھانوں کا پہرہ مقرر کیا سب سے زیادہ تمسخر انگیز بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خانجہاں کو ہلاک اور ذلیل کرنے کے منصوبے مکمل ہو چکے تھے۔ خان جہاں کو اسکی صحیح صحیح خبریں ضرور معلوم ہو چکی تھیں۔ کوئی دوسرا کم ہمت شخص ہوتا تو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے چھری کے نیچے گردن رکھ دیتا۔ یا خانجہاں اگر حقیقتاً اپنے آپ کو خطاوار جانتا تو وہ بھی ہر قسم کی سزا برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ لیکن وہ چونکہ اپنے آپ کو بالکل بیخطا یقین کرتا تھا۔ لہذا آخر وقت تک مدافعت اور بہادروں کی طرح جان دینے پر آمادہ ہو گیا۔ منتخب اللباب کی روایت ہے کہ شاہجہاں کو جب خانجہاں کے اس طرح گوشہ نشین ہونے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے اسلام خاں کو تسلی کے لیے بھیجا اور اسکو ہر قسم کا اطمینان دلایا۔ چنانچہ خانجہاں پھر بدستور دربار میں آنے لگا۔ مگر چند روز کے بعد بعض مصاحبوں نے خانجہاں کو یقین دلایا کہ یہ چند روزہ ڈھیل مصلحتاً دی گئی ہے اور ہلاکت بہت قریب ہے۔ مصاحبوں کے اس بیان کو بھی منتخب اللباب میں غلط ہی بتایا گیا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہر شخص خان جہاں ہی سے دل لگی کرتا تھا اور لطف یہ کہ آیندہ کے واقعات سے یہ تمام دل لگی کی باتیں حقیقت و اصلیت کے سانچے میں ڈھلجاتی ہیں۔

شجاعت و بہادری کے حیرت انگیز کارنامے

آخر ایک روز رات کو دو گھڑی رات گئے خان جہاں آگرہ سے روانہ ہوا جس کی

تفصیل خافی خاں نے ان الفاظ میں بیان کی ہے

"شبے از شبہا بعد از انقضائے دو ساعت بخوبی با سائر متعلقان صغیر و کبیر کہ بعضے را بر فیلان و برخے را بر اسپان برقع پوش سوار نمودہ جریدہ خانہ بدوش گشتہ معہ دو ہزار سوار افغان جرار کہ اکثر آں از خویش و تبار و کیجان او دو قالب بودند و دوازدہ نفر فرزندان و داماد و دو صد سہ صد پیادہ و شاگرد پیشۂ ہوا خواہ قدیمی از آگرہ نقارہ و طبل زناں برآمدہ مرحلہ پیمائے تیہ حیرانی گردید"۔

شاہجہاں کو خان جہاں کے اس طرح آگرہ سے فرار ہونے کا حال معلوم ہوا اُس نے فوراً خواجہ ابوالحسن - خدمت پرست خاں عرف رضا بہادر سیر آتش - سید مظفر خاں بارہہ - نصیر خاں - خواص خاں بھٹی - مرحمت خاں بخشی - راجہ بتھیلداس سہ ہزاری پسر راجہ گوپال داس - راجہ پرتھی راج - معتمد خاں - خان زماں - رائے رایاں - راجہ جے سنگھ وغیرہ بیس مشہور سرداروں کو تیس چالیس ہزار فوج اور زبردست توپخانہ کے ساتھ خانجہاں کے تعاقب میں روانہ کیا۔

شاہجہاں کو جب خانجہاں کے روانہ ہونے کا حال معلوم ہوا اُس سے چار گھڑی بیتے ڈیڑھ گھنٹہ بعد یہ فوج آگرہ سے روانہ ہو چکی تھی - سوچنے کے قابل بات یہ ہے کہ صرف دو ہزار پٹھانوں کی فوج کے تعاقب میں بیس بڑے بڑے سپہ سالار ایک عظیم الشان لشکر اور زبردست توپخانہ لیکر روانہ ہوتے ہیں - آدھی رات کا وقت ہے جبکہ سب آرام میں ہیں - اس قدر جلد اس لاؤ لشکر کا مرتب و مسلح ہو کر روانہ ہو جانا یہ شبہہ پیدا کرتا ہے کہ یہی رات خانجہاں کے گرفتار و قتل کرنے کی پہلے سے مقرر ہو چکی تھی - اور یہ تمام سردار معہ اپنی اپنی فوج اور توپخانہ کے پہلے سے مستعد اور حکم کے منتظر تھے کہ حکم پاتے ہی خانجہاں کے مکان کا محاصرہ کرلیں - خانجہاں کو اتفاقاً تھوڑی دیر پہلے اسکا علم ہوا اور وہ نہایت سراسیمگی کے عالم میں اپنا ننگ و ناموس بچانے کے لیے اس طرح روانہ ہوا کہ عورتوں کو برقعے پہنا کر گھوڑوں پر سوار کرنا پڑا - اگر اُسکو پہلے سے اسکا علم ہو گیا ہوتا تو یہ کچھ بھی دشوار نہ تھا کہ وہ کم از کم اتنے ہاتھی فراہم کر لیتا کہ عورتیں اُن پر سوار ہو سکتیں - یا وہ اپنی کوئی جائے پناہ متعین کر کے عورتوں کو پہلے سے وہاں بھیج دیتا - لیکن آئندہ پیش آنے والے واقعات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ خانجہاں اپنے لیے کوئی جائے پناہ اور منزل مقصود متعین کیے بغیر آگرہ سے روانہ ہوا تھا - خانجہاں کی ہیبت اور اُسکا رُعب [illegible] اسکا اندازہ صرف اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ

کہ دو ہزار کے چھوٹے سے لشکر کو جس کے ساتھ عورتیں، بچے، مال و اسباب اور شاگرد پیشہ لوگ بھی تھے اس قدر خطرناک تصور کیا تھا کہ مذکورہ عظیم الشان لشکر کو بھی جو رات ہی میں روانہ ہو چکا تھا کافی ہو چکا تھا کافی نہ سمجھ کر صبح اُٹھتے ہی شاہجہاں نے آگرہ سے پیہم کمکی فوجیں بھیجنی شروع کر دیں۔ خان جہاں کی بہادری و سپہ سالاری کے مرتبے کو سمجھنے کے لیے مذکورہ تصور سے بہت کچھ روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ خان جہاں کے دل گردہ کا اس بات سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آگرہ سے چوروں کی طرح نہیں بھاگا بلکہ نقارہ بجاتا ہوا چلا۔

جنگِ چمبل

آگرہ سے اٹھارہ کروہ (کوس) کے فاصلہ پر جبکہ خانجہاں دریائے چمبل کو عبور کرنے کیلئے کشتیاں فراہم کر رہا تھا اور سورج افق مشرق سے کچھ تھوڑا ہی بلند ہوا تھا کہ مذکورہ شاہی لشکر پہونچ گیا۔ خانجہاں نے اس عجلت میں عورتوں اور بچوں کو دوسرے کنارے پر پہونچایا اور خود دریا کے اسی طرف رُک کر حملہ آور فوج کا مقابلہ کیا۔ وہ تماشا دیکھنے کے قابل ہوگا جبکہ نہایت گرانبار بے معین و مددگار مٹھی بھر فوج اس عظیم الشان شاہی لشکر کے مقابلے میں جسکی پشت پر کمکی فوجوں کا تانتا بندھا ہوا تھا مصروفِ جنگ ہوئی ہوگی۔ خان جہاں کے لیے یہ اور بھی نازک موقع تھا کہ اُسکی پشت پر دریا تھا۔ نہ اِدھر اُدھر حرکت کرنے کا موقع تھا، نہ کسی امداد کی توقع تھی۔ مگر شاہی لشکر کا سیلاب ان مٹھی بھر افغانوں سے ٹکرایا تو معلوم ہوا کہ دریائے چمبل کے کنارے کوئی ریتی کی دیوار نہیں بلکہ فولادی قلعے کی دیوار یا سنگ خارا کا ایک پہاڑ تھا۔ پانی کا سیلاب جب پہاڑ سے ٹکراتا ہے تو شور بلند ہوتا ہے۔ یہاں بھی غریو لشکر سے میدان گونج اُٹھا۔ بہادری و مردانگی نے اپنے پورے حسن و جمال کا تماشا دکھایا۔ شجاعت نے مردوں کے منہ چومے تو نے تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھاتی سے لپٹا لیا۔ خون کی بارش نے صفحۂ زمین کو زرافشاں بنایا اور مقتولوں کی خون فشاں لاشوں نے اُس پر بیل بوٹے بنائے دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی عورتیں اپنے شوہروں، بھائیوں، اور بیٹوں کی جاں فشانیوں کو سکتہ کے عالم میں دیکھ رہی تھیں اور دریائے چمبل کا آب رواں اپنی سُریلی آواز میں اس طرح نغمہ خواں تھا ؎

بہادر جو نامی ہیں وقت ستیز بدن میں نہیں رکھتے پاے گریز

اس ستیز و آویز کا نتیجہ یہ ہوا کہ خان جہاں کے دو بیٹے عصمت خاں و حسین خاں، ایک داماد شمس خاں اور شمس خاں کے دو بھائی محمد خاں و محمود خاں کُل پانچ قابل تذکرہ سردار اور کُل ستر پٹھان کشتوں کے پُشتے لگا کر شجاعت و مردانگی کا آخری مرحلہ طے کر گئے اور سرخروئی کے ساتھ اس جہان فانی

سے عالم جاودانی کی جانب رخصت ہوئے - ان پانچوں مذکورہ سرداروں کی نسبت پٹھانوں کے مخالف اور غیر ہمدرد مورخ خافی خاں کے الفاظ یہ ہیں کہ

ہر پنج پنجۂ شیر ژیاں را روز نبرد رنجہ می داشتند و در معرکۂ مصاف فیل داں را اماں نمی دادند"

خان جہاں کے مذکورہ نقصان کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہی لشکر کے نقصانات پر بھی غور کرو خدمت پرست خاں میر آتش - سید محمد خاں بسیرہ سید مظفر خاں بارہہ - سید محمد شفیع بسیرہ سید مظفر خاں بارہہ - راجہ متیلداس کے دو بھائی - سادات بارہہ کے ۱۹ روشناس بہادر - گئی راجپوت سردار - ستر سنگل سردار جان سے مارے گئے - اور راجہ متیلداس راجہ پرتھی راج سید مظفر خاں بارہہ - خواص خاں بھٹی ایسے زخمی ہوئے کہ لاشوں میں سے زندہ نکالے گئے اور کئی کئی مہینہ کے علاج معالجہ کے بعد اُٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئے - شاہی لشکر کے تمام مقتولین کی کوئی صحیح تعداد نہیں بتائی جا سکتی - لیکن انکی تعداد کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ خانجہاں لودی اس شاہی لشکر کا دریائے چمبل کے کنارے ستھراؤ کر کے دریائے چمبل کے پار ہو کر روانہ ہوا ہے تو اگلے روز یعنی لڑائی ختم ہونے اور خان جہاں کے دریا سے عبور ہو کر روانہ ہونے کے بعد ۱۲ گھنٹے تک بقیۃ السیف شاہی لشکر کو لاشوں کے دفن کرنے سے فرصت نہ ملی - آگرہ سے تازہ دم فوجیں بھی پہونچ گئیں، اور اگلے روز دوپہر کو شاہی لشکر دریائے چمبل کو عبور کر کے خانجہاں کے تعاقب میں روانہ ہوا - مذکورہ زخمیوں کو دھولپور میں چھوڑا اور گوالیار کی طرف روانہ ہوا - خانجہاں گوالیار، چندیری، بندیلکھنڈ ہوتا ہوا گونڈوانہ پہونچا - شاہی لشکر کے دل پر خانجہاں کی ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ وہ خان جہاں سے دو روز پیچھے پیچھے رہا - گونڈوانہ سے خانجہاں اجمیر کی سلطنت نظام شاہی میں داخل ہوا - اور دولت آباد پہونچ کر قیام کیا - شاہی لشکر مالوہ کے پہاڑوں اور جنگلوں کو طے کرتا اور خان جہاں کا سراغ لگاتا ہوا بکلانہ پہونچکر مقیم ہوا - شاہجہاں کو اطلاع دیگئی کہ بغیر آپ کے تکلیف فرمائے کام نہیں چلیگا - متیلداس، پرتھی راج، سید مظفر بارہہ، خواص خاں بھٹی وغیرہ مذکورہ مجروحین اب اچھے ہو گئے تھے - شاہجہاں نے انکو بلا کر خلعت ہائے فاخرہ اور بڑے بڑے انعام عطا کیے اُنکے مناصب و مراتب بھی بڑھائے - خواجہ ابو الحسن اور دوسرے سردار جو مخالف فوج کو لیے ہوئے بکلانہ میں غنیم تھے وہ بھی رد تحسین و آفرین ہوئے اُن کے مناصب میں بھی اضافہ کیا گیا -

خان جہاں کے مقابلہ پر شاہجہاں

یکم ربیع الآخر ۱۰۳۶ھ کو شاہجہاں ایک عظیم الشان لشکر ہمراہ لیکر آگرہ سے روانہ ہوا۔ کوچ و مقام کرتا ہوا دریائے نربدا کو عبور کرکے سرحد خاندیس میں داخل ہوا اور ارادت خاں و شائستہ خاں و اعظم خاں و راجہ گج سنگھ کی سرداری میں پچاس ہزار فوج دیکر ارادت خاں کو اس کل فوج کا افسر اعلیٰ اور ذمہ دار سپہ سالار بنا کر خان جہاں کی گرفتاری کی تاکید کی اور خود بماہ جمادی الآخر ۱۰۳۶ھ برہانپور پہونچکر قیام کیا۔ اسی دوران قیام میں برہان پور کا نام دار السرور تجویز ہوا۔ خواجہ ابو الحسن جریدہ برہان پور میں حاضر ہوکر باریاب خدمت ہوا اُسکو بدستور خانجہاں کی گرفتاری پر مامور رکھ کر اُسکے ساتھ شاہ نواز خاں کو بھی ایک شائستہ فوج دیکر روانہ کیا گیا۔ شیر خاں گورنر گجرات کے پاس حکم بھیجا گیا کہ احمد آباد میں اپنا نائب اور قائم مقام چھوڑکر معہ لشکر گجرات ابو الحسن کی مدد کو پہونچے۔ بکلانہ کے راجہ کو فرمان بھیجا گیا کہ اپنی پوری طاقت اور تمام ذرایع کو شاہی لشکر کی امداد و اعانت میں صرف کرے۔ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت اور شمالی ہند کی مغلیہ سلطنت کے درمیان اگرچہ پہلے سے حالت جنگ قائم تھی مگر شاہجہاں کی تخت نشینی کے بعد کوئی خصوصی سرگرمی طرفین سے ظاہر نہ ہوئی تھی۔ اب خانجہاں کے اس طرف آجانے پر شمالی ہند کی فوجوں کا ٹڈی دل دکن کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ریاست احمد نگر نے بھی مقابلہ کی تیاری کی۔ شاہجہاں نے کالپی کے صوبہ دار عبد اللہ خاں کو بھی بلاکر اس حملہ آوری میں شریک کیا۔ تلنگانہ، خاندیس، بکلانہ تین طرف سے ریاست احمد نگر پر حملہ آوری شروع ہوئی۔ امام قلی خاں پسر جاں سپار خاں، پسر شجاعت خاں، راجہ ستر سال سنگھ برادرزادہ مانسنگھ، دیانت خاں وغیرہ نامی سردار لڑائیوں میں مارے گئے۔ گردھر داس اور بہت سے راجپوت سردار زخمدار ہوئے شاہجہاں نے ریاست احمد نگر پر نہ صرف جنگی دباؤ ڈالا بلکہ امرائے احمد نگر اور رعایا احمد نگر کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش و سازش بھی جاری رکھی۔ چنانچہ اسی دوران جنگ میں بہت سے سرداران ریاست احمد نگر آآکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے بڑے مناصب اُنکو عطا کیے گئے۔ ان لوگوں میں جادو راے (سیوا مرہٹہ کا نانا)۔ ساہو بھونسلہ (پدر سیوا مرہٹہ داماد جادو راے)۔ جگدیو (جادو رائے کا سالا)۔ پنگ راو۔ تاوجی وغیرہ مرہٹے خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں جن کو بڑی بڑی جاگیریں اور اعلیٰ درجہ کے منصب شاہجہاں سے عطا کیے۔ اسی زمانہ سے مرہٹوں کے حوصلے بلند ہوئے اور نظام شاہی حکومت کی نگاہ میں

بھی اس غداری کے سبب اُنکی اہمیت بڑھ گئی۔ مسلمان سرداروں میں سادات خاں اور شرزہ خاں قابل تذکرہ ہیں جو شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہو کر مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ شاہجہاں کی اس تدبیر نے نہ صرف ریاست احمد نگر بلکہ خانجہاں لودی کو بھی سخت پریشان و تحیر بنا دیا۔

جنگِ راجوری

مذکورہ غدار مرہٹوں کی تحریک اور شاہجہانی ترغیب سے مرہٹوں کی جمعیتوں نے فرنگیوں کو اپنے ساتھ ..... شامل کر کے ساحل سمندر کی جانب ریاست احمد نگر کے لیے سخت مشکلات پیدا کر دیں لیکن خان جہاں نے ایک طرف شاہی لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا دوسری طرف وہ فرنگیوں اور مرہٹوں کے اس فتنے کو بھی فرو کر رہا تھا۔ جو شاہی فوج خان جہاں کے مقابلہ پر معرکہ آرا تھی۔ خان اعظم اسکا سپہ سالار اعظم تھا اور یہی سب سے بڑی اور زبردست فوج تھی۔ جب اعظم خاں (خان اعظم) سے عرصۂ دراز تک کچھ نہ ہو سکا تو شاہجہاں نے اعظم خاں کی جگہ آصف خاں وزیر اعظم کو سپہ سالار بنا کر برہان پور سے روانہ کیا۔ اعظم خاں کو بمقام مچھلی گانوں جب آصف خاں کے مامور ہونے کی خبر پہونچی تو بہت نادم و شرمندہ ہوا۔ اسی اثنا میں خبر پہونچی کہ خان جہاں لودی مرہٹہ اور فرنگی باغیوں کی سرکوبی سے فارغ ہو کر تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ مع اہل و عیال قصبۂ راجوری میں مقیم اور شاہی لشکر کی جانب سے بالکل بے خوف و مطمئن ہے۔ اعظم خاں نے اپنی ابتک کی ناکامیوں کی تلافی کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر آصف خاں کے آنے سے پہلے ہی ایک عظیم الشان جرار لشکر کے ساتھ یلغار کیا اور خان جہاں لودی کو جا گھیرا۔ اعظم خاں کے ساتھ ہی یلغار رستم بہادر خاں ابن دریا خاں، راجہ جے سنگھ، راجہ بیتھلداس، سپہدار خاں، خواص خاں، سردار خاں، مرحمت خاں، اہتمام خاں داروغۂ توپخانہ، ناہر داس جھالہ، راجہ انوپ سنگھ، راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ، خان زماں، دلیر اسپ پسران مہابت خاں، شیر خاں، شاہنواز خاں، چندر من بندیلہ، کیلوجی مرہٹہ، اجی رام مرہٹہ، جگدیو مرہٹہ، صفت شکن خاں وغیرہ نامی گرامی سردار موجود تھے۔ خان جہاں لودی نے اس بلائے ناگہانی کے ورود پر عزم و استقلال کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ عورتوں اور بچوں کو مع ساز و سامان قریبی پہاڑ کے درروں میں بھیجدیا اور خود اپنی قلیل جمعیت کو جو اُس کے رشتہ داروں اور وفادار جاں نثاروں پر مشتمل تھی لیکر مقابلہ پر ڈٹ گیا اور شاہجہانی لشکر کو جنگ چیل کا مزا ایک مرتبہ پھر چکھا دیا۔ اس معرکہ کی ایک خاص قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ بہادر خاں ابن دریا خاں شاہی مقدمۃ الجیش کا سردار اور سب سے

زیادہ بہادر شخص تھا دوسری طرف اُس کا باپ دریا خاں لودی خان جہاں لودی کا ہمدم و دستِ راست اور چوٹی کا سردار تھا۔ دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ خان جہاں لودی کے ایک بھتیجے کا نام بھی بہادر خاں تھا وہ اپنی بہادری اور صف شکنی میں بہادر خاں ابن دریا خاں کا حریف اور مدمقابل تھا۔ شاہی فوج نے خانجہاں لودی اور اُسکے ہمراہیوں کو چاروں طرف سے احاطہ کرلیا۔ بظاہر کوئی صورت خان جہاں کے بچنے کی باقی نہ رہی تھی۔ تیر و تلوار اور نیزہ و خنجر کے علاوہ شاہی فوج کا ایک بڑا حصہ بندوقوں سے بھی مسلح تھا۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ شاہجہانی سردار بہادر خاں ابن دریا خاں تیر کے دو زخم اور تلوار کا ایک زخم کھا کر ہلاک ہوا۔ ناہر سنگھ جھالا بھی اُسکے ساتھ مارا گیا۔ ایک خونریز شدید شمشیر زنی کے بعد شاہی لشکر میں شکست کے آثار نمودار ہوئے یعنی تمام لشکر سمٹ کر ایک پشتہ کوہ کی طرف مجتمع ہوا اور خان جہاں جو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دشمنوں کے نرغہ میں مصروف حریف انگنی تھا میدان پر قابض نظر آیا۔ شاہی لشکر نے سمٹ کر اور سنبھل کر پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تلواروں کی بجلیوں نے چمک چمک کر دامن کوہ میں خون کے ندی نالے بہا دیے اور شجاعتِ افغانیہ نے شاہجہانی لشکر کے چھکے چھڑا دیے۔ اس مرتبہ بہادر خاں برادرزادۂ خانجہاں لودی بہت سے زخم کھا کر میدان جنگ میں کام آیا اور دوست دشمن دونوں کو بتا گیا کہ بہادر ایسے ہوتے ہیں جو رمیدان جنگ میں اس طرح جان دیا کرتے ہیں۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ

"ہر کرا از خم کاری می رسید آرزوے زخم دیگر نمودہ قدم جرأت بقصد سربازی پیش می گذاشتند تا آنکہ بہادر خاں از طرف خصم از زخمہاے پیاپے از پا درآمد بہادر خاں کہ از بسیاریِ زخم اُفتادہ بود چوں رمقے باقی داشت بہ دِ غیرت از جاے خود برخاستہ باز روے بلشکر یا دشاہی دست بشمشیر بردہ حملہ ہاے مردانہ نمودہ آخر بزخم گولہ تفنگ افتاد۔ راجپوتے آمد کہ سر او را جدا سازد چند بار از کمر برآوردہ چناں افتادہ بر راجپوت انداخت کہ گوش او بباد داد و راجپوت زخم خوردہ دست از بر داشت سر او را جدا ساختہ با انگشتریِ دست و براق او نزد اعظم خاں آورد۔"

خان جہاں لودی نے اب میدان میں دیر تک قیام مناسب نہ سمجھ کر اپنے اہل و عیال کی طرف منہ موڑا اور اُنکو ہمراہ لیکر صاف نکل گیا۔ جس ہاتھی پر عورتیں سوار تھیں وہ ایسا مرکز

تھا کہ چل نہ سکا مجبوراً عورتوں کو گھوڑوں پر برقع پوش سوار کرا کر روانہ ہوا۔ شاہی فوج میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اُس کا تعاقب کر سکتی۔ شاہی لشکر کو اس لڑائی میں بہت سے آدمی اور متعدد سوار قتل کرا کر صرف اس قدر کامیابی ہوئی کہ خان جہاں کا بھتیجا بہادر خاں مارا گیا۔ بہادر خاں کی انگوٹھی اعظم خاں نے برہان پور بادشاہ کے پاس روانہ کی۔ اس انگوٹھی کے نگینے پر بہادر خاں کا نام کندہ تھا۔ یہ انگوٹھی اس بات کی زبردست دلیل تھی کہ بہادر خاں مارا گیا۔ شاہجہاں نے اس انگوٹھی کو دیکھ کر خوشی کے شادیانے بجوائے اور برہان پور میں چراغاں کیا گیا۔

احمد نگر کی نظام شاہی ریاست کو اگرچہ خان جہاں کے پہونچنے سے بڑی تقویت حاصل ہو گئی تھی اور خانجہاں کی پامردی و جوانمردی کا نتیجہ تھا کہ اس چھوٹی سی ریاست نے ہندوستان کے شہنشاہ شاہجہاں کا کامیاب مقابلہ کر کے اپنا رعب و وقار قائم رکھا۔ لیکن اب مسلسل معرکہ آرائیوں سے تنگ آکر دربار احمد نگر صلح کی جانب مائل اور خان جہاں کو گرفتار کر کے شاہجہاں کے سپرد کرنے کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔ خان جہاں تک یہ خبریں پہونچ چکی تھیں لہذا وہ دکن کو بھی اپنے لیے جائے پناہ نہ دیکھ کر اس بات پر آمادہ ہوا کہ مالوہ و راجپوتانہ و پنجاب کے وسیع ملکوں کو چیرتا ہوا پشاور دریائے غنان کے پہاڑوں میں پہونچ کر دم لے جہاں پٹھانوں کے قبائل سے اُسکو ہمدردی و اعانت کی توقع تھی۔ خان جہاں جب حدود ریاست احمد نگر سے نکل کر حدود خاندیس میں داخل ہوا تو شاہجہاں حواس باختہ اور بیحد فکرمند ہوا۔ اُس نے عبداللہ خاں۔ سید مظفر خاں بارہہ۔ سرفراز خاں، درگا داس۔ مادھو سنگھ۔ کیتا خاں وغیرہ سرداروں کو فوجیں دیکر مامور کیا کہ دریائے نربدا کے تمام گھاٹوں کی حفاظت کریں اور خان جہاں لودی کو دریائے نربدا عبور نہ کرنے دیں۔ دو دو گروہ بردار ہر سردار کے ساتھ محض اس کام کے لیے مامور ہوئے کہ ایک کی خبر دوسرے کو پہونچاتے رہیں۔ اس طرح دو سو گروہ برداروں کو مصروف ہونا پڑا جو دلیل اس بات کی ہے کہ مذکورہ سرداروں کی تعداد ایک سو تھی جو دریائے نربدا پر مامور ہوئے تھے۔ خانجہاں لودی نے دریائے نربدا کو عبور کیا اور کوئی اُسے نہ روک سکا۔ مالوہ اور راجپوتانہ کے جنگلوں، پہاڑوں اور ریگستانوں کو طے کرتا ہوا دیپال پور تک پہونچ گیا۔ بظاہر احمد نگر اور دیپال پور سہولی الفاظ معلوم ہوتے ہیں لیکن ہندوستان کے نقشے میں احمد نگر اور دیپال پور کے مقاموں کا فاصلہ دیکھو اور یہ بھی دیکھو کہ راستے میں کون کون سے پہاڑ، دریا، اور شہر و قصبات حائل ہیں، پھر یہ بھی سوچو کہ برہان پور میں شاہجہاں بہ اعظم ہندوستان کی پوری طاقت لیے ہوئے پڑا ہے

اور رات دن اس فکر میں مبتلا ہے کہ خان جہاں کا کانٹا جلد از جلد چھایا جائے۔ خان جہاں کا صرف ہزار بارہ سو تباہ حال و افسردہ خاطر پٹھانوں کی جمعیت کے ساتھ دیپال پور پہونچ جانا معجزہ سے کم نہ تھا۔ اور اگر وہ افغانستان کے پہاڑوں تک پہونچ سکتا تو بہت زیادہ ممکن تھا کہ شیر شاہ اعظم کی سلطنت پھر پٹھانوں کے قبضہ میں آجاتی اور شاہجہاں کو اپنے پردادا ہمایوں کی طرح ایران و ہندوستان کے درمیان طے کرنی پڑتیں۔ مگر خدا استبداد کو اس طرح نہیں، بلکہ حضرت عالمگیر علیہ الرحمہ کے ذریعہ ہندوستان میں اسلامی اثر قائم رکھنا منظور تھا۔ پنجاب و پشاور کے صوبہ دار غافل نہ تھے اور دیپال پور سے آگے بڑھ کر پنجاب یا سندھ کے میدانوں میں خان جہاں کا قتل و گرفتاری سے محفوظ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ خانجہاں کی خبر سنتے ہی جالندھر سے پشاور تک کی چھاؤنیوں میں حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ لہذا خانجہاں دیپال پور سے پھر الوہ کی طرف متوجہ ہوا۔ سرونج پہونچ کر دو تین روز قیام کیا۔ عبداللہ خاں صوبہ دار کالپی اور سید مظفر خاں بارہہ سرونج کی جانب متوجہ ہوئے لیکن سرونج پہونچکر معلوم ہوا کہ خان جہاں لودی دو روز پہلے سرونج سے روانہ ہو چکا ہے اور دو شاہی ہاتھی جو سرونج میں موجود تھے انکو اپنے ہمراہ لے گیا ہے۔

دریاخاں کی شہادت

سرونج سے روانہ ہو کر خان جہاں بکرماجیت ابن جیجار سنگھ بندیلہ کے علاقے میں داخل ہوا تو بکرماجیت اپنا لشکر جرار لے کر خان جہاں کی گرفتاری کے لیے چلا۔ اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خان جہاں آگرہ سے صرف دو ہزار افغانوں کی جمعیت لیکر چلا تھا۔ ان دو ہزار افغانوں میں سے کسی نے اُسکی رفاقت ترک نہیں کی۔ حالانکہ اُنکو کسی جگہ بھی چین سے بیٹھنا اور سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ ہر روز مصروف قتال رہنا یا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مقابلہ بھی ہمیشہ دس گنی، بیس گنی یا پچیس گنی فوج سے ہوتا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ خان جہاں کی قابلیت سرداری زیادہ مستحق تحسین ہے یا اُسکے دو ہزار رفیقوں کی وفاداری زیادہ مستوجب آفریں ہے۔ کم از کم یہ ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خانجہاں ایسا لایق اور شریف سردار تھا کہ اُسکے گرد ایک دو نہیں بلکہ دو ہزار ایسے مستعد، بہادر، وفادار، جان نثار اور انتخاب روزگار اشخاص جمع ہو گئے تھے جنھوں نے ہر قسم کی سختیاں سہنے اور بالآخر اپنی جانیں قربان کر دینے میں تامل نہیں کیا۔ کسی سپہ سالار اور شریف سردار کی اس سے بڑھ کر اور کوئی تعریف نہیں کیجا سکتی کہ اُسکے ماتحت اُسکے فرمانبردار و

جاں نثار اور آخر دم تک وفادار تھے۔ سیکڑوں معرکہ آرائیوں کے بعد جن میں سے بعض بڑی بڑی لڑائیوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے خان جہاں کے پاس دو ہزار جاں فروشوں میں سے اب صرف نو سو آدمی باقی رہ گئے تھے۔ ان نو سو مصیبت زدہ مسافروں کے قافلے میں بہت سے زخمی، بیمار، عورتیں، بچے، سامان رسد، ڈیرے خیمے سب کچھ تھے۔ ایسے گرانبار قافلہ کا لوٹ لینا بکرماجیت بندیلہ کے لیے کیا مشکل تھا جو دس پندرہ ہزار سواروں کا لشکر لیکر گھر سے نکلا تھا۔ خان جہاں نے ان نو سو آدمیوں سے بکرماجیت کا مقابلہ کرنا چاہا لیکن دریا خاں نے باصرار تمام خان جہاں کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ پانسو آدمیوں کے ساتھ عورتوں، بچوں اور بیماروں کو لیکر آگے نکل جائے اور دریا خاں چار سو آدمیوں کے ساتھ بندیلہ کے لشکر کو روکے۔ عورتیں اور بچے خان جہاں کے لیے وبال جان بنے ہوئے تھے اور ہر جگہ انھیں کی وجہ سے اُسکو دقتیں پیش آتی تھیں۔ اگر عورتوں اور بچوں کی رسی اُسکے گلے میں پڑی ہوئی نہ ہوتی تو غالباً ہندوستان کی تاریخ میں کوئی بہت بڑی تبدیلی ہو گئی ہوتی۔ بہرحال خان جہاں عیال و اطفال کو لیکر آگے بڑھا اور دریا خاں نے رُک کر بکرماجیت کا مقابلہ کیا۔ یہ چار سو بہادر ایک ایک کرکے مارے گئے اور دریا خاں بھی میدان جنگ میں پیشانی پر بندوق کی گولی کھا کر مارا گیا۔ بکرماجیت نے صبح سے شام تک ان چار سو آدمیوں کو بمشکل جام شہادت پلایا اور خان جہاں کو اس کروزہ وقفہ کے سبب بآسانی بکرماجیت کے علاقے سے سلامت نکل جانے کا موقعہ مل گیا۔ بکرماجیت نے دریا خاں کا سر کاٹ کر شاہجہاں کے پاس برہان پور بھیجدیا۔ بادشاہ نے بکرماجیت کے اس عظیم الشان کارنامے سے خوش ہو کر خلعت، جمدھر، شمشیر خاص اور نقارہ اُسکو عطا کیا۔ اُسکے منصب اور مرتبے کو بڑھایا۔ خان جہاں اور اُسکے ہمراہی پیہم سفر کرتے کرتے تنگ آگئے تھے آخر مقام بھانڈیر کے قریب جو جھانسی سے شمال و مشرق میں ہے قیام کرکے آرام کرنا ضروری معلوم ہوا۔

جنگ بھانڈیر

خان جہاں کے اس قلیل جمعیت کے ساتھ قیام کی خبر سُن کر سید مظفر خاں بارہ ایک لشکر عظیم کے ساتھ پہونچ گیا۔ خان جہاں کو اُس کے قریب پہونچنے کا حال ایک روز پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ اُس نے اہل و عیال، مجروحوں اور بیماروں کو ایک منزل آگے روانہ کیا اور خود مظفر خاں کے مقابلہ پر آمادہ ہوا۔ دریا خاں کے مارے جانے کے بعد خان جہاں لودی اپنی زندگی سے بیزار اور دنیا و مافیہا سے متنفر ہو چکا تھا۔ سید مظفر خاں سے یہ مقابلہ بہت عظیم الشان اور قابل یادگار ہوا۔ اس معرکہ کی نسبت منتخب اللباب کے الفاظ

یہ ہیں کہ

عجب مقابلہ و مقاتلۂ رستمانہ از ہر دو طرف روداد کہ سیدان بارہہ مقابل شمشیر افغانان کہ ہر یکے چوں سد سکندر ثبات در زیدہ داد شرط نمکخواراں آخر روز سیداد پروانہ وار بران شعلہ کوہ زدہ جوہر شجاعت بروے کار آوردند و از افغانان نیز چستیہا مردانہ مردو بظہور آمد کہ سادات بارہہ آفریں گفتند ؎

چو برق از رگ ابر بر مصاف بروں کرد شمشیر خود از غلاف
چناں گشت دست و بغل کار زار کہ شد تیغ ہا جفت مقراض وار

خان عالم کا خویش مسمّی شیر زاد و راجہ دُرگا داس راجپوت اس لڑائی میں خان جہاں کے ہاتھ سے مارے گئے - خان جہاں اور اُسکے اکثر ہمراہی زخمی ہوے - خان جہاں کے دو بیٹے بندوق کی گولیوں سے مارے گئے - خان جہاں یہاں سے کالنجر کی طرف گیا - اب اُسکے ہمراہ سو دو سو آدمیوں سے زیادہ نہیں رہ گئے تھے - کالنجر کے قلعہ دار سید احمد نے اپنی رستمی دکھانے کا بہت اچھا موقع پایا اور خانجہاں کے بیٹے حسن خاں اور بعض زخمیوں کو گرفتار کر سکا اور اس قابل رحم قافلے سے بعض ڈیرے خیمے اور سامان رسد چھین لینے میں کامیاب ہوا -

آخری معرکہ خان جہاں کالنجر سے روانہ ہو کر تالاب سندرہ کے قریب پہونچا جو کالنجر کے شمال میں کین ندی کے کنارے ہے - چند ہمراہی جو باقی رہ گئے تھے انکو قسمیں دے دیکر رخصت کرنا چاہا کہ اپنی جان سلامت لیکر جدا ہو جاؤ، مگر کسی نے جدائی گوارا نہ کی - سب نے آخر وقت تک ساتھ رہنے کی قسمیں کھائیں - راجہ ادھو سنگھ بھی گذشتہ معرکے کے بعد سے مظفر بارہہ سے آملا تھا - یہ دونوں ملکر کے خان جہاں کے قریب پہونچ گئے - اب خان جہاں کے ہمراہ صرف بیس آدمی اور دو ہاتھی تھے - ان دونوں ہاتھیوں کو مورچہ بنا کر اول معروف خدنگ اندازی ہوے - اسکے بعد شمشیر و خنجر تک نوبت پہونچی - اس شیر بیشۂ شجاعت کی آخری ساعتوں کا حال میں اپنے الفاظ میں لکھنا نہیں چاہتا - فانی خاں کو خان جہاں سے مطلق ہمدردی نہیں - وہ خان جہاں کو بُرا کہنے اور گالیاں دینے میں ذرا باک نہیں کرتا اور اُسکی ذلت و تباہی کا تذکرہ ہمیشہ خوش ہو ہو کر کرتا ہے - میں اس جگہ فانی خاں کے الفاظ نقل کرتا ہوں -

"خان جہاں چوں تیر خوردہ زخم رسیدہ عرش کناں بزور رستمانہ پرداخت ؎

نر اسیدہ شیراں بگشت آمدند نہنگاں ز دریا بدشت آمدند

دراں عرصہ شورے بر انگیختند کہ در چشم محشر نمک ریختند
ز بر ند گیہا ے شمشیر کیں لب زخم بر تیغ گفت آفریں

وآں از جاں سیر آمدہ خوں گرفتہ در عرصہ کارزار ہیچ وجہ کوتاہی نہ نمودہ داد مردانگی میداد تا طناب عمرش بہ تیغ اجل بریدہ گشت و بہ برچھی او ہوشنگ از پا در آمد و با وجود زخم دیگر کہ بہ پاے رسید باز بعد از افتادن خود داری نمودہ نشستہ تا دم واپسیں از دوست و دشمن آفریں شنیدہ در جواب محاربۂ حریف کوتاہی و پہلو خالی نمودہ تا رسیدن سید مظفر خاں ہر ستیاری حربۂ جانستانی بعالم بقا شتافت ۔ گویند شاہ قلی نام گرز بردار سر او را از تن جدا ساخت "

اس آخری معرکہ میں بھی خان جہاں لودی سید مظفر خاں کے ایک پوتے اور ستائیس دوسرے شاہجہانی بہادروں کو خاک و خون میں ملا کر شہید ہوا۔

شیر نر کی ڈروک سے بڑے بڑے پہلوانوں اور نوجوانوں کا پیشاب بلکہ پاخانہ بھی خطا ہو جاتا ہے ۔ شیر نر جب ہاتھی پر حملہ کرتا ہے تو ہاتھی سُرین کے بل زمین پر گر پڑتا ہے ۔ شیر نر جب غرا کر کچھار سے اُٹھتا ہے تو ہم نے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں کی جوتیاں ڈھیلی ہو جاتی ہیں ۔ لیکن ہم نے یہ تماشا بھی اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ مرے ہوئے شیر کی کھال ایک چمار اُتار رہا ہے اور اُسکی مونچھ کے بال بڑے اطمینان کے ساتھ دیا سلائی سے جلائے جا رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے شیر نر کی دُم پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے اور اُسکی آنکھوں کو انگلیوں سے ٹٹول رہے ہیں ۔ عقلمند ایسے نظاروں سے عبرت حاصل کرتے اور غافل بے پروائی کے ساتھ گزر جاتے ہیں ۔

مذکورہ دو ہزار بہادروں میں سے صرف تیس آدمی خان جہاں کے بعد زندہ بچے جو اہل و عیال .... کو لیکر بھاگے یا مختلف موقعوں پر قید ہو گئے تھے باقی سب کے سب ایک ایک کر کے خانجہاں پر پروانہ وار نثار ہوے ۔ خانجہاں کا سر شاہجہاں کے پاس عبداللہ خاں لیکر پہونچا تو شاہجہاں نے عبداللہ خاں کو فوراً شش ہزاری منصب اور فیروز جنگ کا خطاب عطا کیا ۔ خوشی کے شادیانے بجے ۔ جشن برپا ہوے اور شاہجہاں کے دم میں دم آیا ۔ آخر جمادی الثانی یا شروع رجب ۱۰۴۰ھ میں خانجہاں مارا گیا ۔ خانجہاں کے کٹے ہوے سر کو شاہجہاں نے شہر شہر گشت کرایا ۔ ؎

سر گشتہ برنیزہ می زد نفس
کہ معراج مرداں ہمین ست و بس

اکبر شاہ خاں ۔ نجیب آباد

۶ ۔ ستمبر ۱۹۲۸ء

پتنگے

اختر، قصبہ س ـــــ کا ایک نوعمر رئیس (جسکی جائداد حال ہی میں کورٹ آف وارڈس سے چھوٹی تھی) اور آنریری مجسٹریٹ، اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھ رہا تھا۔ کچھ دن پہلے مقدمہ کے فریقین کے گواہ گزر چکے تھے اور جرح ہو چکی تھی اور صبح تک اُسے فیصلہ لکھ کر سنا دینا تھا اور اپنے حاکم تحصیل کے پاس بھیجنا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور پانی ابھی ابھی برس کر کھلا تھا۔ اختر نے کمرے کی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں اور دروازوں پر پردے چڑھا دیے تھے تاکہ ہوا آسانی سے کمرے میں آسکے لیکن ہوا رُکی ہوئی تھی اور کمرے میں نہیں آ رہی تھی۔ تیز روشنی والا لمپ جسکے اوپر گلوب نہیں چڑھایا گیا تھا اپنی روشنی کمرہ کی دیواروں پر ڈال رہا تھا۔ صرف دیوار کے اُس حصے پر روشنی نہیں پہونچتی تھی جہاں تصویریں ٹنگ رہی تھیں اور جنکے سائے ٹیڑھے ترچھے ہو کر دیواروں پر پڑ رہے تھے۔ لمپ کی چمنی نے کمرے کی چھت میں ایک بڑا ہلکے زنگ کا گول دھبا ڈال رکھا تھا اور سامنے آتشدان کے کارنس پر رکھی ہوئی تصویروں کے شیشے چمک رہے تھے۔

اختر نے اب تک کب کا فیصلہ لکھ لیا ہوتا۔ وہ محنتی آدمی تھا اور وقت کا پابند اور ہر کام کو اپنے وقت پر کرتا تھا مگر کبھی جب اُسکی طبیعت خراب ہوتی تو مجبوراً اُسے اپنے اصول توڑنے پڑتے اور وقت کے خلاف کام کرنا پڑتا۔ دو دن سے اُسکی طبیعت خراب تھی۔ موسم کی تبدیلی اور ہوا کے وقت ناوقت چلنے نے اُسکے جوڑ جوڑ میں درد پیدا کر دیا تھا جسکی وجہ سے وہ کام کرنے کے لائق نہ رہا تھا اور آرام کرتا رہا تھا۔ دن کو اُس نے فیصلہ لکھ لینے کے لیے ارادہ کیا تھا مگر ٹھیک اُسوقت جبکہ وہ کام کرنے جا رہا تھا اُس نے چند لوگ ملنے آگئے جنھوں نے اُسکے کئی گھنٹے خراب کیے۔ وہ کچھ نہ کر سکا تھا اور اور اب لکھنے بیٹھا تھا۔

یکایک ایک بڑا سا سیاہ چیونٹا جسکے پَر نکل آئے تھے معلوم نہیں کہاں سے اُڑکے آیا اور لمپ کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ چکر کاٹ کر وہ اختر کے سامنے کاغذ پر آکے گرا جسے اُسنے مُنہ سے پھونک کر اُڑا دیا۔ اُسکے بعد ایک پروانہ آیا اور طوافِ شمع کرنے لگا۔ اختر نے اُسے بھی پہلے کیڑے کی طرح اُڑا دینا چاہا مگر یہ اُسکی بہ نسبت زیادہ منتقل مزاج تھا اور اُسکی کوشش کے باوجود وہاں سے نہ ہٹا۔ دیکھتے دیکھتے پَر دار چیونٹے، پروانے، جگنو، بوٹ، اور بیشمار کیڑے اور پتنگے جنکے

نام کسی کو نہیں معلوم، لمپ کے گرد جمع ہو گئے اور لمپ کی سطح پر، میز پوش پر، کاغذ پر رینگنے لگے اور دوات اور اُس کے قمیص کے اندر داخل ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ اُنھوں نے باری باری اُڑ کے گیت گانا شروع کیا۔ کچھ سیاہ رنگ کے ناش کے دیول کے برابر کیڑے اُڑتے اُڑتے تھک کے ایک جگہ گر پڑے اور وہیں تک بے حرکت گویا دم سادھے مُردے کی طرح پڑے رہے اور اُن میں سے ایک طرح کی بو آنے لگی۔ کچھ کیڑے اور پتنگے اُسکے گریبان اور آستینوں کی راہ سے اُسکے کپڑوں کے اندر گھس گئے اور بعض اُسکے منہ اور رخساروں پر طمانچے مارنے لگے ایک سیاہ پتنگے نے اُسکے قلم کے راستے میں اپنے آپ کو لا ڈالا اور مُصر ہوا کہ یا وہ لکھنا بند کردے یا اُسکو پائمال کر ڈالے۔ ایک دوسرا کیڑا اُسکے ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے کاغذات کی تہ میں گھس گیا اور کاغذ کو اُچھالنے لگا۔ اُس نے کاغذ اُٹھایا اور اُسے پھونک کر اُڑا دینا چاہا مگر وہ اُڑ کر کسی اور طرف جانے کے بجائے اُسکے منہ کے اندر چلا آیا.....

آخر یہ اتنے بہت سے کہاں سے آئے ہیں؟" آخر نے خیال کیا "جب روشنی نہیں ہوتی تو یہ ڈھونڈھنے سے بھی کہیں نظر نہیں آتے اور چراغ جلتے ہی یہ ہر طرف سے اپنی جان ہتھیلی پر لیکر دوڑتے ہیں۔ شاید یہ اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں اور اُسی وقت مرجاتے ہیں۔ اس بری طرح جان دینے میں انھیں کیا مزہ آتا ہے؟ اللہ ہی اُن پر رحم کرے اور انھیں سمجھ دے۔ انھیں کوئی کیسے بھگائے؟ آدمی ہاتھی کو پکڑ سکتا ہے اور شیر کا شکار کر سکتا ہے اور میدانِ جنگ میں ہزاروں آدمیوں کا خون بہا سکتا ہے مگر پروانے نہیں اُڑا سکتا۔" اُس نے غور سے انھیں دیکھنا شروع کیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی جانیں تھیں جن کی زندگی کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ اُڑتے تھے اور پھر پھڑپھڑاتے تھے، رینگتے تھے اور ٹھہر جاتے تھے۔ بہت سے پروانے جل کے مرچکے تھے اور جنتوں کے پر اُنکے بازوؤں سے علیحدہ ہو کر میز پوش کی سطح پر پڑے تھے اور وہ خود پرواز کی قوت کھو کے شمع کے صرف رینگنے پر اکتفا کرتے تھے۔

"مگر ان سے کوئی کب تک لطف اُٹھائے؟" اختر نے سوچا "اس لیے فرصت کی ضرورت ہے اور اچھی صحت کی۔ میرے پاس نہ فرصت ہے نہ اچھی صحت۔ مجھے کام کرنا ہے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے اور مجھے آرام کرنا ہے۔" اُس نے پھر لکھنا شروع کیا مگر پھر اُسے پتنگے کام سے روکنے لگے اُسے مقدمہ کی روئداد پڑھنا تھی اور وکیلوں اور گواہوں کے بیانات اور بحثوں پر غور کرنا تھا اور خیالات اکٹھا کرنے تھے مگر ان سب سے زیادہ دشوار اور غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ پروانے کیونکر اُڑائے جائیں،

وہ اُٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آکے اُس نے پیاز کے کچھ ٹکڑے لمپ اور میز پر رکھے۔ اسکے بعد اُس نے کمرے کی سب کھڑکیاں بند کردیں اور دروازوں کے پردے گرادیے لیکن کیڑوں کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

آخر وہ کیا کرے؟ اُسکے پاس صرف یہی رات تھی اور اسی رات اُسے فیصلہ لکھ کر تیار کرلینا تھا۔ مگر وہ کیونکر لکھے؟ اگر صبح تک اُس نے فیصلہ نہ لکھ لیا اور کل نہ سنا دیا اور مسل کو تحصیل نہ بھیجدیا تو اُسکی پڑی سبکی ہوگی اور اُسکی ساری ساکھ خاک میں مل جائے گی۔ وہ ایک عزت دار رئیس تھا اور اُس کا سارے حکام اور رعایا پر بڑا اثر تھا۔ معلوم نہیں فیصلے میں تعویق ہوئی تو اسکا کیا اثر پڑے۔ ان پتنگوں کو کیا معلوم کہ اُنکے اس ننھے سے مشغلۂ تفریح میں اُسکے لیے کیسی تلخ مصیبت کا سامنا تھا۔ اُسے غصہ سا آنے لگا۔ کمرے کی گرمی اور اُس نے اُسکے مزاج میں اور برہمی پیدا کی، وہ دروازہ کھول کر لمپ کو باہر پھینکدینا چاہتا تھا۔ اُسکی پیشانی سے پسینہ کے چند قطرے کاغذ پر ٹپک پڑے جن کی سیل روانی نے اُسکی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ اور اُسکے لکھے ہوئے کو مٹانا شروع کیا۔ اُس نے تنگ آکر قلم کاغذ پر زور سے پٹک دیا جس نے کاغذ اور میز پوش پر کئی گل بوٹے کھلا دیے۔ ان گل بوٹوں نے اُسکے دماغی توازن میں اور خلل پیدا کی۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے لمپ کو منہ سے پھونک کے گل کردیا۔

تاریکی یکدم چھا گئی۔ کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی اور چاند یا روشنی کی ایک شعاع بھی کسی طرف نہ آتی تھی، صرف تاریکی۔ کسی فوٹو گرافر کے ڈارک روم سے زیادہ تاریک۔ کیونکہ اُس میں بھی دھیمی سرخ روشنی حیات کا پتہ دیتی ہے۔ ملٹن کے مشہور بیان کردہ تاریکی سے زیادہ تاریکی ہر طرف چھا گئی۔ کائنات جو گو لمپ کے وجود کے ساتھ زندہ تھی سیاہ ہوگئی، یکدم جیسے مرگئی، چپ ہوگئی .....

آہستہ آہستہ اختر نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے اور دروازے کو ڈھونڈھا اور آہستہ آہستہ ٹٹولتے ہوئے وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہونچا اور بستر پر پڑ گیا۔ دن بھر سردی ہوا چلی تھی اور اسوقت بھی خنکی تھی اور وہ ملاقاتیوں کے ساتھ دن بھر تکلف سے بالکل بندھا ہوا، جکڑا ہوا، اپنی طبیعت پر جبر کرکے بیٹھا رہا تھا اور اُس نے آرام نہ کیا تھا، جسکی وجہ سے اُس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اب پردوں نے آکر اُسکے دماغ میں ابتری پیدا کردی تھی۔ اُس نے بستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلیں اور اپنے پیر بار بار رو دے مارے۔ اس کے دل و دماغ میں اسوقت ایک بے چینی تھی اور وہ اپنے کو ایک بہت بدقسمت آدمی خیال کررہا تھا "مجھے ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے ..... مگر جب یہ

پتنگے کچھ کرنے دیں" اُس نے اپنے پیروں کے نیچے سے کمبل اُٹھا کر اُسے اپنے بدن پر ڈال لیا۔ اور اپنے کانوں سے سرہانے رکھی ہوئی تولیا لپیٹ لی ....

آہستہ آہستہ فضائے سیاہ کو چیر کر اُس کمرے کی ہر چیز اُس میں سے اُبھرنے لگی اور صاف نظر آنے لگی۔ اُسکے سرہانے اُسکی چھوٹی میز تھی جس پر سفید دھلا لوداریز پوش پڑا تھا۔ داہنی طرف دیوار سے برابر برابر لگے ہوئے بید کے موڑھے تھے سامنے کی دیوار سے لگی ہوئی اُسکی سنگار میز تھی جسکا بڑا جلبی آئینہ اس تاریکی میں چمک رہا تھا .... دوسری طرف کمرے میں سے ہارمونیم کی دلربا تان اور ہلکے رسیلے قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ اُسکی بیوی اور اُسکی چھوٹی سالی تھیں جو آپس میں خوش فعلیاں کر رہی تھیں اور نغمہ سرائی کر رہی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ اختر کو اسوقت اِن جرسیلے قہقہوں اور رسیلی آوازوں کے بجائے غمناک اور ترحم آمیز لہجوں، ہمدردو غمگسار آوازوں کی ضرورت تھی، جو اُسکے حال کو سنبھالیں، ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی جو اُس کا حال اُس سے پوچھے اور ممکن ہو تو اُس کے پیر دبائے۔

"میرے پیر کون دبائے؟" اختر نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ خیالات کی دُنیا عجیب دُنیا جس طرح کمرے کی فضائے سیاہ میں سے ہر چیز اُبھری تھی اور اُسکی آنکھوں کے سامنے آئی تھی اسی طرح اُسکے دماغ اور خیال کی دنیا میں دبے ہوئے گڑے ہوئے خیالات اُبھرنے لگے اور دیدۂ دل کے سامنے آگئے۔ نہ معلوم کس طرح اُسے وہ رات یاد آئی جب اسی طرح کی تاریکی تھی اور اُسکی ماں، اُسکے باپ سے آہستہ آہستہ سرگوشی کر رہی تھی اور سسکیاں بھرتی جاتی تھی۔ اُسے صاف یاد آیا۔ وہ ایک رات تھی جب اُسکی شادی نہیں ہوئی تھی اور اُسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی اور وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اُس لڑکی سے شادی کرنے پر اصرار کر رہا تھا۔ مگر اُسکی ماں کے آنسو اُسکے وقتی جذبۂ محبت پر غالب آئے تھے اور اُس نے اس لڑکی سے شادی نہیں کی تھی۔ اور اُسے یہ خیال کر کے افسوس ہوا کہ اُسکی شادی اُس لڑکی سے نہیں ہوئی جسے وہ اس قدر چاہتا تھا جسکے لیے وہ دیوانہ ہوگیا تھا، اور جو اَب تک کنواری تھی۔ کیا اچھا ہوتا اگر اُس نے اپنی اُس پہلی مایوس محبت کی یاد میں اپنی زندگی بغیر شادی کے گزاری ہوتی۔ لوگ اُسے دیکھتے اور اُسے ایک عجیب و غریب شخصیت سمجھتے، ایک پُر راز ہستی جو ایک کھوئی ہوئی محبت کی یاد کو کلیجے سے لگائے ہے اور اسی کے سہارے زندگی ختم کرتا ہے۔

"مگر یہ ہے کیا؟" اُس نے خیال کیا "پتنگوں کو میری کھوئی ہوئی محبت سے کیا تعلق ہے

اور یہ خیالات میرے دل میں کیسے آئے؟" اور یہ وہ نہ سمجھ سکا۔ اُس نے کروٹ لی اور اُس کے جسم کی ہڈیاں چٹ چٹ بولیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسکے نیچے کا دھڑ اُسکے بدن سے علٰحدہ ہو گیا ہے اور اُسکا نہیں ہے کسی دوسرے کا ہے۔ بستر پر اُسے کل نہیں آ رہی تھی اور اُسکے دماغ کی کوئی کل بگڑ گئی تھی اور اُسکے خیالات میں ایک جنگ سی ہو رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُسکے جسم کا ہر حصہ اُس جنگ عظیم سے منسوب ہے۔ وہ بستر سے اُٹھا اور کمبل اور تکیے لیکر وہ بستر کے نیچے فرش پر پڑ رہا تاکہ خیالات کی آمد کو روک سکے اور انتشار دماغی کو کم کرے لیکن ایسا نہ ہوا اور اُسے اپنی زندگی کے بعید سے بعید واقعات اور حادثات یاد آتے رہے جیسے اُس رات خیالات نے قسم کھائی تھی کہ اسکی ساری گذشتہ زندگی اُسکے سامنے لے آئیں گے اور دوہرا دیں گے۔

پورے دو گھنٹے گزر گئے .....

یکدم کہیں سے ایک روشنی نمودار ہوئی اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اُسکی بیوی اپنے ہاتھ میں موم بتی لیے آ رہی تھی اور اُسکے پیچھے بارہ برس کی ایک خوبصورت نازک چھوکری کشتی میں چائے کا سامان لیے تھی۔ فوراً جیسے مُردہ زندہ ہو جائے اختر چونک پڑا اور سراسیمگی میں کمبل اور تکیوں کو اُٹھا کے وہ اپنے بستر پر آیا اور ایسے اہتمام سے چُپ پڑ گیا جیسے وہ گھنٹوں سے بے خبر سو رہا ہے۔

"چائے لائی ہوں .... کیا سو گئے؟" اختر نے اپنی بیوی کی سُریلی آواز سُنی۔

اُس کی بیوی نے اُسے بیدار کیا اور لمپ روشن کیا اور اُسے چائے پلائی اور اُس سے اچھی باتیں کرتی رہی اور چلی گئی۔ خوب گہرے رنگ کی تیز چائے کی تین پیالیاں پی کر اختر کی جان میں جان آئی۔ پھر اُس نے کئی سگرٹیں سلگائیں اور ان کے دھوئیں اُڑائے اور کمرے میں ٹہلتا رہا ..... گیارہ بجے کے قریب وہ دفتر کے کمرے میں داخل ہوا اور میز کے سامنے بیٹھا اور دو بجے صبح تک خوب دھنواں دار مضمون لکھتا رہا....

میز پوش پر پروانوں کے پر اب تک پڑے تھے مگر پروانے اُڑ نا اور باہر سے پتنگے آنا اب بند ہو گئے تھے۔

جلیل احمد قدوائی، بی۔ اے

افکارِ وحشت

نہاں بلا کی تپش جانِ بیقرار میں ہے
کشش یہ کس کی دل آویزیِ بہار میں ہے

تری ادا کی جھلک شوخیِ بہار میں ہے
تری نوائے طرب نغمۂ ہزار میں ہے

نہیں ہے ایک طرف سے کشش محبت میں
کچھ اپنے دل میں ہے اور کچھ نگاہِ یار میں ہے

تو ہی تو ہے چمن رنگ و بو کا جلوہ فروش
ترا ہی عشوہ و ناز رنگینیِ بہار میں ہے

ہوا ہے مدعیِ دید و بدۂ حیراں
لبِ خموش بیانِ حدیثِ یار میں ہے

اگرچہ خاک ہوا دل ترے تغافل سے
ہنوز تیری توجہ کے انتظار میں ہے

ہم اپنے عقدۂ مشکل کو دیں مبارک باد
کسی کا گوشۂ ابرو کشادِ کار میں ہے

دلِ اسیر کا میرے رہینِ منت ہے
وہ پیچ و خم جو تری زلفِ تابدار میں ہے

مرے ہی جوشِ محبت کی ہے سکھائی ہوئی
وہ دلبری کی ادا جو نگاہِ یار میں ہے

نہیں ہیں راہ نوردانِ عشق بے ساماں
علاجِ آبلۂ پا کا نوکِ خار میں ہے

بجھا ہوا ہے دل ایسا کہ کچھ اثر ہی نہیں
نگاہِ یار کی شوخی نگاہِ یار میں ہے

جہانِ کار ہے یہ اور تو دلِ ناداں
فریبِ مسئلۂ جبر و اختیار میں ہے

گواہِ شوق نہیں صرف ایک دامنِ چاک
نشاں جنوں کا گریباں کے تار تار میں ہے

خزاں کے دست تعدی کو جس سے تھی تحریک
وہی بھراب چمن آرائیِ بہار میں ہے

اُمیدیں بڑھتی ہیں اُس کی بقدرِ مایوسی
عجیب بات یہ تیرے امیدوار میں ہے

عدوئے امن و اماں تھی کشاکشِ ہستی
میسر اب مجھے آسودگی مزار میں ہے

ہے میری آنکھ کا نور اور میرے دل کا سرور
وہ جام مے جو مرے دستِ رعشہ دار میں ہے

رہے گا دل اثرِ بیخودی سے گم کب تک
نگاہ اُسکی تقاضائے بار بار میں ہے

اثر ہوا نہ ذرا بھی ترے تغافل کا
کہ اک زمانے سے شوق اپنے کاروبار میں ہے

تمام عمر نہ اُترے گا نشۂ وحشت کا
یہی جو کیف تری چشمِ پُرخمار میں ہے

رضا علی وحشت

روح رواں

یوں تو سب جانتے ہیں کہ اُردو کا پُتلا بقول آزاد سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے بنا ہے، باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط وخال کا کام کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ زبان اُردو پر جس قدر مسلمانوں کے احسانات ہیں اُسی قدر ہندوؤں کے بھی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش کے دور میں اس حقیقت کو اکثر اصحاب نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اور سیاسی تنازع البقاء کے ہنگامہ نے ادبیات میں بھی ایک اچھا خاصا محاذ جنگ قائم کر رکھا ہے۔ ایک فریق کی کوشش تمام تر اس پر صرف ہو رہی ہے کہ زبان میں اجنبی سے اجنبی عربی و فارسی الفاظ بہ افراط استعمال کیے جائیں اور اُردو کو خالص اسلامی رنگ دیدیا جائے۔ وہ اپنے نزدیک اسی کو "ادب لطیف" کہتے ہیں کہ چند غیر مانوس الفاظ و تراکیب کو جمع کر دیا جائے۔ مطلب ہو یا نہ ہو۔ دوسرے گروہ کی سعی کا مدار اس پر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عبارت میں سنسکرت اور ہندی کے ثقیل سے ثقیل الفاظ داخل کر دیے جائیں۔ خواہ سادگی و روانی کا خون کیوں نہ ہو جائے۔ ایسے حضرات روزمرہ میں سیکڑوں عربی و فارسی الفاظ بولتے ہیں مگر عام تحریر و تقریر میں بلا تکلف ہندی لفظ تلاش کرتے ہیں۔

ایسے نازک دور میں اس مشترکہ ملکی زبان کی صحیح خدمت کی آواز جس طبقہ سے بھی بلند ہو قابل صد تبریک ہے۔

حال میں بابو جگت موہن لال صاحب رواں ایم اے ایل ایل بی وکیل اُناؤ کا کلیات اُردو نہایت دیدہ زیب طباعت کے ساتھ روح رواں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جسکو دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ برادران وطن میں اپنی ملکی زبان سے صحیح ذوق رکھنے والے موجود ہیں۔ رواں صاحب قانون اور انگریزی لٹریچر میں کافی دستگاہ رکھنے کے ساتھ فارسی ادبیات کا اچھا مذاق رکھتے ہیں اور اُردو کے ایک نکتہ سنج سخنور ہیں۔

اس حسین و جمیل مجموعہ کو اُنھوں نے منظومات، غزلیات، قطعات اور رباعیات کے عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم اگرچہ منطقی نہیں اور بجا بجا متداخل معلوم ہوتی ہے، تاہم مصنف نے غالباً اسی میں سہولت سمجھی۔ موضوعات کے اعتبار سے اُنھوں نے مناظر، واقعات،

جذبات، اخلاق، تصوف، فلسفہ، تغزل سبھی پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اپنی قدرتِ کلام اور تنوعِ تخئیل کا درخشاں ثبوت دیا ہے۔

منظومات کے تحت میں وہ نظمیں ہیں جن میں جناب رواں نے کسی تخیلی یا حقیقی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ بعض نظموں میں چند مسامحات بھی موجود ہیں جو غالباً ابتدائی مشق کے زمانہ کی یادگار ہیں، اور جو انھوں نے خود شاعر کا میلانِ سخن اور ارتقائی مذاق دکھانے کے لیے بدستور قائم رکھے ہیں۔ نظمیں مجموعی طور پر بلند اور دلآویز ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ شاعری کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں

شاعری کیا ہے اک احساسِ قوانینِ جمود — دل کے جذبات کا اظہار بتائید قیود
برہمن ہے دلِ شاعر۔ بتِ فطرت معبود — جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسنِ نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ پہ تصویر اتر آتی ہے

اللہ اللہ رے وسعتِ دامانِ غزل — بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
ختم ہونا ہے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل — پوچھیے حافظ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

جذبات کا تموج انسانی دل میں کم و بیش ہونا ضروری ہے۔ مگر شاعر و غیر شاعر میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر زیادہ حساس اور ذکی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے احساسات کو بیان کرنے کے لیے بہترین اسلوب انتخاب کر سکتا ہے۔ اس کا اندازہ کسی قدر اس نظم سے ہوتا ہے جو رواں نے لاوارث بچہ کے عنوان سے لکھی ہے۔ شاعر نے ایک نومولود حسین بچے کو دیکھا ہے جو گھورے پر پڑا ہوا ملا ہے۔ اور صحیح اس کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوا ہے۔ جسکو اس طرح ادا کیا ہے۔

آہ اے فوارۂ بزمِ رباطِ روزگار — آہ اے تازہ اسیرِ گردشِ لیل و نہار
آہ اے دیباچہ شرحِ کتابِ دردِ دل — آہ اے عنوانِ بابِ اضطرابِ جانگسل
آہ اے تفسیرِ خوابِ مستِ ایامِ شباب — آہ اے تفسیرِ کیفِ بادۂ جامِ شباب

اسی قسم کے چند اشعار کے بعد جن کی دلآویزی اور بلیغ تراکیب شاعر کی جودتِ طبع کا پتہ دیتی ہیں اس طرح استفسار ہوتا ہے

سچ بتا بچے ترا والی ہے کون — پھول ہے تو کس شجر کا اور ترا مالی ہے کون

زینتِ آغوش ہے تو جھکی رہ اور ہے کون — نور ہے جس گھر کا تو، بچے تیارہ گھر ہے کون
تو کوئی اسرار پنہانی کا دفتر تو نہیں — تو کسی میخانۂ معنی کا ساغر تو نہیں
حیف کیا میں مان لوں دنیا کے لوگوں کی دلیل — تجھ کو سمجھوں ثمرۂ بدکاریِ نفسِ ذلیل

شاعر کے خیالات میں ایک پُر اضطراب اُلجھن رونما ہے۔ ایک طرف اُس حسین و جمیل معصوم مورت کو "ثمرۂ بدکاریِ نفسِ ذلیل" ماننے سے گریز کرتا ہے۔ دوسری طرف "حضرتِ انسان کی کمزوریاں" دیکھتے ہوئے اپنے فیصلہ کو "دنیا کے لوگوں کی دلیل" کا تابع قرار دینے پر مجبور رہے۔ آخر عالمِ حیرت میں یوں چلا اُٹھتا ہے

حسن کا بربادِ ہونا کچھ مجھے بھاتا نہیں — میرے مالک کچھ سمجھ میں رازیہ آتا نہیں
باپ ماں کے نفسِ سرکش کی کہانی ہائے ہائے — اے معاذاللہ بچے کی زبانی ہائے ہائے
خود غرض انسان تیری خود پرستی الاماں — یہ تری ناعاقبت اندیش ستی الاماں

نظم کی نظم یکسر جذبات، اخلاقیات، اور ادب لطیف کا دلکش مرقع ہے۔ جناب رواں نے ایک اور نظم "شوہر کُش حسینہ" کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ جو شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔ رواں کا دل ایک طرف حسینہ کے بے پناہ حُسن کے تاثرات سے متاثر معلوم ہوتا ہے، دوسری طرف اُسکی سفاکی اور شوہر کُشی کا شکوہ سنج نظر آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بے وفا سمجھوں تجھے یا باوفا سمجھوں تجھے — حسنِ فطرت کے فرشتے بول کیا سمجھوں تجھے
کیا تجھے مظلوم کج نہمی دنیا مان لوں — یا مجسم میں کوئی سرِّ خدا سمجھوں تجھے

شاعر جو حُسن کو اپنا مرکزِ پرستش مانتا ہے اُسکی نامرادی اور شکستہ حالی دیکھ کر تصویرِ حیرت ہے۔ اور اس طرح سوال کرتا ہے

قید ہی گر تجھکو بھاتی ہے تو میرے دل میں آ — کیلئے مٹی کی دیواروں میں زندانی ہے تو
انجمن افروز ہوتی آہ تو وہ شمع تھی — کیلئے زنداں میں وقفِ سوز پنہانی ہے تو
قدسیوں میں ہو جگہ تیری ترا وہ حُسن تھا — سچ بتا کیوں مبتلائے عالمِ فانی ہے تو

ذیل کا شعر شاعر کے افتادِ طبع کی کتنی سچی ترجمانی کر رہا ہے

دوسروں کو تو کوئی وجہِ تمسخر ہو تو ہو — مجھ کو لیکن باعثِ تکلیفِ روحانی ہے تو

شاعر تو سن جذبات کو مطلق العنان چھوڑنا نہیں چاہتا اور ایک سادہ ضمیر و اخلاق کی آواز سے چونکتا ہوا کڑھ کر رہ جاتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اُسکی تعلیمِ فلسفۂ اخلاق شروع ہوتی ہے اور یہی اُسکا

کمال ہے۔ سنیے وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس میں بھی خشک، استدلال کے بدلے شاعرانہ رنگینی کا عنصر نمایاں ہے۔ یہی واعظ و شاعر کا بین فرق ہے

یہ جفائیں اے نگاہِ ظلم پرور کس لیے — یہ ستم تو نے سیے آخر ستمگر کس لیے
جانگداز کو نگاہِ ناز کافی تھی تری — ملق عاشق پر کیا تھا تیز خنجر کس لیے
کیا رہیگا آہ بتلا تیرے پائے ناز پر — تو نے کاٹا عاشق جانباز کا سر کس لیے
اضطراب دل کا تھا کیا کم تماشا دلفریب — رقص بسمل کا ہوا منظور منظر کس لیے
کیوں کیا بدنام تو نے حسن کی عصمت کو آہ — داغ ڈالا مہ میں شرم و حیا پر کس لیے

کام تو نے اے حسیں جانِ وفا کا کیونکر کیا
خون اپنے شوہر ناشاد کا کیونکر کیا

اسکے بعد وہ بیگناہ مقتولِ ستم شوہر کی نعش سے مخاطب ہوتا ہے

آہ اے مقتول۔ آہ اے کشتہ تیغ بیدریغ حسن — آہ اے صید جراحت خوردۂ شمشیر حسن
آہ اے مخمور سم گیسوئے افعی سرشت — آہ اے تازہ اسیر حلقۂ زنجیر حسن

سچ بتا دے تجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی
حسن عالم سوز کو کیوں تجھ سے ایسی کد ہوئی

پوری نظم پڑھیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

"منظر عبرت" میں ایک مزدور کی زبانی سے اُسکی داستانِ درد بیان کی گئی ہے۔ یہ غریب سادہ دل، محنت، نیکی اور خلوص کا مجسمہ ہے۔ اور تمام گھر کی اُمیدوں کا مرکز۔ مزدوری کے لیے نکلا ہے اور زمین کھودنے کی خدمت پر مامور ہے۔ اور تک اوپر سے ایک انگارہ ٹوٹتی ہے اور اُسکی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس نظم میں اگرچہ ادبی لطافت، زبان، بیان لیکن اُسکے سرتاسر پُر تاثیر ہونے میں شک نہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف پہلا بند لکھنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

منظر عبرت ہے اے رہرو ذرا تھم دیکھ لے — رو برو آئینہ اسرار عالم دیکھ لے
عالمیں دیکھے گا پھر ایسی بہت کم دیکھ لے — حسرتوں کا خوں ارمانوں کا ماتم دیکھ لے

داستان خانہ ویرانی ذرا سُن لے تو جا
سرگزشتِ عالمِ فانی ذرا سُن لے تو جا

اسی سلسلہ میں کچھ مذہبی نظمیں ہیں۔ جن میں "خلدِ بال" نسبتاً بہتر ہے۔

رواں صاحب کو ادلے جذبات کے علاوہ تصویرِ مناظر کھینچنے میں بھی خاص کمال ہے۔ گنگا کنارے کی شام نہایت پیارنی نظم ہے اور جن لوگوں نے کبھی گنگا کے کنارے شام کا دلفریب منظر دیکھا ہے وہ بیتنا اسکی داد دیں گے اور اعتراف کرینگے کہ رواں کا قلم جزئیات کا احاطہ کرنے میں کس قدر مہارت رکھتا ہے۔ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں

اُف یہ فضا ۔۔۔ یہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے — موجوں کا پیلا پن فطرت کے یہ کرشمے
حدِ نظر تک پانی پھیلا ہوا ہے پانی — پانی میں آرہے ہیں ہلکورے ہلکے ہلکے
یوں ٹمٹما رہے ہیں ایک ایک پہ موجیں — ملنے کو مضطرب ہیں گویا کہیں کسی سے
آئینہ ہے گویا اللہ ری دلفریبی — ایک آسمان اوپر ایک آسمان نیچے
یہ نشہ خیز منظر یہ دل ربا موشی — یہ ماہ فرما مناظر گنگا میں تیرے صدقے

مسرور کر رہی ہے گو ہم کو سیرِ دریا
اور خلق ہے دل کو لے کاش ہم بھی ہوتے

حصۂ منظومات کی بابت یہ بیان مکمل رہیگا اگر رواں کی نظم "دو آئینے" کی نسبت اظہارِ خیال نہ کیا گیا۔ اس میں ایک ہندو بیوہ سے پیامِ شادی اور بیوہ کا جواب ہے۔ پوری نظم کی نقل کے لیے سفینہ ناکافی ہوگا۔ اور انتخاب کرنا درحقیقت شاعر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس لیے پوری نظم کے مطالعہ کے لیے اہلِ نظر کو دعوتِ نظر دیتے ہوئے میں اس حصہ کو ختم کرتا ہوں اور قدر گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے عندیہ میں یہ نظم اردو ادب کے شاہکاروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ ہندو عورت کے جذبات کی اس سے بہتر ترجمانی میں نے نہیں دیکھی۔

غزلیات رواں دورِ جدید کے عمدہ غزل لکھنے والوں میں ہیں۔ اور تغزل، تصوف، فلسفہ، اخلاق، غرض دورِ جدید کی غزل کے تمام خصائص اُنکے یہاں ملتے ہیں۔ اُنکا فلسفۂ شعر آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔ اُردو کے قدیم اساتذہ میں رواں میر اور غالب کے معتقد ہیں۔ ان دونوں شاہانِ سخن کی بارگاہ میں وہ اپنا خراجِ عقیدت اس طرح ادا کرتے ہیں

میر سمجھا تھا فقط معنیِ اسرارِ سخن
ختم غالب پہ ہوئی گرمیِ بازارِ سخن

تغزل کی بابت اُن کا خیال ہے کہ واردات عشق کو اس طریقہ سے بیان کیا جائے کہ جو اثر بیان کرنے والے پر ہوا ہے سننے والے پر بھی مترتب ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اسلوبِ بیان اور مضمون

ایسا ہو کہ بڑے چھوٹوں کے سامنے یا چھوٹے بڑوں کے سامنے ادا کر سکیں۔ اس شرط کو نباہنے میں وہ نمایاں طور پر کامیاب ہوئے ہیں جیسا کہ آئندہ انتخاب پڑھنے والوں کو اندازہ ہوگا۔

رواں بالطبع فلسفی واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی غزلیات اور رباعیات میں فلسفہ اور اخلاقیات کا عنصر زیادہ ہے۔ تصوف کا مذاق بھی اسی کا اثر ہے۔ مگر انکا فلسفہ اور تصوف بیشتر ہندو تخیل کا رہین منت ہے اور ہر ہر قدم پر ویدانت، تناسخ، تنوطیت کی تعلیم ملتی ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید تمہید کے بجائے ہر خصوصیت سے متعلق کچھ نمونہ پیش کیا جائے جس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو سکے۔

مضامین تغزل و عشق

ذرا حسنِ نمک آلود سے کردے خبر ظالم
مرے زخمِ جگر وہ لذتیں پھر یاد کرتے ہیں

گزاری اتنی مدت قید میں صیاد کی میں نے
کہ اب ڈھونڈھے نہیں ملتا چمن میں آشیاں مجھکو

میں کہہ چلا تھا داورِ محشر سے حال دل
اک سرگیں نگاہ گلو گیر ہو گئی

طلسم وعدۂ فردا کے توڑنے والے
تجھے خبر نہیں کیا لطف انتظار میں ہے

دیکھیں گرتی ہے قفس پر کہ چمن پر بجلی
آج یا میں ہی نہیں یا مرا صیاد نہیں

میں یکجا ہی کرتا تھا اپنے حواس
کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا

قفس میں اور یہ صیاد نے مجھ پر ستم ڈھایا
نظر کے سامنے ہی لاکے شاخِ آشیاں رکھدی

آبلے دل کے یہاں ٹوٹ کے ناسور ہوئے
مڑکے دیکھا بھی نہ اُس محوِ خود آرائی نے

تری نگاہ جراحت نواز کے صدقے
یہ تازگی مرے داغِ کہن میں آئی ہے

ارے مرے دل بیگیں کے روندنے والے
بچا بچا، کہ یہ تصویر ہے زمانے کی

وہ عرضِ حال میں اشکوں پہ معترض ہیں عبث
میں کیا کروں یہی سُرخی ہے اس فسانے کی

گلہ فضول ہے طولِ شبِ جدائی کا
بہت سی راتیں ہوئیں ایک کی سحر نہ سہی

بہت دنوں میں ہوا ہے یہ فیصلہ دل کا
کہ آج چل کے چکالیں معاملہ دل کا

تصوف و فلسفہ

اشعار ذیل میں آپ ملاحظہ کریں گے کہ رواں نے فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ اور مضمون کے خشک ہونے کے باوجود انداز بیان کی رنگینی کو کہیں ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ تخیل قدرۃً بلند ہے مگر زبان میں سلاست اور بیان میں تاثیر ہر جگہ موجود ہے۔

کسی دنیا کو دکھلا اپنی آنکھیں دیکھنے والے
دوا کر ہوش کی لے کہنے والے بے نشاں مجکو

تاسف ہے اگر ہو کاوشِ سود و زیاں مجکو
کہاں سے کھینچ لائی ہے مری قسمت کہاں مجکو

اک زلف سب کے پاؤں کی زنجیر ہوگئی
جس جا پہ ختم منزلِ تدبیر ہوگئی

جلتے جب شمع کو دیکھا تو پگھلتے دیکھا
یہ بالکل بھول جاتا ہے کہ کوئی دیکھتا بھی ہے

کون تبلائے مرے خواب کی تعبیر مجھے
اب خیالات مرے دیتے ہیں تعزیر مجھے

توڑ دنیا ہے یہ آئینۂ تصویر مجھے
کہ میرے حسن کا جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے

اٹھا جاتا ہے ویرانہ میں گنج شائیگاں میرا
کسی سے پوچھتے ہیں اہلِ بینش جب نشاں میرا

اے کاش کہ میں اس میں پیدا نہ ہوا ہوتا
سنتے پذیر ہوں ستمِ روزگار کا

حیف کچھ ایسی بھی باتیں ہیں کہ جو یاد نہیں
آوارۂ منزل ہوں آوارۂ منزل تھا

جو کم نظر ہیں اُسے شمعِ جاں بھی کہتے ہیں
دولتِ ہمہ عالم میری تنگدستی ہے

اپنی لے نے بیخبر اے نے ترے نغمہ کی صدا
قلب سیاہ ہوگیا کاوشِ امتیاز میں

اُف یہ کسی نے کیا کہا خاص زبان راز میں
کہ کوندنے لگا ایک ایک ذرہ بزمِ امکاں کا

آئینہ کہہ رہا ہے کہ آئینہ ساز تھا
تصویر سمجھتا ہوں پہ وہ نظر آتا ہے

یہ محض مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اُنکے اکثر اشعار کی تان تصوف یا فلسفہ پر آکر ٹوٹتی ہے۔ ہر شعر کی تفصیل کیجائے تو مضمون زیادہ طویل ہو جائے گا۔ اسلیے دوسرے اصنافِ سخن کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔

قطعات ۔ میں بھی بیشتر یہی انداز پایا جاتا ہے اگرچہ اتنے دلکش نہیں۔ نمونہ کے طور پر ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

جہانِ عشق میں بیہوشیوں کی انتہا جو ہے — وہیں سے عالمِ عقل و خرد کی انتہا سمجھو
علاج درد کا جب تک دلِ غافل رہے غافل — وہی حد ہے کہ جب تک تم مرض کو لادوا سمجھو

رباعیات۔ ڈیڑھ سو سے کچھ اونچی ہیں اور ان میں سے اکثر خیالات کی بلندی اور زبان کی صفائی کے لحاظ سے اُردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ رواں کو رباعی سے خاص شغف ہے اور وہ رباعی نویس کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ یوں تو اُنکی غزلیں اور دوسری نظمیں بھی عموماً مذاقِ عام سے بلند ہیں، لیکن رباعی میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز و مخصوص درجہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے وسیع خیالات کو ادا کرنے کے لیے رباعی کی تنگنا ے کو منتخب کیا ہے۔ اور جہاں جہاں انکا توسنِ قلم اس نازک اور دشوار گزار مرحلہ سے عہدہ برآ ہوا ہے اُسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔ خیالات زیادہ تر تصوف یا فلسفہ کے بحث سے متعلق ہیں اور وہی ہر جگہ بار بار آتے ہیں۔ اگرچہ بیشتر مقامات پر شاعر نے اپنے طرزِ ادا سے گونہ تازگی پیدا کردی ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر ہم چند عنوانوں کے ماتحت بعض رباعیوں کے نمونے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں:۔

تدبیر و تقدیر

تدبیر پہ منحصر نہ اوقات پہ ہے — انجامِ عمل خدا ہی کی ذات پہ ہے
یہ کوششِ نامراد کہتی ہے رواں — تقدیر کی راہ اتفاقات پہ ہے

ایضاً

مذہب فقط اک ہوس ہے ایمان نہیں — باب ایمان کا کوئی عنوان نہیں
نیکی کرنا تو خیر مشکل ہے رواں — بندے کے لیے گنہ بھی آسان نہیں

آزادی و اسیری

آزاد ضمیر ہو فقیری یہ ہے — دل بے پروا رہے امیری یہ ہے۔
زنجیر نہیں ہے باعثِ قید رواں — محدود رہے خیال اسیری یہ ہے

تنوعیت

دھوکے میں جہاں کے ہر بنی آدم ہے — عنوان خوشی بھی سُرخیِ ماتم ہے
یہ فیصلۂ نگاہِ عبرت ہے رواں — عشرت کدۂ جہاں میں غم ہی غم ہے

حقیقتِ انسانی

جتنا بیہوش تر ہوں دانا تر ہوں — جتنا مشہور تر ہوں رُسوا تر ہوں
اے میرے ٹٹانے والے معلوم نہیں — میں ہستی و نیستی سے بالا تر ہوں

رازِ عالم

غم کی عظمت کسی کو معلوم نہیں — رازِ فطرت کسی کو معلوم نہیں
سب محوِ خیالِ اہلِ دنیا ہیں رواں — اپنی قیمت کسی کو معلوم نہیں

ایضاً

دل! رازِ ثبات تجکو معلوم نہیں — اصلی حالات تجکو معلوم نہیں
تو نقطۂ اصل و مرکزِ ہستی ہے — شاید یہ بات تجکو معلوم نہیں

ثباتِ ہستی

ہے گرم چہار سمت بازارِ فنا — ہے دارِ حیات سربسر دارِ فنا
لیکن کیونکر جہاں کو فانی سمجھوں — ذرّے کو بھی حبب نہیں ہے اقرارِ فنا

تناسخ

یہ ہستی جزو و کُل نہیں ہونے کی — ہستی پابندِ مُل نہیں ہونے کی
محفل بدلے لگن بدل جائے مگر — یہ شمعِ حیات گُل نہیں ہونے کی

فلسفۂ گناہ

گر پھر کبھی زندگی عنایت کرنا — مالک میرے خودی عنایت کرنا
ہوتے ہیں گناہ وجہِ تکمیلِ حیات — پھر ذوقِ گناہ ہی عنایت کرنا

تہذیب و فطرت

تابع ہمیں عقل کا کیے دیتی ہے — آزادیِ دل فنا کیے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے — فطرت سے ہمیں جدا کیے دیتی ہے

تشکیک

دیں شیخ کا - مذہب برہمن کیا ہے کیا غایت جاں ہے مقصد تن کیا ہے
دھوکے ہیں یہ قصہ ہائے نار و جنت کس کو معلوم ہے بعد مُردن کیا ہے

بعض رباعیوں میں اپنے رنگ کے خلاف رندی و سرمستی کے خیالات ادا کیے ہیں - اور اس جوش و خروش کے ساتھ کہ تعجب ہوتا ہے کہ آیا یہ وہی غم پرست شاعر ہے! کوئی اور ایک رباعی سنتے جائیے :-

نوروز ہے غرق بادہ و نیا کر دے میرا ارمان آج پورا کر دے
پیالوں میں شراب بھر کے اس میں ساقی تو کاسۂ آسماں کو سیدھا کر دے

ہمیں رواں صاحب کے فلسفۂ حیات سے اختلاف ہو یہ امر دیگر ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے کوکشن (معتقدات) کو جوش اور رنگینی کے ساتھ شاعری کے پیرایہ میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں - اور خصوصاً رباعی میں وہ ایک بلند پایہ سخنور سمجھے جانے کے اہل ہیں -

اسی کے ساتھ ساتھ کلیات میں بعض مقامات پر زبان کی خامیاں اور فروگذاشتیں نظر آتی ہیں مثلاً صفحہ ۳۷ پر پران ناتھ استعمال کیا ہے حالانکہ تقطیع میں پ یا ر گر جاتی ہے - اگرچہ ہندی میں ان دونوں حرفوں کا تلفظ ایک حرف کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے، مگر اردو اسکی متحمل نہیں ہو سکتی - صفحہ ۴۰ پر ذوالاکرام ہے - جسکے کچھ معنی نہیں - ذوالکرم اس موقع پر ہونا چاہیے یا قافیہ و وزن کی رعایت سے نیکنام وغیرہ - اکثر جگہ لگانے قابل، دیکھنے قابل لکھا ہے - حالانکہ یہ غیر فصیح ہے - اسی طرح سے صفحہ ۸۴ پر مسافر کے بدلے سفیر کا لفظ بے محل ہے - صفحہ ۱۴۲ پر ہر بنی آدم تحریر کیا ہے - ظاہر ہے کہ بنی آدم جمع ہے اُسپر ہر بنی آدم لکھنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے -

علاوہ بریں صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۶ پر مثنویات کو قطعات کی ذیل میں درج کر دیا ہے - اور اسی قسم کی چند اور فروگذاشتیں ہیں - جو اگر نہ ہوتیں تو بہتر تھا - تاہم ان جزوی تسامحات کی بنا پر جناب رواں کے کلام کے مجموعی اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا - بلکہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اپنے کمال کی وجہ سے ملک کے خوشگو شعرا کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں -

ضیاء احمد ایم اے بدایونی
(لکچرار - علیگڈھ)

۲۲ - اکتوبر ۱۹۲۸ء

غلط رہ نمائی

دو چیز تیرۂ عقل است، دم فرو بستن
بوقتِ گفتن، و گفتن بوقتِ خاموشی

لکھنؤ میں آل انڈیا پارٹیز کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے، ہندوستان کے زعماء و رہنمایانِ قوم و ملک یکجا ہوتے ہیں۔ چار روز کامل جلسوں، مشوروں اور فیصلوں میں گزرتے ہیں اور خاتمہ پر شرکاءِ مجلس اس عظیم الشان جلسہ کے بخیر و خوبی اتمام پر باہم مبارکباد دیتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گذشتہ چند سال کی خانہ جنگیوں اور بہیمیت کی نمایش کے بعد بالآخر ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہاتھ آگیا جس سے بدنصیب ہندوستان تیرہ و تاریک ہنگاموں سے نکل کر آزادی کی روشنی بخش جدوجہد میں گامزن ہونے کے لائق بنجائیگا، اور ملک میں پھر وہی یکجہتی و اتحاد کی ہوا چلنے لگیگی جو ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے اندر سوراج حاصل کرنے کی دلخوش کُن توقعات پیدا کرنے کی موجب ہوئی تھی۔

کانفرنس کے اندر مسلمانوں کی تینوں بڑی سیاسی مجالس کے نمایندے تشریف رکھتے ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے اُس ذیلی مجلس کے اراکین موجود ہیں جو ہندوستان کے لیے دستور اساسی ترتیب دینے کے متعلق غیر مسلم جماعتوں سے گفت و شنید کرنے پر مامور تھی، مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ تین روز تک لکھنؤ میں منعقد رہتا ہے، اور آخری دن میں نمایندے کانفرنس کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ اپنی محترم جماعت کی طرف سے دس بزرگوں کو نمایندگی کے لیے انتخاب کرتی ہے۔ کانفرنس کا اجلاس قیصر باغ کی شوربارہ دری میں بڑے طمطراق اور جاہ و جلال کے ساتھ شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے دستور اساسی مرتب کرنے والی کمیٹی کے اراکین کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف اور شکریہ کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ مجلس خلافت کی طرف سے مولانا شوکت علی صاحب نہرو کمیٹی کا شکریہ ادا فرماتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ایک حرفِ مخالفت بھی زبان سے نکلے تو میری زبان مفلوج ہو جائے، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلماء اپنی محترم مجلس کی طرف سے شکریہ ادا فرماتے ہیں اور مولوی محمد یعقوب صاحب گذشتہ اجلاس مسلم لیگ کے صدر مسلم لیگ کی نمایندگی فرما کر تجویز شکریہ کی تائید فرماتے ہیں۔ اور جب تجویز کی منظوری کا وقت

آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مولانا حسرت کے سوا جنکی مخالفت کی تائید اُس جماعت کے کسی رکن نے بھی نہ کی جسکے نمایندہ ہوکر وہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، کسی کو اظہار تشکر میں عار نہیں۔

اسکے بعد ڈومینین سٹیٹس (یعنی برطانوی نوآبادیات کے مساوی درجہ) والی تجویز پیش ہوئی تو سب سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو ایک اعلان برأت پڑھتے ہیں جس پر اُنکے علاوہ دیگر ہندو مسلمانوں کے دستخط ثبت تھے اور جسکا مفہوم یہ تھا کہ ہم لوگ آزادیِ کامل کے حامی ہیں اس لیے حصول مدعا کے لیے اپنی آزادیِ عمل کو قائم رکھتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ اس تجویز کی تائید ہم نہیں کر سکتے، مگر چونکہ کانفرنس کے کام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے اس لیے اس تجویز کے متعلق ووٹ دینے سے ہم اجتناب کریں گے۔ پھر مسٹر سبھاش چندر بوس اپنی اور شعیب قریشی صاحب کی جانب سے اعلان فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم لوگ اس کمیٹی کے رکن تھے جس نے یہ دستور اساسی مرتب کیا ہے، لیکن آزادیِ کامل کی جد وجہد کرنے کے متعلق ہم بھی اپنی آزادیِ عمل پر قرار رکھیں گے۔ البتہ اس تجویز کی منظوری میں حارج نہ ہونگے اسکے بعد خلافت کمیٹی کی جانب سے مولانا شفیع داؤدی صاحب صدر مجلس خلافت، اور جمعیۃ العلماء کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند بھی اسی قسم کے اعلان فرماتے ہیں، اور بالآخر مولانا حسرت موہانی کی واحد اختلافی رائے کے ساتھ تجویز منظور کرلی جاتی ہے۔

اب فرقہ وارانہ مسائل کی باری آتی ہے اور سب سے پیشتر مسئلۂ سندھ کے بارے میں اعلان ہوتا ہے کہ سندھ کے ہندو مسلمان اور پارسی نمایندوں نے باہمی سمجھوتے سے ایک تجویز منظور کرلی ہے جس پر مسلمانوں کی جانب سے مولانا شوکت علی صاحب اور مولانا شفیع داؤدی صاحب نے بھی دستخط فرمادیے ہیں۔ اور یہ تجویز جلسہ کے سامنے پیش ہوکر منظور کی جاتی ہے۔ ٹھیک معلوم نہیں کہ مولانا حسرت نے جو ہر تجویز سے اختلاف کرنے کے لیے گویا مامور تھے اس تجویز کے بارے میں اپنا اختلاف ثبت کرایا یا جلسہ کے اندر جس جوش و خروش کا اظہار اس موقع پر کیا گیا اُس نے اُنکو اپنے وظیفہ سے غافل کردیا۔

پھر تالیوں کی گونج میں پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ نمایندوں کی جانب سے ایک متفقہ سمجھوتہ پیش ہوا۔ جسکے متعلق مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی کو ضامن بناتے کے بجائے غلطی سے ڈاکٹر سپرو، مولانا ابوالکلام اور مسٹر سروجنی نائیڈو کو واسطہ بنایا گیا تھا۔

مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب، جمعیۃ العلماء کے چار محترم نمایندے مراجعت فرمائے وطن ہو چکے تھے ورنہ وہ مشاہدہ

فرماتے کہ جب یہ سمجھوتہ سنایا گیا اور اس پر دستخط کرنے والوں کے نام پڑھے گئے تو شرکائے بزم نے کس درجہ مسرت و انبساط کا اظہار کیا۔

وقتاً مولانا شوکت علی صاحب "اوسٹرم" (تقریر کرنے کا مقام) پر تشریف لائے اور پھرے ہوئے انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں اعلان فرمایا کہ خلافت کمیٹی نے اسکے خلاف تجویز منظور کی ہے اور خلافت کمیٹی اُسی تجویز پر قائم ہے۔

بجلی کی کوندھ دیکھکر یا بادل کی گرج سُن کر جو حالت لوگوں کی ہوتی ہے بعینہٖ یہی سماں اُسوقت جلسہ میں نظر آرہا تھا۔ غیر مسلم انگشت بدنداں تھے کہ صوبۂ پنجاب کے نمائندوں کے باہمی سمجھوتے کے بعد اس قسم کے اعلان کا کیا محل تھا۔ اور مسلمان ندامت سے سرنگوں تھے کہ اُنکے محبوب ترین رہنما مقتضیاتِ وقت سے کس درجہ ناآشنا ہیں۔

اسی حالت میں بعض نمائندگان پنجاب نے مولانا سے استفسار کیا کہ مجلس خلافت نے اس قسم کے اعلان کی کب ہدایت کی تھی، اور مولانا نے زبان سے کم مگر چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ کی جنبشوں سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس کا جواب بھی مرحمت فرمایا اور اُنکے نیچے اُترتے ہی مولانا عبدالقادر قصوری نے پنجاب کے مسلمان نمائندوں کے طرزِ عمل کے حق بجانب ہونے کے متعلق ایک واضح بیان دے کر اہلِ جلسہ کی تشویش و حیرت کو دفع کر دیا۔

پھر بنگال کی جانب سے مسٹر سین گپتا اور مولانا اکرم خاں صاحب نے اعلان کیا کہ بنگال کے ہندو مسلمانوں کو نہرو رپورٹ کی وہ تجاویز منظور ہیں جنکا تعلق اُس صوبہ کی فرقہ وارانہ نمائندگی سے ہے۔

اب بقیہ سفارشات کے متعلق ترمیمات پر بحث شروع ہوئی نمائندگان جمعیۃ العلماء میں سے مولانا حسرت کو سب سے زیادہ تقریر فرمانے کے مواقع حاصل ہوئے کیونکہ اُنھیں بابے بسم اللہ سے لیکر نامے تمت تک غالباً ہر چیز سے اختلاف تھا۔ اور دس نمائندوں میں سے ایک جب فرض کفایہ کی ادائگی کے لیے اس درجہ مستعد ہو تو بقیہ اصحاب کے سر سے ساری ذمہ داری ساقط ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔

مسلم لیگ کے نمائندوں میں سے مولوی محمد یعقوب صاحب تو اسے شکریہ کے ساتھ ہی تشریف لے گئے تھے البتہ ڈاکٹر کچلو اور مسٹر چھاگلہ کانفرنس کی کارروائی میں برابر حصہ لیتے رہے اور آخر الذکر کی ایک اہم ترمیم بحث مباحثہ کے بعد اصولاً قبول بھی ہوگئی

مجلس خلافت کے نمائندوں میں سے پنجاب کے بعض اصحاب نے پورا پورا حصہ لیا۔ مولانا شوکت علی تو پہلے ہی شیر مار چکے تھے اس لیے اب چھوٹے چھوٹے پرندوں اور ننھے ننھے پرندوں کے شکار کی طرف کیوں مائل ہوتے۔ البتہ مولانا شفیع داؤدی صاحب نے بعض ترمیمات پیش کیں۔ ایک میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بعض تبدیلیاں تجویز کیں جسے انھوں نے بھی قبول فرما لیا اور کانفرنس نے بھی اسکی منظوری دیدی۔ بعض کے متعلق صدر نے یہ فیصلہ کیا کہ منظور شدہ تجاویز کی بدولت اب یہ ترمیمات خلافت ضابطہ ہوگئیں اور آخری ماندہ ترمیم پیش کرنے کے وقت معلوم ہوا کہ صاحب موصوف صدر کے اس فیصلہ سے ناراض ہو کر کسی دعوت میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ اور انھوں نے یا مولانا شوکت علی صاحب نے خلافت کمیٹی کے کسی دوسرے نمائندے کو بھی یہ خدمت سپرد نہیں فرمائی کہ اس ضروری ترمیم کو جلسہ کے روبرو پیش کرے۔

دو دن بعد مولانا شوکت علی صاحب لکھنؤ سے دہلی پہونچے اور ہمدرد کے ذریعہ آل پارٹیز کانفرنس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اور بمبئی پہونچ کر کانفرنس کی مخالفت میں اخبار خلافت کے ذریعہ مسلسل گولہ باری شروع کر دی گئی اور کانفرنس کے ساتھ ہی ساتھ مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام اور "پنجابی ٹولی" سبھی کو تاک تاک کر مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔

ادھر مولانا شوکت علی نے شبخون مارا اور ادھر جمعیۃ علماے ہند کے اخبار الجمعیۃ نے باڑھ مارنا شروع کر دی اور حضرات صدر و ناظم جمعیۃ نے اسی پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ بعض مشتبہ چال چلن کے لوگوں کی معیت میں جامع مسجد دہلی میں ایک جلسہ کر کے گہار مچا دی کہ لکھنؤ میں مسلمانوں کا قتل عام ہو گیا۔

ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ایسی جماعتیں پہلے سے موجود تھیں جو آتش افتراق کو شعلہ زن کرنے کے لیے ہوا دینے پر مامور تھیں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مولانا شوکت علی اور جمعیۃ العلماء کی شرکت سے انکے نصیب کھل گئے۔ اور سارے ملک میں طوفان و تلاطم بپا ہو گیا۔ اور مسلمانان ہند دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

نہرو رپورٹ کوئی حدائی ضابطہ نہ تھا کہ اسکے خلاف زبان کھولنا گناہ قرار پائے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے انعقاد کی غرض ہی یہ تھی کہ اس رپورٹ کے مالہ وما علیہ پر غور و بحث ہو۔

کوئی شخص یہ توقع نہیں کرتا تھا کہ ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں میں سب ہی اسکے حرف حرف کو تسلیم کرلیں گے۔ اور کم سے کم ہر قوم کے اندر ایک جماعت ایسی ضرور موجود تھی جسکے متعلق آسانی پیشینگوئی کی جاسکتی تھی کہ خواہ باہم اُنکے درمیان کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو مگر اس رپورٹ کی مخالفت میں وہ ضرور متفق الخیال ہونگے۔

لیکن یہ توقع بیجا نہ تھی کہ ملک کے وہ تمام ہی خواہ، جو موجودہ اجنبی حکومت سے کسی نہ کسی حد تک بیزار ہیں اور متمنی ہیں کہ اس ملک میں بھی اہل ملک کو وہی حقوق حاصل ہوں جو اغیار اور دنیا کی اکثر دوسری اقوام کو اپنے اپنے ممالک میں حاصل ہیں، اس رپورٹ کو پورے غور و خوض اور ضروری تغیرات و ترمیمات کے بعد ضرور قبول کرلیں گے تاکہ کسی قسم کی مشترکہ جد و جہد ممکن ہو۔

مجلس خلافت کے ایک مخلص کارکن، اس رپورٹ کی تیاری میں شریک رہے تھے اور سوائے ایک دو باتوں کے رپورٹ کے بقیہ حصص کے بارے میں اُن کا اختلاف بھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔

مجلس خلافت میں جب تین دن کے قریب بحث ہوئی تو اُسوقت بھی صرف بعض جزئیات میں ترمیم کا مطالبہ کیا گیا۔ پوری رپورٹ مسترد نہیں کی گئی۔

جمعیۃ العلماء نے البتہ غالباً اس غلط فہمی (غلط فہمی اس لیے کہ بعد کو ڈاکٹر انصاری صاحب نے تحقیقات کی تو آل پارٹیز کانفرنس کا دعوت نامہ دفتر جمعیۃ العلماء کے کاغذات سے برآمد ہوا) میں کہ آل پارٹیز کانفرنس نے اُسکو دعوت شرکت نہ دے کر اُسکی اہمیت کو نظر انداز کیا، اپنی بعض مخالفانہ رایوں کو قبل از وقت شایع کردیا۔ لیکن جب اُسکے نمایندے کانفرنس میں شریک ہوئے تو اُن کا فرض تھا کہ جن جن امور میں اختلاف تھا کانفرنس کے روبرو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتے اور شرکائے کانفرنس کو موقع دیتے کہ اُنکے اعتراضات کو جانچیں اور فیصلہ کریں کہ وہ کہاں تک قابل قبول یا لائق استرداد ہیں۔ لیکن یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ دلوں کی باتیں زبانوں پر نہیں آئیں۔ بیشتر حضرات صم و بکم بنے بیٹھے رہے اور اب ہر طرف سے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کیا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق پامال ہوگئے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوگیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر غور کیا جائے تو اس سارے شور بے ہنگام کا باعث سوائے اسکے کیا ہوسکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب کے بقول آل پارٹیز کانفرنس میں بعض رہنمایان خلافت اور چند علماء کرام کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوئی جسکے یہ حضرات اپنے مقتدر سنا صب کے لحاظ سے حقدار تھے۔

اگر یہی تھا، اور اسکے سوا بظاہر کوئی معقول بات کہی بھی نہیں گئی، تو ذرا غور کرنا چاہیے کہ اسکی ذمہ داری کس پر ہے؟ مولانا شوکت علی صاحب اور مولانا شفیع داؤدی صاحب دونوں بڑے صدر کے پشت پر جو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں وہیں مولانا ابوالکلام اور مہاراجہ صاحب محمود آباد وغیرہ کے پاس تشریف فرما تھے۔ اور جب سندھ کا معاملہ پیش ہوا تو باوجودیکہ ان حضرات کو سندھ سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا مگر انکی نزاکت پر نظر کرکے ان دونوں صاحبوں سے بھی سندھ کے سمجھوتے پر دستخط کرائے گئے۔ حضرات علمائے کرام جلسہ میں بہت دیر کو تشریف لائے اور آخری نشستوں میں دیگر نمایندگان جمعیۃ العلماء و مجلس خلافت کے پاس بیٹھ گئے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کو یہ امر مناسب معلوم ہوا تھا تو وہ بہت آسانی سے بابو موہن لال سکسینہ یا اور کسی کارکن کو توجہ دلاکر ان حضرات کے لیے عمدہ نشست کا انتظام فرما سکتے تھے۔ بلکہ زیادہ آسان یہ تھا کہ وہ خود آگے کی صف میں جہاں تشریف رکھتے تھے اس جگہ کو خالی کرکے ایک صاحب کو وہاں لیجا کر بٹھا دیتے جسکے بعد منتظمین کا توجہ کو غالباً اس غلطی کے انسداد کی طرف توجہ ہو جاتی۔ مگر شاید وہ بھول گئے ؎

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است

اور اسلامی تعلیم کے بموجب تو غالباً یہ بات ایسی وقیع نہ تھی کہ اتنی اہم مجلس کی کارروائی پر اس کا اثر پڑنے دیا جاتا۔ پھر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی کو تو اس کی بھی شکایت کا موقع نہیں۔ اور اسی لیے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچنا پڑتا ہے کہ ان حضرات کی موجودہ روش کا سبب کچھ اور بھی تھا۔ وہ سبب کیا ہو سکتا ہے؟

کیا یہ کہ مجلس خلافت کے آخری اجلاس میں مولانا شوکت علی صاحب کی رائے و مرضی کے خلاف انگورہ فنڈ کے اس مسئلہ سے جو اسی جلسہ میں مجلس خلافت کی ملک قرار دیدیا گیا، بیس ہزار روپیہ جامعہ ملیہ کی اعانت میں دینا منظور ہوا۔ اور اسکی ذمہ داری انکی رائے گرامی میں ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام اور پنجابی ٹولی کی سازش پر ہے۔ یا پھر جیسا کہ انکی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کہ پنجاب کے بارے میں جو سمجھوتہ ہوا ہے اسکے متعلق انکی رائے والا یہ ہے کہ پنجابی ٹولی اور مولانا ابوالکلام نے اس سمجھوتے کے ذریعہ سے مجلس خلافت کو ذلیل و خوار کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے، میں کچھ ذاتی واقفیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اتفاق سے اسوقت میں مجلس خلافت کے جلسہ میں موجود نہ تھا۔ البتہ جو کچھ سنا اسکی بنا پر سمجھتا ہوں کہ خواہ یہ تصفیہ مولانا شوکت علی صاحب کی رائے کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہوا ہو، مگر یہ بات کچھ ایسی نہ تھی کہ

اس کا اثر آل پارٹیز کانفرنس کے معاملات میں قبول کیا جاتا۔

اب رہی دوسری بات، تو میری ناقص رائے میں اول تو مرکزی خلافت کمیٹی کی ذلت و رسوائی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ سمجھوتہ کرنے کے گناہگار سب کے سب مجلس خلافت کے رکن ہیں۔ اور کم سے کم دو حضرات ایسے ہیں جو سنین ماضیہ میں مجلس خلافت کے صدر رہ چکے ہیں۔ دوسرے جو تھوڑی بدنمائی پیدا ہوئی ہے اُسکے ذمہ دار بھی بہت کچھ مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی ہیں۔ کیونکہ سمجھوتے کا اعلان ہونے سے قبل دونوں حضرات کو بتا دیا گیا تھا کہ نمائندگان پنجاب کیا تصفیہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور اُنکا فرض تھا کہ وہ مجلس مرکزیہ خلافت کا ملتوی شدہ جلسہ طلب کرتے اور تمام صورت حالات کو اُسکے روبرو پیش کرکے از سر نو فیصلہ کرا لیتے۔ اور جیسا کہ مجلس خلافت کے اندر رائے شماری سے ظاہر ہوا تھا یہ امر یقینی ہے کہ مجلس خلافت اس سمجھوتے کو قبول کر لیتی کیونکہ ابتداءً جب یہ مسئلہ پیش ہوا اور رائے شماری کی نوبت آئی تو پہلے اہل پنجاب کی رائے لی گئی۔ ۴ نے تحفظ نشست کے خلاف اور ۱۱ نے موافق رائے دی۔ پھر جب سب اراکین کی رائے لی گئی تو اُسوقت ۲۶ موافق اور ۱۵ مخالف تھے۔ اب اگر یہ سمجھوتہ سامنے آتا تو ۱۵ پنجابی اور ۱۱ دیگر صوبجات کے نمائندوں کی مجموعی طور پر ۲۶ رائیں سمجھوتہ کے موافق ہوتیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ رائیں مخالف۔ بہت ممکن تھا کہ مخالفت کرنے والوں کی تعداد اس سے بھی کم ہو جاتی اسلیے کہ تحفظ کی موافقت میں رائے دینے والوں میں سے بعض حضرات نے محض اہل پنجاب کی اکثریت کا ساتھ دیا تھا۔ کانفرنس میں جانے سے قبل بھی عرض کیا گیا اور کانفرنس میں سمجھوتہ ہو جانے کے بعد تو بہت سے اراکین خلافت نے تحریری درخواست دی کہ مجلس خلافت کا ملتوی شدہ جلسہ طلب کیا جائے۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

بہرحال اس تمام روداد سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے رہنمایان کرام کے سامنے قوم و ملک کی فلاح و بہبود کے بجائے ذاتیات کا سوال کتنی زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور شکوک و شبہات یا کہ رنجش پر ملک و قوم کے اہم سے اہم مقاصد کس طرح قربان کر دیے جاتے ہیں۔ اور بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ

اب کسے رہنما کرے کوئی؟

۲۷۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء　　ظفر الملک

نظرے خوش گزرے

سفیر اودھ ، اس پرچہ میں مکمل ہوگئی ہے۔ صرف سرورق چھپنا باقی ہے۔ جن اصحاب نے اسکے اوراق رسالہ سے علیحدہ کرکے کتابی صورت میں رکھے ہوں دفتر کو مطلع فرمائیں تاکہ سرورق چھپنے کے بعد ارسال خدمت کیا جائے۔

ہمدرد کے سلسلہ میں دہلی کی مسلسل ہفتہ وار حاضری کا نتیجہ یہ ہوا کہ الناظر کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہوتی رہی تا آنکہ اب ختم سال میں دو ماہ سے بھی کم باقی رہ گئے ہیں اور الناظر کے چھ پرچے شایع ہونا باقی ہیں۔ پہلے خیال تھا کہ دو سہ ماہی نمبر نکال کر سال آیندہ سے پرچہ کی بروقت اشاعت کا انتظام کیا جائے مگر آیندہ چند ہفتوں میں، غیر معمولی مصروفیت کا سامان فراہم ہے، اسلئے امید نہیں کہ اس پر عمل کیا جاسکے گا۔

ماہ رواں کے آخر میں سائمن کمیشن ناخواندہ مہمان بنکر لکھنؤ آرہا ہے اور دس دن تک یہاں قیام کرنیوالا ہے۔ ان بن بلائے مہمانوں پر اہل شہر کو مختلف مظاہروں کے ذریعہ یہ امر واضح کرنا ہے کہ دفتری اقتدار کے کارندے خواہ کتنے ہی نمایشی طریقوں سے انکا خیر مقدم کریں مگر اہل لکھنؤ اس خیر مقدم میں شریک نہیں۔ پھر ۶ دسمبر کو مولانا محمد علی صاحب یورپ سے ہندوستان واپس پہونچنے والے ہیں۔ انکی تشریف آوری پر ہمدرد کے سلسلہ میں غالباً کامل ایک ہفتہ دہلی میں رہنا ہوگا اور بڑے دن کی تعطیل میں قومی ہفتہ کی شرکت کے لیے کلکتہ جانے کا قصد ہے۔ ان تمام مصروفیتوں کو پیش نظر رکھ کر تہیہ کرنا پڑا ہے کہ ۱۹۲۸ء کی دوسری ششماہی کا کوئی پرچہ شایع نہ کیا جائے بلکہ نئے سال سے الناظر کو بروقت شایع کرنے کی کوشش کی جائے۔ جن اصحاب کی سیاد خریداری جون میں ختم ہوتی ہے انکا سال خریداری آیندہ جولائی کے بجائے جنوری سے شروع ہوگا اور جنوری ۱۹۲۹ء کا پرچہ انکی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کیا جائیگا۔ اور بقیہ اصحاب کی سیاد میں چھ مہینے کی توسیع کردی جائیگی تاکہ کسی صاحب کا اس تاخیر سے نقصان نہ ہو۔

مری جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل بی وکیل غازی آباد الناظر کے لیے امریکہ کی تاریخ ترجمہ و تلخیص کے لیے تیار کررہے ہیں۔ انشاء اللہ نئے سال سے اسکے اوراق ماہ بماہ نذر ناظرین ہونگے۔ اور کوشش کیجائیگی کہ ۱۹۲۹ء کے اندر اندر یہ کتاب مکمل ہوجائے۔ وما توفیقی الا باللہ

ظفر الملک ۔ ۸ نومبر ۱۹۲۸ء

عجز اور قصور ہمت کا عایق نہ ہو تو مجھے ایسی امید داری ہے کہ میرے امثال مین کسر کسی کو ہوگی
جب تک تلاش کی طرف توجہ نہین ہے البتہ کچھ عسرت اور افکار مین گرفتاری ہے چنانچہ
اوسی خانہ نشینی کے عرصہ مین بدون اس کے کہ میری طرف سے کچھ درخواست ہو نواب
محمد علی خان ٹونک کے نواب نے کمال آرزو سے گھر بیٹھے مجھے طلب کیا اور پانسو روپیہ
ماہہ میرا مقرر کیا۔ بعضے وجوہ سے اوس کے قبول کرنے مین تامل تھا آٹھ مہینے تک راقم نے
آرے اور بلے مین رکھا اور باوصف اونکے اصرار کے اور تاکید طلب کے وہان جانے کا اتفاق نہ
ہوا۔ اس عرصہ مین اون پر ایک مصیبت آئی یعنی سلطنت انگریزی کی عدالت اور انصاف
نے اون کو حکومت سے معزول کر دیا اب اصرار اور مبالغہ نواب محمد علی خان کا میری طلب مین اور
زیادہ ہوا اور جو قصہ اون کی معزولی کا سنا اوس سے معلوم ہوا کہ جن رفع مظالم کی
نیت سے اون کی معزولی ہوئی اوس مین اوس بیچارے کی ذات پر مظالم واقع
ہوے اگرچہ پچھلے امتحانون سے راقم اپنے دل مین عہد کر چکا تھا کہ کبھی ہندوستان
کے پولیٹکل یعنی نظم سلطنت کے باب مین گورنمنٹ کی تدابیر کے مخالف کسی تدبیر مین
راقم شرکت نہ کریگا لیکن صرف اس نظر سے کہ ایسے اوقات مین اس جنس کے رؤسا اکثر
غدار اور مفسد اور طماع لوگون کے پھندے مین پڑ جاتے ہین اور تباہ ہوتے ہین شاید اگر میرے مشورہ
کو قبول کرین تو اون کے دستبرد سے بچین اور اس معزولی کی بلا سے زائد اور تباہی مین نہ پھنسے ہین
راقم نے اون کی رفاقت اور مصاحبت قبول کی اگرچہ اوسکے قبول کرنے مین راقم فی الجملہ اپنی
تہنک سمجھتا تھا جب راقم اون کے پاس آیا تب اونھون نے نہایت عجز و الحاح سے مجھ سے کہا
کہ پانسو روپیہ مہینا جو حالت قیام ریاست مین اونھون نے وعدہ کیا تھا اب اوس کا ایفا اون سے
نہین ہو سکتا ایک مہینا اوس حساب سے دیکے درخواست کی کہ تین سو روپیہ مہینا سے زیادہ کے
اب وہ متحمل نہین ہو سکتے چونکہ مین اون کے پاس آچکا تھا اور وہ عذر اون کا قابل قبول تھا راقم نے
قبول کیا دو برس تک باوصف اس کے کہ اون کی رفاقت مین راقم کا بہت نقصان ہوا اون کے

راقم کو نواب محمد علی خان نواب ٹونک نے بلا طلب کیا اور پانسو روپیہ ماہہ مقرر کیا

نواب محمد علی خان نے معزولی کے بعد طلب کیا اور راقم نے رفاقت قبول کی

ہمراہ رہا۔ اس صحبت دراز مین اگرچہ اون کو راقم نے حسن اخلاق اور تواضع اور فروتنی اور بعضے اور صفات مستحسنہ مین فرد پایا مگر شان ریاست اور سرداری سے اون کو عاری پایا اور چونکہ علی العموم اہل ہند خصوص رؤسا اور بالتخصیص اون مین اہل اسلام ادبار اور نکبت مین گرفتار ہین سو اپنا نیک و بد سمجھنے کی کسی کو لیاقت نہین ہے اور بالتخصیص رؤسا آدمی کو بالکل نہین پہچانتے اور مطلق دوست اور دشمن مین اونکو تمیز نہین ہے جیسا مولوی معنوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہین چشم دارد گوش دارد این زکا + خیره ام از چشم بندی خدا + کوئی ایک نصیحت میری اونھون نے قبول نہ کی جہان تک ممکن تھا مصارف لغو سے مین اون کو روکتا رہا مگر پھر چہ فروش گندم نما لوگون کے ہاتھ مین جیسے وہ پہنے تھے ویسے ہی پھنسے رہے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا اساسہ ٹونک سے ساتھ لائے تھے وہ سب اوڑا دیا۔ میری صلاح یہ تھی کہ کہین کسی کو وکیل کرکے نہ بھیجین صرف وہین بیٹھے ہوئے ایک مرافعہ وزیر ہندوستان کے پاس کردیوین اگر کچھ مفید ہو تو بہتر نہین تو صبر اور شکر کرین آخر وہین کا بیٹا رئیس ہے۔ پانچ ہزار روپیہ درماہہ اون کا مقرر ہے جو اساسہ پاس ہے اوس کی حفاظت کرین۔ ایک نہ سنی جو پاس تھا اوس کو ضایع کیا۔ آیندہ دیکھیے اون کی کیا گت ہوتی ہے خدا اون کو زندہ رکھے بعضے صفات مستحسنہ مین بے نظیر ہین غرض صحبت راقم کی اون کے ساتھ برہم ہوئی اور رفاقت اونکی ترک ہوئی۔ اب میری غیبت مین ٹھنڈے لوہے کے پیٹنے کی تدبیرون مین جو گیا سو گیا آیندہ دیکھیے کیا کھوتے ہین۔ ان سب کو الف کے نقل کے بعد بموجب مضمون بلاغت مشحون وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اس امر کے اظہار سے راقم کو باک نہین ہے کہ مجھ سا بدلیاقت ناقص اور ناتمام اپنے جوہر ذاتی مین اس وقت تک جسکی عمر ستر برس کی پہونچی جناب اقدس الٰہی تعالے شانہ نے محض اپنے لطف و کرم سے بدون استحقاق کے اوسکو اوس رتبہ اور ناموری پر پہونچایا کہ جس نے میرے آبا و اجداد کی جو شہرت اور بلند پایگی تھی اوس کو روشن کیا۔ انگلستان مین سلطانہ برطانیہ اعظم اور ایرلینڈ اور ہندوستان وغیرہ یعنی ملکہ معظمہ وکٹوریا دام اقبالہا و حشمتہا جس کا جھنڈا شوکت اور عظمت کا اکثر کرۂ عالم پر اوڑ رہا ہے اوس کے دربار مین

ذکر کرامت ترقی اور ناموری اور اپنے احوال
اپنے پروردگار کی نعمت کا بیان چیت مین ذکر کر

راقم نے نہایت عزت اور امتیاز کے ساتھ راہ پائی۔ اونکے کھانے کی میز پر مدعو ہوا تھا اگرچہ بافتضائے
تقدیر کے جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے اوس کا ظہور نہ ہوا۔ ہندوستان مین ایک وقت مین کئی سو سوار
اور پیادے انگریزی فوج کے میری سواری کے جلو مین دوڑے۔ قطع نظر اپنے ہندوستانی کے
ابنائے جنس سے برافراختگان انگلشیان جو آج ہندوستان مین سر تفاخر عرش برین پر رکھتے ہین
جس صحبت کی شرکت سے اور جس دعوت مین مطلوب ہونے سے نہایت اپنا فخر اور اعزاز سمجھتے
ہین اور شاید بعضون کو وہ صحبت اور دعوت باوصف کمال سعی کے میسر نہ ہوا دشواری سے میسر
ہوا ون صحبتون اور دعوتون مین راقم بزرگون کی بہت خواہش اور آرزو سے شریک ہوا۔ آنریبل مسٹر
گلاڈاسٹن جو آجکل ملکۂ معظمہ سلطنت برطانیہ اعظم کے وزیر اعظم ہین اونکی لیڈی نے اپنی صحبت شبینہ
مین جہان تمام ارکین سلطنت اور وزرا اور امرا جمع تھے دو دفعہ اپنا رقعہ طلب کا بھیج کے اوس مجمع
کی شرکت سے راقم کو شرف کیا اور بہت سی دعوتون مین اونھی صحبتون مین جن کے میزبان اوس عہد
مین مسٹر گلاڈاسٹن سے عزت اور امتیاز مین چڑھ کے تھے شریک ہونے سے راقم نے عزت اور
امتیاز حاصل کی نام بنام سب کا ذکر کرنا عبث اور فضول ہے بہت سے لوگون کے نام راقم بھول
بھی گیا ہے۔ صدہا میری تصویرین چھپی ہوئی اور کھنچی ہوئی مرقعون مین اور دفترون مین ارکین اور
شاہزادون کے برطانیہ اعظم کے اور فرانسیس اور روس اور پروش اور اطالیا اور صقالیا اور جرمن اور
پرتگیز اور اسپانیول اور روم اور شام اور مصر کے موجود ہین جب تلک ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان
کی حکومت پر رہی اوس کے کورٹ آف ڈیرکٹرز کے ساتھ اور بورڈ آف کنٹرول کے ساتھ اور قبل اور
بعد اوسکے برخاست کے سلطنت کے وزرا کے اور اکثر ارکین اور امرا کے ساتھ مراسلات اور مکاتبات
ہوا کیے شاہنشاہ فرانسیس کے خطوط حسب الحکم میرے نام پر آئے اوس سلطنت کے اکثر امرا کے ساتھ
مکاتبات رہے اکثر لوگ بہ لقب ہز اکسلنسی مجھکو لکھا کیے۔ الغرض سایۂ عزت و امتیاز ہر خاص و عام
کا اوس ممالک کے اشارہ کے واسطے میری طرف اوٹھتا تھا اور میری دعاے شبانہ روزی کا اللھم
اجعلنی محسودا ولا تجعلنی حاسدا الحمد للہ والمنۃ کہ مستجاب ہوئی کہ یہ گمنام ناچیز ہمیشہ محسود خاص اور عام کا

رہا کہ اوس سے اب بھی اس حالت کم مایگی مین بھی بچاؤ نہین ہے اور اگرچہ اس ناموری اور بلند پایگی کے ساتھ جو ہزارون مرتبہ میری حیثیت اور لیاقت سے زایہ ہے اور لاکھون روپیہ میرے ہاتھ سے صرف ہوا اور ہاتھ مین آکے نکل گیا کچھ مایہ نوکل جو اعقاب کے کام آوے یا میری حالت بے دست و پائی مین کام آوے وہ مین نے نہ چھوڑا اور جو تھوڑا بہت مدتون کی محنت اور مشقت نے اکٹھا کیا تھا وہ انگلستان مین دشمنون کے اور عدالت کے مصارف کے نذر کیا لیکن مال و منال کو مین ہاتھ کا میل سمجھتا ہون آیا اور صاف ہو گیا۔ اب صرف دو آرزو مین ہین جس کے واسطے شبانہ روز دست بدعا ہون ایک یہ ہے کہ اللہ تعالے میری عاقبت بخیر کرے اور دوسری یہ ہے کہ میرے اعقاب فکر حصول ناموری کی اپنی ذات سے کرین اور عیش و عشرت دارین مین بسر کرین اور زہے سعادت اونکی اگر میرے انفاس بقیہ چند کو طلب اور تلاش سے فارغ رکھین۔ گو آرزو یہ ہے کہ ضیق اور عسرت حالیہ کو یاد اے فرایض اور واجبات جو میری گردن پر ہین اس قدر اللہ تعالے اور مجھے اس عالم مین رکھے کہ مین خود اوسکو دفع کرون اور اوس کا بوجھ اعقاب کی گردن پر نہ ڈالون اس واسطے کہ اب تک ہاتھ پاؤن چلتے ہین لیکن اِرَادَۃُ اللہِ غَالِبٌ عَلٰی کُلِّ اِرَادَۃٍ جو مقدر ہو چکا ہے اور لوح محفوظ مین لکھا جا چکا ہے وہ خواہ مخواہ واقع ہو گا۔ راقم کے اولاد ذکور مین ایک میرا بڑا بیٹا مولوی فرید الدین خان سلمہ اللہ تعالے ہے۔ سلخ صفر المظفر ۱۲۵۹ھ مین مطابق یکم اپریل ۱۸۴۳ء پیدا ہوا۔ الحمد للہ نہایت سعید اور رشید ہے بہت تقوے کے ساتھ بسر کرتا ہے استعداد عربیت مین اچھی حاصل کی حدیث شریف کے درس مین بہت اوس کو شغف ہے مشکوۃ شریف اور صحیح بخاری سند کر چکا ہے۔ اور معمولی تحصیل کی کتابون مین متوسطات سے فارغ ہو چکا ہے اب بھی شغل چلا جاتا ہے فکر مین معقولات سے فارغ ہونے کے ہے سوا اے فرایض اور واجبات اور سنن اور مستحبات حتی المقدور ترک نہین کرتا۔ اللہ تعالے نے اب تک باضیب رکھا ہے مین برس کی عمر مین اودھ کی سلطنت سے قدامت آبائی کی نظر سے سات سو روپیہ مشاہرہ اوسکے واسطے مقرر ہوا اگرچہ پھر تخفیف مین قریب نصف کے

فرید الدین خان ولد ذکور مین پیدا ہونے والے مولوی

رہا مگر سلطنت کی ضبطی تک ملا کیا۔ چونکہ بسبب شغل درس و تدریس کے قوانین سلطنت کے یاد کرنے مین اونکو توجہ نہین ہے اور نہ ایسا کوئی اپنا مربی باقی رہا جس کو نظر رعایت کی ہو۔ سردست اس سلطنت مین ایسا کوئی عہدہ اون کو ملنا جو موافق حیثیت آبائی کے ہو عسیر معلوم ہوتا ہے۔ اور فضل الٰہی سے چونکہ ذہین اور باعلم ہین قوانین یاد کر لینا اور امتحان دینا کچھ دشوار نہین ہے۔ اگر کوئی ایسا مربی ہاتھ آوے کہ فتوح اور فلاح بالیقین ہو خواہ امتحان دینگے اسی نظر سے کہ باوصف ایسی محنت گوارا کرنے کے کچھ حاصل نہو توجہ نہین کرتے۔ بہرصورت اون کی سعادت مندی اور رشادت سے مجھے امید ہے کہ جناب اقدس الٰہی تعالے شانہ کوئی راہ اونکی فلاح کی نکالیگا قریب تین برس کے گذرے ہین کہ اونکی شادی کردی تھی اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ وہ عزیزہ مرحومہ جس کے ساتھ اون کا عقد ہوا تھا لاولد اس جہان سے اٹھ گئی۔ اس صدمہ سے البتہ اون کو بڑا ملال ہے اللہ تعالے صبر عطا کردے اور نعم البدل نصیب ہو۔ اس پیرانہ سالی مین ایک مصیبت عظیمہ میرے اوپر یہ ہوئی کہ اب تک اونکی اولاد کے دیدار سے مجھے اطمینان اور مسرت نہ حاصل ہوئی۔ وہ میری پہلی شادی سے جو والدین مغفورین نے کی تھی پیدا ہوا اگرچہ اور اولاد بھی ہوئی تھی مگر کوئی زندہ نہ رہی صرف اوس کی ایک بہن ہے جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہے اوس کی شادی مین اولاد تقریب مین پچیس تیس ہزار روپیہ صرف ہوے۔ عباسیون مین واحد علی سلمہ نام ایک لڑکے سے جو ہمارے خاندان کا نواسہ بھی ہے اوس کی شادی ہوئی۔ بہت لایق اور ہوشیار اور کارگزار ہے۔ اب تک الور کی ریاست مین معزز عہدے پر نوکر تھا کئی مہینے سے بیکار ہے خدا اوس کی دین و دنیا رفاہ اور فلاح سے کاٹے ایک اوس کا بیٹا میرا نواسہ ہے ساجد علی نام کلام اللہ حفظ کرتا ہے بیس سیپارے سے زیادہ حفظ کر چکا ہے بہت فطین اور ذہین ہے قیافہ اوس کا بہت اچھا ہے۔ اللہ تعالے اوسکی عمر مین برکت دیوے اور دین اور دنیا مین بہ آسایش بسر کرے[1] دو نکاح راقم نے اپنی خوشی سے کیے۔ ایک سیدہ کے ساتھ نکاح کیا تھا اوس سے میرا چھوٹا بیٹا ہے مولوی اکرم الدین احمد خان نام سلمہ اللہ تعالی تیرھوین رمضان المبارک سنہ ۱۲۶۰ھ مطابق ستائیسوین ستمبر

[1] نانا کی دعا مقبول ہوئی۔ حافظ ساجد علی صاحب وکیل اورنگ آباد کا وجود گرامی اسپر شاہد ہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوا فضل الٰہی سے نہایت سعید اور رشید ہوا۔ لیاقت اور قابلیت نوشتخواند فارسی کی بہت اچھی حاصل کی۔ عربیت مین متوسطات تک نوبت پہونچی تھی کچھ استعداد بھی ہوگئی مگر تکمیل نہ کی۔ اپنے شوق سے انگریزی شروع کی۔ تین برس تک لکھنؤ کے کیننگ کالج مین مشغول رہا فی الجملہ لکھنے پڑھنے کی کچھ استعداد بھی ہوگئی تھی کہ اوسکی شادی جناب عم والامقام مولوی خلیل الدین خان بہادر مغفور کی پوتی کے ساتھ جو امیر الدین خان مرحوم کی بیٹی ہے کردی جب سے انگریزی کا شغل بھی اوس کا موقوف ہوگیا۔ مین چاہتا تھا کہ اوس مین اوسکو تکمیل ہوجاے مگر اوس کی بہت عالی مقتضی خانہ نشینی کی نہ ہوئی۔ جیسا اوپر اوس کی طرف ایما ہوچکی ہے حیدرابا د دکن کا اوس نے سفر کیا اور وہان فوراً ایک معزز عہدہ پر مامور ہوگیا اور آیندہ امیدوار ترقی کا ہے۔ اور آجکل میری خانہ نشینی مین مدار مصارف خانگی سارے کس وکو کا جو قریب ایک سو آدمی زن و مرد ہین اوسی پر۔ اور میرے دو بھتیجے مولوی احسن الدین احمد خان اور مولوی ذکی الدین خان سلمہم اللہ تعالے پر جو تینون بھائی ایک ہی جگہ پر ہین۔ اور برادر عزیز حافظ مولوی ریاض الدین خان سلمہ اللہ تعالے پر ہے۔ اللہ تعالے اون سب کی عمرون مین برکت دے اور خوش رکھے

اب ذکر اپنے نسب نامون کا موافق پچھلے وعدہ کے ضرور ہوا۔ قدیم سے ہم زبان بزبان سنتے چلے آئے ہین کہ ہم لوگ علوی ہین جن کے دو خاندان اس قصبہ مین ہین ایک خاندان ملکزادون کا مشہور ہے اور ایک مخدوم زادون کا۔ یون نقل کرتے ہین کہ ایک بزرگ علوی ابوبکر جامی نام جون پور مین سلطان حسین سلطان الشرق کے عہد مین وارد ہوے۔ اسعد الدین یا اسد الدین سالاری اون کے وزیر تھے اون کی بیٹی کے ساتھ شادی ہوئی اون سے دو بیٹے پیدا ہوے۔ ایک کا نام نصیر الدین نصرت اور دوسرے کا نام بہاء الدین کیقباد۔ اور قصبۂ کاکوری مین ایک راجہ بیس کی قوم کا تھا اوس کا نام تھا راجہ ساتھنا اوس قصبہ مین ایک مرد شریف جو ظاہر اسید تھے اوسی راجہ کے سوارون مین نوکر تھے اونکا مکان اوسی راجہ کے قلعہ کے نیچے تھا جس کا نام کاکور گڈھ تھا۔ وہ سید کہین اوسی راجہ کے کام کو گئے تھے

قصبہ کاکورہ کے نسب نامہ کا ذکر اور اوس کی وجہ تسمیہ

۱؎ اول تعلقداری (ڈپٹی کشنری) سے نیشن لی ۱۲ منہ

گھر مین اون کی بی بی اور ایک اونکی بیٹی نا کتخدا تھی۔ سانون کا مہینا تھا اون کے گھر مین ایک درخت تھا اوس پر وہ جھولا جھولتی تھی۔ وہ راجہ بدمعاش جوان تھا۔ ہاتھی پر سوار نکلا اوس لڑکی پر اوس کی نظر پڑی۔ لوگ متعین کیے کہ اوس لڑکی کو لے آؤ۔ اوس لڑکی کی ماں نے لوگون سے کہا بہت اچھا مین اوس کو پوشاک اور زیور سے آراستہ کرکے جب تم لیجاؤ اور کوٹھری مین لیجا کے پہلے اپنی لڑکی کو چھری سے ذبح کیا اور بعد اوسکے اپنے تئین قتل کیا۔ اوس لڑکی کا باپ جب گھر مین پھر کے آیا سیدھا جون پور کو چلا گیا اور دن کو مشعلین جلا کے اور سر پر خون مین ڈوبا ہوا کپڑا ڈال کے قصر سلطنت مین گیا۔ مشعلین دن کو جلانا اشارہ ہے ظلم کی تاریکی کی طرف۔ الغرض جب شاہ حسین کو اس مظلمہ کی اطلاع ہوئی وہ بہت برہم ہوے اور اپنے وزیر اسعد الدین سالاری کے ساتھ مخفی ایک بندوبست کیا کہ وہ بادشاہ سے ظاہر مین برہم ہوکے جونپور سے مع اپنے کس و کو کے دتی کے ارادہ پر روانہ ہوے اور کسی مقام پر کاکوری کے قریب خیمہ کرکے راجہ ساتنا کو اطلاع کی اور یہ پیغام دیا کہ ہم سے اور سلطان الشرق سے بدمزگی ہوگئی ۔۔۔ اس واسطے ہم اپنی سلطنت قدیم دتی مین جاتے ہین اس سفر مین زنانہ یعنی محل کے لوگون کا لیجانا موجب زحمت کا ہے اس واسطے آپ اگر مہربانی سے ہمارے محل کے لوگون کو چند روز کے واسطے اپنے قلعہ مین جگہ دیجئے کہ وہ حفاظت سے رہین تو ہم بہت ممنون ہونگے دتی مین پہونچ کے اطمینان کے بعد ہم طلب کرلین گے راجہ چونکہ بدمعاش تھا وہ نعمت غیر مترقبہ سمجھا کہ لاکھون کا مال اور وزیر کے محل کی سیکڑون خوبصورت خوب صورت بیگمات مفت ملتی ہین نہایت خوش ہوا اور نہایت عجز و الحاح سے عرضی بھیجی کہ قلعہ حضور کا ہے اور مین غلام ہون بخوبی حفاظت کرونگا اس واسطے بدرقہ کی حاجت نہین ہے قلعہ کے اندر کوئی مسلح نہ آوے محل کے لوگ بے تکلف داخل ہون۔ اسعد الدین سالاری نے یہ بندوبست کیا کہ دو ہزار زنانی ڈولی ۔۔۔ ہر ڈولی پر دو سپاہی مسلح تلوار وغیرہ چھوٹے ہتھیار سے اور تیر و کمان سے جو اوس وقت رایج تھے تیار کین اور خود کچھ اور بدرقہ کے ساتھ ہمراہ ہوے ظاہر مین جو مسلح لوگ تھے وہ قلعہ سے باہر رہے ڈولیان سب جب قلعہ مین آچکین چار ہزار سپاہی مسلح پڑھ دیوے

کا اوٹھا کے نکل پڑے اور قتل عام شروع کر دیا۔ خود راجہ کو پکڑ کے سیکڑون عذاب سے قتل کیا منقول یون ہے کہ سلطان حسین کا حکم تھا کہ کتے اور بلی تک دہان زندہ نہ چھوڑنا۔ یہ ظاہرا مبالغہ ہے اس واسطے کہ مرد اور عورت اور لڑکے سپاہی اور پیشہ ور کسی کو زندہ نہ چھوڑنا اور سب پیشہ کے لوگ جون پور سے ہمراہ کر دیے تھے کہ اس قصبہ مین نئے آباد ہون۔ چنانچہ یہ حکایت ہمارے قصبہ مین سب خاص و عام کی زبان پر اباعن جد منقول چلی آتی ہے ایک بہت بوڑھا حجام جو ہمارے خاندان کا برتی تھا وہ بھی بچپن مین ہم سے یہ حکایت نقل کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ہم بھی رئیس قدیم اس قصبہ کے ہین اور تمھارے اجداد کے ساتھ سلطان حسین کے بھیجے ہوے آکے آباد ہوئے ہین۔ الغرض یون منقول ہے کہ ساری کاکوری سلطان حسین نے اسعد الدین سالاری کے اختیار مین چھوڑی اور اونکے دونون نواسے نصیر الدین نصرت اور بہاء الدین کیقباد یہان آباد ہوے انھین کو یا بہاء الدین کیقباد کی اولاد مین سے کسی کو ملک کا خطاب ہوا چنانچہ چند پشت تک ملک کا لفظ اسما کے ساتھ ضم ہوتا تھا کہ وہ نسب نامہ سے معلوم ہوگا اور اونکی اولاد سب ملکزادے کہلاتے ہین اور نصیر الدین نصرت کی اولاد سب مخدوم زادہ مشہور ہین اس واسطے کہ اونکی تیسری پشت مین حضرت مخدوم نظام الدین قاری معروف بہ شیخ بھکاری یا شیخ بھیکہ قدس سرہ پیدا ہوے جو بہت بڑے نامور مشایخ اور علما و کبار مین گذرے ہین اونکے عہد سے ساری اونکی اولاد مخدوم زادے کہلاتے ہین آئین اکبری مین مشایخ کے زمرہ مین نام نامی اونکا مندرج ہے اور بڑے بڑے امراے نامی اکبری عہد کے اون کے مریدین مین تھے چنانچہ ماہیم آنکہ جو اکبر بادشاہ کی دائی تھین اور اونکے بیٹے یا بھائی امراے کبار اکبری مین تھے جن کا نام شمس الدین کوکہ مشہور ہے اونھون نے وصیت کی تھی کہ حضرت کے جوار مین مدفون ہون اون کا بہت بڑا عقیدہ بنا ہوا ہے اور عوام کی زبان مین ماہم ساہم کا روضہ مشہور ہے۔ حالات اور صفات حضرت کے نقل کرنے کے واسطے ایک مجلد جدا گانہ درکار ہے ان دونون خاندانون مین تو بسبب یکجہتی ہونے کے قدیم سے خلط تھا ایک اور خاندان عباسیون کا ہے یعنی نسبون کا حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی طرف منتہی ہوتا ہے یہ خاندان بھی مدت سے ہمارے دونون خاندانون سے مخلط ہے
اور اوسی خاندان مین منصب اس قصبہ کی قضا کا ہے اور وہ مدعی ہین کہ پہلے رئیس کاکوری کے اوسی
خاندان کے بانی ہین مگر سند قدامت کی ظاہر افرمان اونھین سلطان حسین کا ہے تو غالبًا جب
اسعد الدین سالاری کی اولاد کو ریاست یہان ملی اوسی عہد مین سند قضا کی اوس خاندان کو ملی ہو
ایک اور صدیقی خاندان ہے جو کاکوری کے رؤسا مین ہین وہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی طرف
منتسب ہے وہ خاندان بھی پچھلے زمانہ مین دونون علوی خاندانون سے اور عباسی خاندان سے مخلط
تھا۔ اب اوس خاندان مین صرف ایک گھر باقی ہے جن سے ہمارے خاندانون مین اختلاط ہے اور
کئی گھر مخدوم زادون کے اوس خاندان کے نواسے ہین جو اب تک ہمارے یہان مخلط ہین۔ کچھ گھر
اوس خاندان کے باقی ہین جن سے اختلاط نہین ہے۔ ایک اور خاندان ہے کہ وہ بھی اپنے تئین
صدیقی کہتے ہین مگر یہ راقم کو نہین معلوم ہے کہ اوسی صدیقی خاندان کے ہین یا اوس سے علاوہ کوئی
دوسرا خاندان ہے جتنے گھر اون کے ہین وہ سب چودھری کہلاتے ہین کسی عہد مین یہ منصب
اون کے خاندان مین مفوض ہوا ہوگا جو پچھلے زمانے مین ایک معتمد خدمت بادشاہی تھی اور اس
سلطنت اودھ کی ضبطی تک کچھ نہ کچھ کام اس منصب کا اون خاندانون مین رہا جب سے انگریزی
ہوئی تب سے صرف نام رہگیا ہے لیکن اوس خاندان سے ہمارے تینون خاندانون کے ساتھ کبھی
خلط اور آمیزش نہین ہوئی۔ ایک اور گھرانا تھا کہ اون کو ستامی کہتے تھے ایک بزرگ مولوی حسن بخش
صاحب مرحوم اس گھرانے مین نامی ہوے اونھین کے ذریات کچھ باقی ہین کچھ مغول ہین سنتے ہین
کہ بعضے خاندان مغول کے اس قصبے مین بہت پرانے تھے یہان تک کہ کہتے ہین بعضے پالکی نشین
تھے اور پالکی پچھلے عہد مین یہ پالکی نہ تھی جو اب مروج ہے ظاہر امراد اوس سے جھالردار پالکی ہے
جو بے عطاے سلطنت کے کوئی استعمال نہین کر سکتا تھا۔ اب بھی کچھ گھر باقی ہین مگر کوئی نام برآوردہ
اونمین نہین ہے سلطنت کی ضبطی تک سپاہ کے فرقہ مین سوارون مین چند لوگ نوکر تھے۔ لیکن وے
لوگ اونھین خاندانون کے ذریات مین ہین جو پالکی نشین کہلاتے تھے یہ مجھکو نہین معلوم ہے سنتے

یون ہین کہ وہ خاندان ہودہ تالاب جو اس قصبہ مین ہے اوسکے کنارہ رہتے تھے۔ اوراب یہ لوگ وہان سے الگ قصبے کے شمال کی طرف رہتے ہین۔ کچھ اور خاندان خوش باش بھی تھے اب کوئی نام براور وہ اون مین نہین ہے۔ ہنود مین کایتھ کی کئی قوم ہین اونمین بھی کوئی نامی نہین ہے چند لوگ روزگار پیشہ ہین کچھ کھاتے پیتے ہین۔ دو ایک بنیے کی قوم مین کچھ متمول ہو گئے ہین مردم شماری انگریزی جو ہوئی اوس سے معلوم ہوا کہ کل عام و خاص آٹھ ہزار آدمی اب یہان کے باشندون مین ہین۔ یہان تک طوالت اس قصبہ کے ذکر مین ہوئی۔ اب اصل غرض جو نسب نامہ کے ذکر کی ہے وہ یہ ہے ہم نے اپنے والد ماجد مغفور سے سنا ہے کہ جناب حضرت جد امجد مغفور نے ایک نسب نامہ پچھلے کاغذات اسناد سے لکھا تھا مگر یہ نہین معلوم ہوا کہ وہ خاص اپنے ہی خاندان کا تھا یا سب خاندانون کا تھا سو وہ نسب نامہ شیخ فیض بخش صاحب مرحوم جو ایک بزرگ ہمارے ملکزادون کے خاندان کے تھے وہ لے گئے لیکن خود اونھون نے ایک بہت بڑی کتاب تمام کاکوری کے خاندانون کے نسب نامہ کی لکھی ہے شاید وہ نسب نامہ جناب جد امجد مغفور کا لکھا ہوا اون کا کچھ معین ہوا ہو یا وہی اصل تھا اس کا حال ہم کو معلوم نہین ہے بموجب اوس نسب نامہ کے جو وہی امر قدیم سے ہمارے دونون خاندانون مین ملکزادے اور مخدوم زادے کی زبان پر چلا آیا ہے نسبت ان دونون خاندانون کی محمد ابن حنفیہ ابن علی مرتضے کرم اللہ وجہہ کی طرف ہے اور بیچ مین واسطہ شیخ احمد جام کی طرف دونون خاندانون مین مشہور ہے چنانچہ ایک اور بزرگ مخدوم زادون کے شیخ احسان علی صاحب مرحوم نے اوسی نسب نامہ کے مطابق مخدوم زادون کا نسب اپنی بیاض مین لکھا ہے اور آخر مین اوس نسب نامہ کے یہ عبارت لکھی ہے۔ از کتاب مخدوم شیخ بھیکو قدس سرہ این چند سطور از بیاض شاہ حسن علی صاحب متوطن جورہ من اعمال بلیدہ کالپی در باب نسب نامہ نوشتہ شد انتہے۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ جناب حضرت شاہ تراب علی قدس سرہ نے ایک کتاب کشف المتواری لکھی ہے اوس مین جو نسب نامہ مخدوم زادون کا لکھا ہے اوس سے اور جو قدیم سے ہمارے دونون خاندانون مین مشہور تھا بڑا فرق ہے اور چونکہ وہ نسب نامہ کتاب

زاد الآخرت کے مقدمہ سے نقل ہوا ہے جو تصنیف ملا عبد الرشید ملتانی کی حضرت مخدوم شیخ بھیکھ کے خلفاؤن مین سے ہے بظاہر نہایت معتبر ہے اوس مین نصیر الدین تک تو اتفاق ہے جو قدیم نسب نامون مین نصیر الدین نصرت لکھا ہے اور اوس نسب نامہ مین امیر نصیر الدین دلیل اللہ لکھا ہے بعد اوس کے قدیم نسب نامون مین نصیر الدین نصرت ابن ابو بکر جامی مرقوم ہے اور اس نسب نامہ مین امیر نصیر الدین دلیل اللہ ابن ابو محمد خافی لکھا ہے اور اوسکے بعد بالکل ایک دوسرے کے خلاف ہے اور ابو محمد خافی کے کوئی بیٹے بہاء الدین کیقباد تھے یا اون کی شادی اسعد الدین سالاری کی بیٹی کے ساتھ اسکا حال بھی وہان نہین لکھا گیا۔ ایک اور رامر مشتبہ نقل کرتے ہین کہ شیخ احمد جام علوی نہ تھے شاید فاروقی یا صدیقی تھے۔ غرض عجیب سانحہ ہے نہ مشہر قدیم کو بالکل ہم غلط کہہ سکتے ہین اور نہ انکشاف کشف المتواری کو خلاف واقع تصور کر سکتے ہین۔ بار خدایا اگر یہ کہیے کہ کوئی ایک اونمین سے نسب مادری ہے اور بسبب عظمت شان کسی بزرگ کے اوس طرف منتسب ہوا اور اصل سے سہو اور ذہول واقع ہوگیا۔ یا جیسا بعضے بزرگون کی زبان سے یہ بھی سنا ہے کہ اصل ہمارے خاندان ملک زادون کا انتساب حضرت ابو بکر صدیق کی طرف ہے اور شاید خواجہ احمد جام صدیقی تھے اور جو بزرگ ابو بکر جامی جون پور مین آئے اور اسعد الدین سالاری کی بیٹی کے ساتھ اون کی شادی ہوئی وہ صدیقی ہون غرض حقیقت حال اور غیب کا آگاہ خداوند تعالے ہے۔ بہر صورت اس مقام پر ہم نسب نامہ اپنے خاندان آبائی کا موافق مشہرۂ قدیم کے جناب شیخ فیض بخش صاحب مرحوم کی کتاب سے نقل کرتے ہین اور جو انتساب ہمارے خاندان کو مخدوم زادون مین ہے اوس کو بموجب انکشاف کشف المتواری کے ہم نقل کرین گے۔ پس اول یہ ہے راقم عاصی شیخ الدین المخاطب بہ خان بہادر ابن قاضی حکیم الدین خان بہادر ابن اقضی القضات قاضی نجم الدین خان بہادر ابن مولوی حمید الدین ابن مولوی غازی الدین ابن ملا محمد غوث ابن ملک ابو الخیر ابن ملک ابو النعماء عرف ابو المکارم ابن ملک عبد السلام ابن ملک سیھے[1] ابن ملک چاند ابن ملک حسام الدین ابن

(۱) ابن ابو الخیر ابن ابو النعماء عرف ابو المکارم ابن ملک عبد السلام ابن ملک سیھے

[1] ملک سیھے اور ملک چاند دو نو لقب ہین جو بسبب شہرت کے اسنادین وہی لکھے گئے۔ اصل نام ان دو نو بزرگون کے معلوم نہین ہوئے ۱۲

ملک نظام الدین ابن[۱۳] ملک بہاء الدین کیقباد۔ یہان تک ان بزرگون کے نام اسناد اور وثایق سے متحقق ہوے ہین اوس سے آگے موافق اشہار قدیم دونون خاندان ملکزادون اور مخدوم زادون کے جن دونون خاندانون کا اتصال اسی پشت مین ہے یعنی بہاء الدین کیقباد ملکزادون کے جد اور نصیر الدین نصرت مخدوم زادون کے جد دونون حقیقی بھائی تھے بیٹے[۱۴] ابوبکر جامی کے ابن[۱۵] خواجہ درویش احمد ابن[۱۶] خواجہ احمد جام زندہ پیل ابن[۱۷] خواجہ ابی طالب ابن[۱۸] خواجہ محمد شاہ ابن[۱۹] خواجہ محمد رضا ابن[۲۰] خواجہ موسی ابن[۲۱] خواجہ عمران ابن[۲۲] خواجہ عثمان ابن[۲۳] خواجہ ابوحنیف ابن[۲۴] خواجہ اسفندیار ابن[۲۵] خواجہ ابوالحسن کوفی ابن[۲۶] خواجہ ابوتراب ابن[۲۷] خواجہ رضی الدین ابن[۲۸] خواجہ ابوالقاسم ابن[۲۹] محمد حنفیہ ابن[۳۰] علی مرتضی سلام اللہ علیہ وکرم اللہ وجہہ۔ اور راقم کا انتساب مخدوم زادون کے خاندان سے دو وجہ سے معلوم ہے اور شاید کسی اور پشت سے بھی ہو کہ وہ معلوم نہین ہوا اول یہ ہے کہ راقم مسیح الدین ابن[۱] مولوی علیم الدین خان بہادر ابن[۲] قاضی القضات مولوی نجم الدین علی خان بہادر ابن[۳] جناب مولوی حمید الدین مغفور والد ماجد راقم کی والدہ مسماۃ حیاتی بی بی بنت[۵] محمد حوزم ابن[۶] محمد اکرم ابن[۷] محمد افضل ابن[۸] محمد اشرف ابن[۹] شیخ عبدالقادر ابن[۱۰] شیخ شہاب الدین عرف سوندھے صاحب اور دوسری وجہ یہ ہے کہ راقم مسیح الدین ابن[۱] بی بی قطب النسا بنت[۲] بی بی شریف ہماری جدہ مادری کی والدہ بی بی ہدایت بنت[۴] شیخ حفیظ اللہ ابن[۵] امیر الرحمن ابن[۶] شیخ عصمت اللہ ابن[۷] شیخ عزیز اللہ ابن[۸] شیخ عبدالکریم ابن[۹] شیخ شہاب الدین عرف سوندھے صاحب اور شیخ شہاب الدین سوندھے صاحب ابن[۱۰] مخدوم نظام الدین قاری عرف شیخ بھیکھ یا شیخ بھکاری ابن[۱۱] قاری امیر سیف الدین ابن[۱۲] قاری امیر حبیب اللہ نظام الدین معروف بہ پیر کلان ابن[۱۳] قاری امیر نصیر الدین دلیل اللہ ابن[۱۴] قاری محمد صدیق المعروف بہ ابو محمد خافی ابن[۱۵] قاری عبداللہ ابن[۱۶] قاری عبدالصمد ابن[۱۷] قاری امیر شمس الدین خورد معروف بہ قاری محقق جامع جمع الجوامع کبیر لغت تفاسیر و احادیث ابن[۱۸] قاری عبدالمجید دربان آستانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن[۱۹] حاجی الحرمین سلطان حسین ابن[۲۰] قاری امیر ابراہیم اور یہ قاری

نسب نامہ راقم کا انتساب مخدوم نظام الدین قاری عرف شیخ بھکاری سے جو مخدوم زادون مین سے ہین ثابت ہوا

امیر ابراہیم خلیفہ اور نواسہ حضرت سید عبدالرزاق خلف اور خلیفہ حضرت غوث الثقلین محی الدین گیلانی قدس سرہ کے تھے اور ابن[۱۲] قاری سلطان عبداللطیف ابن[۱۳] قاری امیر عبداللہ خانی ابن[۱۴] مولانا شمس الدین صابر ابن[۱۵] قاری مجیدالدین خانی ابن[۱۶] قاری امیر سلیمان منصر ابن[۱۷] مولانا وجیہ الدین احمد ابن[۱۸] قاری محمد ابن[۱۹] قاری احمد ابن[۲۰] علی ابن[۲۱] محمد حنفیہ ابن[۲۲] جناب مستطاب امیرالمومنین علی مرتضی سلام اللہ علیہ وکرم اللہ وجہہ۔ اب انتساب اپنا عباسیہ کے خاندان مین لکھا جاتا ہے یعنی راقم مسیح الدین ابن[۱] قطب النسا مغفورہ بنت[۲] شیخ غریب اللہ ابن[۳] شیخ محمد نوح ابن[۴] قاضی محمد تقی ابن[۵] قاضی عبدالحلیم۔ اور جدۂ پدری راقم کی بنت[۶] شیخ محمد اسلم ابن[۷] قاضی محمد تقی ابن[۸] قاضی عبدالحلیم۔ اور راقم کی جدۂ مادری بنت[۹] بخشی رفعت اللہ خان ابن[۱۰] قاضی محمد واعظ ابن[۱۱] قاضی حافظ ابن[۱۲] قاضی عبدالحلیم۔ سو تین واسطے قاضی عبدالحلیم کی طرف منتسب ہوئے ابن[۱] قاضی سعود ابن[۲] قاضی حسین ابن[۳] قاضی بایزید ابن[۴] مخدوم قاضی شیخ دانشمند ابن[۵] مخدوم قاضی شیخ بہاءالدین ابن[۶] مخدوم قاضی شیخ کلان ابن[۷] مخدوم شیخ فضل اللہ ابن[۸] مخدوم شیخ عنایت اللہ ابن[۹] مخدوم شیخ فخرالدین ابن[۱۰] مخدوم شیخ ابوالبرکات ابن[۱۱] مخدوم شیخ طاہر ابن[۱۲] مخدوم شیخ علی ابن[۱۳] مخدوم شیخ حسین ابن[۱۴] مخدوم شیخ منہاج الدین ابن[۱۵] مخدوم شیخ محمد ابن[۱۶] مخدوم شیخ ضیاءالدین ابن[۱۷] مخدوم شیخ زین الدین ابن[۱۸] مخدوم شیخ کمال الدین ابن[۱۹] مخدوم شیخ مسعود ابن[۲۰] مخدوم شیخ محمود ابن[۲۱] مخدوم صدرالدین حامد ابن[۲۲] مخدوم قاضی خواجگی ابن[۲۳] مخدوم احمد ابن[۲۴] قاضی یحیی۔ ابن[۲۵] مخدوم قاضی علی ابن[۲۶] مخدوم قاضی احمد ابن[۲۷] مخدوم قاضی قاسم ابن[۲۸] مخدوم قاضی عبدالملک ابن[۲۹] مخدوم قاضی احمد حاکم قلعہ ٹھٹھ ابن[۳۰] مخدوم ابراہیم ابن[۳۱] موفق ابن[۳۲] ابراہیم ابن[۳۳] اسمٰعیل ابن[۳۴] محمد ابن[۳۵] علی ابن[۳۶] عبداللہ ابن[۳۷] عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہان تک جو کچھ اپنے حال مین مجھے لکھنا مقصود تھا وہ تمام ہوا۔

تمت

خاتمہ

مولوی سیح الدین خان مرحوم کی خود نوشت آپ کے ملاحظے سے گذر چکی اون کی ایک دوسری تالیف تاریخ الخلفا اون کے فرزند رشید مولوی محمد اکرم الدین خان نے جو ریاست حیدرآباد مین اول تعلقداری کے عہدہ تک فائز ہو کر وظیفہ یاب ہوے ۱۳۰۵ھ مین مطبع بھیکاجی نارائن واقع اورنگ آباد دکن مین طبع کرائی تھی۔ اس کے شروع مین ۸ صفحہ پر اسی خود نوشت سے اخذ کر کے مولف کے مختصر سوانحی حالات اُنھون نے درج کیے تھے جس کے آخر مین یہ عبارت تھی :-

"۲۳- دسمبر ۱۸۶۵ء کو آپ نے وطن مین معاودت فرمائی اور اپنا اکثر وقت تاریخ انگلستان (جس کا آخری جزو یہ خود نوشت ہے) کی تالیف مین جو نہایت نادر و مفید کتاب ہے اور حفظ کلام مجید مین صرف فرمایا قریب بیس بائیس سیپارہ کے حفظ بھی کر لیے تھے۔ مگر علالت اور قضا نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔ اسی عرصے مین آپ کو چند دنون نواب ٹونک و رامپور کی مصاحبت مین بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

الغرض مولوی صاحب نے ابتداے سن شعور سے زمانۂ وفات تک اپنا وقت کبھی بیکار و رایگان نہین کیا۔ آپ کے تالیفات مین مفتاح الرشاد لکنوز المعاش والمعاد۔ اور جدول طلوع و غروب۔ اور تاریخ انگلستان اور شرح خطبۂ شقشقیہ۔ اور تاریخ الخلفا حالات خلفاے بنی امیہ و بنی عباس مین۔ اور تاریخ فارسی ہندوستان واودھ یادگار ہین۔ آپ کے خیالات اگرچہ گذشتہ صدی کے بزرگوارون سے بالکل نئے اور علیحدہ تھے مگر

آپ اپنے مذہبی عقائد مین نہایت راسخ و مضبوط تھے جس کی تصدیق خود آپ کے کلام سے ہوسکتی ہے۔

"۷ محرم ۱۲۹۵ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۸۷۷ء کو آپ نے بعارضہ استسقا اس جہان فانی سے مقام کاکوری مین رحلت فرمائی۔ اللہ تعالے جناب ممدوح کو اپنے جوار رحمت مین جگہ دے۔"

تاریخ الخلفا جس زمانے مین لکھی گئی یا شائع ہوئی اوس وقت تو یقیناً بہت زیادہ قدر کے قابل تھی کہ غالباً اردو مین اوس سے پیشتر اس مبحث پر کوئی ایسی جامع کتاب نہین موجود تھی۔ لیکن اب بھی باوجودیکہ متعدد تالیفات و تراجم اس موضوع پر شائع ہوچکے ہین اوس کا مطالعہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اول تو لایق مؤلف نے اہتمام و تلاش سے عربی و فارسی کی قدیم تاریخون کا مطالعہ کرکے ضروری حالات اخذ کیے تھے۔ دوسرے تاریخی روایات کی تحقیق اور واقعات کے متعلق اظہار رائے کا جہان تک تعلق ہے مصنف نے بہت آزاد خیالی سے کام لیا ہے۔ البتہ موجودہ زمانہ زبان کی جس سلاست اور ترتیب مضامین کی جن خوبیون کا خوگر ہوگیا ہے وہ اوس مین نہ ملین گی۔ خدا کرے کہ مصنف کے اہل خاندان کی کوشش سے یہ کتاب دوبارہ زیور طبع سے آراستہ ہوجائے یا یہ سعادت بھی اس حقیر کی قسمت مین آئے۔

حال ہی مین مولوی حافظ محمد علی حیدر علوی کاکوروی نے "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" کے نام سے ایک بسیط کتاب شایع کی ہے جس مین کاکوری کے اکثر علما۔ فضلا۔ شعرا۔ امرا وغیرہ کے حالات درج ہین۔ اس کے صفحات ۳۹۹-۴۰۳ مین مولوی مسیح الدین خان کا تذکرہ ہے۔ جو تاسترا سی خود نوشت سے ماخوذ ہے۔ آخری عبارت جس مین تصانیف اور وفات کا ذکر ہے نقل کی جاتی ہے۔

"تصانیف ان کے حسب ذیل ہین :-

(۱) مفتاح الرشاد لکنوز المعاش والمعاد فارسی مطبوع

(۲) جدول طلوع وغروب

(۳) تاریخ انگلستان مشہور بہ سفرنامۂ لندن - اردو غیر مطبوع - نہایت بے مثل تاریخ ہے

(۴) شرح خطبۂ شقشقیہ حضرت جناب امیر کرم اللہ وجہہ - غیر مطبوع -

(۵) تاریخ الخلفا اردو مطبوع -

(۶) تاریخ ہندوستان واودھ - غیر مطبوع -

(۷) شرح مکتوب حضرت ابی بکر صدیق بنام حضرت علی - غیر مطبوع -

(۸) شرح الشرح رسالۂ نثر اللآلی غیر مطبوع

(۹) ضوابط ستہ غیر مطبوع - زبان فارسی کے اصول کے بیان مین -

انھون نے بمقام کاکوری بعارضۂ استسقا بتاریخ ۷ - محرم روز چہارشنبہ ۱۲۹۹ھ بعمر ۸۸ سال انتقال کیا - اور حظیرۂ خاندانی متصل چاند محل کاکوری مین دفن ہوے

قطعۂ تاریخ انتقال از مولوی محی الدین خان ذوق کاکوروی درعبوری ومعنوی

سال ماہ فوت مولانا مسیح الدین خان — روز وتاریخیکہ رفت او جانب خلد برین

بین عیان زین مصرع وبگذار روی اشتباہ — یوم الاربعاء وبد از ماہ محرم ہفتمین"

۹۹ ۱۲

تاریخ الخلفا کا جو اقتباس پہلے درج ہوا اوس مین تاریخ انتقال ۷ - محرم ۱۲۹۹ ہجری مطابق ۳۰ - نومبر ۱۸۸۱ء ہے - یعنی سنہ ہجری غلط چھپ گیا ہے - مصرعۂ تاریخی کی شہادت قوی کے علاوہ صد سالہ جنتری دیکھی گئی تو ۳۰ - نومبر ۱۸۸۱ عیسوی کو ۷ - محرم ۱۲۹۹ ہجری ہی سے مطابقت ہوتی ہے - ۷ - محرم ۱۲۹۹ تو ۱۹ - نومبر ۱۸۸۶ء کے مطابق تھی -

خود نوشت مطبوعہ کے صفحہ ۷ پر مصنف کے پردادا مولوی حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے جس فارسی رسالہ کا ذکر ہے اوسے خود نوشت سے کوئی تعلق نہ تھا - اس لیے خارج کر دیا - انشاء اللہ العزیز یہ رسالہ علیحدہ چھپ جائیگا -

ظفر الملک - ۹ - اکتوبر ۱۹۲۸ء

مرزا رجب علی سرور مرحوم

فسانہ عجائب ۴
انشائے سرور ۶

میر منیائی مرحوم

امیر اللغات نامکمل ۴
صنوخانہ عشق ۴
مرآۃ الغیب ۴
محامد خاتم النبیین ۸
بینائے سخن ۴
مکاتیب امیر منیائی ۴

جلال مرحوم

سرمایہ زبان اردو ۴
مضمونہائے دلکش ۴
نظم نگارین ۴
رسالہ تعدد زوجات ۸
افادہ تاریخ ۸
قواعد النحو ۴

مرزا احمد عباس متوشی مرحوم

نسانہ نادر جہاں ۴
بیوی سہیلی ۱۲
دختر عمر ۸
افسون ۱۱

منشی فضل حسین بہار

نیاز و بسمل ۴
زار حسین ۴

پنڈت شانتا تھ سرشار

فسانہ آزاد جلد ۴
سیر کہسار ۴
خدائی فوجدار ۴
جام سرشار ۴
الف لیلا کھٹرنا دل ۴

منشی سجاد حسین مرحوم

اخلق الذین ۸
دربار جرام پور ۸
پیاری دنیا ۸
کایا پلٹ ۸
مجھی چھری ۶
طرحدار لوٹری ۴
لطیفی فارس ۱۲
کیلی کا بھل
جوہر حق
مزالی ۱۲
ایاب خرمی ۱۲
طاہرہ ۱۲
شوقین ملکہ ۱۲
یوسف و زلیخا ۱۲
گل رشتہ کھنو ۱۲
شاعرانہ دعاشقانہ مضامین ۱۰
آغاز و ختم سال ۴
سیر رجال ۴

منشی محمد حسن قمر

تاریخی و غیر تاریخی مضامین ۴
بازار ۴

پریم چند

پریم بتیسی ۴
پریم پچیسی ۴

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

رام پیاری کامل ۴
عبرت کامل ۴
حسن سرور کامل ۴
اختر حسینہ ۴
دیول دیوی ۴
جعفر و عباسہ ۱۲

شوق قدوائی مرحوم

ترانہ شوق ۴
قاسم و زہرہ ۱۲
نیرنگ جمال ۴
کنجینہ ۱۲
میکنفن اور لوی ۲

خواجہ عبدالرؤف عشرت

زبان دانی ۶
اصلاح زبان اردو ۶
قواعد میر ۶
اصول اردو ۶
جان اردو ۶
شاعری کی پہلی کتاب ۴
دوسری کتاب ۴
تیسری کتاب ۴
لغات اردو ۴

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم

یادایام ۴
تذکرہ گل رعنا ۴
تاریخ ابن خلدون جلد اول ۴
" روم ۴
" سوم ۴
" چہارم ۴
" پنجم ۴
" ششم ۴
" ہفتم ۴
" ہشتم ۴
" نہم ۴
" دہم ۴
" یازدہم ۴
سلطان صلاح الدین ۶
نور الدین محمود ۶

مولوی محمد علیم انصاری

الاسلام والنصرانیہ ۱۲
فتح اندلس ۴
ابو مسلم خراسانی ۴
تاریخ عرب ۴

حافظ اسلم جیراجپوری

سیرۃ الرسول ۴
خلافت راشدہ ۴
خلافت بنو امیہ ۴
خلافت بنو عباس ۴
عباسیہ بغداد ۴
علوم عرب ۴

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

رحمۃ للعالمین ۴
سفرنامہ حجاز ۴

مولوی خلیل الرحمن

اخبار الاندلس جلد ۴
تاریخ مولدین ۴
مختصر تاریخ اسلامی ۴
عذرا ۴

مولوی محمد اشرف

سیرۃ الرسول ۴
تاریخ آل عثمان ۴
حالات مرزا سورجان ۴
حالات قسطنطنیہ ۴
تاریخ العرب ۴
تاریخ الکرد و الکردیہ ۴

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

سیرۃ الصدیق ۴
علماے سلف ۴
امراے ہنود ۴

منشی سجاد حسین بہاری

آخر کبری ۴
حیات مسیح ۴
تذکرۃ الشعرا حسینی ۴

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

منشی سجاد حسین بہاری

آخر کبری ۴
حیات مسیح ۴
امراے ہنود ۴

نوٹ:- مہاتما بدھ کی مختصر و انگریزی اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ۴

ملنے کا پتہ - انا طوک کمپنی لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا ایم اے

خیالات عزیز ۱۲ / ذکر ہاروتی ۱۲

خواجہ عباد اللہ اختر

صدیق اکبر ۱۲ / حضرت زید ۶ / مشاہیر اسلام ۱۲ / بغداد ۱۲ / دمشق ۱۲ / دیوان ظفر ۱۲

مفتی نور الحق صاحب

تاریخ الوالبشر ۸ / تذکرۃ النبیین ۱۲ / حقانیت اسلام ۱۲

میر ولی اللہ بی اے

بندگی ۱۲ / کاس الکرام ۱۲ / لسان الغیب جلد اول ۱۲ / " " دوم ۱۲ / " " سوم ۱۲ / " " چہارم ۱۲

مسدس مسعودی

انتخاب اردو ۱۲ / جاپان کا تعلیمی نظام ۱۲ / انتخاب نذیر ۱۲

مولنا حسرت موہانی

شرح دیوان غالب ۱۲ / کمل دیوان حسرت ۱۲

مولوی عبد الماجد بی اے

خیالستان ۱۲ / حکایات و احساسات ۱۲ / پیام امن ۱۲ / خصوصت اسلام ۱۲ / فلسفیانہ مضامین ۱۲ / آزاد و بیتیاں ۸

مسٹر ظفر علی۔ ایڈیٹر

عروس کا کلب ۹ / زمینی چھڑی ۱۲ / اکبر ۱۲ / اورنگ زیب ۱۲ / رنجیت سنگھ ۱۲ / لارڈ کلائیو ۱۲

پروفیسر فرید الدین

تحفہ سائنس ۸ / بادل کے بچے ۸ / خونابۂ عشق ۸

حکیم محمد اشفاق علی بی اے

پاپ کا گناہ ۸ / حسن کی حقیقت ۸

مسٹر عبد الحمید بی اے

جذبات فطرت چار حصے ۸ / معارف فطرت ۸ / مناظر قدرت ۸ / علم الصحت ۱۲

مولوی عبد الرزاق ندوی

اسوۂ حسنہ ۸ / کتاب الوسیلہ ۸ / لڑکی کا وہ دولہا ۸

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن ۱۲ / سیرۃ عائشہ ۱۲ / حیات امام مالک ۸ / خلافت عثمانیہ ۱۲ / خلافت و ہندستان ۸ / مولوی عہد اسلام ۱۲ / شامی جہاز ۸ / سیرۃ عمر بن عبد العزیز ۱۲ / انقلاب الامم ۸ / تاریخ الحرمین الشریفین ۸ / فقہ اسلام ۱۲ / طرفہ نسوانی ۸ / شعر العجم جلد ۴ / مولوی عبد الباری ندوی / جنگ یرموک کی کہانیاں ۱۰ / مبادی علم النفس ۸ / پرکلہ فلسفہ ۸

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

معاش الدین ۸ / مذکرۃ المصنفین ۸ / صحف سماوی ۸ / شمع محفل ۱۰

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

سیر الصحابہ جلد اول ۸ / سیر انصار و مہاجرین جلد ۸ / سیر الصحابیات ۸

مولوی عبد الصمد صارم

قرآن آسان قاعدہ ۱۲ / سلطان نامہ ۸ / محرم نامہ ۸ / فاطمی دعوت اسلام ۸ / نور کوثر پاک ۱۲ / کرشن جنم ۸ / شامی جہاز ۸ / سیارہ دل ۸ / سرائے سفر ۸ / نسبت الفوت ۸ / قطرات اشک ۸ / جوہر فراست ۸ / عروس کربلا ۸ / یاسمین شام ۸ / تیغ کمال ۸ / ماہ عجم ۸ / محبوب خدا بنو ۸ / سودہ ۸

خواجہ حسن نظامی

سلطان نامہ ۸ / محرم نامہ ۸ / نور کوثر پاک ۱۲ / کرشن جنم ۸ / شامی جہاز ۸ / سیارہ دل ۸ / سرائے سفر ۸ / نسبت الفوت ۸ / قطرات اشک ۸ / جوہر فراست ۸ / عروس کربلا ۸ / یاسمین شام ۸ / تیغ کمال ۸ / ماہ عجم ۸ / محبوب خدا بنو ۸ / سودہ ۸

نیاز فتح پوری

آبشار ۸ / پچیس کہانیاں ۱۲

مولوی عبد النصاری

سفرنامہ کمال سلیمانیہ ۱۲ / سیر دہلی ۱۲

مولوی عبد الرشید الجزری

الزہرا ۱۲ / صبح زندگی ۸ / شام زندگی ۸ / شب زندگی ۸ / نور زندگی ۱۲ / دوشیزہ ۸ / شاہ اول و شہزادہ ۸ / قطرات اشک ۸ / جوہر فراست ۸ / عروس کربلا ۸ / یاسمین شام ۸ / تیغ کمال ۸ / ماہ عجم ۸ / محبوب خدا بنو ۸ / سودہ ۸

کتابستان علی

چند بات بہاشا ۸ / بہار ستان ۸ / صحابیات ۸ / تاریخ الذہبیین ۸

پاس عظیم آباد

رقعہ نامچہ ہند ۱۲ / اسلام کا انجام ۶ / چراغ سخن ۱۲ / نشتر پاس ۱۲

مکتبہ الدین یعنی مرحومین کے استقلال مسلمانوں کی خوشحالی اور آئندہ نسلوں کی حفاظت کا ذمہ دار خانقاہ رحیمیہ

لے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

۸۹۱sd۳۰ ۳۰۵۱۱۱